

جاوید احمد غامدی

# البیّنات

الانعام - الحجرات  
۶ — ۱۵

۲



جملہ حقوق محفوظ ہیں

## نئی اشاعت نظر ثانی کے بعد

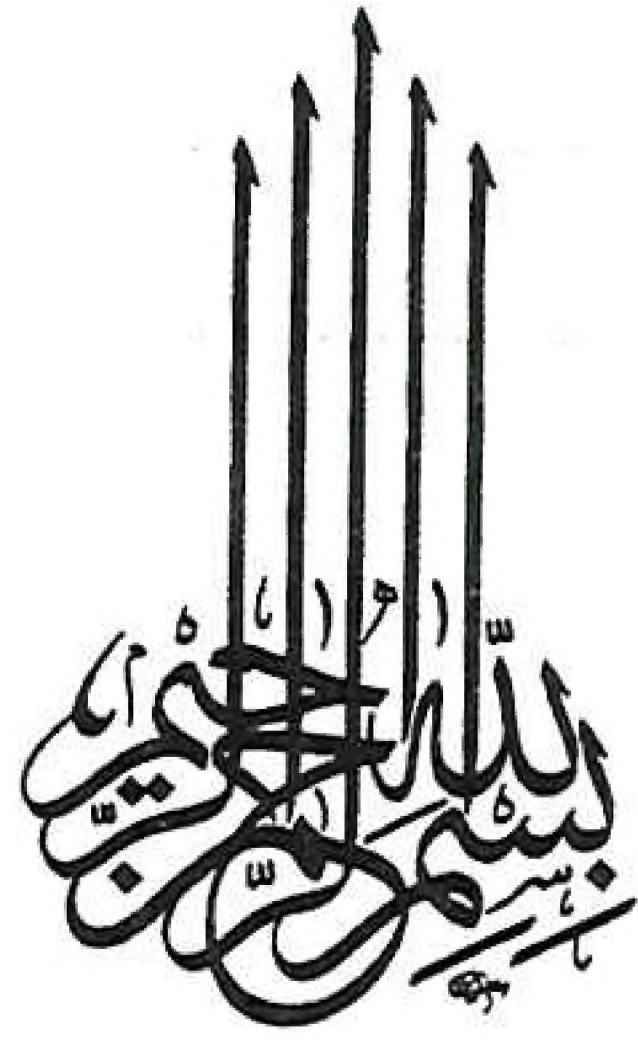
المورد	ناشر:
ٹویکل پرنٹنگ پریس، لاہور	طابع:
جولائی 2018ء	طبع اول:
محمد یوسف نگر	کتابت:
	قیمت:
978-969-8799-94-6	:ISBN

Address: Post Box 5185, Lahore Pakistan.

Website: [www.al-mawrid.org](http://www.al-mawrid.org)

Email : [info@al-mawrid.org](mailto:info@al-mawrid.org), [almawrid@brain.net.pk](mailto:almawrid@brain.net.pk)





## فهرست

### باب دوم

۱۲	_____	۶- الانعام
۱۲۷	_____	۷- الاعراف
۲۶۴	_____	۸- الانفال
۳۲۱	_____	۹- التوبة

### باب سوم

۴۱۳	_____	۱۰- یونس
۴۶۴	_____	۱۱- هود







٥١٢	_____	١٢- يوسف
٥٢١	_____	١٣- الرعد
٥٩٢	_____	١٤- ابراهيم
٦١٢	_____	١٥- الحجر







## باب دوم

### الانعام - التوبة

قریش پر اتمام حجت  
مسلمانوں کا تزکیہ و تطہیر  
اور قریش اور اہل کتاب، دونوں کے لیے  
خدا کی آخری دینونت کے ظہور کا بیان





## باب دوم

### الانعام - التوبة

۶ — ۹

یہ قرآن مجید کا دوسرا باب ہے۔ اس میں 'الانعام' سے 'التوبة' تک چار سورتیں ہیں۔ ان سورتوں کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے پہلی دو — 'الانعام' اور 'الاعراف' — ام القریٰ مکہ میں اور آخری دو — 'الانفال' اور 'التوبة' — ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔

قرآن کے دوسرے تمام ابواب کی طرح یہ چیز اس باب میں بھی ملحوظ ہے کہ یہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا اور مدنیات پر ختم ہو جاتا ہے۔

اس کے مخاطب مکی سورتوں میں قریش اور مدنیات میں مسلمان ہیں، اہل کتاب کا ذکر اگر کہیں ہوا ہے تو ضمناً ہوا ہے۔ چنانچہ اس کی ملکیت میں استدلال بھی بیش تر عقل و فطرت اور نفس و آفاق کے شواہد سے ہے یا پھر تاریخ کے حقائق اور قریش کے مسلمات سے۔ اس لیے کہ وہ صحیح بھی تھے اور قریش انھیں تسلیم بھی کرتے تھے۔

اس کا موضوع قریش پر اتمام حجت، مسلمانوں کا تزکیہ و تطہیر، اور قریش اور اہل کتاب، دونوں کے لیے خدا کی آخری دینونت کے ظہور کا بیان ہے۔

یہ باب ایک ذرۂ سنام ہے جس میں آگے اور پیچھے کے تمام ابواب اپنے منہا کو پہنچتے اور رسولوں کے باب میں خدا کی اس سنت کا ظہور ہوتا ہے جس کے تحت انھیں



غلبہ حاصل ہوتا اور اُن کے مخالفین لازماً مغلوب ہو جاتے ہیں۔

یہ مضمون اس باب میں جس ترتیب کے ساتھ بیان ہوا ہے، وہ یہ ہے:

الانعام: دعوت و انذار۔

الاعراف: انذار اور اتمام حجت۔

الانفال: اتمام حجت کے بعد خدا کی آخری دینونت کے لیے مسلمانوں کا تزکیہ و تطہیر

اور انھیں جہاد کی تیاری کی ہدایت۔

التوبة: آخری دینونت کا ظہور۔





# الانعام - الاعراف

٢ — ٤





## الانعام - الاعراف

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں جو حقائق عقل و فطرت اور نفس و آفاق کے دلائل سے ثابت کیے گئے ہیں، دوسری میں انہی کا اثبات تاریخی دلائل کے ساتھ اور اتمام حجت کے اسلوب میں ہوا ہے۔ پہلی سورہ میں دعوت اور دوسری میں انذار کا پہلو غالب ہے۔ دونوں کے مخاطب قریش ہیں اور ان کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ دونوں سورتیں بالترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلہ انذار عام اور مرحلہ اتمام حجت میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ — الانعام — کا موضوع قریش کے لیے توحید، رسالت اور معاد کے بنیادی مسائل کی وضاحت، ان مسائل کے بارے میں اُن کی غلط فہمیوں پر تنبیہ اور انہیں توحید خالص پر ایمان کی دعوت ہے۔

دوسری سورہ — الاعراف — کا موضوع قریش کو انذار اور اُن کے لیے اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ کسی قوم کے اندر رسول کی بعثت کے مقتضیات و تضمینات کیا ہیں اور اگر کوئی قوم اپنے رسول کی تکذیب پر اصرار کرے تو اُس کے کیا نتائج اُسے لازماً بھگتنا پڑتے ہیں۔



## سورة الانعام

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَجَعَلَ  
الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ ثُمَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ ①

— ۱ —

اللہ کے نام سے جو سرا سر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔  
شکر اللہ ہی کے لیے ہے جس نے زمین و آسمان بنائے، روشنی اور تاریکیاں پیدا  
کیں۔ پھر تعجب ہے کہ یہ منکرین اپنے پروردگار کے ہم سر ٹھیراتے ہیں! وہی ہے جس

۱۔ اصل میں لفظ 'الْحَمْدُ' استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں یہ کسی کی خوبیوں اور کمالات کے  
اعتراف کے لیے بولا جاتا ہے۔ پھر ان خوبیوں اور کمالات کا فیض اگر حمد کرنے والے کو بھی پہنچ رہا  
ہو تو اس میں شکر کا مفہوم آپ سے آپ شامل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سورۃ اعراف (۷) آیت ۴۳،  
سورۃ یونس (۱۰) آیت ۱۰ اور سورۃ ابراہیم (۱۴) آیت ۳۹ میں اس کے نظائر سے واضح ہوتا ہے کہ  
'الْحَمْدُ لِلَّهِ' کی ترکیب میں یہ بالعموم اُسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جسے ہم لفظ  
شکر سے ادا کرتے ہیں۔

۲۔ یہ مشرکین عرب کے مسلمہ سے استدلال فرمایا ہے کہ جب وہ زمین و آسمان اور نور و ظلمت  
سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے ہیں تو پھر کیسی عجیب بات ہے کہ اُسی کے شریک ٹھیرانے کی  
جسارت کرتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...شُرک پر اظہار تعجب کا ایک پہلو تو یہی ہے کہ جب ساری چیزوں کا خالق خدا ہی ہے تو پھر  
شُرک کی گنجائش کہاں سے نکلی؟ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کائنات کی چیزوں میں بظاہر جو تضاد نظر





هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا ۖ وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهُ  
ثُمَّ أَنْتُمْ تَمْتَرُونَ ② وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ ۖ يَعْلَمُ  
سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُونَ ③ وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ

نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر (تمہارے لیے) ایک مدت ٹھیرادی اور ایک دوسری مدت بھی ہے جو اُس کے ہاں مقرر ہے۔ تعجب ہے کہ اس کے بعد بھی کج بحثیاں کرتے ہو! وہی اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی۔ وہ تمہارے کھلے اور چھپے سے واقف ہے اور جو کمائی تم کر رہے ہو، اُسے بھی جانتا ہے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ اُن

آتا ہے، مثلاً زمین اور آسمان، روشنی اور تاریکی، سردی اور گرمی، تو اس تضاد کے اندر اس کائنات کے مجموعی مقصد کے لیے ایسی حیرت انگیز سازگاری بھی ہے کہ کوئی عاقل تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان میں سے ہر ایک کے خالق و مالک الگ الگ ہیں۔ بلکہ ہر صاحب نظریہ ماننے پر مجبور ہے کہ پوری کائنات ایک ہی کارفرما کے ارادے اور مشیت کے تحت حرکت کر رہی ہے۔“ (تدبر قرآن ۱۷/۳)

۳۔ مطلب یہ ہے کہ وہی خدا ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تم انکار نہیں کر سکتے۔ پھر یہ بھی جانتے ہو کہ ہر ایک کے لیے جینے کی ایک مدت مقرر کر دی گئی ہے۔ ان حقائق کو سمجھتے ہو تو اس بات میں شک کی گنجائش کہاں سے پیدا ہو جاتی ہے کہ جس خدا کو پہلی مرتبہ تمہیں مٹی سے پیدا کر دینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی، وہ مرنے کے بعد اسی مٹی سے تمہیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا؟ تم میں سے ہر ایک کے لیے موت ہے تو اس بعث و نشر کے لیے بھی ایک دوسری مدت ہے جو اُسی نے مقرر کر رکھی ہے۔

۴۔ یعنی تمہارا یہ رویہ اگر اس بھروسے پر ہے کہ زمین کا نظم و نسق کچھ دوسرے خداؤں کے سپرد ہے، تم اُن کے پرستار ہو، اس لیے وہ تمہیں بخشوالیں گے تو یہ غلط فہمی دور کر لو۔ زمین و آسمان،







الانعام  
۶

مَنْ آتَىٰ رَبَّهُمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝ فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ  
لَمَّا جَاءَهُمْ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝  
الَّذِينَ يَرَوُكُم أَهْلُكُمْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَكَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ  
مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَارًا ۝ وَجَعَلْنَا  
الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَأَنْشَأْنَا

کے پاس اُن کے پروردگار کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی آتی ہے، وہ اُس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ سو اُنھوں نے (اس وقت بھی) حق کو جھٹلادیا ہے، جب کہ وہ اُن کے پاس آ گیا ہے۔ اس لیے عنقریب اُس چیز کی خبریں اُن کے پاس آ جائیں گی جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے ہیں۔ کیا اُنھوں نے دیکھا نہیں کہ اُن سے پہلے کتنی قومیں ہم نے ہلاک کر دیں جنھیں زمین پر ہم نے وہ اقتدار بخشا تھا جو، (قریش کے لوگو)، تمھیں نہیں بخشا ہے؟ اُن پر ہم نے خوب مینہ برسائے اور اُن کے نیچے نہریں بہا دیں، مگر (وہ جھٹلانے پر مصر رہے تو) اُن کے گناہوں کی پاداش میں بالآخر ہم نے اُنھیں ہلاک کر دیا

دونوں کا خدا ایک ہی ہے اور دونوں میں اُسی کا حکم چل رہا ہے۔ تمھارے کھلے اور چھپے، سب احوال بھی اُس کے علم میں ہیں اور تمھارے اعمال سے بھی وہ پوری طرح واقف ہے۔ کسی میں یارا نہیں کہ اُس کے علم میں کوئی اضافہ کر سکے۔ متنبہ ہو جاؤ، اُس کی بارگاہ میں کسی شفاعت باطل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

۵ یہاں 'حق' سے قرآن مجید مراد ہے۔

۶ یعنی خدا کا عذاب جس کی وعید تمام رسولوں نے اپنی قوموں کو سنائی ہے۔

۷ اوپر جو دعویٰ کیا گیا ہے، یہ اُس پر تاریخ کی شہادت پیش کر دی ہے۔ سورہ اعراف میں اس



مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ⑥

وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ  
الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ⑦ وَقَالُوا لَوْلَا أَنْزَلَ  
عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنْزَلْنَا مَلَكَ لَقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُونَ ⑧  
وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكَ لَجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلْبِسُونَ ⑨

اور اُن کے بعد اُن کی جگہ دوسری قوموں کو اٹھا کھڑا کیا۔ ۱-۶

تم پر، (اے پیغمبر)، اگر ہم کوئی ایسی کتاب اتار دیتے جو کاغذ پر لکھی ہوئی ہوتی اور  
یہ اُس کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر دیکھ بھی لیتے، تب بھی یہ منکرین یہی کہتے کہ یہ کھلے  
ہوئے جادو کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نبی پر (علانیہ) کوئی فرشتہ کیوں  
نہیں اتارا گیا؟ (یہ احمق نہیں سمجھتے کہ) اگر ہم نے کوئی فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک  
فیصلہ ہو جاتا، پھر ان کو کوئی مہلت نہ ملتی۔ اور (نہیں سمجھتے کہ) اگر ہم اُس کو کوئی فرشتہ

کی تفصیلات آئیں گی جو اس سورہ کے ثنی کی حیثیت رکھتی ہے۔

۸ یہاں سے آگے اُن اعتراضات اور مطالبات کا جواب دیا ہے جو منکرین اپنے اعراض کے  
لیے بہانے کے طور پر پیش کر رہے تھے۔

۹ یعنی اعراض کا سبب چونکہ وہ نہیں جو بیان کر رہے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ اپنی خواہشوں کے  
خلاف کوئی بات ماننا نہیں چاہتے، اس لیے ان کا یہ مطالبہ پورا بھی کر دیا جائے تو اسی طرح کی باتیں  
کریں گے۔ یاد رہے کہ یہ اُسی طرح کے مطالبے کا جواب ہے جو اہل کتاب کی زبان سے سورہ  
نساء (۴) کی آیت ۱۵۳ میں نقل ہو چکا ہے۔

۱۰ یہ اس سنت الہی کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا علم و عقل اور ارادہ و اختیار کے امتحان کے لیے







الانعام  
۶

وَلَقَدْ اسْتَهْزَيْ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا  
مِنْهُمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝۱۰ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ  
انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝۱۱

قُلْ لِّمَن مَّا فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ قُلْ لِلَّهِ كَتَبَ عَلَى  
نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لِيَجْمعَكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۝

بنا کر بھیجتے تو اُسے بھی انسان کی صورت ہی میں بھیجتے۔ اور اس طرح ان کو اُسی شبے  
میں ڈال دیتے جس میں یہ اب پڑے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تم سے پہلے بھی  
رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو اُن کا مذاق اڑانے والوں کو اُسی چیز نے آگھیرا جس کا وہ  
مذاق اڑاتے تھے۔ ان سے کہو، ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا  
انجام کیا ہوا ہے۔ ۷-۱۱

ان سے پوچھو، زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، وہ کس کا ہے؟ کہہ دو، اللہ ہی کا  
ہے۔ اُس نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے۔ وہ تم سب کو جمع کر کے ضرور روز

بنائی گئی ہے۔ جب پردے اٹھا دیے جائیں گے اور لوگ حقائق کو پچھتم سر دیکھ لیں گے تو کسی کا  
ایمان اُس کے لیے نافع نہ ہوگا۔ ایمان وہی معتبر ہے جو غیب میں رہتے ہوئے اور عقل و فطرت  
کے اُن دلائل کی بنیاد پر لایا جائے جس کی دعوت انبیاء علیہم السلام نے دی ہے۔

۱۱ اس لیے کہ انسان اُسے انسانوں کی شکل ہی میں دیکھ سکتے اور اُس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔  
۱۲ شبے میں ڈالنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی ہے۔ یہ اُس ضابطے اور قانون کی  
نسبت ہے جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت و ضلالت کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔

۱۳ یہ صرف اجمالی اشارہ ہے۔ اس کی تفصیل آگے سورہ اعراف (۷) میں آئے گی۔



الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٢﴾ وَلَهُ مَا سَكَنَ

قیامت کی طرف لے جائے گا جس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس کو وہی لوگ نہیں مانتے جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کر لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ رات میں

۱۲۔ سوال کے بعد مخاطب کی طرف سے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی جواب دینے کا یہ اسلوب اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب مخاطب کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہوتی اور سوال سے مقصود بھی اصلاً اُس کے کسی مسلمہ کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے۔

۱۵۔ یعنی صفت رحمت سے کمال درجہ متصف ہے، لہذا اپنی اس صفت کے تقاضے بھی لازماً پورے کرے گا۔

۱۶۔ اصل الفاظ ہیں: 'لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ'۔ ان میں 'إِلَى' کا صلہ دلیل ہے کہ یہاں کوئی لفظ ہانکنے اور لے جانے کے معنی میں محذوف ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے:

”... قیامت کا آنا خدا کی صفت رحمت کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر قیامت نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کائنات کا خالق رحمان و رحیم نہیں ہے۔ اُس کے نزدیک، نعوذ باللہ، عدل و ظلم، نیکی اور بدی، خیر اور شر، دونوں یکساں ہیں۔ یہ ایک کھلنڈرے کا کھیل اور ایک اندھیرنگری ہے۔ یہ باتیں چونکہ بالبداهت باطل ہیں، رحمان و رحیم خدا کی شان کے بالکل منافی ہے کہ وہ کوئی بے غایت و بے مقصد کام کرے، اس وجہ سے لازمی ہے کہ ایک ایسا دن وہ لائے جس میں اُس کی رحمت کامل کا ظہور ہو، اپنے نیک بندوں کو وہ اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے اور جو بدکار و نابکار ہیں، وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۷)

۱۷۔ اس مضمون کی وضاحت آگے آیت ۳۱ میں فرمادی ہے کہ قیامت کے دن یہ خسارے میں مبتلا لوگ کس طرح حسرت سے اپنے سر پیشیں گے اور گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے کس بے بسی کے ساتھ جہنم کی طرف دھکیل دیے جائیں گے۔







الانعام  
۶

فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣﴾  
قُلْ اَغَيْرَ اللَّهِ اتَّخَذُ وَلِيًّا فَاَطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ  
يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ قُلْ اِنِّيْ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا

ٹھیر جاتا اور دن میں رواں ہوتا ہے، وہ اُسی کے قبضہ قدرت میں ہے اور وہ سمیع و علیم ہے۔ ۱۲-۱۳

کہہ دو، اللہ کے سوا کیا میں کسی اور کو اپنا کارساز بنالوں جو زمین اور آسمانوں کا خالق ہے اور کھاتا نہیں کھلاتا ہے؟ کہہ دو، مجھے تو حکم ملا ہے کہ سب سے پہلے میں اُس کے

۱۸ اصل الفاظ ہیں: 'لَهُ مَا سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ'۔ 'سَكَنَ' کے بالمقابل 'ماتحرك' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ یہاں عربیت کے اسلوب پر حذف کر دیا ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۱۹ مطلب یہ ہے کہ خدا کی قدرت سب کو محیط اور اُس کا علم سب کو حاوی ہے۔ شب و روز میں کوئی چیز اُس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتی۔ وہ جب چاہے گا، ہر جگہ سے سب کو بلائے گا اور اپنے حضور میں اکٹھا کر لے گا۔

۲۰ یہ اوپر کی بات کا لازمی نتیجہ بھی ہے اور مشرکین پر ایک نہایت لطیف تعریض بھی۔ مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان کے خالق اور پوری کائنات کے رازق کو چھوڑ دوں اور تمھارے اُن بتوں کو معبود بنا لوں جو اپنے وجود کے لیے بھی تمھارے محتاج ہیں اور اُن کے سامنے تم حلوے مانڈے پیش کرتے ہو تو راضی اور آسودہ ہوتے ہیں؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ مشرکین اپنے بتوں کے آگے جو کچھ پیش کرتے ہیں، اس تصور کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ یہ اُن کی پسندیدہ اور مرغوب غذا ہیں جن کو وہ نوش کرتے اور جن کی خوشبو سے محفوظ ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے ایک خدا پرست خدا کے نام پر جو کچھ پیش



تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ قُلْ إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رَبِّي  
عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ مَنْ يُصِرْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ  
وَذَلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ۝

وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يَمْسَسْكَ  
بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ

سامنے سراطاعت جھکا دوں اور تاکید کی گئی ہے کہ تم ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو۔  
کہہ دو کہ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک ہولناک دن  
کے عذاب سے دوچار ہو جاؤں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اُس دن عذاب سے دور رکھا  
گیا، وہی ہے جس پر خدا نے رحم فرمایا اور یہی کھلی کامیابی ہے۔ ۱۶-۱۷

(یقین رکھو کہ) اگر اللہ تمہیں کسی رنج میں مبتلا کر دے تو اُس کے سوا کوئی نہیں جو  
اُسے دور کر سکے اور اگر بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

کرتا ہے، اُس کا کوئی حصہ، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، خدا کو نہیں پہنچتا، بلکہ سب کا سب خدا  
کے حق دار بندوں کو پہنچتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۲۹/۳)

۲۱ یعنی تم شرک کرتے ہو تو کرو، اس کی ذمہ داری تم پر ہے۔ مجھے تو اسی بات کا حکم دیا گیا ہے  
کہ خدا کے سامنے سرنگوں رہوں اور کسی کو اُس کا شریک نہ ٹھیراؤں۔ اس مضمون کے لیے اصل میں  
’لَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں تاکید کے ساتھ ایک نوعیت کا زجر  
بھی ہے، لیکن اس کا رخ اُنھی لوگوں کی طرف ہے جن کا رویہ زیر بحث ہے۔

۲۲ اس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ جو لوگ اس کامیابی کو بھولے ہوئے ہیں، اُس دن اُنھیں  
اندازہ ہو جائے گا کہ کس بدبختی اور محرومی کا سامان کر کے دنیا سے آئے ہیں۔





الانعام  
۶

وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ۝ قُلْ أَيْ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً ۖ قُلِ اللَّهُ قُلُوبُهُ شَهِيدٌ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۖ وَأَوْحَىٰ إِلَىٰ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنْذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ ۖ أَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ إِلَهَةً أُخْرَىٰ ۚ قُلْ لَا أَشْهَدُ ۚ قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلَهُ وَاحِدٌ وَإِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ۝

اپنے بندوں پر وہ ہر لحاظ سے حاوی ہے اور حکیم و خبیر ہے۔ ان سے پوچھو، کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے؟ کہہ دو، اللہ کی، وہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے۔ اور میری طرف یہ قرآن اس لیے وحی کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے سے میں تمہیں خبردار کر دوں اور انہیں بھی جنہیں یہ پہنچے۔ کیا تم اس بات کے گواہ بنتے ہو کہ خدا کے ساتھ کچھ دوسرے معبود بھی ہیں؟ کہہ دو، میں اس کی گواہی نہیں دے سکتا۔ کہہ دو، وہی ایک معبود ہے اور میں ان سے یقیناً بری ہوں جنہیں تم شریک ٹھیراتے ہو۔ ۱۷-۱۹

۲۳ یہ اوپر والی بات کی توضیح مزید ہے کہ جب نفع و ضرر سب خدا کے اختیار میں ہے تو کسی دوسرے کو مولیٰ و مرجع کیوں بنایا جائے؟ اور اُس کے حضور میں دعا و مناجات کے لیے ہاتھ کیوں اٹھائے جائیں؟

۲۴ لہذا یہ نہیں ہو سکتا کہ دنیا کو کسی انجام اور غایت تک پہنچائے بغیر چھوڑ دے۔ اُس کے علم و حکمت کا تقاضا ہے کہ ایک روز جزا برپا ہو جس میں حق و باطل کے فیصلے کیے جائیں۔

۲۵ یہ وہی بات ہے جو سورہ فرقان (۲۵) آیت میں 'لِيَكُونَ لِلْعَلَمِينَ نَذِيرًا' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن روز قیامت تک ذریعہ انذار ہے۔ علما جب اس کی دعوت لے کر اٹھیں تو انہیں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے اسی کو ذریعہ انذار بنانا چاہیے۔ خدا کی معرفت اور عقبی شناسی کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے جو لوگوں کو بیدار کر سکے۔



الَّذِينَ اتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمُ الَّذِينَ  
خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝۲۰ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ  
عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۝۲۱ وَيَوْمَ  
نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا إِنَّا سُرَّكَاؤُكُمْ الَّذِينَ

جنہیں ہم نے کتاب عطا فرمائی ہے، وہ اس (قرآن) کو پہچانتے ہیں، جس طرح  
اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ جن لوگوں نے، البتہ اپنے آپ کو خسارے میں ڈال رکھا  
ہے، وہ اسے نہیں مانتے<sup>۲۰</sup> (اور شرک پر اصرار کرتے ہیں)، دریاں حالیکہ اُس شخص سے  
بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اُس کی آیتوں کو جھٹلا دے؟ یقیناً ایسے  
ظالم کبھی فلاح نہیں پاسکتے۔ (اس لیے) اُس دن کو یاد رکھو جس دن ہم ان سب کو اکٹھا  
کریں گے،<sup>۲۱</sup> اس کے بعد ان مشرکوں سے پوچھیں گے کہ تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریک

۲۰ اوپر قرآن کا ذکر جس مقصد سے ہوا ہے، اُس کی توثیق مزید کے لیے یہ صالحین اہل کتاب  
کی گواہی پیش کی ہے۔ فرمایا ہے کہ قرآن کے انذار پر ایمان لانے سے وہی محروم ہیں جنہوں نے  
اپنے آپ کو گھائٹے میں ڈال رکھا ہے، ورنہ صالحین اہل کتاب تو اُس کو اور اُس کے پیش کردہ حقائق  
کو اپنے صحیفوں کی روشنی میں اُسی طرح جانتے، پہچانتے اور اُن کا خیر مقدم کرتے ہیں، جس طرح  
ایک مہجور باپ اپنے یوسف گم گشتہ کو پہچانتا ہے اور اُس کے پیرہن کی خوشبودور ہی سے محسوس کر لیتا  
ہے۔

۲۱ اصل الفاظ ہیں: ”يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا“۔ اوپر جن گروہوں کا ذکر ہوا ہے، لفظ  
’جَمِيعًا‘ کی تاکید نے اُن سب کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے، خواہ وہ خدا کے شریک ٹھیرانے والے  
ہوں، قیامت کا انکار کرنے والے ہوں یا آیات الہی کی تکذیب کرنے والے۔ یہ سب اگرچہ  
مشرکین تھے، مگر قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ وجوہ تکذیب میں کسی حد تک الگ الگ بھی تھے۔







الانعام  
۶

كُنْتُمْ تَرْعَمُونَ ۚ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فَتَنْتَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ  
رَبَّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ۚ أَنْظِرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ  
عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۚ ۚ  
وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۖ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً

کہاں ہیں جنہیں تم خدا کا سا جہی گمان کرتے تھے؟ پھر ان کا فریب ختم ہو جائے گا، مگر  
کہیں گے: اللہ، ہمارے پروردگار کی قسم، ہم مشرک نہیں تھے۔ دیکھو، انھوں نے، (ان  
ظالم لوگوں نے) کس طرح خود اپنے اوپر جھوٹ بولا ہے اور جو افترا یہ کرتے رہے، وہ  
سارا ان سے ہوا ہو گیا ہے۔ ۲۰-۲۴

ان میں ایسے بھی ہیں جو کان لگا کر تمہیں سنتے ہیں، مگر ان کے دلوں پر ہم

۲۸ اصل میں لفظ 'فِتْنَةً' آیا ہے۔ اس کی اضافت فاعل کی طرف ہے، جملے میں استثناء منقطع ہے  
اور انداز کلام طنزیہ ہے۔ یعنی جس طرح کے فریب دنیا میں دیتے رہے، اُس کی گنجائش ختم ہو جائے  
گی۔ ہاں، کچھ کر سکیں گے تو یہی کہ اپنے جرم کا انکار کر کے اُس کی پاداش سے بچنے کی کوشش  
کریں۔

۲۹ قرآن کے دوسرے مقامات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مشرکین اُس روز اپنے شرک کا اقرار  
کر لیں گے۔ یہاں انکار کا ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پریشان ہو کر کسی مرحلے میں انکار  
کریں گے اور کسی میں بالآخر ماننے پر مجبور ہو جائیں گے، بلکہ اپنے شرک کو پکاریں گے بھی کہ جو  
صورت حال درپیش ہو گئی ہے، شاید اُس سے نکلنے کی کوئی راہ پیدا ہو سکے۔

۳۰ اس میں یہ لطیف تعریض بھی ہے کہ دنیا میں خدا کے بارے میں جھوٹی گواہی دیتے رہے  
اور یہاں اپنے اوپر جھوٹ گھڑ رہے ہیں۔



اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْ اٰذَانِهِمْ وَقَرَّ ط وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَا يُؤْمِنُوْا بِهَا ط  
حَتّٰى اِذَا جَآءُوكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ هٰذَا

نے (اپنے قانون کے مطابق) پر دے ڈال دیے ہیں کہ (جو کچھ سنتے ہیں)، اُسے نہ سمجھیں اور ان کے کانوں کو بہرا کر دیا ہے کہ سن کر بھی نہ سنیں۔ یہ اگر ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں، پھر بھی اُن پر ایمان نہ لائیں گے۔ یہاں تک کہ تمہارے پاس حجت کرتے

۳۱ یعنی اپنے اُس قانون کے مطابق جو قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ جب کوئی شخص حق کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرتا اور جانتے بوجھتے اُسے ماننے سے انکار کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے مہلت ملتی ہے۔ پھر اس مہلت سے وہ اگر فائدہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو اُس کے دل و دماغ کو دعوت حق کے لیے بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ خدا کا عذاب ہے جس سے وہ اپنی شامت اعمال کے نتیجے میں مرنے سے پہلے ہی دوچار ہو جاتا ہے۔

۳۲ یہ محض مبالغے کا ایک اسلوب نہیں، بلکہ بیان حقیقت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... مطلب یہ ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان کے سامنے عجائب اور

کرشمے ظاہر نہیں ہوئے۔ آخر یہ ساری کائنات، آسمان و زمین، سورج، چاند، دریا، پہاڑ، ابر،

ہوا، رات، دن کیا ہیں؟ کیا یہ کرشمے اور عجائب نہیں ہیں؟ ساری کائنات کرشموں اور عجائب

سے بھری پڑی ہے، لیکن جن کے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہی نہ ہوں، اُن کا کیا علاج؟ جس

طرح ان سارے عجائب اور کرشموں سے ان کی آنکھیں بند ہیں، اگر اور کرشمے بھی ان کو دکھا

دیے جائیں، جب بھی یہ کوئی نہ کوئی بات بنا ہی لیں گے اور اپنی ہٹ پر جمے ہی رہیں گے۔“

(تذبر قرآن ۳/۳۴)

\* اس قانون کی وضاحت کے لیے دیکھیے: سورہ نساء (۴) آیت ۱۵۵، اعراف (۷) آیات ۱۰۰-۱۰۲، نحل (۱۶) آیات ۱۰۶-۱۰۸ اور صف (۶۱) آیت ۵۔





الانعام  
۶

إِلَّا أَصَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝ ۳۵ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْهَوْنَ عَنْهُ وَإِنْ يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝ ۳۶ وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وَقَفُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا يَلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبُ بِآيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُونُ مِنَ

ہوئے آئیں گے تو یہ منکرین کہیں گے کہ یہ تو محض اگلوں کے افسانے ہیں۔<sup>۳۳</sup> یہ اس سے دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی اس سے گریز کر جاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہی تباہی کا سامان کر رہے ہیں، مگر اس کا احساس نہیں کرتے۔ اگر تم اُس وقت کو دیکھ سکتے، جب یہ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے، پھر کہیں گے: کاش، ہم واپس بھیج دیے جائیں کہ تصدیق کریں اور اپنے پروردگار کی آیتوں کو نہ جھٹلائیں<sup>۳۴</sup> اور

۳۳ یعنی قرآن جب عاد و ثمود، مدین، سبا، قوم لوط اور قوم فرعون کی تباہی کے واقعات سنا کر انہیں خبردار کرتا ہے تو اُس سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے بوکھلا کر کہتے ہیں کہ کچھ نہیں، یہ تو پچھلی قوموں کے بے سرو پا افسانے ہیں جو معاذ اللہ، ایک سر پھر اسنا تا پھر رہا ہے۔  
۳۴ اصل الفاظ ہیں: 'وَلَا نُكَذِّبُ'۔ یہ مضارع خفیف ہے، لیکن تمنیٰ کا جواب نہیں ہے۔ اس کا نصب دلیل ہے کہ تمنیٰ کا جواب یہاں اس کا معطوف علیہ ہے جو حذف کر دیا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...تمنا کے جواب میں فُضدق‘ یا اس کے ہم معنی کسی لفظ کا آنا بالکل واضح تھا، اس وجہ سے اُس کو حذف کر دیا اور وَلَا نُكَذِّبُ‘ میں جو حرف عطف ہے، اُس کے ذریعے سے محذوف کا پتہ دے دیا۔ وَلَا نُكَذِّبُ‘ کے اظہار میں جو بلاغت ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے اُن کی حسرت کا بھی اظہار ہو رہا ہے اور اعتراف جرم کا بھی۔ یعنی آج تو یہ اکڑ رہے ہیں اور قرآن کو ایک داستانِ پارینہ قرار دے رہے ہیں، لیکن کل حسرت کریں گے کہ کاش، ہم پھر دنیا میں جائیں کہ اپنے رب کی آیات کی تصدیق کریں اور اُن کی تکذیب نہ کریں۔“ (تذبر قرآن ۳/۳۶)



الْمُؤْمِنِينَ ۝ بَلْ بَدَالَهُمْ مَا كَانُوا يَخْشَوْنَ مِنْ قَبْلُ  
وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝  
وَقَالُوا إِن هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ۝  
تَرَىٰ إِذْ وَقَفُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۖ قَالَ أَلَيْسَ هَذَا بِالْحَقِّ ۖ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا ۖ  
قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ

الانعام  
۶

ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔ ہرگز نہیں، بلکہ وہ حقیقت ان کے لیے بے نقاب  
ہوگئی ہے جو اس سے پہلے چھپائے ہوئے تھے۔ اگر انھیں لوٹایا جائے تو وہی کریں  
گے جس سے روکے گئے تھے، اس لیے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ۲۵-۲۸

کہتے ہیں کہ زندگی تو یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے اور مرنے کے بعد ہم ہرگز نہ  
اٹھائے جائیں گے۔ اگر تم اُس وقت کو دیکھ سکتے، جب یہ اپنے پروردگار کے حضور میں  
کھڑے کیے جائیں گے۔ وہ ان سے پوچھے گا: کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟ جواب دیں گے:  
ہاں، ہمارے پروردگار کی قسم، یہ حقیقت ہے۔ وہ فرمائے گا: تو اپنے انکار کی پاداش میں

۳۵ اس لیے کہ ان کے جھٹلانے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ بات ان پر واضح نہیں ہوئی۔ یہ جان  
گئے تھے کہ خدا کے پیغمبر جو کچھ پیش کر رہے ہیں، وہ سراسر حق ہے۔ ان کی آنکھوں پر اُس وقت بھی  
دنیا کی محبت اور غرور و حسد کے جذبات نے پردے ڈال دیے تھے اور اب بھی لوٹا دیے جائیں تو  
یہی چیزیں حجاب بن کر قبول حق سے انھیں روک دیں گی۔

۳۶ قرآن مجید کے مکذبین کے بعد اب آگے مکذبین قیامت کا انجام بیان کیا جا رہا ہے جو  
مرنے کے بعد اٹھائے جانے کو یا تو مانتے ہی نہیں تھے یا بعید از امکان کہہ کر گریز و فرار کے راستے  
نکال لیتے تھے۔





الانعام  
۶

كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ<sup>ط</sup> حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ تَهُمُ السَّاعَةُ<sup>ط</sup> بَغْتَةً قَالُوا يَحْسِرَتْنَا  
عَلَىٰ مَا فَرَّطْنَا فِيهَا<sup>ط</sup> وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ<sup>ط</sup> عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ<sup>ط</sup>  
الْأَسَاءَ مَا يَزِيدُونَ<sup>ط</sup> ۝۳۱ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَلَهُمْ وَلِلدَّارِ  
الْآخِرَةِ خَيْرٌ<sup>ط</sup> لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ<sup>ط</sup> أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝۳۲  
قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لِيَحْزَنُكَ<sup>ط</sup> الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ  
وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بَايَتِ<sup>ط</sup> اللَّهَ يَجْحَدُونَ ۝۳۳ وَلَقَدْ كَذَّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ  
قَبْلِكَ فَصَبْرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا<sup>ط</sup> وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا<sup>ط</sup>

اب چکھو عذاب کا مزہ۔ یقیناً گھائے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے اس ملاقات کو جھٹلایا۔ یہاں تک کہ اچانک جب وہ گھڑی اُن پر آ پہنچے گی تو کہیں گے: افسوس، ہماری اس کوتاہی پر جو اس معاملے میں ہم سے ہوئی ہے اور حال یہ ہوگا کہ اپنے بوجھ وہ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ سنو، نہایت ہی برا ہے وہ بوجھ جو یہ اٹھائے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل تماشا ہے۔ آخرت کا گھر، البتہ کہیں بہتر ہے اُن کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں۔ پھر کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ ۲۹-۳۲  
ہم اس بات سے واقف رہے ہیں<sup>۳۱</sup> کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں<sup>۳۲</sup>، اُس سے تمہیں رنج ہوتا ہے۔ تم اُس پر صبر کرو، (اے پیغمبر)، اس لیے کہ یہ تمہیں نہیں جھٹلا رہے، یہ ظالم تو

۳۱ اصل میں 'قَدْ نَعْلَمُ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ درحقیقت 'قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ' ہے۔ مضارع پر جب اس طرح 'قَدْ' آتا ہے تو اس میں فعل ناقص عربیت کے قاعدے پر محذوف ہوتا ہے۔ یہاں اس سے مضمون میں یہ اضافہ ہو گیا ہے کہ یہ بات برابر ہمارے علم میں رہی ہے اور ہے۔

۳۲ یہ انہی مطالبات کا ذکر ہے جو پیچھے بیان ہو چکے ہیں اور آگے بھی بیان ہوں گے۔



وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَبَايَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٣٢﴾

آیات الہی کا انکار کر رہے ہیں۔ تم سے پہلے بھی رسولوں کو اسی طرح جھٹلایا گیا تھا تو اپنی تکذیب اور اپنی اذیتوں پر اُنھوں نے صبر کیا، یہاں تک کہ ہماری مدد اُنھیں پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے اور (ہماری اس سنت کو سمجھنے کے لیے) پیغمبروں کی کچھ سرگزشتیں تمھیں پہنچ ہی چکی ہیں۔ ۳۳-۳۴

۳۹ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین اور تسلی کے لیے یہ نہایت دل نواز جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی طرف سے کوئی بات لے کر نہیں اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ہمارا کلام اور ہماری کتاب ہے جو ہمارے حکم سے اور ہماری ہدایت کے مطابق ان کے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔ یہ اگر جھٹلا رہے ہیں تو تم کو نہیں، بلکہ ہمیں جھٹلا رہے ہیں۔ اس لیے معاملے کو ہم پر چھوڑو، ان ظالموں سے ہم ہی نمٹیں گے۔

۴۰ یہ اُس سنت الہی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور اُن کے پیروں کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...انبیاء اور اُن کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ کی براہ راست مدد سے ہم کنار ہونے کے لیے ابتلا و امتحان کے ایک طویل اور صبر آزما مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر خدا کی نصرت ظاہر نہیں ہوتی۔ اس دوران میں ان انبیاء کی قوموں کی طرف سے برابر ان کی تکذیب ہوتی ہے۔ ان کو ہر قسم کی ایذائیں دی جاتی ہیں اور ہر پہلو سے ان کو زچ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طرح جو کچھ حق کے مخالفین کے اندر ہوتا ہے، وہ بھی ابھر کر باہر آ جاتا ہے اور جو جو ہر نبی اور اُس کے ساتھیوں کے اندر ہوتا ہے، وہ بھی نکھر کے سامنے آ جاتا ہے۔ یہ وقت ہوتا ہے کہ منکرین حق پر خدا کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور نبی اور اُن کے ساتھی سزاوار ہوتے ہیں کہ اُن کے لیے اللہ کی مدد ظاہر ہو۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی سنت ہے اور اللہ کی سنت کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ تمام رسولوں کی سرگزشتیں اس سنت اللہ پر شاہد ہیں۔“ (تدبر قرآن ۳/۴۴)





الانعام  
۲

وَإِنْ كَانَتْ كِبَرٌ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنْ اسْتَطَعْتَ أَنْ  
تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ ۖ وَلَوْ  
شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَى فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝  
إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ ۖ وَالْمَوْتُ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ  
ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۝

(اس کے باوجود)، ان کا اعراض اگر تمہیں گراں گزر رہا ہے تو زمین میں کوئی  
سرنگ یا آسمان میں کوئی زینہ ڈھونڈ سکتے ہو کہ ان کے پاس کوئی نشانی لے آؤ تو ڈھونڈ  
لو۔ اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا، اس لیے ہرگز جذبات سے مغلوب  
ہو جانے والوں میں سے نہ بنو۔ (ہماری اس دعوت کو) وہی قبول کریں گے جو سننے  
والے ہیں۔ رہے یہ مُردے تو (ان کا انجام اب یہی ہے کہ) اللہ انہیں اٹھائے گا، پھر  
یہ اُس کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔ ۳۵-۳۶

۳۱ اس جملے میں جواب شرط محذوف ہے۔ یہ عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔ ترجمے  
میں ہم نے اُسے کھول دیا ہے۔

۳۲ مطلب یہ ہے کہ دنیا علم و عقل اور ارادہ و اختیار کے امتحان کے لیے بنی ہے۔ اللہ یہ کر سکتا  
تھا کہ بالجبر لوگوں کو ہدایت پر جمع کر دیتا یا کوئی ایسی صورت پیدا کرتا کہ سارے حجاب دور ہو جاتے  
اور لوگ حقیقت کو پچشم سردیکھ لیتے، لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ اُس کی اسکیم یہی ہے کہ لوگ اس  
امتحان سے گزر کر کامیاب یا ناکام ہوں۔ لہذا ان کے ایمان کی آرزو میں اس طرح جذبات سے  
مغلوب نہیں ہونا چاہیے کہ یہ سنت الہی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ جذبات کوئی جذبات نفس نہیں تھے، بلکہ



وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ط قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَنْ يُنْزِلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٤﴾ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَيْرٍ يَّطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَلُكُمْ

کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی؟ کہہ دو: اللہ پوری قدرت رکھتا ہے کہ (جب چاہے)، کوئی نشانی اتار دے، مگر ان میں سے اکثر (یہ مطالبہ اس لیے کرتے ہیں کہ) اس کے نتائج سے واقف نہیں ہیں۔ (دیکھتے نہیں ہو کہ) زمین پر جتنے جانور اپنے پاؤں سے چلتے ہیں اور فضا

سراسر جذبات خیر تھے، مگر حد مطلوب سے بڑھتے ہوئے محسوس ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو روک دیا۔ آیت میں بظاہر عتاب ہے، لیکن یہ عتاب بڑا محبت آمیز ہے۔ اس میں اگر کوئی تلخی ہے تو اس کا رخ اُنھی بد بختوں کی طرف ہے جن کے ایمان کے لیے آپ اس قدر بے تاب تھے۔

۳۳ آگے کی آیات سے بتدریج واضح ہو جائے گا کہ یہ مطالبہ کسی ایسی نشانی کے لیے تھا جو یہ ثابت کر دے کہ اگر یہ لوگ پیغمبر کی تکذیب پر قائم رہے تو ان پر عذاب آجائے گا۔

۳۴ اس اجمال میں بڑی تفصیل پوشیدہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس سے ایک تو یہ بات نکلتی ہے کہ یہ نادان اور مغرور لوگ اس طرح کی نشانی کے ظہور کے نتائج سے آگاہ نہیں۔ ان کے نزدیک یہ محض ایک کھیل تماشا ہے، حالاں کہ یہ نشانی اگر ظاہر ہوگئی تو سب کی کمر توڑ کر رکھ دے گی۔ دوسری یہ کہ یہ خدا کی اس حکمت اور سنت سے واقف نہیں ہیں جو انبیاء اور ان کے مکذبین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کو فوراً پکڑ لے، بلکہ وہ ان کو ایک خاص مدت تک مہلت دیتا ہے جس میں ان پر ہر پہلو سے خدا کی حجت پوری کر دی جاتی ہے۔ جب یہ حجت پوری ہو چکتی ہے، تب خدا ان کو پکڑتا ہے اور جب پکڑتا ہے تو پھر ان کو کوئی چھڑا نہیں







الانعام  
۶

مَا فَرَطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِينَ

میں جتنے پرندے اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتے ہیں، سب تمھاری ہی طرح امتیں ہیں (اور سمجھانے کی حد تک تو) ہم نے اپنی کتاب میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اس کے بعد (یہی باقی ہے کہ ایک دن) یہ اپنے پروردگار کے حضور میں اکٹھے

سکتا۔ تیسری یہ کہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ پیغمبر کی دھمکی جھوٹی ہے یا خدا کے ہاتھ ہی بے بس ہیں، حالاں کہ خدا سرکشوں کو جو ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے تو اس وجہ سے کہ اُس کی تدبیر بڑی محکم ہوتی ہے۔ وہ رسی کتنی ہی دراز کر دے، لیکن اس کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ کوئی اُس کے قابو سے باہر نکل سکے۔ چوتھی یہ کہ یہ بد قسمت لوگ اُس رحمت سے نا آشنا ہیں جو اس مہلت کے اندر مضمحل ہے، بشرطیکہ اُس سے فائدہ اٹھائیں۔ اللہ تعالیٰ رحمت میں سبقت کرتا ہے، غضب میں سبقت نہیں کرتا۔ وہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ وہ توبہ اور اصلاح کے دروازے اُس وقت تک کھلے رکھتا ہے، جب تک بندے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے خود اُن کو اپنے اوپر بند نہ کر لیں۔“

(تدبر قرآن ۳/۴۷)

۳۵ اصل الفاظ ہیں: وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ۔ ان میں مقابل کے بعض الفاظ عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گئے ہیں۔ مثلاً جملے کے پہلے حصے میں 'فِي الْأَرْضِ' ہے تو دوسرے حصے میں 'فِي السَّمَاءِ' کا لفظ نہیں آیا۔ اسی طرح دوسرے حصے میں 'يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ' کے الفاظ ہیں تو پہلے حصے میں 'تدب علی رجليها' یا 'أرجلها' کے الفاظ محذوف ہیں۔ ہم نے ترجمے میں انھیں کھول دیا ہے۔

۳۶ مطلب یہ ہے کہ تم ایک نشانی مانگتے ہو، دیکھنے والی آنکھیں ہوں تو زمین پر چلنے والا ہر جاندار اور فضا میں اڑنے والا ہر پرندہ خدا کی ایک عظیم نشانی ہے۔ پھر قرآن میں بھی ہم نے ان حقائق کو سمجھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حقیقت یہ ہے کہ نشانیوں سے تو صحیفہ عالم بھی بھرا ہوا ہے اور صحیفہ قرآن بھی، لیکن جو کسی بات کو سمجھنے کے لیے تیار ہی نہ ہوں، اُن کا کیا کیا جائے؟



كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا صُمْ وَبُكْمٌ فِي الظُّلُمِ ط مَنْ يَشَاءِ اللَّهُ يُضِلَّهُ ط

کر دیے جائیں گے۔ ہماری آیتوں کو جن لوگوں نے جھٹلانے کا فیصلہ کر لیا ہے، وہ بہرے اور گونگے تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ (اپنے

آیت میں اِلَّا اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ کے الفاظ خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ یہ بتاتے ہیں کہ یہاں جانوروں اور پرندوں کی زندگی کے جس پہلو کو نمایاں کر کے پیش کرنا مقصود ہے، وہ اُن کا نظم اجتماعی ہے۔ اس کی ایک بہترین مثال شہد کی مکھی اور چیونٹی کا اجتماعی شعور ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اِن کا مشاہدہ کیجیے تو آپ کی عقل دنگ رہ جائے گی۔ اِن کے اندر اولاد کی پرورش کا کیسا انتظام ہے، خطرات سے بچاؤ کے لیے کیسی بیداری ہے، مستقبل کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیسی پیش بینی ہے، جماعتی فرائض کا کیسا شدید احساس ہے، کیسی اعلیٰ تقسیم کار ہے، کس درجہ مضبوط نظام امر و طاعت ہے، ضروریات کی فراہمی کے لیے کیسی ان تھک سرگرمی ہے، رہائش اور اپنے ذخائر کی حفاظت کے لیے تعمیر کا کیسا کمال فن ہے، تلاش و جستجو کا کیسا عمیق جذبہ اور حصول مطلوب کے لیے کیسی زیرکی و ہوشیاری اور پھر کتنی جان بازی و قربانی ہے۔“

(تدبر قرآن ۳/۴۸)

یہ اجتماعی شعور کسی نہ کسی درجے میں تمام جانوروں اور پرندوں میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اس سے جو حقیقت واضح ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ زمین و آسمان کی مخلوقات کسی اندھے بہرے قانون فطرت سے وجود پذیر نہیں ہوئیں، بلکہ ایک غایت ہے جس کو سامنے رکھ کر تخلیق کی گئی ہیں۔ یہ غایت ہر فرد نوع کی انفرادی زندگی سے بھی سمجھی جاسکتی ہے، لیکن اجتماعی زندگی کے لیے جب یہ جوڑے کا انتخاب کرتے، خاندان بناتے، دوسرے خاندانوں سے متعلق ہوتے اور اپنے بقا و تحفظ کا اہتمام کرتے ہیں تو اس کا ظہور ایسا واضح ہوتا ہے کہ انسان کی عقل مفلوج نہ ہو گئی ہو تو کبھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہ چیز کسی اندھے بہرے قانون فطرت سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔ قرآن اس کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ اس کے بعد بھی نہیں سمجھتے ہو کہ اس کے پیچھے ایک خالق و مدبر کا ہاتھ ہے اور







الانعام  
۲

وَمَنْ يَشَأْ يَجْعَلْهُ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٣٩﴾  
قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ  
اللَّهِ تَدْعُونَ ۚ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤٠﴾ بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ  
فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ ﴿٤١﴾

قانون کے مطابق<sup>۳۷</sup> جسے چاہتا ہے، گم راہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے، سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔ ۳۷-۳۹

ان سے کہو، ذرا بتاؤ، اگر تم پر اللہ کا عذاب آجائے یا قیامت کی گھڑی آپہنچے تو کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے، اگر تم (اپنے دعووں میں) سچے ہو؟ نہیں، بلکہ (ایسے ہر موقع پر) اُسی کو پکارتے ہو۔ پھر وہ چاہے تو اُس مصیبت کو ٹال دیتا ہے جس کے لیے پکارتے ہو، اور اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو (اُس وقت) تم بالکل بھول جاتے ہو۔<sup>۳۸</sup> ۴۰-۴۱

یہ کائنات مختلف ارادوں، متضاد قوتوں اور تمھارے مزعومہ دیوی دیوتاؤں کی رزم گاہ نہیں ہے، بلکہ اُسی وحدہ لا شریک خالق و مدبر کے علم و حکمت اور رحمت و ربوبیت کی جلوہ گاہ ہے۔  
۳۷ یعنی اس قانون کے مطابق کہ ہدایت وہی پائیں گے جو اپنے طرز عمل کی بنا پر اُس کے مستحق ہوں گے اور جو غلط روی پر اصرار کریں گے، وہ اُسی کے حوالے کر دیے جائیں گے، پھر کبھی راستہ نہ پاسکیں گے۔

۳۸ مطلب یہ ہے کہ اس وقت تو بڑے طنطنے کے ساتھ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو، لیکن وہ آپہنچا تو اپنے سب شریکوں کو بھول جاؤ گے اور اُسی ایک خدا کو پکارو گے جس کے شریک ٹھیرا رہے ہو۔ تم جانتے ہو کہ نفس انسانی میں صرف اُس کی شہادت ثبت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب



وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَآخَذْنَاهُمْ بِالْبَأْسَاءِ  
وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ ﴿٣٢﴾ فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا  
تَضَرَّعُوا وَلَكِنْ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا  
يَعْمَلُونَ ﴿٣٣﴾ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمُ أَبْوَابَ كُلِّ

تم سے پہلے بھی ہم نے بہت سی قوموں کی طرف اپنے رسول بھیجے تھے (اور انہوں نے انکار کیا) تو ہم نے انہیں مصائب و آلام میں بھی مبتلا کیا تھا تا کہ عاجزی اختیار کریں۔ پھر جب ہماری طرف سے اُن پر سختی آئی تو انہوں نے کیوں عاجزی اختیار نہ کی؟ بلکہ اُن کے دل (اور بھی) سخت ہو گئے اور شیطان نے اُن کے لیے (اُن کے) اُسی عمل کو خوبی بنا کر پیش کر دیا جو وہ کر رہے تھے۔ پھر وہ چیز جب انہوں نے بھلا دی، جس سے انہیں یاد دہانی کی گئی تھی تو ہم نے ہر طرح کی خوش حالیوں کے دروازے اُن پر زندگی میں کوئی ایسا مرحلہ آتا ہے جو اصل آزمائش کا ہوتا ہے تو اپنے تمام فرضی معبودوں کو بھول کر اُسی کو پکارتے ہو۔

۴۹ یہاں سے آگے اُس سنت الہی کا حوالہ ہے جس کے تحت رسولوں کے مکذبین ہلاک کر دیے گئے۔ اس سے مقصود قریش کو توجہ دلانا ہے کہ جن قوموں نے عذاب کی نشانی کا مطالبہ کیا ہے، انہیں کبھی ایمان لانے کی توفیق نہیں ملی، بلکہ جس عذاب کا مطالبہ وہ کر رہے تھے، اُسی نے اُن کی جڑ کاٹ دی۔  
۵۰ اصل میں لفظ تَضَرَّعُ آیا ہے۔ یہ قرآن کی خاص تعبیر ہے جو دل کی خشیت اور انابت و عبدیت کے احساس کے ساتھ خدا کے آگے جھک جانے کے لیے اختیار کی گئی ہے۔  
۵۱ یہ حسرت و افسوس کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سختی سے مقصود تو تنبیہ تھی، مگر کتنے بد قسمت تھے یہ لوگ کہ تنبیہ ہونے کے بجائے اور سرکش ہو گئے۔

۵۲ یعنی اُن مصائب و آلام سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا جن میں مبتلا کیے گئے تھے، بلکہ







الانعام  
۲

شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ ﴿٢٢﴾  
فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۖ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٢٣﴾  
قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَابْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلَىٰ  
قُلُوبِكُمْ مِّنْ إِلَٰهِ غَيْرِ اللَّهِ يَاتِيكُمْ بِهِ ۗ أَنْظُرْ كَيْفَ نَصَرِفُ الْآيَاتِ

کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ ہماری اُن بخششوں پر اترانے لگے جو اُن پر کی گئی تھیں تو اچانک ہم نے اُنہیں پکڑ لیا، اب حال یہ تھا کہ بالکل ششدر ہو کر رہ گئے۔  
اس طرح اُن لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنہوں نے (اپنی جان پر) ظلم ڈھایا تھا اور شکر اللہ ہی کے لیے ہے جو عالم کا پروردگار ہے (کہ اُس نے زمین کو ان ظالموں سے پاک کر دیا) ۲۲-۲۵

ان سے پوچھو، کبھی سوچا ہے کہ اگر اللہ تمہاری سماعت و بصارت تم سے چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو اُس کو تمہیں واپس لا دے گا؟  
اُنہیں بھلا کر بالکل نچت ہو گئے۔

۵۳ یہ نہایت لطیف تعبیر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس سے پہلے اس طرح کے مجرموں پر ابتلا کے جو جھوٹے آتے ہیں، اُن سے اُن کے شجر ہستی کے صرف برگ و بار متاثر ہوتے ہیں اور وہ بھی وقتی طور پر، اُن کی جڑ محفوظ رہتی ہے، لیکن جب یہ وقت آجاتا ہے تو خدا اُن پر عذاب بھیجتا ہے جو اُن کے وجود قومی ہی کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کے پھینک دیتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۵۲/۳)

۵۴ یہ اُس احساس کا اظہار ہے جو خدا سے سرکشی کرنے والوں کے انجام پر ہر بندہ مومن کے دل میں پیدا ہونا چاہیے۔

۵۵ مطلب یہ ہے کہ یہی وقت ہے کہ ان قوتوں سے وہ کام لیا جائے جس کے لیے یہ دی گئی



ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُونَ ﴿٣٧﴾ قُلْ أَرَأَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ بَغْتَةً  
 أَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمَ الظَّالِمُونَ ﴿٣٨﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ  
 إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ ۚ فَمَنْ أَمِنَ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ  
 وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۚ ﴿٣٩﴾ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا يَمَسُّهُمُ  
 الْعَذَابُ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿٤٠﴾

دیکھو، کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے (ان کے سامنے) پیش کر رہے  
 ہیں، پھر بھی یہ اعراض کرتے ہیں۔ پوچھو: کبھی سوچا ہے کہ اگر اللہ کا عذاب<sup>۵۶</sup> تم پر اچانک  
 آدھمکے یا ہانکے پکارے آئے تو کیا ظالم لوگوں کے سوا کسی اور کو ہلاک کیا جائے گا؟  
 رسولوں کو تو ہم صرف اس لیے بھیجتے ہیں کہ (لوگوں کے لیے) خوش خبری دینے والے  
 اور (انہیں) خبردار کرنے والے ہوں۔ سو جنہوں نے مان لیا اور اصلاح کر لی تو انہیں  
 کوئی اندیشہ اور کوئی غم نہ ہوگا۔ اس کے برخلاف جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا،  
 اُن کی نافرمانیوں کی پاداش میں ہمارا عذاب انہیں پکڑے گا۔ ۴۶-۴۹

ہیں۔ اگر اللہ نے انہیں سلب کر لیا تو دوبارہ کہاں سے حاصل کرو گے؟ اس کے بعد تو صرف  
 حسرتیں باقی رہ جائیں گی۔

۵۶ اس سے مراد وہ عذاب ہے جو رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر اتمام حجت کے بعد آتا  
 ہے اور صرف انہی کو ہلاک کرتا ہے۔ اہل ایمان اُس سے لازماً بچا لیے جاتے ہیں۔

۵۷ یعنی وہ عذاب لانے یا معجزے دکھانے کے لیے نہیں بھیجے جاتے جس کا مطالبہ تم شب و  
 روز کرتے ہو، بلکہ انداز و بشارت کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس  
 کے مضمرات کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:



قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا  
أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ ۚ إِنَّا تَبِعُوا مَا يُوحَىٰ إِلَيْنَا ۖ قُلْ هَلْ  
يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۖ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ ﴿٥٠﴾

ان سے کہہ دو، (اے پیغمبر)، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھے کی جاتی ہے۔ کہہ دو، (میرا سوال صرف یہ ہے)، کیا اندھے اور دیکھنے والے، دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ پھر کیا تم غور نہیں کرتے؟ ۵۰

”... اس سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ اللہ کے رسول خدا کی رحمت کے مظہر ہوتے ہیں، عذاب اُن کی بعثت کے مقاصد میں سے نہیں، بلکہ اُن کی تکذیب کے لوازم و نتائج میں سے ہے۔ دوسری یہ کہ رسولوں سے لوگوں کو چاہنی وہ چیز چاہیے جس کے لیے وہ آتے ہیں، یعنی ایمان اور عمل صالح کی ہدایت نہ کہ وہ چیز جس سے وہ لوگوں کو بچانے کے لیے بھیجے جاتے ہیں، تیسری یہ کہ یہ خوارق و عجائب نہ رسولوں کے خصائص میں سے ہیں اور نہ اُن کی تعلیم و دعوت کے لوازم میں سے، بلکہ ان کا ظہور اگر ہوتا ہے تو محض اتمام حجت کے طور پر ہوتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ چوتھی یہ کہ اس میں رسول کے لیے پیام تسکین ہے کہ وہ اپنا تعلق اپنے اصل مقصد بعثت — بشارت اور انداز — سے رکھے، جو باتیں اُس کے فرائض سے غیر متعلق ہیں، اُن کو خدا پر چھوڑے، بلا وجہ اُن کے لیے پریشان نہ ہو۔“ (تدبر قرآن ۳/۵۴)

۵۸ مطلب یہ ہے کہ بحث کرنی ہے تو اُس چیز پر کرو جو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ میں غیب نہیں جانتا یا فرشتہ نہیں ہوں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میری بحث کا موضوع ان میں سے کوئی چیز کبھی نہیں رہی۔ میں تو وہی کہتا ہوں جو وحی کے ذریعے سے مجھے کہنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ ۵۹ یعنی سمع و بصر کی صلاحیتوں سے کام لینے والوں اور آنکھیں بند کر کے زندگی بسر کرنے



وَأَنْذِرْ بِهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْ يُحْشَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ  
مَنْ دُونِهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ لَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿٥١﴾  
وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ

(انہیں اب ان کے حال پر چھوڑو) اور اس قرآن کے ذریعے سے اُن لوگوں کو  
خبردار کرو جو اندیشہ رکھتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے حضور میں اس طرح پیش کیے  
جائیں گے کہ اُن کے لیے اُس کے سوا کوئی حامی اور کوئی سفارش کرنے والا نہ ہوگا  
تاکہ پرہیزگاری اختیار کریں۔ ۵۱

(ان کے ایمان کی آرزو میں) تم اُن لوگوں کو اپنے سے دور نہ کرو جو صبح و شام

والوں کا انجام خدا کے ہاں الگ الگ ہوگا یا دونوں برابر ہو جائیں گے؟ میں تم سے صرف یہ پوچھتا  
ہوں کہ تم اس بات پر غور کیوں نہیں کرتے؟

۶۰۔ اس آیت سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”ایک یہ کہ انداز کے لیے فطری اور عقلی چیز یہ قرآن ہے نہ کہ عذاب کی نشانیاں۔

دوسری یہ کہ یہ قرآن بھی نافع اُن لوگوں کے لیے ہے جن کے اندر فطرت کی صلاحیتیں زندہ

ہیں۔ جن کی فطری صلاحیتیں مردہ ہو چکی ہیں، اُن کو قرآن سے بھی نفع نہیں پہنچے گا۔

تیسری یہ کہ تقویٰ اور خدا ترسی کے لیے سب سے بڑا حجاب شفاعت باطل کا عقیدہ ہے۔“

(تذبر قرآن ۵۸/۳)

۶۱۔ اصل میں لفظ تَطْرُدُ آیا ہے۔ یہ معنی کے لحاظ سے ایک سخت لفظ ہے، لیکن سردارانِ قریش

کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ اُن کی خواہش یہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم اپنے اُن ساتھیوں کو دھتکار دیں جو بالکل غربا اور عوام کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ

سمجھتے تھے کہ ان غریبوں کے ساتھ بیٹھنا اُن کے شایانِ شان نہیں ہے۔ چنانچہ انہیں اراذل و







الانعام  
۶

وَجْهَهُ<sup>ط</sup> مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿٥١﴾ وَكَذَلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوا أَهَؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِن بَيْنِنَا أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ ﴿٥٢﴾ وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ

اپنے پروردگار کو اُس کی خوشنودی کی طلب میں پکارتے ہیں۔ ان کی ذمہ داری کا کوئی حصہ تم پر نہیں ہے اور نہ تمہاری ذمہ داری کا کوئی حصہ ان پر ہے کہ (ان کی خواہش پر) تم اُن لوگوں کو دور کر کے ظالموں میں شامل ہو جاؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اسی طرح ان میں سے ایک کو دوسرے سے آزمایا ہے تاکہ یہ (بد بخت اُن غریبوں کو دیکھ کر) کہیں: کیا یہی لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہمارے درمیان سے اپنے فضل کے لیے چن لیا ہے؟

اجلاف قرار دیتے اور کہتے تھے کہ اسلام اگر کوئی فضیلت کی چیز ہے تو اس طرح کے لوگ اُس کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں؟ آیت میں روئے سخن انہی مغروروں کی طرف ہے، لیکن بات ان کو مخاطب کر کے کہنے کے بجائے پیغمبر کو مخاطب کر کے کہی گئی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات اس قابل بھی نہیں تھی کہ ان کو مخاطب کر کے اس کا جواب دیا جائے۔

۶۲ مطلب یہ ہے کہ اپنے اس تکبر کے نتیجے میں یہ اگر جہنم کا ایندھن بنتے ہیں تو اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے کہنے پر تم اگر اُن لوگوں کے حقوق تلف کرتے ہو جو تمہاری شفقت و محبت کے اصلی حق دار ہیں تو خدا کے حضور میں تمہاری طرف سے یہ اُس کے ذمہ دار نہیں ہو جائیں گے۔ خدا کا قانون یہی ہے کہ کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔

۶۳ آیت میں 'لِيَقُولُوا' آیا ہے۔ اس میں لام عاقبت کا ہے جو علت کو نہیں، بلکہ نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اُس سنت الہی کا بیان ہے جس کے تحت لوگوں کو موقع دیا جاتا ہے کہ اس طرح کی باتیں کر کے اپنی بد بختی کا سامان کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا



بَايْتِنَا فَعَلَّ سَلَّمَ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۚ أَنَّهُ  
مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءًا أَوْ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْهُ بَعْدَ ذَلِكَ وَأَصْلَحَ فَإِنَّهُ  
غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٥٣﴾ وَكَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ لِّيَسْتَبِينُوا

(ان سے پوچھو)، کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو سب سے بڑھ کر نہیں جانتا؟ (ان کی خواہش کے برخلاف)، ہماری آیتوں کو ماننے والے یہ لوگ جب تمہارے پاس آیا کریں تو ان سے کہو کہ تم پر سلامتی ہو۔ تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے کہ تم میں سے اگر کوئی نادانی کے ساتھ برائی کا ارتکاب کر بیٹھے گا، پھر اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لے گا تو اس طرح ہے کہ اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان ہے۔

امتحان کے لیے بنائی ہے اور امتحان کے تقاضے سے یہ موقع دینا ضروری ہے۔

۶۴ یہ ان کے ترمذ کا جواب ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مطلب یہ ہے کہ خدا کا دین سونا اور چاندی، ریشم اور مخمل نہیں ہے جس کی کاٹھی اور جس کے جھول گدھوں اور خچروں، گھوڑوں اور اونٹوں پر بھی نظر آجاتے ہیں۔ یہ تو آسمانی نعمت اور یزدانی رحمت ہے جو صرف ان کا حصہ ہے جو ہر حال میں اپنے رب کے شکر گزار رہے، جنہوں نے خدا کی نعمتوں کی قدر کی، جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کا حق ادا کیا، جنہوں نے اپنے کان کھلے رکھے، جنہوں نے اپنی آنکھوں پر غرور کی پٹی نہیں باندھی اور جنہوں نے اپنے دلوں کو مردہ نہیں ہونے دیا۔ رہے وہ نابکار و ناشکرے لوگ جنہوں نے خدا کی بخشی ہوئی تمام ظاہری و باطنی نعمتوں کو خدا ہی کے خلاف استعمال کیا، ان کے لیے اس نعمت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ دنیا نیک و بد، دونوں کو مل جاتی ہے، لیکن دین کی نعمت صرف انہی کو ملتی ہے جو خدا کے شکر گزار ہوتے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۶۱/۳)

۶۵ یہ جس طرح ملاقات یا رخصت کا کلمہ ہے، اُسی طرح خیر مقدم کا کلمہ بھی ہے۔ موقع کلام

سے واضح ہے کہ یہاں یہ اسی دوسرے مقصد سے آیا ہے۔





الانعام  
۶

## سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ ۵۵

قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ قُلْ لَا أَتَّبِعُ أَهْوَاءَكُمْ ۖ قَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ۵۶ قُلْ

ہم اسی طرح اپنی آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں تاکہ نیکوکاروں کی روش بھی نمایاں ہو اور مجرموں نے جو راستہ اختیار کیا ہے، وہ بھی بالکل واضح ہو جائے۔ ۵۲-۵۵

(اے پیغمبر)، کہہ دو کہ مجھے تو اُن کی عبادت سے روکا گیا ہے جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔ کہہ دو، میں تمہاری خواہشوں کے پیچھے نہیں چل سکتا۔ اگر میں نے ایسا کیا

۶۶ یہ بشارت بتا رہی ہے کہ جن لوگوں کو دی گئی، وہ مال و جاہ کے نہیں، بلکہ اُسی رحمت و مغفرت کے طلب گار تھے جس کا ذکر بشارت میں ہوا ہے۔ دنیا کے سر و سامان سے اُن کو کوئی دل چسپی نہ تھی۔ اُن کے دل کی لگن یہی تھی کہ گناہ بخش دیے جائیں اور اُن کے پروردگار کی رضا اُنہیں حاصل ہو جائے۔

۶۷ اصل الفاظ ہیں: 'وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ'۔ اس میں لام علت کا ہے اور اُس سے پہلے 'و' دلالت کر رہی ہے کہ 'لِتَسْتَبِينَ' کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۶۸ یہ لفظ اس آیت میں بھی ہے اور آگے کی آیتوں میں بھی بار بار آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں اُن شبہات و اعتراضات کے جواب میں کہی گئی ہیں جو مخاطبین کی طرف سے پیش کیے جا رہے تھے۔

۶۹ یعنی دعا و استرحام کے لیے پکارتے ہو۔ یہ اُسی بات کو منفی پہلو سے دہرایا ہے جو پیچھے بیان ہوئی ہے کہ خدا کی شہادت جو قرآن کی صورت میں مجھ پر نازل ہوئی ہے، وہ تو یہی ہے کہ زمین و آسمان کا پروردگار وحدہ لا شریک ہے۔



إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَكَذَّبْتُمْ بِهِ ۚ مَا عِندِي مَاتَسْتَعْجِلُونَ  
 بِهِ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ يَقْضُ الْحَقُّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَصِلِينَ ۝<sup>٥٤</sup>  
 قُلْ لَّوِ أَنِّي عِندِي مَاتَسْتَعْجِلُونَ بِهِ لَقُضِيَ الْأَمْرُ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۚ

تو گم راہی میں پڑا اور راستہ پانے والوں میں سے نہیں رہا۔ کہہ دو، میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور تم نے اُسے جھٹلا دیا ہے۔ تم جس چیز کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہو، وہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اُس کا فیصلہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہی حق کو واضح فرمائے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ جس چیز کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو، اگر وہ میرے ہاتھ میں ہوتی تو میرے اور

۱۔ اصل میں لفظ 'أَهْوَاء' آیا ہے۔ اس سے مراد شرکانہ بدعات ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:  
 ”...أَهْوَاء“ کے لفظ سے تعبیر کر کے قرآن نے ان کے بے بنیاد ہونے کو واضح فرمایا ہے کہ ان کے شریک خدا ہونے کی کوئی شہادت نہ تو عقل و فطرت کے اندر موجود ہے، نہ خدا کے کلام و الہام میں، محض اپنے جی سے تم نے یہ چیزیں گھڑی ہیں اور چونکہ ان کی موہوم شفاعت کی امید نے تمہیں ایمان و عمل اور فکر آخرت کی تمام ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا ہے، اس وجہ سے یہ تمہارے نفس کو بہت پسند ہیں۔ بہر حال تمہیں پسند ہیں تو ہوں، لیکن حقیقت اور خواہش میں بڑا فرق ہے۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں حقیقت کو نظر انداز کر کے تمہاری جھوٹی آرزوؤں، باطل خواہشوں اور بے سند بدعات کی پیروی کروں۔“ (تدبر قرآن ۶۶/۳)  
 اے یعنی قرآن مجید جو توحید کی حقیقت کو ہر لحاظ سے واضح کر دیتا ہے۔

۲۔ اصل الفاظ ہیں: ”وَكَذَّبْتُمْ بِهِ“۔ ان میں ضمیر کا مرجع لفظ 'بَيِّنَةٍ' ہے جس کا ترجمہ ہم نے روشن دلیل کے الفاظ سے کیا ہے۔ اس کے لیے ضمیر مونث آنی چاہیے تھی، لیکن یہ لفظ کے بجائے مفہوم و مصداق کے لحاظ سے آگئی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے قرآن کا ایک قطعی حجت اور





الانعام  
۶

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالظَّالِمِينَ ۝۵۸ وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٌ فِي ظُلُمَاتٍ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٌ وَلَا يَابِسٌ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ۝۵۹ وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ

تمھارے درمیان اس معاملے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ (یہ معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے) اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔ غیب کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں، انھیں اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے، اُس کے علم میں ہے۔ درخت سے کوئی ایسا پتا اور زمین کی تہوں میں کوئی ایسا دانہ بھی نہیں گرتا اور نہ کوئی خشک و تر ایسا ہے جسے وہ نہ جانتا ہو۔ یہ سب (اُس کے ہاں) ایک کھلی کتاب میں درج ہے۔ ۵۶-۵۹ وہی ہے جو رات میں تمھاری روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ دن میں کرتے ہو،

واضح شہادت ہونا بھی واضح ہوا اور یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ 'بَيِّنَةٌ' سے مراد قرآن ہی ہے۔

۳؎ یعنی وہ کنجیاں جن سے تمام غیب کے دروازے کھل جائیں۔

۴؎ اوپر والے مضمون کی تقریب سے یہ علم الہی کی وسعت اور اُس کے احاطہ کو بیان فرمایا ہے جس سے ضمنائے بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ خدا صرف کلیات ہی کا نہیں، بلکہ جزئیات کا بھی عالم ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اللہ تعالیٰ کے علم کی اس وسعت کا اعتقاد ہی ہے جو اہل ایمان کے اندر کامل تفویض، کامل اعتماد اور کامل رضا بالقضا کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اس میں معمولی غلط فہمی بھی شرک کی راہیں کھول دیتی ہے۔ یہی چیز آخرت پر سچے اور پکے ایمان کی بنیاد ہے اور اسی کے صحیح تصور و تذکر سے انسان کے اندر وہ خشیت بھی پیدا ہوتی ہے جو زندگی میں اُس کو صحیح روش اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔“ (تذکر قرآن ۶۸/۳)



يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٦٠﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمْ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ ﴿٦١﴾ ثُمَّ رُدُّوْا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقُّ ۖ أَلا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ أَسْرَعُ الْحَاسِبِينَ ﴿٦٢﴾

اُسے بھی جانتا ہے۔ پھر اُسی میں تمہیں اٹھا کھڑا کرتا ہے تاکہ زندگی کی مقرر مدت پوری کی جائے۔ آخر کار تمہیں اُسی کی طرف لوٹنا ہے، پھر وہ تمہیں بتا دے گا جو کچھ کرتے رہے ہو۔ وہ اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے اور تم پر (اپنے) نگران مقرر رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ہی اُس کی روح قبض کرتے ہیں اور (اس کام میں) کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ پھر سب کے سب اپنے حقیقی مولا کی طرف لوٹا دیے جاتے ہیں۔ سنو، فیصلے کا سارا اختیار اُسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ بہت تیزی کے ساتھ حساب چکانے والا ہے۔ ۶۰-۶۲

۵۷ بعث و نشر اور جزا و سزا کے بارے میں لوگوں کے مغالطے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ علم الہی کا صحیح تصور نہیں رکھتے۔ اوپر کی آیتوں میں اُس کی وضاحت فرمائی تو موقع پیدا ہو گیا کہ موت کے بعد زندگی اور حساب کتاب کی یاد دہانی کر دی جائے۔ اس کے لیے اُس تمثیلی مشاہدے کا حوالہ دیا ہے جو ہم میں سے ہر شخص کو ہر روز کرایا جا رہا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...قرآن نے یہاں ہر شب میں سونے کو وفات سے اور ہر صبح کے اٹھنے کو بعث سے تعبیر کر کے توجہ دلائی ہے کہ مرنا اور اٹھنا تو ہر روز ہو رہا ہے، جس طرح تمہارا سونا اور جاگنا ہے، اُسی





الانعام  
۶

قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِّنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا  
وَخُفْيَةً ۚ لَّيِّنَ أَنْجُسًا مِّنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿٦٢﴾ قُلْ  
اللَّهُ يُنَجِّيكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنْتُمْ تُشْرِكُونَ ﴿٦٣﴾ قُلْ  
هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ  
أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبَسَكُمْ شِيعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ۚ انْظُرْ كَيْفَ

ان سے پوچھو کہ بحر و بر (میں آفات و مصائب) کی تاریکیوں سے کون تمہیں بچاتا ہے، جب کہ تم گڑگڑا کر اور چپکے چپکے اُسے پکار رہے ہوتے ہو کہ اگر اُس نے اس مصیبت سے ہمیں بچا لیا تو ہم ضرور اُس کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے؟ کہہ دو، اس سے اور ہر مصیبت سے اللہ ہی تمہیں نجات دیتا ہے، لیکن اس کے بعد پھر شرک کرنے لگتے ہو۔ کہہ دو، وہ پوری قدرت رکھتا ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے کوئی عذاب بھیج دے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے برپا کر دے یا تمہیں گروہ درگروہ کر کے گتھم گتھا کرے

طرح تمہارا مرنا اور اٹھنا ہے اور جس طرح تم میں سے کسی سونے والے کے دن کے اعمال سے خدا لاعلم نہیں ہوتا، اُسی طرح جب تم موت کی نیند سوؤ گے تو خدا تمہاری زندگی کے اعمال بھول نہیں جائے گا اور جس طرح تمہاری ہر شب کی نیند کے بعد صبح ہوتی ہے اور تم آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھتے ہو، اُسی طرح موت کی نیند کے بعد قیامت کی صبح آئے گی اور تم ایسا محسوس کرو گے کہ یہ جو کچھ ہوا، سب صبح و شام کا قصہ ہے۔“ (تدبر قرآن ۶۹/۳)

۶۷ اصل الفاظ ہیں: تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً۔ تَدْعُونَ، ”يُنَجِّيكُمْ“ کی ضمیر مفعول سے حال واقع ہوا ہے۔ ہم نے ترجمہ اسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۷۷ یہ اُن حقائق کی طرف متوجہ فرمایا ہے جو خدا کی توحید سے متعلق خود انسان کے اندر موجود

ہیں۔





نُصِرْفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ⑥٥  
وَكَذَبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ٭ قُلْ لَسْتُ عَلَيْكُمْ  
بِوَكِيلٍ ⑥٦ لِكُلِّ نَبِيٍّ مِّسْقَرٌ ٭ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ⑥٧  
وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى  
يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ٭ وَإِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ

اور ایک دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھا دے۔ دیکھو، کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ سمجھ لیں۔ ۶۳-۶۵

تمہاری قوم نے، (اے پیغمبر)، ہماری اس وعید کو جھٹلادیا ہے، دریاں حالیکہ یہ بالکل حقیقت ہے۔ ان سے کہہ دو کہ میں تمہارے اوپر کوئی داروغہ نہیں بنایا گیا ہوں (کہ تمہیں ضرور ہی سمجھا دوں)۔ ہر بات کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ (اس کے باوجود عذاب ہی مانگتے ہو تو) عنقریب یہ حقیقت تمہیں بھی معلوم ہو جائے گی۔ ۶۶-۶۷

(انہیں اب ان کے حال پر چھوڑو) اور جب دیکھو کہ لوگ ہماری آیتوں پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہو جایا کرو، یہاں تک کہ کسی دوسری بات میں لگ

۸ ے یہ خطاب اگرچہ واحد کے صیغے سے ہے، لیکن آگے کی آیتوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے مخاطب تمام مسلمان ہیں جنہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ہدایت کی گئی ہے کہ دعوت و تبلیغ کے مقصد سے بھی اُن لوگوں کی مجلس میں نہ بیٹھے رہیں جو خدا کے دین اور اُس کے پیغمبر کا مذاق اڑانے میں لگے ہوئے ہوں۔

۹ ے اصل میں لفظ يَخُوضُونَ آیا ہے۔ یہ اُس سخن گستری کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کا مقصد کسی بات کو ہنسی، دل لگی اور مذاق میں اڑا دینا ہو۔





بَعْدَ الذِّكْرِ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٦٨﴾ وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ  
مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَلَٰكِنْ ذِكْرٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿٦٩﴾

جائیں۔ اور اگر کبھی شیطان بھلا دے تو غلطی کا احساس ہو جانے کے بعد ان ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو۔ ان کے حساب کی کوئی ذمہ داری ان لوگوں پر نہیں ہے جو خدا سے

۸۰۔ اس ہدایت کے دو پہلو ہیں اور دونوں نہایت اہم ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:  
”ایک تو یہ کہ یہ رویہ اُس حکمت دعوت کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تبلیغ کے لیے پسند فرمائی ہے۔ جس وقت کسی گروہ پر کسی چیز کی مخالفت، اُس کی تضحیک اور اُس کی تردید کا بخار چڑھا ہوا ہو اور بخار کی شدت سے مریض کی کیفیت ہدیانی ہو رہی ہو، عین اُسی حالت میں اُس کے سامنے اُس چیز کو پیش کرنا گویا اُس کے بخار اور ہدیانی، دونوں کو مزید بڑھا دینا ہے۔ اگر کوئی معالج مریض کی بیماری ہی میں اضافہ چاہتا ہو تو وہ تو آزاد ہے جو چاہے کرے، لیکن کوئی مہربان طبیب جو مریض کی صحت کا خواہاں ہے، وہ کبھی ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ اسی رعایت احوال کے پیش نظر یہاں مسلمانوں کو ہدایت ہوئی کہ جب تم دیکھو کہ یہ اسلام کے مخالفین قرآن کا مذاق اڑانے پر تلے ہوئے، طنز و تضحیک کے ترکش سنبھالے ہوئے اور مخالفت کے لیے آستین چڑھائے ہوئے ہیں تو اُس وقت طرح دے جاؤ اور کسی ایسے وقت کا انتظار کرو، جب یہ بحرانی کیفیت ذرا دور ہو جائے تو اُس وقت اُن کو سنانے اور سمجھانے کی کوشش کرو۔

دوسرا یہ کہ یہ اُس غیرت حق کے منافی ہے جو اہل ایمان کے اندر ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔ اگر کوئی شخص یا گروہ علانیہ خدا اور رسول کے خلاف بکواس کرتا ہے تو اُس سے لڑنا بھی ایک داعی کے لیے غلط، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اور خاموش رہنا بھی غلط، اس لیے کہ اس سے وہ حمیت حق مجروح ہوتی ہے جو علامت ایمان ہے اور جس کا ضعف بالآخر درجہ بدرجہ آدمی کو اُس نفاق میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں مبتلا ہو جانے کے بعد اللہ، رسول، قرآن اور شریعت ہر چیز کی توہین و تذلیل وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور کانوں سے سنتا ہے، لیکن اُس کو ایسا سانپ سونگھ جاتا ہے کہ



وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لِبَآئِهِمْ لَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ  
الدُّنْيَا وَذَكَرَ رَبَّهُ أَنْ تُبَـسَّلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ

ڈرنے والے ہیں۔ البتہ، یاد دہانی اُن کا فرض ہے تاکہ یہ بھی ڈرنے والے بن جائیں<sup>۸۱</sup>۔  
جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے اور جنہیں دنیا کی زندگی نے دھوکے میں  
ڈال دیا ہے<sup>۸۲</sup>، انہیں چھوڑو اور اس قرآن کے ذریعے سے یاد دہانی کرتے رہو کہ کہیں کوئی

زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔“ (تدبر قرآن ۷۷/۳)

۸۱۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم تبلیغ و دعوت کو کس درجے میں اپنی ذمہ داری  
سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہیں اطمینان دلایا ہے کہ مواخذہ اس بات پر تو ضرور ہوگا کہ جنہیں تبلیغ کا حکم دیا  
گیا تھا، انہوں نے لوگوں کو تبلیغ و تذکیر کی یا نہیں، لیکن اس بات پر ہرگز کوئی مواخذہ نہ ہوگا کہ لوگوں  
نے ہدایت قبول کیوں نہیں کی۔ لہذا محض اس وجہ سے مذاق اڑانے والوں کی مجلس میں بیٹھے رہنے  
کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ انہیں ہر حال میں بات سمجھا کر ہی اٹھنا ہے۔ یاد دہانی کرنا یقیناً فرض  
ہے، مگر اپنے آپ کو لوگوں کی ہدایت و ضلالت کا ذمہ دار سمجھ کر اُن کے درپے ہونا کسی پر فرض نہیں  
ہے۔

۸۲۔ یہ اُن کی شرارت کا اصل سبب بتایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اُن کا اصلی مغالطہ یہی ہے کہ جب ہماری زندگی کامیاب ہے تو ہمارا رویہ بھی لازماً صحیح  
ہے۔ وہ اسی دنیا کی زندگی کو کل کی زندگی سمجھے بیٹھے ہیں اور یہ زندگی چونکہ جزا و سزا کے اصول پر  
نہیں چل رہی ہے، بلکہ امتحان و آزمائش کے اصول پر چل رہی ہے، یہاں حق کے ساتھ خدا  
نے باطل کو بھی ڈھیل دے رکھی ہے، اس وجہ سے وہ اپنی خواہشوں کی پیروی میں باطل ہی کو اپنا  
دین بنا بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی زندگی اور یہی رویہ صحیح ہے اور قرآن اُن کو جس انجام سے  
خبردار کر رہا ہے، وہ محض ایک موہوم ڈراوا ہے۔“ (تدبر قرآن ۸۰/۳)





الانعام  
۶

دُونِ اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ ۖ وَإِنْ تَعْدِلْ كُلُّ عَدْلٍ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا ۚ  
أُولَئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا ۖ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ  
وَعَذَابٌ أَلِيمٌ ۖ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٤٠﴾

قُلْ أَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلَىٰ  
أَعْقَابِنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْنَا اللَّهَ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيَاطِينُ فِي الْأَرْضِ

شخص اپنے کرتوتوں کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے نہ کر دیا جائے۔ اور وہ بھی اس  
حال میں کہ اللہ کے آگے نہ اُس کا کوئی حامی و مددگار ہو اور نہ سفارش کرنے والا، اور اگر ہر  
معاوضہ بھی دے تو اُس سے قبول نہ کیا جائے۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے کرتوتوں کی پاداش  
میں ہلاکت کے حوالے کیے جائیں گے۔ جس کفر کا ارتکاب یہ کرتے رہے ہیں، اُس کی  
پاداش میں ان کے لیے کھولتا ہوا پانی اور ایک دردناک عذاب ہے۔ ۶۸-۷۰

ان سے پوچھو، کیا ہم اللہ کے سوا انھیں پکاریں جو ہمیں نہ نفع دے سکتے ہیں، نہ  
نقصان؟ اور اس کے بعد بھی کہ اللہ نے ہمیں ہدایت بخش دی ہے، کیا ہم الٹے پاؤں

۸۳ اصل میں 'أَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'أَنْ' سے پہلے 'مُخَافَةً' یا اس کے  
ہم معنی کوئی دوسرا لفظ ان میں عربیت کے قاعدے سے حذف ہو گیا ہے۔

۸۴ اصل الفاظ ہیں: 'لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ'۔ یعنی پہلی ضیافت ماء حمیم  
سے ہوگی، پھر عذاب الیم کے حوالے کر دیے جائیں گے۔ سورہ واقعہ (۵۶) کی آیت ۹۳ میں  
قرآن نے اس کی تصریح کر دی ہے۔

۸۵ جن چیزوں کے نفع و نقصان کی نفی کی گئی ہے، اُن کے لیے اصل میں لفظ 'مَا' آیا ہے۔ یہ  
اُن کی تحقیر پر دلالت کرتا ہے۔



حَيْرَانَ ۖ لَهُ أَصْحَابٌ يَدْعُونَهُ إِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۖ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَى ۖ وَأْمُرْنَا لِلْعِلْمِ ۖ ۝۱۱۱ وَأَنَّ

پھر جائیں؟ اُس شخص کی طرح جسے شیطانوں نے بیابان میں بہکا دیا اور حیران و سرگشتہ چھوڑ دیا ہو، دریاں حالیکہ اُس کے ساتھی اُسے راہ ہدایت کی طرف بلا رہے ہوں کہ ہمارے پاس آ جاؤ۔ کہہ دو، حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے اور ہمیں حکم دیا

۸۶ یعنی اس سے پہلے اگر کسی گم راہی میں مبتلا رہے تو اُس کے لیے کچھ عذر ہو سکتا تھا، لیکن اب اگر اُسی حماقت کا ارتکاب کریں تو خدا کے حضور میں کیا عذر پیش کریں گے؟

۸۷ یعنی شیاطین جن و انس۔ حیران و سرگشتہ چھوڑ دینے کی نسبت ان کی طرف اس لیے کی گئی ہے کہ ایمان و اخلاق کی گم گشتگی کو یہی اُس درجے تک پہنچاتے ہیں جس کا ذکر تمثیل میں ہوا ہے۔

۸۸ اصل میں لفظ 'الْأَرْض' استعمال ہوا ہے جس کے معنی زمین کے ہیں، لیکن قرینہ موجود ہو تو اس سے زمین کا کوئی خاص حصہ بھی مراد لے سکتے ہیں۔ یہاں گم گشتگی کی تمثیل بیان ہو رہی ہے، اس لیے صحرا اور بیابان مراد ہے، جہاں راہ بھٹکنے کا خطرہ ہوتا ہے۔

۸۹ یہ اُنھی لوگوں کی تمثیل ہے جن کا رویہ زیر بحث ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”اس تمثیل کا اسلوب اگرچہ بظاہر ایک عمومی تمثیل کا ہے، لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ فی الحقیقت یہ اُن مخالفین اسلام کی تمثیل ہے جو یہاں زیر بحث ہیں۔ اس تمثیل میں اُن کے سامنے یہ بات رکھی گئی ہے کہ تم صحرا میں بھٹکتے ہوئے مسافر کی مانند ہو، شیاطین اور گم راہ لیڈروں نے تمہاری مت ماردی ہے اور تمہارے کچھ راہ یاب ساتھی (اشارہ اہل ایمان کی طرف ہے) تمہیں اصل راہ کی طرف بلا رہے ہیں، لیکن تم اُن کی پکار نہیں سن رہے ہو۔“

(تذبر قرآن ۸۲/۳)



اقِمْو الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوهُ ۖ وَهُوَ الَّذِي اِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٤٢﴾ وَهُوَ  
الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ وَيَوْمَ يَقُولُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۗ

گیا ہے کہ اپنے آپ کو جہانوں کے پروردگار کے حوالے کر دیں اور حکم دیا گیا ہے کہ نماز کا اہتمام کرو اور اُس سے ڈرتے رہو، اس لیے کہ وہی ہے جس کے حضور میں تم سب اکٹھے کیے جاؤ گے، اور وہی ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے۔<sup>۹۳</sup> جس دن

۹۰ اس لیے کہ جب وہ عالم کا پروردگار ہے تو وہی حق دار ہے کہ اپنے آپ کو اُس کے حوالے کیا جائے۔

۹۱ پیچھے فرمایا ہے: ”وَأْمُرْنَا لِنُسَلِّمَ لِرَبِّ الْعَلَمِينَ“۔ یہ ٹکڑا بھی اُسی کے تحت ہے، لیکن اسلوب غائب کے بجائے حاضر کا ہو گیا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ کلام میں براہ راست خطاب کا زور پیدا ہو جائے۔

۹۲ نماز اور تقویٰ کے بعد یہ توحید اور آخرت کا ذکر بھی ہے اور اُن کی دلیل بھی۔ مطلب یہ ہے کہ نماز کا اہتمام اور حدودِ الہی کا احترام اس لیے ضروری ہے کہ ایک دن خدا کے آگے حاضر ہونا ہے۔

۹۳ یہ پچھلے جملے کی دلیل ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”آسمان وزمین میں خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کے جو آثار و دلائل موجود ہیں، وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ یہ کارخانہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے جو اُس نے محض اپنا جی بہلانے کے لیے بنایا ہو، بلکہ یہ ایک قدیر، علیم، حکیم اور رحمن و رحیم ذات کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ اگر یہ یونہی چلتی رہے، اس کے اندر جو ظلم ہے، اُس کے انصاف کے لیے کوئی دن نہ آئے، جو عدل ہے، اُس کی داد کا کوئی وقت نہ آئے، اس کے اندر جو برے، شریر اور نابکار ہیں، اُن کو کوئی سزا نہ ملے، جو نیک، حق شناس اور عدل شعار ہیں، اُن کو اُن کی نیکیوں کی جزا نہ ملے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ سارا کارخانہ بالکل عبث، بے غایت اور باطل ہے جس کے بنانے والے



الانعام  
۲



قَوْلُهُ الْحَقُّ ط وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ ط عِلْمُ الْغَيْبِ  
وَالشَّهَادَةُ ط وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ④  
وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ إِذْ رَأَى أَنَّهُ اتَّخَذَ أَصْنَامًا إِلَهَةً ۖ إِنِّي أَخَذْتُكَ

کہے گا کہ (حشر برپا) ہو جائے تو ہو جائے گا۔ اُس کی بات شدنی ہے۔ جس دن صور پھونکا جائے گا، اُس دن اُسی کی بادشاہی ہوگی۔ وہ غائب و حاضر، ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے۔ ۹۴-۷۳

انھیں ابراہیم کا واقعہ سناؤ، ۹۵ جب اُس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا: کیا تم بتوں کو

کے نزدیک خیر اور شر، ظلم اور عدل، حق اور باطل میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ یہ بات انسان کی عقل و فطرت کسی طرح بھی قبول نہیں کر سکتی، اس لیے کہ جس خالق کی خلقت کے ہر گوشے میں اُس کی حکمت، قدرت، رحمت اور ربوبیت کے آثار موجود ہیں اور اتنی کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ انسان کسی طرح اُن کا احاطہ نہیں کر سکتا، اُس کی نسبت وہ کس طرح یہ باور کر لے کہ اُس کو ہماری نیکی بدی اور ہمارے عدل و ظلم سے کوئی بحث نہیں ہے؟ اگر بحث ہے اور ضرور بحث ہے، اس لیے کہ یہ بحث نہ ہو تو یہ دنیا بالکل کھیل، بلکہ نہایت ظالمانہ کھیل بن کے رہ جاتی ہے تو اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ اس دنیا کے لیے ایک یوم انصاف آئے جس میں خدا کی کامل رحمت اور اُس کی کامل حکمت ظاہر ہو اور ہر نیکی اپنا صلہ پائے اور ہر بدی اپنی سزا۔“

(تذکر قرآن ۸۳/۳)

۹۴ اس لیے ضروری ہے کہ اُس کا ہر فیصلہ عدل و حکمت پر مبنی ہو۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی مغالطے میں پڑ جائے یا کسی باطل کو حق اور حق کو باطل بنادے۔ اُس کے عدل و حکمت اور علم و خبر میں کوئی نقص نہیں ہے کہ اس طرح کی کوئی چیز اُس سے صادر ہو جائے۔

۹۵ آگے دوسرے نبیوں کا بھی ذکر ہے، لیکن ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ خاص اہتمام کے ساتھ اس لیے سنایا جا رہا ہے کہ بنی اسمعیل بھی انھیں اپنا خاندانی بزرگ اور مذہبی پیشوا مانتے تھے





الانعام  
۶

وَقَوْمَكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۴۳ وَكَذٰلِكَ نُرِيْ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتِ  
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُوقِنِيْنَ ۝۴۴

معبود بنائے بیٹھے ہو؟ میں تو تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی گم راہی میں دیکھ رہا ہوں۔  
ابراہیم کو ہم اسی طرح زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مشاہدہ کراتے تھے تاکہ وہ اپنی  
قوم پر حجت قائم کرے اور خود بھی اُن لوگوں میں سے ہو جائے جو پورا یقین رکھنے  
والے ہوں۔ ۹۸-۷۴-۷۵

اور بنی اسرائیل بھی۔ پھر دونوں یہ دعویٰ بھی رکھتے تھے کہ جس دین پر وہ اس وقت عمل پیرا ہیں، اُس  
کی وراثت اُنھوں نے سیدنا ابراہیم ہی سے پائی ہے۔

۹۶ یہود کے مذہبی لٹریچر کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آزر صرف بت پرست ہی نہیں،  
بت گر اور بت فروش بھی تھے۔ قرآن نے اپنے عام اسلوب کے خلاف اُن کے نام کی تصریح غالباً  
اس لیے کی ہے کہ وہ اُس اختلاف کو رفع کرنا چاہتا ہے جو یہود و نصاریٰ کے ہاں اس نام کے  
بارے میں پایا جاتا ہے۔

۷۷ اصل الفاظ ہیں: 'كَذٰلِكَ نُرِيْ اِبْرٰهِيْمَ'۔ یہ دراصل 'كُنَّا نُرِيْ اِبْرٰهِيْمَ' ہے۔ عربی  
زبان کے عام اسلوب کے مطابق فعل ناقص حذف ہو گیا ہے۔ ملکوت الہی کا یہی مشاہدہ ہے جس  
سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو اُس دلیل و حجت کی طرف رہنمائی دی جو اُنھوں نے اپنی قوم پر  
قائم فرمائی۔ اُن کی اس حجت کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ یہ جملہ اُسی کی تمہید ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اس  
ملکوت الہی کا مشاہدہ اُس نظر سے کرتے تھے جو درختوں کے ایک ایک پتے، زمین کے ایک ایک  
ذرے اور آسمان کے ایک ایک تارے کو معرفت کردگار کا دفتر بنادیتی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:  
”جہاں تک غور کرنے کا تعلق ہے، اس ملکوت پر غور تو ایک سائنس دان بھی کرتا ہے، لیکن وہ  
سارا غور و فکر اپنی ذات یا اپنے محدود ماحول کو محور بنا کر کرتا ہے۔ اُس کی نگاہ صرف اپنے نفع



عاجل پر ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ اُن حقائق تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا جو اُس کی نگاہ کو اُس کے مطلوب نفع عاجل سے ہٹا دیں۔ وہ چمن میں کھلے ہوئے گلاب کو اس نگاہ سے دیکھتا ہے کہ اُس سے گل قند یا اسی طرح کی کوئی اور چیز تیار ہو سکتی ہے جس سے فلاں فلاں فائدے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اس چکر میں نہیں پڑتا کہ اُس پھول کے حسن و جمال، اُس کی رعنائی و دل کشی، اُس کی عطر بیزی و مشام نوازی میں اُس کے صانع کی قدرت، کاری گری، حکمت، رحمت اور ربوبیت کے جلوے دیکھنے کی کوشش کرے اور ان جلووں سے بے خود ہو کر پھول سے گزر کر پھول کے پیدا کرنے والے کے جمال و کمال کے مشاہدے میں غرق ہو جائے:

اے گل بتو خرسندم تو بویے کسے داری

حالاں کہ ایک صاحب نظر کے لیے پھول کا یہی پہلو زیادہ جاذب نظر ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر پھول سے مقصود صرف گل قند ہی ہوتا تو صرف اس مقصد کے لیے اُس کی ایک ایک پتھڑی پر قدرت کو اس فیاضی کے ساتھ گل کاری کی کیا ضرورت تھی؟ یہ گل کاری اور صنعت گری تو اسی لیے فرمائی گئی ہے کہ پھول کی ایک ایک پتی معرفت کردگار کے دفتر کا کام دے۔“

(تذبرقرآن ۹۰/۳)

۹۸ اس جملے کا معطوف علیہ اصل میں محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔ آگے کی آیتوں میں تِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ کے الفاظ سے اُس کا تعین ہو جاتا ہے۔ اس میں جس یقین کا ذکر ہے، وہ ایمان سے اوپر کا درجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں: ”...ایمان ایک عام چیز ہے جس کے لیے اگر فطرت سلیم ہو تو اندر کا وجدان بھی کافی ہوتا ہے، لیکن یقین فکر و نظر، تفکر و تدبر اور ملکوت الہی کے علم و مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے۔ اُس کے مراتب و مدارج کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ چنانچہ آگے نَرْفَعُ دَرَجَتٍ مِّنْ نَّشَأُ میں اُسی کے مراتب عالیہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ یہی یقین جب ایمان کے اندر پیدا ہوتا ہے، تب اُس کا فیضان متعدی ہوتا ہے، یہاں تک کہ بسا اوقات اُس سے دشت و جبل گونج اٹھتے ہیں۔“ (تذبرقرآن ۹۲/۳)





الانعام  
۶

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاكَوْكَبًا ۚ قَالَ هَذَا رَبِّي ۚ فَلَمَّا أَفَلَ  
قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ ﴿٩٩﴾ فَلَمَّا رَا الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَذَا رَبِّي ۚ فَلَمَّا  
أَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ ﴿١٠٠﴾

چنانچہ<sup>۹۹</sup> (ایک دن) جب اُس پر رات طاری ہوئی تو اُس نے تارا دیکھا (اور لوگوں کو متوجہ دیکھ کر) کہا: یہ میرا رب ہے۔ پھر (اسی طرح کے ایک موقع پر) جب تارا ڈوب گیا تو اُس نے کہا: میں (خدائی کے لیے) اُن کو پسند نہیں کر سکتا جو ڈوب جاتے ہیں۔ پھر (ایک دن) جب چاند کو چمکتے دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے۔ لیکن جب وہ بھی

۹۹ یہاں سے آگے اب اُس حجت ابراہیمی کا بیان ہے جو آں جناب نے زمین و آسمان میں ملکوت الہی کے مشاہدے سے اخذ کر کے اپنی قوم کے سامنے پیش فرمائی۔ اس میں بناے استدلال یہ حقیقت ہے کہ جن چیزوں کو معبود سمجھ کر لوگ اُن کی پرستش کرتے ہیں، وہ سب محکوم و مقہور، اپنی تقدیر کے پابند اور اپنے خالق کے احکام و قوانین کے تحت مسخر ہیں۔ اُن میں سے کوئی چیز ان احکام و قوانین سے سرمو انحراف نہیں کر سکتی۔

۱۰۰ اصل میں یہ بات کہنا مقصود تھی، لیکن ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے مزاج کی رعایت سے استدراج کا طریقہ اختیار فرمایا۔ چنانچہ کسی مجلس میں پہلے ایک دن خود اپنے آپ کو مخاطب کر کے وہ بات کہی جس سے اُن کی ستارہ پرست قوم کسی حد تک مطمئن ہو گئی کہ ہمارے معبودوں سے بے زار یہ شخص بھی اب شاید کچھ مان لینے پر آمادہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اپنی قوم کے کانوں میں یہ بات ڈال کر وہ کچھ دن خاموش رہے۔ پھر کسی دن صبح کے وقت جب تارے ڈوب گئے تو خود کلامی کے اُسی انداز میں دوسروں کو سناتے ہوئے اُنھوں نے فرمایا کہ میں ڈوب جانے والوں کو خدائی کے لیے پسند نہیں کر سکتا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ طلوع کے بعد ان ستاروں کے غروب کو بھی دیکھو۔ یہ اپنے وجود سے شہادت دے رہے ہیں کہ انھیں جس قانون کا پابند بنایا گیا



فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسُ بَارِغَةً قَالَ هَذَا رَبِّي هَذَا أَكْبَرُ فَلَمَّا أَفَلَتْ  
قَالَ يَقَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ۝ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي

ڈوب گیا تو اُس نے کہا: اگر میرے پروردگار نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گم راہ لوگوں میں سے ہو کر رہ جاؤں گا۔ پھر (ایک دن) جب سورج کو چمکتے دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے۔ لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو اُس نے (اپنی قوم کو مخاطب کر کے) کہا: میری قوم کے لوگو، میں اُن سب سے بری ہوں جنہیں تم (خدا

ہے، اُس سے ذرہ برابر تجاوز نہیں کر سکتے۔ اس لیے کوئی عاقل انہیں اپنا معبود کیسے بنا سکتا ہے؟ یہ منصب تو اُسی کے شایان شان ہے جو حق و قیوم اور قدیم و لایزال ہو۔

۱۰۱۔ اس میں تعلیم کا قدم مزید آگے بڑھ گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہاں صرف اتنی ہی بات نہیں ظاہر ہوئی کہ ڈوبنے والے سزاوار عبادت نہیں، بلکہ یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ ان ڈوبنے والوں کو معبود بنانا کھلی ہوئی ضلالت ہے۔ نیز یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ یہ ضلالت کوئی معمولی چیز نہیں ہے، بلکہ بڑے حسرت و اندوہ کی چیز ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ ہدایت کا سرچشمہ صرف خدا ہے، وہ ہدایت نہ بخشے تو انسان ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اُس کے درپے ہو جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں حضرت ابراہیم نے چونکہ اپنے آپ سے کہیں، اس وجہ سے سننے والوں میں سے جس کے کان میں پڑی ہوں گی، اُس کے لیے ان سے چڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی، بلکہ جس کے اندر کچھ بھی غور و فکر کی صلاحیت رہی ہوگی، وہ اس سوچ میں پڑ گیا ہوگا کہ ایک یہ شخص ہے جو طلب ہدایت میں اس طرح بے قرار ہے اور ایک ہم ہیں کہ پتھر کی طرح اپنی جگہ سے کھسکنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔“

(تدبر قرآن ۹۵/۳)

۱۰۲۔ صاف واضح ہے کہ یہ بات اُنھوں نے طنز، تحقیر اور استہزا کے طور پر کہی ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ خاص مزاج ہے۔ دوسروں کو مشتعل کیے بغیر اپنی بات اُن تک پہنچانے کے



## فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٤٩﴾

کے) شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے یک سو ہو کر اپنا رخ اُس ہستی کی طرف کر لیا ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں<sup>۱۰۳</sup>۔ ۷۶-۷۹



الانعام  
۶

لیے تور یہ، استدراج اور پاکیزہ ظرافت کے یہ انداز وہ بالعموم اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی اسلوب اُس جملے میں بھی ہے جو بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد انھوں نے اپنی قوم کی پوچھ گچھ کے جواب میں فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... انبیاء کے طریقہ کار اور خطاب و استدلال میں استدراج، مزاح، طنز، تور یہ اور تدریج وغیرہ کے انداز جو کہیں کہیں پائے جاتے ہیں، یہ سب انسانی فطرت کے مقتضیات پر مبنی ہیں۔ ان میں سے ہر اسلوب کا ایک محل ہوتا ہے اور ہر انداز اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ بسا اوقات ایک وقفہ جو بظاہر ٹھہراؤ ہوتا ہے، سفر کی ہزاروں منزلیں طے کر دیتا ہے اور ایک دل آویز طنز جو بظاہر طنز ہوتا ہے، ہزاروں حجتوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۹۹/۳)

۱۰۳۔ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ کے جو الفاظ آیت میں آئے ہیں، اُن میں 'لِلَّذِي' کلام دلیل ہے کہ 'وَجَّهْتُ' کا لفظ یہاں 'اُسلمت' کے مضمون پر بھی مشتمل ہے۔ قوم کو مخاطب کیے بغیر ایک تدریج کے ساتھ اپنی بات اُس کے کانوں میں ڈالنے کے بعد اب اُس کو مخاطب کر کے ابراہیم علیہ السلام نے براہ راست اپنے عقیدے کا اعلان فرمایا ہے۔ یہ درحقیقت اسلام اور توحید کی دعوت ہے جو اس اسلوب میں پیش کی گئی ہے۔ اوپر جس یقین کا ذکر تھا، یہ اُسی یقین کا اظہار ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ بتا رہا ہے کہ یہ اعلان کس اذعان اور کس شدت احساس کے ساتھ کیا گیا ہے۔ غروب آفتاب سے جب اُن کے سب سے بڑے معبود کی حقیقت بھی واضح ہو گئی تو یہی موقع تھا کہ یہ دعوت اُن کے سامنے پیش کی جائے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، جن کی خدائی کی دلیل اُن کے وقتی کروفر ہی سے اخذ کی گئی ہو، اُن کی بے ثباتی اور ناپائیداری پر



وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ<sup>ط</sup> قَالَ أَتُحَاجُّونِي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ<sup>ط</sup> وَلَا  
أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا<sup>ط</sup> وَسِعَ رَبِّي كُلَّ

اُس کی قوم (اس بات پر) اُس سے جھگڑنے لگی۔ اُس نے جواب دیا: کیا تم اللہ کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو، دراصل حالیکہ اُس نے میری رہنمائی فرمائی ہے؟ میں اُن سے نہیں ڈرتا جنہیں تم اُس کا شریک ٹھیراتے ہو۔ ہاں، اگر میرا پروردگار ہی کچھ

سب سے موثر تقریر کا وقت وہی ہوتا ہے، جب اُن کی لاش اُن کے پرستاروں کے سامنے پڑی ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے ٹھیک اسی موقع کا انتخاب کیا۔ اُن کی اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ معبود وہی ہو سکتا ہے جو زمین و آسمان کا خالق ہو۔ انسان اپنے آپ کو اُسی کے حوالے کر سکتا ہے۔ جو خود فراخی افلاک میں خوار و زبوں ہیں، وہ کسی کو کیا دیں گے اور کوئی اپنے آپ کو اُن کے حوالے کیوں کرے گا؟ اس لیے توحید پر ایمان کے ساتھ یہ اعلان بھی ضروری ہے کہ بندہ مومن ہر شرک سے بری ہے اور وہ کبھی مشرکین میں سے نہیں ہو سکتا۔

۱۰۴۔ یعنی اُس اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو جسے تم بھی مانتے ہو کہ زمین و آسمان کا خالق ہے۔ یہ اُنہوں نے اس لیے فرمایا کہ اُن کی قوم خدا کی منکر نہ تھی، بلکہ اُس دور کی تمام دوسری قوموں کی طرح اُس کے شریک ٹھیراتی تھی۔ جملے کا آخری حصہ بتا رہا ہے کہ یہ تمام واقعہ نبوت کے بعد کا ہے۔

۱۰۵۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دلیل کا جواب دلیل سے دینے کے بجائے اُن کی قوم نے اپنے اوہام سے اُنہیں ڈرانا شروع کر دیا۔ ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے یہ اُنھی ڈراؤوں کا جواب ہے۔ یہ ڈراؤے کیا ہو سکتے تھے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...شرک کی بنیاد... چونکہ تمام تر خوف اور وہم پرستانہ اندیشوں پر ہوتی ہے، اس وجہ سے قوم





الانعام  
۶

شَيْءٍ عِلْمًا ۖ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ﴿٨٠﴾ وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ  
وَلَا تَخَافُونَ ۚ إِنَّكُمْ أَشْرَكْتُمْ بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا  
فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ ۚ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٨١﴾ الَّذِينَ  
آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ

چاہئے۔ میرے پروردگار کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ پھر کیا تم دھیان نہیں کرتے؟ اور میں اُن چیزوں سے کیسے ڈروں جنہیں تم شریک ٹھیراتے ہو، جب کہ تمہارا حال یہ ہے کہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اُن چیزوں کو اللہ کا شریک بنا رکھا ہے جن کے حق میں اُس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ سو (بتاؤ کہ) ہم دونوں فریقوں میں سے کون امن و اطمینان کا زیادہ مستحق ہے، اگر تم جانتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ امن و اطمینان تو اُنھی کے لیے ہے جو ایمان لائے اور اُنھوں نے اپنے ایمان

کے لوگوں نے طرح طرح سے اُن کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا کہ معبودوں سے نفرت و بغاوت کا اعلان کرتے ہو تو اُن کی پکڑ میں آ جاؤ گے، اندھے ہو جاؤ گے، اپاہج ہو جاؤ گے، تم پر بجلی گرے گی، بری موت مرو گے۔“ (تدبر قرآن ۹۶/۳)

۱۰۶۔ یہ استثنا تفویض الی اللہ کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں، خدا کے اعتماد پر کہہ رہا ہوں۔ میرا ارادہ چاہے جتنا پاک اور عزم جتنا سچا ہو، اُس کی تکمیل اگر ہو سکتی ہے تو اُسی پروردگار کی توفیق سے ہو سکتی ہے۔ ہر راستے کی اپنی آزمائشیں ہیں اور بندہ مومن ان آزمائشوں میں اُس کی مدد اور توفیق کے بغیر کسی طرح پورا نہیں اتر سکتا۔

۱۰۷۔ اس لیے مجھے یہ اندیشہ بھی نہیں ہے کہ اُس کی لاعلمی میں کوئی مجھے نقصان پہنچا دے گا۔

۱۰۸۔ یعنی خدا کے غضب اور اُس کے قہر سے ڈرنا تو تمہیں چاہیے کہ اُس کی سند کے بغیر اُس کے شریک ٹھیراتے اور اُس پر جھوٹ باندھتے ہو۔



وَهُمْ مُّهْتَدُونَ ﴿٨٢﴾

وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ ۖ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ  
مِّنْ نَّشَأٍ ۖ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿٨٣﴾ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ  
كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن قَبْلُ ۚ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ

کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا اور وہی راستہ پانے والے ہیں۔ ۸۲-۸۰

یہ تھی ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیم کو عطا فرمائی کہ اپنی قوم پر قائم کرے۔ ہم  
جس کو چاہتے ہیں، اُس کے درجے پر درجے بلند کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا  
پروردگار حکیم و علیم ہے۔ (پھر یہی نہیں)، ہم نے ابراہیم کو اسحق اور یعقوب عنایت  
فرمائے۔ اُن میں سے ہر ایک کو ہم نے ہدایت بخشی۔ اِس سے پہلے یہی ہدایت ہم  
نے نوح کو بخشی تھی اور (ابراہیم کے بعد) اُس کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان،

۱۰۹۔ اِس سے مراد وہی شرک ہے جس میں ابراہیم علیہ السلام کی قوم مبتلا تھی۔

۱۱۰۔ یہ قرآن نے خود واضح کر دیا ہے کہ اوپر نجوم و کواکب اور مہ و آفتاب کے طلوع و غروب  
کے حوالے سے جو کچھ کہا گیا ہے، وہ ابراہیم علیہ السلام کا اپنا کوئی فکری ارتقا نہیں، بلکہ اُن کے  
استدلال کا بیان ہے جو انھوں نے توحید کی دعوت کے لیے اختیار فرمایا۔ آیت میں 'عَلَىٰ قَوْمِهِ'  
کے الفاظ اِس پر صریح دلیل ہیں۔

۱۱۱۔ اصل میں لفظ 'دَرَجَاتٍ' آیا ہے۔ یہ جمع بھی ہے اور اِس پر تنوین بھی ہے۔ ہم نے ترجمے  
میں یہ چیزیں ملحوظ رکھی ہیں۔

۱۱۲۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہ چاہنا اہل ٹپ نہیں ہوتا، بلکہ ہمارے علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔  
ہم اپنے قرب کے یہ مدارج اُنھی کو عطا فرماتے ہیں جو اِن کے اہل ہوتے ہیں۔





الانعام  
۶

وَيُؤَيِّبُ وَيُؤَسِّفُ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ ط وَكَذٰلِكَ نَجْزِي  
الْمُحْسِنِينَ ﴿٨٣﴾ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيسٰى وَإِلْيَاسَ ط كُلٌّ  
مِّنَ الصّٰلِحِينَ ﴿٨٤﴾ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِلْيَاسَ وَيُونُسَ وَلُوطًا ط وَكَلَّا فَضَّلْنَا  
عَلَى الْعٰلَمِينَ ﴿٨٥﴾ وَمِنۡ اٰبَائِهِمْ وَذُرِّيَّتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ  
وَهَدَيْنَاهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٨٦﴾ ذٰلِكَ هُدٰى اللّٰهُ يَهْدِىۤ اِلَيْهِ  
مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهِ ط وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٨٧﴾

ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی۔ ہم نیکوکاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔  
اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو بھی۔ یہ سب نیکوکاروں میں سے تھے۔ اور اسمعیل،  
یسع، یونس اور لوط کو بھی۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت عطا فرمائی  
تھی۔ نیز ان کے آبا و اجداد، ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں کو بھی ہم نے اپنی  
ہدایت سے نوازا، انھیں برگزیدہ کیا اور (توحید کی اسی) صراط مستقیم کی طرف ان کی  
رہنمائی فرمائی تھی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے۔ اپنے بندوں میں سے وہ جسے چاہتا ہے،

۱۱۳۔ یہی وہ پیغمبر ہیں جن کا ذکر بائبل کے مجموعہ صحائف میں ایلیا کے نام سے ہوا ہے۔

۱۱۴۔ اس سے ملتے جلتے نام کے جن دو پیغمبروں کا ذکر بائبل میں ہوا ہے، ان میں سے الیشع  
قرآن کے تلفظ سے قریب تر ہے۔ ان کا زمانہ ۱۳ ق م بتایا جاتا ہے۔ دوسرے یسعیاہ ہیں جن کا  
زمانہ ۶۲۰ ق م بتایا گیا ہے۔

۱۱۵۔ یہ اُسی عمومی فضیلت کا ذکر ہے جو انبیاء علیہم السلام کو ان کے منصب کے لحاظ سے تمام  
انسانوں پر حاصل ہوتی ہے۔

۱۱۶۔ یہ لفظ اصل میں نکرہ آیا ہے، لیکن اس کی تنکیر تفسیر شان کے لیے ہے۔



أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ ﴿٨٩﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهِدَاهُمْ اِقْتَدِهٖ ۖ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ

(اپنے قانون کے مطابق) اس سے سرفراز فرماتا ہے۔ لیکن اگر کہیں یہ لوگ بھی شرک میں مبتلا ہو گئے ہوتے تو ان کا سب کیا کرایا ان سے اکارت ہو جاتا۔ یہی لوگ تھے جنہیں ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی۔ سو تمہارے یہ مخاطبین اس کا انکار کریں گے تو کچھ پروا نہیں کہ ہم نے یہ نعمت کچھ اور لوگوں کے سپرد کر دی ہے جو اس کے منکر نہیں ہوں گے۔ (علم نبوت کے جن حاملین کا ہم نے ذکر کیا ہے)، وہی تھے جو اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے، سو انہی کے طریقے کی پیروی کرو۔ ان لوگوں

۷۱ یعنی اس مرتبے کے لوگ بھی اگر کہیں شرک میں مبتلا ہو جاتے تو ان کا انجام یہی ہوتا۔  
استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مجرد اس بنیاد پر ان کی برگزیدگی قائم نہ رہتی کہ یہ نوح یا ابراہیم کی اولاد ہیں۔ یہ تنبیہ اہل عرب کے لیے بھی ہے اور بنی اسرائیل کے لیے بھی کہ توحید سے منحرف ہو کر جو لوگ مجرد اُس نسبت پر برگزیدگی کے خواب دیکھ رہے ہیں جو انہیں ابراہیم کی اولاد ہونے کے سبب سے حاصل ہے، وہ نری حماقت میں مبتلا ہیں۔ یہ تو درکنار اگر وہ بھی شرک میں آلودہ ہو جاتے تو خدا کے ہاں اُن کا بھی کوئی وزن باقی نہ رہ جاتا۔“ (تدبر قرآن ۱۰۲/۳)

۱۱۸ اس سے مراد وہ اختیار و اقتدار ہے جو ان بزرگوں کو کسی نہ کسی حیثیت سے حاصل رہا اور جس کی بنا پر یہ موقع انہیں حاصل ہوا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق تمام معاملات کے فیصلے کتاب الہی کے مطابق کریں۔

۱۱۹ اصل میں وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں ’ب‘ اس بات کا قرینہ ہے



## إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ⑨

سے، البتہ کہہ دو کہ میں اپنی اس دعوت پر تم سے کوئی صلہ نہیں چاہتا (کہ نہیں مانو گے تو میرا کوئی نقصان ہو جائے گا)۔ یہ تو محض ایک یاد دہانی ہے تمام دنیا والوں کے لیے ۸۳-۹۰



الانعام  
۶

کہ 'وَوَكَّلْنَا' کے لفظ میں ذمہ دار بنائے جانے کے ساتھ امین اور ضامن بنائے جانے کا مفہوم بھی شامل ہو گیا ہے۔ 'قَوْمًا' سے صحابہ کرام کی وہ جماعت مراد ہے جو شراب سے آکر اس ہدایت سے بہرہ یاب ہوئی اور جس کی نصرت سے ایک ایسی قوم پیدا ہوئی جو پورے عالم کے لیے دعوت توحید کی علم بردار بن گئی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس ٹکڑے میں صحابہ کی استقامت اور مستقبل میں امت کی کثرت کی پیشین گوئی ہے اور اس پہلو سے یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عظیم بشارت ہے جو اُس دور میں آپ کو دی گئی، جب آپ مخالفتوں کے طوفان سے گزر رہے تھے۔ الفاظ سے تقدیر الہی کا وہ اٹل فیصلہ بھی مترشح ہو رہا ہے جو اس دعوت کو فتح مند کرنے کے لیے ہو چکا ہے اور یہ اشارہ بھی نکل رہا ہے کہ اللہ نے اپنے جن بندوں کو اس کے لیے کھڑا کر دیا ہے، اُن کی قلت تعداد پر نہ جاؤ، یہی لوگ اس دعوت کے علمبردار ہوں گے اور یہی قطرے ایک دن سمندر بنیں گے۔“  
(تدبر قرآن ۳/۱۰۳)

۲۰۔ اصل میں لفظ 'ذِکْرٌ' استعمال ہوا ہے۔ یہ قرآن کے لیے آیا ہے اور دو حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... ایک تو اس حقیقت کی طرف کہ وہ جو کچھ پیش کر رہا ہے، وہ کوئی اوپری اور انوکھی بات نہیں ہے، بلکہ اُنھی حقائق کی یاد دہانی ہے جو انسانی فطرت کے اندر ودیعت ہیں، لیکن لوگوں نے اُن کو اپنی خواہشات و بدعات کے نیچے دبا دیا ہے۔ دوسرے اس حقیقت کی طرف کہ یہ اُسی ہدایت الہی کی یاد دہانی کر رہا ہے جس کو نوح، ابراہیم اور تمام انبیاء لے کر آئے، لیکن اُن کے



وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِذْ قَالُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِّن شَيْءٍ ۖ قُلْ مَنْ أَنزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَىٰ نُورًا وَهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ يُبَدُّونَهَا وَتُخْفُونَ كَثِيرًا

حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی صحیح قدر نہیں پہچانی، جب انہوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے کسی انسان پر کچھ نازل نہیں کیا۔<sup>۱۲۱</sup> ان سے پوچھو، پھر اُس کتاب کو کس نے نازل کیا تھا جس کو موسیٰ لے کر آئے تھے، جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی، جس کو ورق ورق کر کے اُنھیں دکھاتے اور زیادہ کو چھپا لیتے ہو اور<sup>۱۲۲</sup> (جس کے

ساتھ نسبت کے مدعیوں نے اس ہدایت الہی کی جگہ مختلف ناموں سے مختلف ضلالتیں ایجاد کر لیں اور اُنھی ضلالتوں کو اپنے بزرگوں کا دین سمجھ بیٹھے۔ قرآن اپنی اس تذکیر سے تاریخ کے فراموش کردہ اوراق کو بھی یاد دلارہا ہے اور فطرت کے فراموش کردہ اسباق کو بھی۔ پس جس کا جی چاہے، اُس سے فائدہ اٹھائے۔“ (تدبر قرآن ۱۰۴/۳)

۱۲۱ آگے کے مضمون سے واضح ہے کہ یہ قول یہود کا ہے جو اُس زمانے میں قریش کو شہ دے رہے اور طرح طرح کے اعتراضات القا کر رہے تھے۔ اُن کے ذہن میں بات تو یہ رہی ہوگی کہ تورات کے بعد کسی نئی کتاب اور نئی شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہی، اس لیے اللہ اب کسی انسان پر کچھ نازل نہیں کرے گا، لیکن اُنھوں نے بات اس طرح کہی جس سے عربوں کی قومی حمیت بھی نہ بھڑکے اور اُن کا مقصد بھی حاصل ہو جائے۔ قرآن نے پہلے اُن کے اس قول کے ظاہر کو سامنے رکھ کر تبصرہ کیا کہ جو لوگ خدا کو اپنی مخلوقات سے اس قدر بے تعلق سمجھیں کہ اُن کے اندر طلب ہدایت کا نہایت قوی داعیہ پیدا کر کے اُس نے اس داعیے کا کوئی جواب نہیں دیا، اُن کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ صدیوں تک دین و شریعت کا حامل رہنے کے باوجود اُنھوں نے خدا کی قدر نہیں پہچانی اور اُس علیم و حکیم ہستی کے بارے میں نہایت غلط اندازہ قائم کیا ہے۔





الانعام  
۶

وَعَلَّمْتُمْ مَالَكُمْ تَعْلَمُوا أَنْتُمْ وَلَا آبَاؤُكُمْ قُلِ اللَّهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ  
فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ ⑨ وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ مُصَدِّقٌ

ذریعے سے) تمہیں وہ علم دیا گیا جسے نہ تم جانتے تھے نہ تمہارے باپ دادا؟ کہہ دو،  
اللہ ہی نے، پھر انہیں ان کی کج بختیوں میں چھوڑ دو، کھیلتے رہیں۔ یہ (اُسی کتاب کی

۱۲۲۔ یہود نے تورات کی جو ناقدری کی یہ اُس کا اظہار بھی ہے اور اُن کی بات کے باطنی پہلو کا  
جواب بھی کہ خدا کی کتاب کے ساتھ جو سلوک اُنہوں نے کیا ہے، اُس کے بعد تو ناگزیر ضرورت  
تھی کہ ایک نئی کتاب اور نئی شریعت نازل کی جائے تاکہ لوگ تاریکی سے نکل کر روشنی میں آئیں اور  
گم راہی سے نجات حاصل کر لیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہود نے تورات اُس شکل میں جمع نہیں کی تھی جس شکل میں مسلمانوں نے قرآن کو مابین  
الدفتین جمع کیا، بلکہ اُنہوں نے اُس کو مختلف اجزا میں تقسیم کر لیا تھا اور ہر جز کو الگ الگ قلم بند  
کیا تھا۔ اس طرح اُن کو اُس کی اُن تعلیمات اور پیشین گوئیوں کے چھپانے کا آسانی سے موقع  
مل جاتا تھا جن کو وہ اپنی خواہشات اور مصالح کے خلاف پاتے۔ جب ایک کتاب کے اجزا  
الگ الگ کراسوں کی شکل میں ہوں اور اُس پر اجارہ داری بھی مخصوص ایک گروہ کی ہو تو وہ بڑی  
آسانی سے یہ کر سکتا ہے کہ اُس کے جس جز کو چاہے، اپنے مخصوص حلقے سے باہر کے لوگوں کے  
علم میں نہ آنے دے۔ قرآن نے یہود پر کتاب الہی کے اخفا کا جو جرم عائد کیا ہے، اُس کی  
ایک نہایت سنگین شکل یہ بھی تھی اور قرآن کے انداز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح  
کتاب الہی کا زیادہ حصہ یہود نے چھپا لیا تھا، صرف اُس کا تھوڑا حصہ وہ ظاہر کرتے تھے، اس  
لیے کہ بُبْدُونَهَا وَتُخْفُونَ کَثِيرًا کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جو حصہ چھپایا جاتا  
تھا، وہ زیادہ تھا۔ اس کے معنی لازماً یہ بھی ہوئے کہ جو حصہ ظاہر کیا جاتا تھا، وہ تھوڑا تھا۔“

(تدبر قرآن ۱۰۸/۳)

۱۲۳۔ پہلے محض اشارہ فرمایا تھا۔ یہاں سے آگے اب قرآن کی مستقل حیثیت واضح کی جا رہی



الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَهُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿٩٢﴾

طرح) ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے، بڑی خیر و برکت والی ہے، جو کچھ اس سے پہلے آچکا ہے، اُس کی تصدیق کرتی ہے، اُس لیے کہ تم اس کے ذریعے سے لوگوں کو خوش خبری دو اور اس لیے کہ اُنھیں متنبہ کر دو جو ام القریٰ اور اُس کے گرد و پیش کے رہنے والے ہیں۔ (تم مطمئن رہو)، جو آخرت کو مانتے ہیں، وہی اسے مانیں گے اور وہی اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ ۹۱-۹۲

ہے کہ اس کتاب کے نزول کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔

۱۲۴ یہ اُس عالمگیر خیر و برکت کی طرف اشارہ ہے جس کا ظہور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ پر قرآن کے نزول سے ہوا اور جس کی بشارت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اُس وقت دے دی گئی تھی، جب وہ خدا کے حکم پر اپنے بیٹے کو قربان کر دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ بائبل کی کتاب پیدائش میں ہے:

”خداوند فرماتا ہے: چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے، دریغ نہ رکھا، اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا... اور تیری نسل کے وسیلے سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔“

(۱۸-۱۶:۲۲)

۱۲۵ یعنی اُن پیشین گوئیوں کی مصداق ہے جو اس کے متعلق پچھلے صحیفوں میں موجود ہیں اور اس لیے نازل کی گئی ہے کہ اُس پورے سلسلہ نبوت کی صداقت پر ایک برہان قاطع بن جائے جو تورات کے نزول سے لے کر اب تک جاری رہا ہے۔

۱۲۶ اس کا عطف اُس مفہوم پر ہے جو پہلے جملے سے نکلتا ہے۔ وضاحت قرینہ کی بنا پر اصل میں





الانعام  
۶

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ قَالَ أُوحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ وَمَنْ قَالَ سَأُنْزِلُ مِثْلَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ ط وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُو أَيْدِيهِمْ

اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹی تہمت باندھے یا کہے کہ میری طرف وحی آئی ہے، دراصل حالیکہ اُس کی طرف کوئی وحی نہ آئی ہو اور اُس سے بڑھ کر جو دعویٰ کرے کہ میں بھی اُس جیسا کلام نازل کیے دیتا ہوں، جیسا خدا نے نازل کیا ہے؟ اور کبھی تم دیکھتے، جب یہ ظالم موت کی بے ہوشیوں میں ہوں گے اور فرشتے

اُسے حذف کر دیا ہے۔ قرآن کی یہ ضرورت قریش کے تعلق سے بیان ہوئی ہے، جن پر اتمام حجت کے لیے اُسے نازل کیا گیا اور جس کے نتیجے میں پورے عالم کے لیے اُس عظیم خیر و برکت کا ظہور ہوا جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔

۱۲۷۔ یہ اشارہ صالحین اہل کتاب کی طرف ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ اُن کی تعریف کی ہے اور ہر جگہ یہی شناخت بتائی ہے کہ وہ نماز کا اہتمام کرتے اور اُس میں شب و روز آیات الہی کی تلاوت کرتے ہیں۔

۱۲۸۔ یعنی شرک کرے۔ اسے جھوٹی تہمت سے اس لیے تعبیر کیا ہے کہ مشرکین اپنے جی سے معبود گھڑتے اور اُن کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ اُنھیں خدا نے اپنا شریک قرار دیا ہے۔ یہ قریش کا سب سے بڑا جرم تھا۔ چنانچہ اہل کتاب کے مفسدین کا ذکر کرنے کے بعد قرآن نے اُن کی طرف توجہ فرمائی ہے تو سب سے پہلے اُن کے اسی جرم کا ذکر کیا ہے۔

۱۲۹۔ یہ اُن ہفوات کا حوالہ ہے جو قریش کے لیڈر بکتے رہتے تھے تاکہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعوے کا کوئی اثر قبول نہ کریں کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ آپ کی اپنی کوئی بات نہیں، بلکہ خدا کا کلام ہے جو خدا کی طرف سے اُس کے ایک فرشتے کے ذریعے سے نازل کیا



اَخْرِجُواْ اَنْفُسَكُمْۙ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ  
تَقُولُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٩٣﴾  
وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فِرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرْكٰنْتُمْ

ہاتھ بڑھائے ہوئے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ لاؤ، اپنی جانیں حوالے کر دو، آج  
تمہارے اس جرم کی پاداش میں تمہیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا کہ تم اللہ پر ناحق  
تہمت باندھتے تھے اور اُس کی آیتوں سے متکبرانہ اعراض کرتے تھے۔<sup>۱۳۱</sup> لو، بالآخر  
ویسے ہی اکیلے اکیلے ہمارے پاس آ گئے ہو،<sup>۱۳۲</sup> جیسے پہلی مرتبہ ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا۔  
گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی صداقت ظاہر ہوتی ہے تو جن لوگوں کے پندار پر اُس کی زد  
پڑتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اُس کے مقابل میں بے بس محسوس کرتے ہیں تو اسی طرح کی دھونس  
سے وہ اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اُن کے دام فریب میں پھنسے ہوئے عوام اُن  
کی صلاحیتوں سے مایوس ہو کر اُس صداقت کو اختیار نہ کر لیں۔ لیکن اس قسم کی نمائشی اور ادعائی  
شہ زوری اصل حقیقت کے مقابل میں کیا کام دے سکتی ہے اور کتنے دن کام دے سکتی ہے۔  
بالآخر ان زبان کے سورماؤں کو میدان چھوڑ کے بھاگنا پڑتا ہے۔“ (تذبر قرآن ۱۱۱/۳)

۱۳۰ یہ شرط ہے اور آگے اسی کا بیان ہے۔ اس کا جواب اس لیے حذف کر دیا ہے کہ جس  
ہول ناکی کو چشم تصور کے سامنے لانا پیش نظر ہے، وہ الفاظ کی گرفت میں نہیں آ سکتی تھی۔  
۱۳۱ ذلت کا عذاب اس لیے کہ ان متمردین نے خدا اور اُس کے رسول کے مقابلے میں  
سرکشی اور تکبر کا رویہ اختیار کیا۔

۱۳۲ اصل الفاظ ہیں: وَكُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ، عَنْ کا صلد دلیل ہے کہ تَسْتَكْبِرُوْنَ  
کا لفظ یہاں اعراض کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے۔

۱۳۳ پیچھے غائب کا اسلوب تھا۔ اُس کے بجائے حاضر کا یہ اسلوب، اگر غور کیجیے تو اُن کے





الانعام  
۶

مَا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَ كُمُ الَّذِينَ  
زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ ۖ لَقَدْ تَقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ  
مَا كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٩٣﴾

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ

جو کچھ (دنیا میں) تمہیں دیا تھا، وہ سب پیچھے چھوڑ آئے ہو، اور تمہارے ساتھ ہم  
تمہارے اُن سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھ رہے جن کے بارے میں تم سمجھتے تھے کہ  
تمہارے معاملے میں ہمارے شریک ہیں۔ تمہارے سب رشتے ٹوٹ گئے اور جو کچھ  
گمان تم کیے بیٹھے تھے، وہ سب تم سے جاتے رہے ہیں۔ ۹۳-۹۴

دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے۔ وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی

انجام کی ہول ناکی کو اس طرح نگاہوں کے سامنے لے آیا ہے گویا قیامت آگئی اور اُن سے خطاب  
کیا جا رہا ہے۔

۱۳۴ اصل میں 'تَقَطَّعَ بَيْنَكُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں فاعل ہمارے نزدیک حذف  
ہے، یعنی 'تَقَطَّعَ بَيْنَكُمْ الْحَبْلُ'۔

۱۳۵ یعنی ہمارے شریک ٹھہرا کر اور قیامت میں اُنہیں اپنا شفیع سمجھ کر جو گمان کیے بیٹھے تھے،  
وہ سب ہوا ہو گئے۔

۱۳۶ یعنی ایک چھوٹے سے دانے اور چھوٹی سی گٹھلی کو دیکھو، اُسے زمین کی تہوں میں پھاڑ کر  
اُس سے درختوں اور پودوں کی کونپلیں کون نکالتا ہے۔ یہ خدا ہی کی قدرت ہے کہ اُس نے ایک  
ایک بیج اور ایک ایک گٹھلی میں یہ صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ پھر وہی ہے جو اپنی کائنات کی ہر  
چیز کو اُن کی صلاحیتیں بروئے کار لانے کے لیے امر فرماتا ہے۔ اِن سب چیزوں میں کیا اُس کے  
سوا کسی اور کا تصرف دیکھتے ہو؟ ہر گز نہیں، تم بھی جانتے ہو کہ تنہا اللہ ہے جو دانے اور گٹھلی سے لے



وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ط ذَلِكُمُ اللَّهُ فَأَنَّى تُؤْفَكُونَ ﴿٩٥﴾ فَالِقُ

مردہ کو زندہ سے نکال لانے والا ہے۔ یہ ہے اللہ تو کہاں پھرے جاتے ہو؟ وہی صبح ۱۳۸  
کر پوری کائنات پر بلا شرکت غیرے حکومت کر رہا ہے۔ اس میں کسی دوسرے کو اگر ادنیٰ اختیار  
بھی ہوتا تو ان میں سے کوئی چیز نہ وجود پذیر ہو سکتی تھی اور نہ بروے کار آ سکتی تھی۔

۱۳۷ مردہ سے زندہ کو نکالنے کے لیے فعل استعمال ہوا ہے۔ اس سے مقصود تصویر حال ہے،  
لیکن زندہ سے مردہ کو نکالنے کے لیے فاعل کا صیغہ استعمال فرمایا ہے جس میں عزم اور فیصلے کا مفہوم  
بھی شامل ہو گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ کوئی چاہے یا نہ چاہے، خدا زندگی کو موت میں تبدیل کر دیتا  
ہے۔ اُس کا یہ قانون ایسا اٹل ہے کہ زندگی حاصل ہو جانے کے بعد کسی جان دار کو زندگی سے بڑھ  
کر کوئی چیز محبوب نہیں ہوتی، مگر خدا کا فیصلہ نافذ ہو کے رہتا ہے اور وہ اپنی یہ محبوب ترین چیز بھی اُس  
کے حوالے کر دینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ موت اور زندگی کا یہ قانون جس حقیقت کی طرف  
متوجہ کرتا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...آم کی بے جان گٹھلی اور گیہوں کے بے جان دانے سے ہر ابھر درخت اور لہلہاتا ہوا پودا  
پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اسی سبز و شاداب درخت اور لہلہاتے ہوئے پودے پر زردی، خشکی اور مردنی  
طاری ہونی شروع ہوتی ہے، یہاں تک کہ ایک دن وہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہی مشاہدہ ہم انسانوں  
اور حیوانوں میں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ قوموں اور ملتوں کے اندر بھی موت اور زندگی، عروج  
اور زوال کی یہی داستان برابر دہرائی جا رہی ہے۔ ایک قوم پردہ عدم سے نکلتی ہے، ساری دنیا پر  
چھا جاتی ہے اور پھر وہی قوم، ایک دن آتا ہے کہ پردہ عدم میں جا چھپتی ہے۔ موت اور زندگی  
کے اس قانون سے کسی کے لیے مفر نہیں۔ اگر خدا کے سوا کسی اور کا بھی اس کائنات میں مالکانہ و  
خود مختارانہ تصرف ہے تو کسی ایک گوشے ہی میں وہ اس قانون کو باطل کیوں نہیں کر دیتا اور اگر  
خدا سرے سے ہے ہی نہیں، بلکہ یہ سب کچھ مجرد مادے یا کسی اندھی بہری طاقت کا بروز ہے تو  
اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ بروز قائم و دائم رہے، نہ اس میں کبھی انقطاع ہو، نہ اس کے رخ میں  
کوئی تبدیلی واقع ہو، نہ اس پر کوئی تغیر طاری ہو۔“ (تدبر قرآن ۱۱۷/۳)





الْأَصْبَاحُ ۚ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿٩٦﴾ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٩٧﴾

نکالنے والا ہے۔<sup>۱۳۹</sup> رات کو سکون کی چیز اُسی نے بنایا ہے<sup>۱۴۰</sup> اور سورج اور چاند ایک حساب سے رکھے ہیں۔<sup>۱۴۱</sup> یہ اُسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھیرائے ہوئے اندازے ہیں۔<sup>۱۴۲</sup> وہی ہے جس نے تمہارے لیے تارے بنائے تاکہ صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں اُن سے رہنمائی حاصل کرو۔ ہم نے اپنی نشانیاں اُن لوگوں کے لیے

۱۳۸۔ یعنی خدا کی یہ شانیں دیکھتے ہو اور اس کے باوجود اُس کے شر کا بنانے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہو؟

۳۹۔ یعنی جوزمین کے اندر دفن ہونے والے دانے اور گٹھلی کو پھاڑ کر درخت اور سبزہ پیدا کرتا ہے، اُس کی شانیں آسمان میں بھی دیکھو، وہی پردہ شب کو چاک کر کے اُس کے اندر سے صبح کو نمودار کرنے والا بھی ہے۔

۱۴۰۔ اِس سے یہ اشارہ خود بخود نکلا کہ رات انسان کے لیے راحت و سکون کا بستر اِسی لیے بچھاتی ہے کہ اُس کے بعد صبح ہونی ہے جس میں اُسے معاش اور معیشت کی سرگرمیوں میں مصروف ہو جانا ہے۔

۱۴۱۔ یعنی اُن کے لیے ایک ضابطہ اور نظام الاوقات مقرر کیا ہے جس سے وہ آسمان میں ہوتے ہوئے زمین والوں کے لیے موسم پیدا کرتے اور دن، مہینے اور سال معین کرتے ہیں۔

۱۴۲۔ یہ جملہ اس طریقے سے آیا ہے گویا عقل سلیم کے ساتھ اس کائنات پر غور کرنے والے ہر دل کی صدا ہے جو بے اختیار زبان پر آگئی ہے۔



وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ قَدْ  
فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ﴿٩٨﴾ وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ

کھول کر بیان کر دی ہیں جو جاننا چاہیں۔<sup>۱۴۳</sup> وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا ہے، پھر ہر ایک کے لیے ایک جاے قرار ہے اور اُس کے سپرد خاک کیے جانے کی جگہ بھی۔<sup>۱۴۶</sup> ہم نے اپنی نشانیاں اُن لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دی ہیں جو سمجھنا

۱۴۳ اصل الفاظ ہیں: لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ۔ اِن میں فعل ارادہ فعل کے لیے ہے۔ مدعا یہ ہے کہ نشانیاں مانگتے ہو تو دیکھ لو، علم کے سچے طالبوں کے لیے یہ نشانیاں کیا کم ہیں جو ہم نے کھول کر بیان کر دی ہیں۔

۱۴۴ یعنی آدم سے پیدا کیا ہے۔ یہ اب خارجی عالم کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد انسان کو خود اُس کی خلقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ صورت، شکل، زبان اور لہجے کے اختلافات کے باوجود تمہارا وجود اپنے جبلی تقاضوں اور فطری داعیات سے شہادت دیتا ہے کہ تم سب ایک ہی آدم کی اولاد ہو اور تمہارا خالق بھی ایک ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ آیت میں اِس کے لیے لفظ اُنْشَاکُمْ استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف پیدا کرنے کے نہیں ہیں، بلکہ یہ بھی ہیں کہ تمہیں نشوونما بخشی، پروان چڑھایا اور اِس طرح فروغ دیا ہے کہ اُس کی قدرت و حکمت کا ایک معجزہ بن گئے ہو۔

۱۴۵ یعنی رہنے بسنے کی جگہ ہے جس میں وہ اتنے دن لازماً گزارتا ہے جو اُس کے لیے مقدر ہوتے ہیں اور جو رزق لکھا ہوتا ہے، اُس سے متمتع ہو کر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ یہ چیز خود بتاتی ہے کہ جس نے پیدا کیا ہے، یہ مستقر بھی اُسی کا دیا ہوا ہے، اِس میں کسی دوسرے کا کوئی دخل نہیں ہے۔

۱۴۶ اصل میں لفظ مُسْتَوْدَعُ آیا ہے۔ اِس کے معنی ہیں: وہ جگہ جہاں کوئی چیز امانت و



مَاءٌ فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُخْرَجُ  
مِنْهُ حَبًّا مُتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِن طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَجَنَّتٍ  
مِّنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ

چاہیں<sup>۱۴۷</sup>۔ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے ہر چیز کے انکھوے اُس  
سے نکالے، پھر اُس سے سرسبز شاخیں اٹھائیں جن سے ہم تہہ برتہ چڑھے ہوئے دانے  
پیدا کر دیتے ہیں<sup>۱۴۸</sup>۔ اور کھجور کے شکوفوں سے لٹکتے ہوئے گچھے بھی اسی سے پیدا ہوتے  
ہیں<sup>۱۴۹</sup> اور انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار بھی ہم نے اسی سے پیدا کیے ہیں، جن کے  
پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور الگ الگ بھی<sup>۱۵۰</sup>۔ (ان میں سے) ہر ایک

ودیعت کے طور پر حفاظت سے رکھی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ موت کے بعد کہاں رکھے جاؤ گے،  
اُس کی جگہ بھی اُسی پروردگار نے متعین کر رکھی ہے تاکہ جب چاہے، اپنی یہ امانت زمین کی تحویل  
سے واپس مانگ لے۔

۱۴۷ پہلے فرمایا تھا: ”جو جاننا چاہیں“۔ جاننے کی خواہش انسان کو حقائق کی طرف متوجہ کرتی  
ہے اور سمجھنے کی خواہش اُس کے اندر محسوسات سے آگے بڑھ کر دیکھنے کا حوصلہ پیدا کر دیتی ہے۔  
۱۴۸ غائب سے متکلم کی طرف یہ التفات نہایت دل نواز ہے۔ گویا کمال رافت و رحمت سے  
انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے کہ ادھر دیکھو، یہ ہمیں ہیں کہ آسمان کے پانی سے تمہارے لیے کیا  
کچھ پیدا کر دیتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس میں رافت، عنایت اور ربوبیت کا اظہار بھی ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی  
کہ آسمان و زمین اور ابرو ہوا، سب پر ہماری ہی حکومت ہے۔ اگر آسمان پر کسی اور کی حکومت  
ہوتی، زمین پر کسی اور کی تو یہ تو افق کہاں سے ظہور میں آتا کہ آسمان سے پانی برستا اور زمین اپنے  
خزانے اگل دیتی؟“ (تدبر قرآن ۱۲۳/۳)



أَنْظُرُوا إِلَى ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَيَنْعِهِ ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٩٩﴾

کے پھل کو دیکھو، جب وہ پھلتا ہے اور اُس کے پکنے کو دیکھو، جب وہ پکتا ہے۔ اِن کے اندر اُن لوگوں کے لیے بڑی غیر معمولی نشانیاں ہیں جو ماننا چاہتے ہیں۔ ۱۵۳۔ ۹۵-۹۹

۱۴۹۔ یعنی پہلے سرسبز خوشے اور بالیاں نکالتے ہیں، پھر اپنی قدرت و حکمت سے اُن پر تہ برتہ دانے جمادیتے ہیں۔

۱۵۰۔ غلے کے بعد پھلوں کا ذکر فرمایا ہے اور اُن میں سب سے پہلے کھجور کو لیا ہے جو اہل عرب کا عام پھل تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... کھجور کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ اُس کے درخت، اُس درخت کے اندر گانے کا پیدا ہونا اور پھر اُس سے لٹکتے ہوئے بوجھل خوشوں کا ظہور میں آنا، ہر چیز کی طرف توجہ دلا دی ہے تاکہ اُس کاری گری پر انسان کی نظر پڑے جو اُس کے ابتدائے ظہور سے لے کر اُس کی تکمیل اور پختگی تک قدرت اُس پر صرف کرتی ہے۔ اسی کاری گری اور صنعت پر غور کرنے سے انسان کو صانع کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور وہ اُس کی قدرت و حکمت اور اُس کی رحمت و ربوبیت کا کچھ اندازہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت کا منشا ان قدرتوں اور حکمتوں کے اظہار سے یہی ہے کہ انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہو، ورنہ جہاں تک کھجور کی ضرورت مجرد غذا کے لیے ہے، اُس کی فراہمی کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ ایک چھوٹی سی گٹھلی سے درجہ بدرجہ ایک تناور درخت بنے، پھر ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر اُس کے اندر گانے اور خوشے پیدا ہوں، پھر اُن کے اندر ننھی ننھی کیریاں بیٹھیں، پھر وہ درجہ بدرجہ پھل بنیں، پھر پک کر اور بوجھل ہو کر اُن کے خوشے زمین کی طرف لٹک آئیں اور انسان کو زبان حال سے دعوت شوق دیں۔ یہ سارا اہتمام، دل گواہی دیتا ہے کہ اسی لیے ہے کہ انسان پر خدا کی قدرت، اُس کی ربوبیت اور اُس کی حکمت کے اسرار ظاہر ہوں۔“ (تدبر قرآن ۱۲۵/۳)





۱۵۱۔ یہ اہل عرب کے معروف پھل تھے، اس لیے صرف انھی کا ذکر کیا ہے اور ان میں بھی خاص طور پر اُس گونا گونی اور بوقلمونی کی طرف توجہ دلائی ہے جس سے خدا کی ربوبیت، رحمت، فیاضی اور قدرت و حکمت کی شان نمایاں ہوتی ہے۔

۱۵۲۔ اصل الفاظ ہیں: 'أَنْظُرُوا إِلَى ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَيَنْعِهِ'۔ 'يَنْعِهِ' کے بعد 'إِذَا أَثْمَرَ' کے الفاظ عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گئے ہیں۔ 'إِلَى ثَمَرِهِ' میں ضمیر کا مرجع اوپر کی سب چیزیں ہیں، لیکن یہ واحد اس لیے لائی گئی ہے کہ ہر چیز کو الگ الگ لے کر اُس پر غور کرنے کی طرف متوجہ کیا جائے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”فرمایا کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو لے کر اُس کے پھلنے سے لے کر اُس کے پکنے کے مراحل تک ہر مرحلے کو دیکھو اور اُس پر غور کرو تو خالق کی قدرت، حکمت، ربوبیت، صناعت، کاریگری، باریک بینی، فیض بخشی اور اُس کے حسن و جمال کی اتنی نشانیاں اور اتنی شہادتیں تمہارے سامنے آئیں گی کہ تم اُن کو شمار نہیں کر سکو گے۔ تم ایک نشانی اور ایک معجزہ مانگتے ہو، آنکھیں ہوں تو ہر شاخ معجزہ، ہر پھول معجزہ، ہر پھل معجزہ۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے اندر قدرت کے اعجاز کے ہزاروں شاہ کار جلوہ نما نہ ہوں۔ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ دنیا اپنے بقا کے لیے ان تمام عجائب کی نمائش کی محتاج نہ تھی۔ یہ بالکل سادہ اور بے رنگ حالت میں بھی وجود میں آ سکتی اور باقی رہ سکتی تھی، لیکن خالق کائنات نے یہ پسند فرمایا کہ ایک ایک پھول اور ایک ایک پتی سے اُس کی عظیم قدرت و حکمت اور اُس کی بے نہایت رحمت و ربوبیت ظاہر ہو تاکہ انسان اُس کی معرفت حاصل کرے۔ لیکن یہ انسان کی عجیب بد قسمتی ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنی ذہانت کے مظاہرے کا اتنا شوقین ہے کہ اگر ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے مدفون کھنڈروں سے کوئی ٹوٹا ہوا مٹی کا مرتبان بھی اُس کو ہاتھ آ جائے تو اُس پر کھینچی ہوئی آڑی ترچھی لکیروں سے وہ اُس عہد کے آرٹ، اُس عہد کے کلچر، اُس عہد کی تہذیب، اُس دور کے مذہب، اُس دور کی سیاست، غرض ہر چیز پر ایک مزعومہ فلسفہ اور ایک فرضی تاریخ تیار کر دے گا، دوسری طرف اُس کی بلادت اور بدذوقی کا یہ عالم ہے کہ خالق کائنات نے ایک ایک پتی پر اپنی حکمت کے جو دفاتر رقم فرمائے ہیں، نہ اُن کا کوئی حرف اُس کی سمجھ میں آتا ہے، نہ اُن سے اُسے کوئی رہنمائی حاصل



وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوا لَهُ بَنِينَ

لیکن (ان کی سفاہت کا یہ عالم ہے کہ) انھوں نے جنوں کو خدا کا شریک ٹھہرا لیا ہے؛<sup>۱۵۲</sup> دراں حالیکہ اُسی نے انھیں پیدا کیا ہے<sup>۱۵۵</sup> اور بغیر کسی علم کے اُس کے لیے بیٹے

ہوتی ہے۔“ (تدبر قرآن ۱۲۷/۳)

۱۵۳ یعنی ضدی اور ہٹ دھرم نہیں ہیں۔ بات سمجھ میں آ جائے تو ماننے کے لیے تیار ہیں۔ علم اور تفقہ کے ساتھ یہ تیسری چیز بھی ضروری ہے۔ یہ نہ ہو تو آدمی سامنے پڑی ہوئی چیزوں کو بھی دیکھنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فرمایا کہ اس طرح کے لوگوں کے لیے اس بات کی غیر معمولی نشانیاں ہیں کہ اس کائنات کی خدائی اگر مختلف دیوتاؤں اور خداؤں میں بٹی ہوئی ہوتی تو رائی کا ایک دانہ بھی اپنی صلاحیتیں اجاگر نہیں کر سکتا تھا؛ موت و حیات کا کارخانہ جس تو اتر کے ساتھ اور ایک قانون اور قاعدے کے مطابق چل رہا ہے، ایک دن کے لیے بھی نہیں چل سکتا تھا؛ رات اور دن میں یہ توافق اور سازگاری ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی تھی کہ ایک انسان کے لیے راحت کا بستر بچھائے اور ایک اُس کے لیے معاش اور معیشت کی سرگرمیوں کا میدان گرم کر دے؛ آسمان کے تارے زمین والوں کے لیے شمع برداری کی خدمت انجام نہیں دے سکتے تھے؛ انسان اُن تنوعات کے ساتھ جو ہر قوم اور قبیلے سے نمایاں ہیں، ایک ہی سمت میں تہذیب کا سفر جاری نہیں رکھ سکتے تھے؛ زندگی، رزق اور اسباب و وسائل میں ایک دوسرے کے لیے ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی تھی؛ کائنات کے اجزائے مختلفہ اس قدر تدبیر و حکمت کے ساتھ انسان کی زندگی کے بقا کا ذریعہ نہیں بن سکتے تھے۔ یہ حقائق گواہی دیتے ہیں کہ سورج، چاند، ابرو ہوا، نور و ظلمت، سردی گرمی، بہار و خزاں، زمین و آسمان، غرض یہ کہ کائنات کی ہر چیز پر ایک ہی قادر و قیوم کی حکمرانی ہے۔ اس کائنات کو بنانے اور اس کو چلانے میں کوئی بھی اُس کا شریک نہیں ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ، تَبْرَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ۔

۱۵۴ یعنی اس کے باوجود کہ خدا کی یہ شانیں شب و روز دیکھتے ہیں، لیکن ان احمقوں کی



وَبَنِي بِغَيْرِ عِلْمٍ ط سُبْحَنَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُصِفُونَ ۝ بَدِيعُ  
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ط أَنِّي يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُنْ لَهُ صَاحِبَةً ط

اور بیٹیاں تصنیف کر لی ہیں۔ وہ پاک اور بالاتر ہے اُن سب چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ تو زمین اور آسمانوں کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ اُس کے

خرد باختگی، سفاہت اور بوالفضولی دیکھو کہ جنوں اور بھوتوں کو اُس کا شریک ٹھہراتے ہیں اور اس طرح گویا اپنے توہمات کو خدا بنا کر اُن کی پرستش کر رہے ہیں۔

۱۵۵۔ یہ کلام کے بیچ میں ایک جملہ معترضہ ہے جس سے بلاتا خیر اس لغویت کی تردید فرمادی ہے کہ خدا کی ایک مخلوق اُس کی شریک بھی ہو سکتی ہے۔

۱۵۶۔ اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیوں کا درجہ دیتے اور اُن کی مورتیں بنا کر دیویوں کی حیثیت سے اُن کی پوجا کرتے تھے۔ یہی معاملہ مسیحیوں نے سیدنا مسیح کے ساتھ کیا اور انھیں خدا کا بیٹا بنا دیا۔ یہ سب بغیر کسی عقلی یا نقلی دلیل کے کیا گیا۔ نہ خدا نے کبھی اس کی شہادت دی اور نہ عقل و فطرت کے اندر کوئی چیز کبھی اس کے حق میں پیش کی جاسکی۔

۱۵۷۔ اصل میں لفظ سُبْحَنَهُ آیا ہے۔ یہ تنزیہ کا کلمہ ہے، لیکن اس کے اندر تو حید کی نہایت واضح دلیل بھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... عقل و فطرت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ کسی چیز کی طرف کوئی ایسی صفت منسوب نہ کی جائے جو اُس کی ثابت، مسلم اور بدیہی صفات کے ضد یا منافی ہو۔ اگر ایسا کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی ہی مانی ہوئی ایک حقیقت اپنے ہی دوسرے مفروضے سے باطل ہو جاتی ہے۔ اگر ایک شخص بادشاہ ہے تو اُس کی طرف غلامی کی صفات منسوب نہیں ہو سکتیں۔ فرشتہ ہے تو اُس کو شیطان کی صفات سے ملوث نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح جو ذات خالق، مالک، قدیر، علیم اور کریم و رحیم ہے، اُس کو اُن صفات سے متصف کرنا جو مخلوق کی صفات ہیں، اُس کی اُن تمام صفات کی نفی کے ہم معنی ہے جن کا ماننا از روئے عقل و فطرت واجب ہے اور جن کی نفی سے





وَحَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝۱۰۱ ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ ۚ  
لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ  
وَكِيلٌ ۝۱۰۲ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ ۚ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ  
وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ۝۱۰۳

اولاد کہاں سے آئی، جب کہ اُس کی کوئی بیوی ہی نہیں ہے؟<sup>۱۵۸</sup> اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔<sup>۱۵۹</sup> وہی اللہ تمہارا پروردگار ہے، اُس کے سوا کوئی الہ نہیں، ہر چیز کا خالق ہے، لہذا اُسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز پر نگران ہے۔ اُس کو نگاہیں نہیں پاسکتیں، لیکن وہ نگاہوں کو پالیتا ہے۔<sup>۱۶۰</sup> وہ نہایت باریک بین اور بڑا باخبر ہے۔<sup>۱۶۱</sup> ۱۰۰-۱۰۳

انسان اُن تمام تاریکیوں میں پھر گھر جاتا ہے جن سے ان صفات کے علم کی روشنی ہی نے اُس کو نکالا تھا۔ اگر خدا کو خدا ماننے کے بعد بھی جنات اور فرشتوں کو اُس کا شریک قرار دے دیا گیا اور اُس کو بیٹوں اور بیٹیوں کا باپ بنا دیا گیا تو پھر وہ خدا کہاں رہا؟ پھر تو اُس کے کفو و ہم سر بھی پیدا ہو گئے، اُس کی ذات برادری کے شریک بھی نکل آئے اور اُس کے مد مقابل اور حریف بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔“ (تدبر قرآن ۱۳۰/۳)

۱۵۸ یعنی جب اُس کی بیوی نہیں مانتے تو اولاد کہاں سے پیدا کر لیتے ہو؟ تمہیں بھی تسلیم ہے کہ وہی سب کا خالق ہے، پھر تعجب ہے کہ اُس کے پیدا کیے ہوئے فرشتوں، جنات اور انسانوں کو اُس کی ذات اور اُس کی خدائی میں شریک ٹھہراتے ہو۔

۱۵۹ یعنی جب اُس نے پیدا کیا ہے اور وہ اپنی مخلوقات کی ایک ایک چیز سے واقف بھی ہے تو اُس کو چھوڑ کر کسی اور کے آستانے پر جانے اور سر جھکانے کی کیا ضرورت ہے؟

۱۶۰ مطلب یہ ہے کہ تم اُسے نہیں دیکھ سکتے تو کیا ہوا۔ اس کا نتیجہ کیا یہی ہونا چاہیے کہ اُس کی







الانعام  
۶

قَدْ جَاءَكُمْ بِصَآئِرٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَن أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۖ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِیْظٍ ۝۱۰۴ وَكَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ لِّیَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۵

تمہارے پروردگار کی طرف سے بصیرت کی آیتیں تمہارے پاس آ چکی ہیں۔ چنانچہ اب جو بصیرت حاصل کرے گا، اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنا رہے گا، اُس کا وبال بھی وہی اٹھائے گا اور (جہاں تک میرا تعلق ہے تو) میں تم پر کوئی نگران نہیں ہوں<sup>۱۰۲</sup>۔ ہم اپنی آیتیں اسی طرح مختلف اسلوبوں سے پیش کرتے ہیں، اس لیے کہ اُن پر حجت قائم ہو<sup>۱۰۳</sup> اور اس لیے کہ وہ بول اٹھیں<sup>۱۰۴</sup> کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کر سنا دیا اور اس لیے کہ ہم اُن لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں، اسے ہر لحاظ سے واضح کر دیں۔ ۱۰۴-۱۰۵

ذات کے مظاہر اور اوتار بنا کر انھیں پوجنا شروع کر دو اور اس حماقت کی توجیہ یہ پیش کرو کہ خوگر پیکر محسوس ہے انساں کی نظر؟ ہرگز نہیں، اُس کی نگاہیں تو ہر جگہ اور ہر وقت دیکھتی ہیں، لہذا تمہارے ایمان، اعتماد اور بندگی و اطاعت کے لیے یہی کافی ہے اور یہی کافی ہونا چاہیے۔  
۱۰۱ لہذا تم سے باخبر رہنے کے لیے اُسے اُن مزعومہ وسائل و وسائط کی کوئی ضرورت نہیں ہے جن پر تم بھروسہ کیے بیٹھے ہو۔

۱۰۲ یہ الفاظ براہ راست لسان نبوت پر ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:  
”... یوں ارشاد نہیں ہوا کہ ان لوگوں سے کہہ دو، بلکہ کہنے کی بات پیغمبر نے خود براہ راست فرمادی۔ وحی کی یہ قسم روح نبوت کے غایت قرب و اتصال کی دلیل ہوتی ہے۔ گویا منبع فیض کا فیضان خود زبان رسالت سے چھلک پڑتا ہے۔“ گفتہ او گفتہ اللہ بود شاید اسی حقیقت کی تعبیر ہے۔“ (تذکر قرآن ۳/۱۳۳)

۱۰۳ یہ ’وَلِیَقُولُوا‘ کا معطوف علیہ ہے جو عربیت کے اسلوب پر اصل میں محذوف ہے۔ ہم



اتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَأَعْرِضْ عَنِ  
 الْمُشْرِكِينَ ۝ (۱۰۶) وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكُوا ۚ وَمَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ  
 حَفِظًا ۚ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ۝ (۱۰۷)  
 وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا  
 بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ كَذَلِكَ زَيْنًا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَلَيْهِمْ ۚ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ

تم اُس چیز کی پیروی کرتے رہو، (اے پیغمبر)، جو تمہارے پروردگار کی طرف  
 سے تم پر وحی کی جا رہی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اُس کے سوا کوئی الہ نہیں اور (یہ نہیں  
 مانتے تو) ان مشرکوں کو جانے دو۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ کبھی شرک نہ کر پاتے۔ ہم نے ان  
 پر تمہیں نگران مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم ان کے ضامن ہو۔ ۱۰۶-۱۰۷

(یہ جس سفاهت میں مبتلا ہیں، اُس کے باوجود) تم لوگ انہیں گالی نہ دو جن کو اللہ  
 کے سوا یہ پکارتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ تجاوز کر کے یہ بن سمجھے اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔  
 نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۱۶۴ یعنی زبان سے، بے شک اقرار نہ کریں، مگر اپنے دل میں پکارا انہیں کہ تو نے اس طرح  
 پڑھ کر سنایا ہے کہ گویا کتاب کو گھس ڈالا ہے اور اس طرح احقاق حق کا حق ادا کر دیا ہے۔  
 ۱۶۵ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا کہ انہیں جبراً شرک سے روک دے تو یہ کبھی شرک نہ کر  
 پاتے، لیکن اُس کی مشیت یہی ہے کہ لوگوں کو اختیار دے کر ان کا امتحان کرے کہ کون توحید کی  
 صراط مستقیم پر چلتا ہے اور کون شرک کی راہ اختیار کرتا ہے؟ تم نہ ان پر داروغہ مقرر کیے گئے ہو اور نہ  
 ان کے ضامن ہو کہ نہیں مانیں گے تو جواب دہ ٹھیرائے جاؤ گے، اس لیے اپنی ذمہ داری ادا کرو اور  
 انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، یہ اپنے کرتوتوں کا خمیازہ خود بھگت لیں گے۔



## مَرَجِعُهُمْ فَيَنْبِئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٠٨﴾

(اس لیے کہ) ہر گروہ کے عمل کو ہم نے اسی طرح اُس کے لیے خوش نما بنا رکھا ہے، پھر (ایک دن) اُنھیں اپنے پروردگار کی طرف پلٹنا ہے، اُس وقت وہ اُنھیں بتا دے گا جو وہ کرتے رہے ہیں۔ ۱۰۸

۱۶۶۔ یہ ایک بر محل ہدایت ہے اور اس لیے کی گئی ہے کہ شرک پر جو تنقید اوپر ہوئی ہے، اُس کے زیر اثر مسلمان کہیں حدود سے تجاوز نہ کر بیٹھیں۔ عقل و انصاف یہی چاہتے ہیں کہ بات ہمیشہ اصول و عقائد اور افکار و نظریات کی تنقید و توضیح تک محدود رہے۔ پھر دعوت کے نقطہ نظر سے بھی صحیح طریقہ یہی ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ مخاطبین چونکہ خدا کی صفات اور اُس کے حقوق کا صحیح علم نہیں رکھتے، اس لیے وہ بھی حدود سے تجاوز کریں اور جھوٹے خداؤں کی حمیت میں سچے خدا کو گالیاں دینے لگیں۔

۱۶۷۔ یہ مزید تنبیہ ہے۔ مدعا یہ ہے کہ رسوم، روایات اور معتقدات کی محبت خود اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی فطرت میں ودیعت فرمائی ہے۔ چنانچہ عقائد و اعمال کی تطہیر ضرور کی جائے، مگر اس کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے جو ان چیزوں کے لیے لوگوں کے جذبہ حمیت کو بھڑکانے کا باعث بن جائے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”یہاں ’تزین‘ کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف جو منسوب فرمایا ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر قوم کے اندر اپنی مالوفات سے دل بستگی اور اپنی روایات ملی و اجتماعی کے لیے یہ عصیت ایک حد تک فطری چیز ہے۔ یہ نہ ہو تو قومی و ملی وحدت وجود ہی میں نہیں آ سکتی۔ خاندانوں، قوموں، وطنوں کی شیرازہ بندی اسی چیز سے ہوئی ہے۔ یہ معدوم ہو جائیں تو افراد ہوا میں اڑتے ہوئے چٹوں کے مانند ہو جائیں۔ اس وجہ سے اس چیز کا ایک مقام ہے جو تقاضاے فطرت ہے اور اس کی رعایت ملحوظ ہونی چاہیے۔ اس سے تعرض اُسی حد تک ہونا چاہیے جس حد تک یہ حق کے خلاف ہے اور اُس انداز میں ہونا چاہیے جس سے خود اس کا واجبی حق مجروح نہ ہو۔“ (تدبر قرآن ۱۳۶/۳)



وَأَقْسَمُوا بِاللّٰهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَتْهُمْ آيَةٌ لِّيَوْمِئِذٍ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَا إِذَا جَاءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٠٩﴾ وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا

یہ اللہ کی کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی ان کے پاس آ جائے تو یہ ضرور اُس پر ایمان لے آئیں گے۔ کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں، لیکن، (مسلمانو)، تمہیں کیا پتا کہ وہ آ بھی جائیں تو یہ نہیں مانیں گے۔ ہم اُس وقت بھی ان

۱۶۸۔ یعنی مطمئن رہو، تمہارا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ حق واضح کر دیا جائے۔ یہ اپنی حماقتوں پر اصرار کریں گے تو خود مجرم ٹھہریں گے اور جواب دہی کے لیے ایک دن خدا کے حضور میں پیش ہو جائیں گے۔ وہاں جو کچھ بھگتنا ہے، انہیں بھگتنا ہے۔ اُس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہ ہو گی۔

۱۶۹۔ یہ مطالبہ محض پروپیگنڈے کے لیے تھا۔ اس سے وہ یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ وہ اگر ایمان نہیں لا رہے تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہیں کوئی ایسی نشانی نہیں دکھائی جا رہی جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت کے باب میں فیصلہ کن ہو جائے۔ اُن کا یہ مطالبہ نہایت معقول ہے۔ اسے پورا کر دیا جائے تو اُن کے ایمان لانے میں کوئی چیز مانع نہ ہوگی۔

۱۷۰۔ یعنی جس قسم کی نشانیوں اور معجزات کا مطالبہ تم کر رہے ہو، وہ خدا ہی کے پاس ہیں۔ چاہے تو دکھائے اور چاہے تو نہ دکھائے۔ اس کا فیصلہ اپنے علم و حکمت کے مطابق وہی کرے گا۔ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ میرا اصلی فریضہ انداز و بشارت ہے۔ اس سے آگے کوئی چیز میرے اختیار میں نہیں ہے۔

۱۷۱۔ یہ خطاب عام مسلمانوں سے ہے اور بتا رہا ہے کہ بار بار کے مطالبات کو سن کر اُن کے اندر بھی یہ خواہش پیدا ہو جاتی تھی کہ اللہ تعالیٰ آخر پہلے بھی تو پیغمبروں کو معجزے دیتے رہے ہیں،





الانعام  
۶

لَمْ يُوْثِقُوْا بِهِ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۱۰  
وَلَوْ اَنَّا نَزَّلْنَا اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ  
كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا اِلٰى يَوْمٍ مِّنْ وَّالٍ اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنْ

کے دلوں اور ان کی نگاہوں کو اُسی طرح الٹ دیں گے، جس طرح یہ پہلی بار اس  
(قرآن) پر ایمان نہیں لائے اور ان کی سرکشی میں انھیں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیں گے۔<sup>۲</sup> انھیں  
ان کی طرف فرشتے بھی اتار دیتے اور مُردے بھی ان سے باتیں کرنے لگتے اور (دنیا  
کی) سب چیزیں ان کے سامنے گروہ در گروہ جمع کر دیتے، جب بھی یہ ماننے والے  
پھر ان کے مطالبے پر کوئی معجزہ دکھا کیوں نہیں دیتے کہ ہمارے یہ بھائی راہِ راست پر آجائیں؟  
فرمایا ہے کہ انھیں کوئی معجزہ دکھا بھی دیا جائے تو نہیں مانیں گے، اس لیے کہ ان کے نہ ماننے کی  
وجہ وہ نہیں ہے جو یہ ظاہر کر رہے ہیں۔

۲۔ یہ اُن کے ایمان نہ لانے کا اصلی سبب بیان کر دیا ہے کہ محض سرکشی، طغیان، غرور نفس اور  
پندارِ سیادت ہے جو ایمان نہ لانے کا باعث بن رہا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو پہلی بار ہی قرآن کی دعوت سن  
کر اُسے مان لیتے۔ اب اگر کوئی معجزہ دکھا بھی دیا جائے تو یہی چیز پھر حجاب بن جائے گی اور خدا کا  
قانون یہ ہے کہ جو غرور نفس کی بنا پر دل و نگاہ کا زاویہ غلط کر لیتے ہیں، انھیں وہ اُسی طرف پھیر دیتا  
ہے، جدھر وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ استاذِ امام لکھتے ہیں:

”...اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ سیدھے دیکھنے کے بجائے الٹے دیکھتے اور سیدھی راہ  
اختیار کرنے کے بجائے الٹی راہ چلتے ہیں، اُن کے دل اور اُن کی فکر بھی کج کر دی جاتی ہے۔ پھر  
وہ احوال کی طرح ہر چیز کو بس اپنے مخصوص زاویے ہی سے دیکھتے ہیں۔ اسی سنت اللہ کی طرف  
فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ میں اشارہ فرمایا ہے۔ یہاں اسی معروف سنت اللہ کا  
حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ کیسے باور کرتے ہو کہ اگر ان کو ان کی طلب کے مطابق کوئی  
معجزہ دکھا دیا گیا تو یہ مومن بن جائیں گے؟ آخر وہ تمام نشانیاں جو آفاق و انفس میں موجود



اَكْثَرُهُمْ يَجْهَلُونَ ۝

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَاطِئِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ۚ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا

نہیں تھے، الا یہ کہ اللہ چاہے۔ مگر (کیا کیا جائے کہ) ان میں سے اکثر جہالت میں مبتلا ہیں۔ ۱۰۹-۱۱۱

(یہ معاملہ صرف تمہارے ساتھ نہیں ہے)۔ ہم نے انسانوں اور جنوں کے اشرار کو اسی طرح ہر نبی کا دشمن بنایا۔ وہ دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کو پر فریب باتیں ۱۰۶ القا

ہیں، جن کی طرف قرآن نے انگلی اٹھا اٹھا کر اشارہ کیا اور ان کے مضمرات و دلائل واضح کیے، جب ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے دلوں اور ان کی نگاہوں کے زاویے کو درست کرنے میں کارگر نہ ہو سکی تو آخر کوئی نئی نشانی کس طرح ان کی کایا کلپ کر دے گی؟ جو حجاب آج ہے، وہ کل کس طرح دور ہو جائے گا اور جو اندھا پن آج دیکھنے سے مانع ہے، وہ اس نشانی کے ظہور کے وقت کہاں چلا جائے گا؟ جس طرح آج تک وہ ساری نشانیوں کو جھٹلا رہے ہیں، اُسی طرح اس نشانی کو بھی جھٹلا دیں گے اور جو قلب ماہیت ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کی آج دیکھتے ہو، وہ قلب ماہیت اُس وقت بھی اپنا عمل کرے گی۔“ (تدبر قرآن ۱۴۱/۳)

۳۱ مطلب یہ ہے کہ اللہ اُنھی کو ایمان و ہدایت کی توفیق عطا فرماتا ہے جو حق کے سچے طالب ہوں۔ یہ جس جہالت میں مبتلا ہیں اور علم و استدلال سے فیصلہ کرنے کے بجائے جس طرح کی شرطیں عائد کر رہے ہیں، اُن کے ساتھ کسی کو ہدایت کی توفیق ارزانی نہیں ہوتی۔

۳۲ یعنی مخالفانہ شورش اور مخاصمانہ اعتراضات و مطالبات کا معاملہ جو قریش کے لیڈر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کر رہے تھے۔

۳۵ یہ اُس سنت ابتلا کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت اشرار و شیطین کو مہلت دی جاتی ہے کہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، کر لیں۔ اس کے لیے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، اُن میں فعل کی





فَعَلُوهُ فَذَرَهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴿١١٢﴾ وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفِئْدَةُ الَّذِينَ

کرتے رہتے ہیں۔ تیرا پروردگار چاہتا تو وہ کبھی ایسا نہ کر پاتے۔ سو انھیں ان کی  
افترا پر دازیوں میں پڑا رہنے دو۔ اس لیے دشمن بنایا کہ اس سے حق پرستوں کی

نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اُسی اسلوب پر ہوئی ہے جو قرآن میں سنن الہیہ کے بیان کے لیے اختیار  
کیا گیا ہے۔ اشرار و شیاطین کو یہ مہلت کیوں دی جاتی ہے؟ اس کے وجوہ آگے بیان فرمائے  
ہیں۔

۶۱ اصل میں 'زُخْرَفَ الْقَوْلِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ صفت ہے جو اپنے موصوف کی طرف  
مضاف ہو گئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس سے مراد وہ مشرکانہ بدعات ہیں جو ہر دور کے شیاطین جن وانس نے باہمی گٹھ جوڑ  
سے ایجاد کیں، پھر اُن کے اوپر شریعت الہی کا لیبل لگا کر اُن کو رواج دیا اور جب انبیاء مصلحین  
نے اُن کی اصلاح کی دعوت دی تو اُن کی مخالفت میں بحث و جدال کا بازار گرم کیا۔ چنانچہ اس  
موقع پر بھی یہی ہوا۔ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی دعوت دی اور اُن کے  
بتوں اور مشرکانہ عقائد کے تحت اُن کی حرام ٹھیرائی ہوئی چیزوں کی بے حقیقتی واضح فرمائی تو  
شرک کے یہ ائمہ آستینیں چڑھا چڑھا کے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور جس پر ان کا زور  
چلا، اُس کو اپنے دام فریب میں پھنسانے اور عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ محمد (صلی اللہ  
علیہ وسلم) ہم کو ہمارے باپ دادا کے دین اور ابراہیم کی ملت سے ہٹا رہے ہیں۔“

(تذکر قرآن ۱۲۳/۳)

۷۱ یہ تسلی کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا پروردگار اُن کی افترا پر دازیوں کے آگے بے بس  
نہیں ہے۔ اس کی آزادی اُس نے خود انھیں عطا فرمائی ہے۔ اس سے مقصود امتحان ہے اور یہ دنیا اسی  
امتحان کے لیے برپا کی گئی ہے، ورنہ اللہ چاہتا تو بالجبر سب اشرار و شیاطین کو اُن کی افترا پر دازیوں  
سے روک دیتا۔



لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَلِيَرَضُوا مَا هُمْ مُقْتَرِفُونَ ﴿١١٣﴾  
 أَفَغَيْرَ اللَّهِ ابْتَغَىٰ حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ  
 مُفَصَّلًا ۖ وَالَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابُ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِّنْ  
 رَبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿١١٤﴾ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ

حق پرستی واضح ہو جائے اور اس لیے کہ قیامت کا انکار کرنے والوں کے دل اسی طرف  
 لگے رہیں، وہ اس پر راضی رہیں اور جو کمائی انھیں کرنی ہے، کر لیں۔ ۱۱۳-۱۱۴

(تم مجھ سے جھگڑ رہے ہو) تو (بتاؤ کہ) میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا  
 تلاش کروں، دریاں حالیکہ وہی ہے جس نے تمھاری طرف یہ کتاب اتاری ہے جس  
 میں (دین و شریعت کے متعلق) ہر چیز کی تفصیل ہے۔ اور جنھیں ہم نے (اس سے پہلے)  
 کتاب عطا فرمائی، وہ جانتے ہیں، (اے پیغمبر) کہ یہ تمھارے پروردگار کی طرف

۱۱۸ یہ مہلت کے وجوہ ہیں۔ اشرار و شیاطین کو جو ڈھیل دی جاتی ہے، وہ اسی لیے دی جاتی  
 ہے کہ اُن کے اندر کا فساد پوری طرح سامنے آجائے اور وہ اپنے اوپر اللہ کی حجت تمام کر لیں۔  
 آیت میں وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ کا معطوف علیہ محذوف ہے اور شیاطین کے پیروں کی صفتُ الَّذِينَ لَا  
 يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ بتائی گئی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ شیاطین کی جس دعوت کا ذکر ہوا ہے، وہ  
 انھی کو اپیل کرتی ہے جو مرنے کے بعد جی اٹھنے کا عقیدہ نہیں رکھتے۔

۱۱۹ یعنی اس معاملے میں جھگڑ رہے ہو کہ خدا کی خدائی تنہا اُسی کے ہاتھ میں ہے یا اُس میں  
 کچھ دوسرے بھی شریک ہیں اور اُس نے کیا جائز رکھا اور کیا حرام ٹھہرایا ہے۔

۱۲۰ اس سے صالحین اہل کتاب مراد ہیں۔ اُن کی شہادت کا ذکر قرآن کے بعض دوسرے  
 مقامات میں بھی ہوا ہے۔





صِدْقًا وَعَدْلًا ۖ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَتِهِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝۱۱۵  
وَإِنْ تُطِيعْ أَكْثَرَمَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۖ إِنَّ  
يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۝۱۱۶ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَنْ

سے حق کے ساتھ اتاری گئی ہے، لہذا تم کہیں شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو جانا۔<sup>۱۸۱</sup>  
تمہارے پروردگار کی بات (ان لوگوں کے حق میں) سچائی اور انصاف کے ساتھ پوری  
ہو گئی ہے۔ اُس کی باتیں کوئی تبدیل نہیں کر سکتا اور وہ سمیع و علیم ہے۔<sup>۱۸۲</sup> زمین والوں میں  
زیادہ ایسے ہیں کہ اُن کی بات مانو گے تو تمہیں خدا کے راستے سے بھٹکا کر چھوڑ دیں گے۔<sup>۱۸۳</sup>

۱۸۱۔ یہ خطاب اگرچہ باعتبار الفاظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن صاف واضح ہے کہ  
روئے سخن اُنھی لوگوں کی طرف ہے جو سورہ کے مخاطبین ہیں۔

۱۸۲۔ یعنی وہ بات جو خدا نے اُسی وقت کہہ دی تھی، جب ابلیس نے دھمکی دی تھی کہ میں اولاد  
آدم کو شرک اور بت پرستی میں مبتلا کر کے چھوڑ دوں گا تو خدا نے فرمایا تھا کہ اگر ایسا ہے تو میں بھی  
تجھے اور تیری پیروی کرنے والوں کو دوزخ میں بھر کر رہوں گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ فیصلہ سچائی اور عدل، دونوں معیاروں پر پورا ہے۔ خدا نے جو بات فرمائی، وہ سچی بھی  
ہے اور مبنی بر عدل بھی۔ اس لیے کہ خدا نے ان پر اپنی حجت پوری کر دی ہے۔ اس کے باوجود  
اگر یہ ہدایت الہی کی جگہ القاعے شیطانی ہی کی پیروی پر بضد ہیں تو یہ اُسی انجام کے سزاوار ہیں  
جس کی خدا نے ان کو خبر دی ہے۔ خدا کے فیصلے اُس کی مقررہ سنت کے تحت ہوتے ہیں، اُن کو  
کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اللہ سمیع و علیم ہے، نہ اُس کی کوئی بات بے خبری پر مبنی ہوتی، نہ اُس میں  
کسی خطایانا انصافی کا امکان ہے۔“ (تدبر قرآن ۱۳۶/۳)

۱۸۳۔ اس لیے کہ لوگوں کی اکثریت بالعموم غوغائے عام کی پیروی کرتی ہے، اُس کے فیصلے کسی  
دلیل و سند اور علم و حجت پر مبنی نہیں ہوتے۔



يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١١٤﴾

فَكُلُوا مِمَّا ذَكَرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١١٨﴾ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذَكَرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ

یہ محض گمان پر چلتے اور اٹکل دوڑاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اُس کی راہ سے بھٹک چکا ہے اور جو سیدھی راہ پر ہیں، انہیں بھی وہ خوب جانتا ہے۔ ۱۱۴-۱۱۷

سو (تم لوگ پروانہ کرو اور) اگر اُس کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو تو جن جانوروں کو

۱۱۴ مطلب یہ ہے کہ اللہ دونوں گروہوں سے واقف ہے۔ وہ اُن سے معاملہ بھی اپنے علم کے مطابق کرے گا۔ اُس کی بارگاہ میں لوگوں کے دعوے اُن کے کچھ کام نہ آئیں گے۔

۱۱۵ یعنی ان کے اُس پروپیگنڈے کی پروانہ کرو جو یہ تمہاری اصلاحات کے خلاف کر رہے ہیں کہ یہ شخص وہ چیزیں بھی جائز ٹھہرا رہا ہے جو ہمارے بزرگوں — ابراہیم و اسمعیل علیہما السلام — کے زمانے سے حرام چلی آرہی تھیں۔ یہ ان کے ظنون و اوہام ہیں۔ ابراہیم و اسمعیل کا دین درحقیقت وہی تھا جو اس وقت ان کے سامنے شرک و بدعت کی تمام آلائشوں سے پاک کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۱۶ یہ تاکید اور تنبیہ، بلکہ ایک نوعیت کی تہدید بھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”تحریم و تحلیل کا اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اگر کسی اور کے لیے بھی یہ حق تسلیم کر لیا جائے تو یہ خدا کے حقوق میں دوسرے کو حصہ دار بنانا ہے اور یہ شرک ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مسئلہ صرف ایک چیز کے کھانے اور نہ کھانے کا نہیں ہے، بلکہ جن چیزوں کو مشرکانہ توہمات کی بنا پر حرام ٹھہرایا گیا ہے، اللہ کی طرف سے اُن کی حلت کے اعلان کے باوجود اُن سے اجتناب کرنا گویا بالواسطہ شرک کو تسلیم کرنا ہوا، اس وجہ سے یہ مسئلہ کفر و ایمان کا مسئلہ بن جاتا ہے۔“ (مدبر قرآن ۱۵۴/۳)





الانعام  
۲

عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرَرْتُمْ إِلَيْهِ ط وَإِنَّ كَثِيرًا لَّيُضِلُّونَ بِأَهْوَاءِهِمْ  
بِغَيْرِ عِلْمٍ ط إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ ۝۱۱۹ وَذُرُوا ظَاهِرَ  
الْأَثَمِ وَبَاطِنَهُ ط إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْأَثَمَ سَيُجْزَوْنَ

اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو، انھیں (بغیر کسی تردد کے) کھاؤ اور تم ان چیزوں میں  
سے کیوں نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، دریاں حالیکہ اُس نے جو کچھ تم پر حرام ٹھہرایا ہے،  
وہ (اپنی کتاب میں) تمھارے لیے تفصیل سے بیان کر دیا ہے، ۱۸۷ اس استثناء کے ساتھ کہ  
تم کسی چیز (کو کھانے) کے لیے مجبور ہو جاؤ۔ ۱۸۸ حقیقت یہ ہے کہ زیادہ لوگ بغیر کسی علم کے  
اپنی بدعتوں کے ذریعے سے گم راہی پھیلاتے ہیں۔ ان حد سے بڑھنے والوں کو تیرا پروردگار  
خوب جانتا ہے۔ تم اس گناہ کے ظاہر و باطن، دونوں کو چھوڑ دو۔ ۱۹۰ جو لوگ اس گناہ کا

۱۸۷ یہ اُس تفصیل کی طرف اشارہ ہے جو اس سورہ میں بھی ہے اور قرآن کے بعض دوسرے  
مقامات میں بھی کی گئی ہے۔

۱۸۸ اس استثناء کے حدود و شرائط اس سے پہلے سورہ بقرہ اور سورہ مائدہ میں بیان ہو چکے  
ہیں۔

۱۸۹ اصل میں لفظ 'أَهْوَاءٌ' آیا ہے۔ اس کے معنی خواہشات کے ہیں، لیکن سیاق کلام سے  
واضح ہے کہ یہاں اس سے مراد وہ مشرکانہ بدعتیں ہیں جو محض خواہشات کی بنیاد پر دین بنالی جاتی  
ہیں۔ 'بِغَيْرِ عِلْمٍ' کے الفاظ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۹۰ یعنی شرک کے ظاہر و باطن کو چھوڑ دو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... شرک کی ایک تو حقیقت ہے، جو یہ ہے کہ خدا کی ذات یا صفات یا اُس کے حقوق میں کسی

کو شریک ماننا۔ دوسرے اُس کے مظاہر و اشکال ہیں، مثلاً اصنام، انصاب، ازلام، بحیرہ، سائبہ،

وصیلہ، حام اور اس نوع کی دوسری چیزیں جو کسی شرکیہ عقیدے یا تصور کا عملی مظہر اور نشان ہیں۔



بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿١٢٠﴾ وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ  
وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ۖ وَإِنَّ الشَّيْطَانَ لِيُوحِيَ إِلَىٰ أَوَّلِيَّيْهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ

اکتاب کرتے ہیں، وہ عنقریب اپنی اس کمائی کا بدلہ پالیں گے۔ اُن جانوروں میں سے،  
البتہ ہرگز نہ کھاؤ جنہیں اللہ کا نام لے کر ذبح نہیں کیا گیا اور یاد رکھو کہ بلاشبہ یہ صریح  
نافرمانی ہے۔<sup>۱۹۱</sup> اور متنبہ رہو کہ شیاطین اپنے ایجنٹوں کو القا کر رہے ہیں کہ وہ (اس معاملے

ظاہر ہے کہ ان دونوں میں بڑا گہرا ربط ہوتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے سہارے سے پروان  
چڑھتی اور غذا و قوت حاصل کرتی ہیں۔ اس وجہ سے اگر کسی برائی کا استیصال مقصود ہو تو یہ ضروری  
ہوگا کہ اُس برائی کی حقیقت اور اُس کے مظاہر و اشکال، دونوں کا استیصال کیا جائے۔ اس کے  
بغیر اُس کا استیصال ناممکن ہے۔ اگر یہ خیال کر کے اشکال و مظاہر سے چشم پوشی برتی جائے کہ  
جب اصل برائی پر ضرب لگادی گئی تو اشکال و مظاہر میں کیا رکھا ہوا ہے تو وہ برائی انھی اشکال میں  
پھر اپنا نشیمن بنا کر اُس میں اپنے انڈوں بچوں کی پرورش شروع کر دیتی ہے اور آہستہ آہستہ اُس  
کا پورا کنبہ از سر نو آباد ہو جاتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۱۵۶/۳)

۱۹۱ یہ مزید وضاحت ہے کہ جس ذبیحہ پر غیر اللہ کا نام تو نہیں لیا گیا، مگر اللہ کا نام بھی نہیں لیا  
گیا، اُس کی حرمت کے متعلق، البتہ کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ وہ بھی اُسی حکم کے تحت  
ہے جو قرآن میں جانوروں کی حرمت سے متعلق بیان ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ جس طرح مَآ  
أَهْلًا لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ، فسق، یعنی نافرمانی ہے، اُسی طرح یہ بھی فسق ہے۔ اس کے وجوہ کیا ہیں؟ استاذ  
امام لکھتے ہیں:

”اول یہ کہ اللہ کے نام اور اُس کی تکبیر کے بغیر جو کام بھی کیا جاتا ہے وہ، جیسا کہ ہم آیت  
بسم اللہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، برکت سے خالی ہوتا ہے۔ خدا کی ہر نعمت سے، خواہ وہ  
چھوٹی ہو یا بڑی، فائدہ اٹھاتے وقت ضروری ہے کہ اُس پر اُس کا نام لیا جائے تاکہ بندوں کی  
طرف سے اُس کے انعام و احسان کا اعتراف و اقرار ہو۔ اس اعتراف و اقرار کے بغیر کوئی شخص





## وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ﴿١٢١﴾

میں بھی) تم سے جھگڑیں<sup>۱۹۲</sup>۔ اور متنبہ رہو کہ اگر ان کا کہا مانو گے تو کچھ شک نہیں کہ تم بھی مشرک ہو کر رہ جاؤ گے<sup>۱۹۳</sup>۔ ۱۱۸-۱۲۱

کسی چیز پر تصرف کرتا ہے تو اُس کا یہ تصرف غاصبانہ ہے اور غصب سے کوئی حق قائم نہیں ہوتا، بلکہ یہ جسارت اور ڈھٹائی ہے جو خدا کے ہاں مستوجب سزا ہے۔

دوم یہ کہ احترام جان کا یہ تقاضا ہے کہ کسی جانور کو ذبح کرتے وقت اُس پر خدا کا نام لیا جائے۔ جان کسی کی بھی ہو، ایک محترم شے ہے۔ اگر خدا نے ہم کو اجازت نہ دی ہوتی تو ہمارے لیے کسی جانور کی بھی جان لینا جائز نہ ہوتا۔ یہ حق ہم کو صرف خدا کے اذن سے حاصل ہوا ہے۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ جس وقت ہم اُن میں سے کسی کی جان لیں، صرف خدا کے نام پر لیں۔ اگر اُن پر خدا کا نام نہ لیں یا خدا کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام لے لیں یا کسی غیر اللہ کے نام پر اُن کو ذبح کر دیں تو یہ اُن کی جان کی بھی بے حرمتی ہے اور ساتھ ہی جان کے خالق کی بھی۔

سوم یہ کہ اس سے شرک کا ایک بہت وسیع دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ ادیان کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ جانوروں کی قربانی، اُن کی نذر اور اُن کے چڑھاوے کو ابتداءء تاریخ سے عبادات میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس اہمیت کے سبب سے مشرکانہ مذاہب میں بھی اس کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ جو قوم بھی کسی غیر اللہ کی عقیدت و نیاز مندی میں مبتلا ہوئی، اُس نے مختلف شکلوں سے اس غیر اللہ کو راضی کرنے کے لیے جانوروں کی بھینٹ چڑھائی۔ قرآن میں شیطان کی جو دھمکی انسانوں کو گم راہ کرنے کے باب میں مذکور ہوئی ہے، اُس میں بھی، جیسا کہ ہم اُس کے مقام میں واضح کر چکے ہیں، اس ذریعہ ضلالت کا شیطان نے خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اسلام نے شرک کے ان تمام راستوں کو بند کر دینے کے لیے جانوروں کی جانوں پر اللہ تعالیٰ کے نام کا قفل لگا دیا، جس کو خدا کے نام کی کنجی کے سوا کسی اور کنجی سے کھولنا حرام قرار دے دیا گیا۔ اگر اس کنجی کے بغیر کسی اور کنجی سے اُس کو کھولنے یا اُس کو توڑنے کی کوشش کی گئی تو یہ کام بھی ناجائز اور جس جانور پر یہ ناجائز تصرف ہوا، وہ جانور بھی حرام۔“ (تدبر قرآن ۱۵۷/۳)



أَوْ مَنْ كَانَ مَيِّتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا كَذَلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٢﴾ وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ

(تم ان کی پروا نہ کرو)۔ کیا جو مُردہ تھا، پھر ہم نے اُسے زندہ کر دیا اور اُس کو ایک ایسی روشنی عطا فرمائی جسے وہ لوگوں کے درمیان لے کر چل رہا ہے، اُس شخص کے مانند ہو جائے گا جس کا حال یہ ہے کہ تاریکیوں میں پڑا ہوا ہے، کسی طرح اُن سے نکلنے والا نہیں ہے؟ ان منکروں کے اعمال ان کے لیے اسی طرح خوش نما بنا دیے گئے ہیں۔

۱۹۲ یعنی اُسی طرح کا غوغا برپا کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں جو ان لوگوں نے اپنی قراردادہ بعض حرمتوں کی حلت کا سن کر برپا کر رکھا ہے۔ چنانچہ اپنے ایجنٹوں کو بتا رہے ہیں کہ لو اب یہ نیا دین لے کر آنے والے تمہارے سب باپ دادوں کو حرام خور قرار دے رہے ہیں جو نذر اور چڑھاوے کے بعض جانوروں کو اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کرتے اور اُن کا گوشت کھاتے رہے ہیں۔ آگے آیت ۱۳۸ میں مشرکین کے اس عقیدے کا ذکر ہوا ہے کہ وہ ان جانوروں پر اللہ کا نام لینا جائز نہیں سمجھتے تھے۔

۱۹۳ یعنی ایک مرتبہ ان کے توہمات سے سمجھوتا کر لو گے تو آہستہ آہستہ شرک کے دوسرے مظاہر بھی تمہارے علم و عقیدہ میں در آئیں گے جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ بالآخر مشرک ہو کر رہ جاؤ گے۔ ۱۹۴ یہ ایمان والوں کی تمثیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن پر کفر و جہالت کی موت طاری تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمان کی زندگی بخشی اور اُن کی رہنمائی کے لیے ایک ایسی کتاب انہیں عطا فرمائی جس کی روشنی میں اب وہ حق و باطل کو الگ الگ دیکھ سکتے، حق کے راستے پر چل سکتے اور دوسروں کو بھی یہی راہ دکھا سکتے ہیں۔

۱۹۵ اس سے مراد ظنون و اوہام اور خواہشات و بدعات کی وہ تاریکیاں ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا

ہے۔





الانعام  
۲

اَكْبَرُ مُجْرِمِيهَا لِيَمْكُرُوا فِيهَا ۖ وَمَا يَمْكُرُونَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا  
يَشْعُرُونَ ﴿١٢٣﴾ وَاِذَا جَاءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُوْتٰى  
مِثْلَ مَا اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ۚ اللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۚ

ہر بستی میں اُس کے بڑے بڑے مجرموں کو ہم نے اسی طرح ڈھیل دی<sup>۱۹۸</sup> کہ اُس میں اپنی  
چالیں چل لیں۔ وہ یہ چالیں اپنے ساتھ ہی چلتے تھے، مگر انھیں اس کا احساس نہیں  
تھا۔ جب اُن کے سامنے کوئی آیت آتی تو کہتے تھے: ہم ہرگز نہ مانیں گے، جب تک<sup>۱۹۹</sup>  
وہی ہم کو نہ دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت

۱۹۶ یہ تمثیل اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کے لیے بیان کی گئی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ انھیں جو کچھ  
عطا ہوا ہے، اُسے وہ کوئی معمولی چیز نہ سمجھیں، اُس کی قدر کریں اور اُس کا زندگی بخش پیغام دوسروں  
تک پہنچائیں اور اُن لوگوں کی خرافات پر کان نہ دھریں جو اپنے کرتوتوں کی بنا پر اندھیروں میں  
ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں۔

۱۹۷ یعنی کفر و جہالت کی جس تاریکی کو انھوں نے اپنے لیے اختیار کیا ہے، خدا نے وہی  
تاریکی اُن کے لیے پسندیدہ بنا دی ہے۔

۱۹۸ اصل میں لفظ 'جَعَلْنَا' آیا ہے۔ یہ یہاں 'اُمہلنا' کے مفہوم میں ہے۔ ہم نے ترجمہ  
اسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۱۹۹ مطلب یہ ہے کہ وہ یہ چالیں بظاہر حق کے خلاف، مگر حقیقت میں اپنے خلاف ہی چلتے  
تھے۔ اس کے لیے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، اُن میں فعل ناقص عربیت کے قاعدے سے  
محذوف ہے۔

۲۰۰ یہ اُن چالوں کی ایک مثال ہے جن کا ذکر ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...ٹھیک یہی بات، جیسا کہ قرآن میں تفصیل سے بیان ہوئی، قریش کے اکابر کہتے تھے۔



سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌ  
بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ ﴿١٢٧﴾ فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ

کا منصب کسے عطا فرمائے۔ اللہ کے ہاں یہ مجرم عنقریب اپنی مکاریوں کی پاداش میں  
ذلت سے اور سخت عذاب سے دوچار ہو جائیں گے۔ سو (یہ ہدایت پانے والے نہیں

اُن کو بھی وہی گھمنڈ تھا جو اُن کے پیشرو مستکبرین اور مکذبین انبیا کو تھا کہ اگر خدا کسی کو رسالت ہی  
دینے والا تھا تو کیا اس تاج کے لیے اُس کو انھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا سرموزوں نظر آیا، آخر  
مکہ یا طائف کے کسی سردار پر اُس کی نظر کیوں نہ پڑی؟ ظاہر ہے کہ یہ بات جو وہ کہتے تھے تو  
محض چال بازی کے طور پر کہتے تھے، اس سے مقصود اُن کا محض اپنی انانیت اور خود فریبی کے لیے  
ایک پردہ فراہم کرنا اور اپنے عوام کو بے وقوف بنانا ہوتا تھا۔ سادہ لوح عوام دنیوی اسباب و  
وسائل کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ جن کو دنیا میں بڑا دیکھتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ خدا کے نزدیک بھی  
یہی بڑے ہوں گے۔ اس ذہن کے لوگ آسانی سے اس قسم کے چکموں میں آ جاتے ہیں۔  
اسی وجہ سے قرآن نے اس بات کو مکر سے تعبیر کیا ہے۔“ (تذبرقرآن ۱۶۰/۳)

۲۰۱ یہ جواب اگرچہ لفظاً سخت نہیں ہے، لیکن معنی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو نہایت سخت  
ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...مطلب یہ ہے کہ یہ منصب رسالت ایسی چیز نہیں ہے جس کا اہل ہر کس و ناکس بن  
جائے۔ یہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ یہ تاج وہ کس کے سر پر رکھے۔ یہ محمل اور زربفت کی جھول  
نہیں ہے جو بسا اوقات گدھوں پر بھی نظر آ جاتی ہے، بلکہ یہ خلعت الہی اور تشریف آسانی ہے جو  
اُنھی کو نصیب ہوتی ہے جن کا انتخاب اللہ تعالیٰ فرمائے۔“ (تذبرقرآن ۱۶۰/۳)

اس سے مزید یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس منصب کے لیے منتخب بھی اُنھی کو فرماتا ہے جو استاذ  
امام کے الفاظ میں اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کے لحاظ سے نوع انسانی کے گل سرسبد، نخل فطرت کے  
بہترین ثمر اور کمال انسانیت کا مظہر اتم ہوتے ہیں۔







الانعام  
۶

لِلْإِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضِيقًا حَرَجًا  
كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ ۚ كَذَلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى  
الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٢٥﴾ وَهَذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا ۚ قَدْ فَصَّلْنَا  
الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَذْكُرُونَ ﴿١٢٦﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ

ہیں، اس لیے کہ) اللہ (اپنے قانون کے مطابق) جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے، اُس کا  
سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گم راہ کرنا چاہتا ہے، اُس کا سینہ تنگ کر دیتا  
اور ایسا بھینچتا ہے گویا اُسے آسمان میں چڑھنا پڑ رہا ہے۔ اللہ اسی طرح اُن لوگوں  
پر ناپاکی مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔ <sup>۲۰۳</sup>حقیقت یہ ہے کہ یہ راستہ تیرے  
پروردگار کا سیدھا راستہ ہے۔ <sup>۲۰۲</sup>(اس کی وضاحت میں) اپنی آیتیں ہم نے اُن لوگوں

<sup>۲۰۲</sup> یعنی اپنے اس قانون کے مطابق کہ ہدایت وہی پائیں گے جو ہدایت کے سچے طالب  
ہوں گے اور جو ہدایت سے گریز و فرار کے راستے تلاش کرنے میں زندگی بسر کر دیں گے، وہ لازماً  
گم راہ کر دیے جائیں گے۔

<sup>۲۰۳</sup> مطلب یہ ہے کہ کفر و شرک کی نجاست کے جو ردے انھوں نے اپنے دل و دماغ میں  
جما رکھے ہیں، وہی ان کے لیے قبول حق میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ چنانچہ اپنے مالوفات اور  
بدعات کو چھوڑنا اور اسلام کی سیدھی صاف راہ کو اختیار کرنا انھیں ایک کٹھن چڑھائی معلوم ہوتا  
ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں توفیق ہدایت سے محروم کر دیا ہے۔ اُس کا قانون  
یہی ہے کہ اسلام کے لیے وہ اُنھی کا سینہ کھولتا ہے جو اس طرح کی غلاظتوں سے اُسے پاک رکھتے  
اور حق کے سچے طالب بن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف جو تعصبات کے اسیر ہو کر رہ  
جاتے ہیں، اُن کا سینہ وہ اپنی ہدایت کے لیے تنگ کر دیتا ہے۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں یہ



بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢٤﴾

وَيَوْمَ يُحْشَرُهُمْ جَمِيعًا ۖ يَمْعَشَرُ الْجِنَّ قَدْ اسْتَكَثَرْتُمْ مِّنَ  
الْإِنْسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيُّوهُمْ مِّنَ الْإِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ

کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو یاد دہانی حاصل کریں۔ اُن کے اعمال کے صلے  
میں اُن کے پروردگار کے ہاں اُن کے لیے سلامتی کا گھر ہے اور وہ اُن کا کارساز  
ہے۔ ۱۲۲-۱۲۷

اُس دن کو یاد رکھو، جب وہ ان سب (مجرموں) کو اکٹھا کرے گا، (پھر فرمائے  
گا): اے جنوں کے گروہ، تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا لیا اور انسانوں

اُس کی سنت ہے اور وہ اپنی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا۔

۲۰۴ اصل الفاظ ہیں: 'هَذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا'۔ اسم اشارہ میں چونکہ فعل کے معنی  
ہوتے ہیں، اس وجہ سے 'مُسْتَقِيمًا' یہاں 'صِرَاطُ رَبِّكَ' سے حال واقع ہو گیا ہے۔

۲۰۵ اوپر فرمایا تھا: 'سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا'۔ یہ جملہ اُس کے بالکل بالمقابل آیا ہے۔  
یعنی مجرم جس انجام کو پہنچیں گے، اُس کے بالمقابل اللہ کے فرماں بردار بندوں کا صلہ یہ ہے کہ اللہ  
اُن کا ساتھی ہوگا اور وہ ہمیشہ کے لیے سکھ اور چین کے گھر میں رہیں گے۔

۲۰۶ یعنی سب کو اکٹھا کرے گا، خواہ وہ انسانوں میں سے تھے یا جنوں کے اشرار و شیطین  
میں سے جو انسانوں کو اپنی خرافات القا کرتے رہے، جیسا کہ اوپر آیت ۱۱۲ میں بیان ہوا ہے۔

۲۰۷ یہ ابلیس کے اُس قول کی طرف نہایت لطیف تلخیص ہے جس کا ذکر قرآن کے دوسرے  
مقامات میں ہوا ہے کہ آدم کی ذریت میں سے بہت تھوڑے میری تاخت سے محفوظ رہیں گے اور  
پروردگار، تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یعنی اللہ تعالیٰ ابلیس کے ان فرزند ان معنوی کو خطاب کر کے فرمائے گا کہ تم نے تو اپنے





الانعام  
۶

وَبَلَّغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ لَنَا ط قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا  
إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ط إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿١٢٨﴾ وَكَذَلِكَ نُؤَيِّدُ بَعْضَ

میں سے اُن کے ساتھی (فوراً) کہیں گے: پروردگار، ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے سے خوب حظ اٹھایا اور (آج) اپنی اُس مدت کو پہنچ گئے ہیں جو تو نے ہمارے لیے مقرر کر دی تھی... اللہ فرمائے گا: اب آگ تمہارا ٹھکانا ہے، تم اُس میں ہمیشہ رہو گے، مگر جو اللہ چاہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا پروردگار حکیم و علیم ہے۔ ہم ظالموں کو اُن کے

پیشوا ابلیس کا مشن بڑی کامیابی سے پورا کیا کہ ذریت آدم میں سے بہتوں کو اپنے فتراک ضلالت کا نچیر بنا لیا اور بڑی سعادت مند نگلی یہ اولاد آدم کہ سادہ لوحی کے ساتھ تمہارے دام فریب میں پھنس گئی۔“ (تدبر قرآن ۱۶۳/۳)

۲۰۸ یعنی اُنھوں نے ہماری عبادت، نیاز مندی اور نذروں اور قربانیوں کے مزے لیے اور ہمارے ساحروں، کاہنوں اور سیانوں نے اپنے پیش نظر مقاصد کے لیے اُن کو طرح طرح سے استعمال کیا۔ چنانچہ جن وانس، دونوں ایک دوسرے سے حظ اٹھاتے رہے۔

۲۰۹ آگے کا جملہ بتا رہا ہے کہ شیاطین انس کی یہ بات بیچ ہی میں کاٹ دی جائے گی۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”یہاں بلاغت کلام کا ایک نکتہ قابل لحاظ ہے۔ شیاطین انس یہ بات بطور اعتراف جرم اور بقصد اظہار ندامت کہیں گے اور یہ تمہید باندھ کر وہ اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کرنا چاہیں گے، لیکن اسلوب کلام صاف شہادت دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی بات تمہید پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دے گا اور اُن کو معذرت اور درخواست معافی کا موقع دیے بغیر ہی اپنا فیصلہ سنا دے گا کہ النَّارُ مَثْوَاكُمْ، خَالِدِينَ فِيهَا، بس اب تمہارا ٹھکانا یہی دوزخ ہے جس میں تمہیں ہمیشہ رہنا ہے، اب باتیں بنانے کی کوشش نہ کرو، عذر، معافی، توبہ اور اصلاح، سب کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۱۶۳/۳)



الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿١٢٩﴾ يَمْعَشَرُ الْجِنَّ وَالْإِنْسِ  
أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمُ آيَاتِي وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ

کرتوتوں کے باعث اسی طرح ایک دوسرے پر مسلط کر دیتے ہیں۔ اے جنوں اور انسانوں کے گروہ، کیا تمہارے پاس خود تمہارے اندر سے وہ پیغمبر نہیں آئے تھے جو میری آیتیں تمہیں سناتے اور تمہارے اس دن کی ملاقات سے تمہیں خبردار کرتے تھے؟ وہ

۲۱۰ یہ استثناء قابل توجہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان مجرموں کے جہنم رسید ہو جانے کے بعد تمام معاملات صرف خدا کی مشیت پر منحصر ہوں گے اور اُس کی مشیت اُس کے علم و حکمت کے تحت ہے جس کا تقاضا ہوا تو وہ اُن کی سزا میں تخفیف بھی کر سکتا ہے اور اُنہیں خاک یا راکھ بنا کر ہمیشہ کے لیے اسی جہنم کی مٹی میں دفن بھی کر سکتا ہے۔ یہ سراسر اُس کی مشیت پر مبنی ہے۔ اُس کے سوا کسی کے لیے امید کا کوئی دروازہ کھلا نہیں رہے گا۔ استاذ امام کے الفاظ میں کسی کی سعی، کسی کی سفارش، کسی کا زور، کسی کی فریاد کچھ کارگر نہ ہوگی، اختیار اور ارادے کی ساری حدیں ختم ہو جائیں گی، توبہ اور اصلاح اور حسرت و ندامت کی مہلتیں گزر جائیں گی، واحد چیز جو کارفرما ہوگی، وہ خدا کی مشیت ہے اور اپنی مشیت کے بھیدوں کو وہی جانتا ہے۔ وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ اور حکیم و علیم ہے۔

۲۱۱ یہ سوال قطع عذر کے لیے ہوگا۔ ضمناً یہ بات بھی اس سے معلوم ہوئی کہ پیغمبر جس طرح انسانوں میں بھیجے گئے، اُسی طرح جنوں میں بھی اُن کے اندر سے بھیجے گئے۔ اس کے لیے اصل میں 'أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اس باب میں بالکل صریح ہیں اور یہی بات اُس قاعدے کے مطابق بھی ہے جو نبیوں کی بعثت سے متعلق قرآن کے دوسرے مقامات میں بیان ہوا ہے کہ وہ جن کی طرف بھیجے جاتے ہیں، اُنہی کے اندر سے بھیجے جاتے ہیں۔

آیت میں لفظ 'يَقُصُّونَ' بھی قابل توجہ ہے۔ اس کے معروف معنی سرگزشتیں سنانے کے ہیں، لیکن یہاں یہ آیتیں سنانے کے لیے آیا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:





الانعام  
۶

يَوْمَكُمْ هَذَا قَالُوا شَهِدْنَا عَلَى أَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمْ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا  
وَشَهِدُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ ﴿١٣٠﴾ ذَلِكَ أَنْ لَمْ يَكُنْ  
رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَى بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا غَافِلُونَ ﴿١٣١﴾ وَلِكُلِّ دَرَجَةٍ  
مِمَّا عَمِلُوا وَمَا رُبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٢﴾ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ  
ذُو الرَّحْمَةِ إِنَّ يَشَاءُ يَذْهَبَكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ

کہیں گے: ہم خود اپنے خلاف گواہ ہیں۔ (ان پر افسوس)، دنیا کی زندگی نے انہیں  
دھوکے میں ڈالے رکھا اور اب خود اپنے خلاف گواہی دے رہے ہیں کہ وہ منکر تھے۔ ہم  
نے یہ پیغمبر اسی لیے بھیجے تھے کہ تمہارا پروردگار بستیوں کو اُن کے ظلم کی پاداش میں  
ہلاک کرنے والا نہیں ہے، جب کہ اُن کے باشندے (حقیقت سے) بے خبر ہوں۔ ان  
میں سے ہر ایک کے درجے اب اُس کے عمل کے مطابق ہیں اور جو کچھ یہ کرتے رہے  
ہیں، تمہارا پروردگار اُس سے ناواقف نہیں ہے۔ تمہارا پروردگار بے نیاز ہے، وہ  
رحمتوں والا ہے۔ اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور تمہارے بعد تمہاری جگہ جس کو

”...ہمارے نزدیک یہاں یہ لفظ اس وجہ سے استعمال ہوا ہے کہ آیات سے یہاں مراد

آیات انذار ہیں جن کا غالب حصہ مکذین و منکرین کے انجام اور اُن کی سرگذشتوں کے بیان پر مشتمل  
ہوتا ہے۔ یہاں موقع محل اسی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن سے جو سوال فرمائے گا، اُس کا مطلب یہی  
ہوگا کہ کیا تمہیں میرے رسولوں نے جھٹلانے والوں کے انجام اور اس دن کی آمد سے خبردار  
نہیں کیا تھا کہ تم نے اپنے آپ کو اس ابدی ہلاکت میں ڈالا؟“ (تدبر قرآن ۱۶۶/۳)

۲۱۲ آگے جو بات فرمائی ہے، یہ جملہ اُس کی تمہید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ایک ہی وقت  
میں بے نیاز بھی ہے اور رحیم و کریم بھی۔ لوگوں کی ہدایت کا جو اہتمام اُس نے کیا ہے اور اپنے پیغمبر  
کے ذریعے سے ایمان و اسلام کی دعوت اُنہیں دی ہے تو اس لیے نہیں دی کہ اس کے بغیر اُس کا



كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ﴿١٣٣﴾ إِنَّ مَا تُوْعَدُونَ  
لَأَتِيٌ ۖ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿١٣٤﴾ قُلْ يَقَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي

چاہے، لے آئے، جس طرح اُس نے دوسرے لوگوں کی نسل سے تمہیں اٹھایا ہے۔ (یاد رکھو)، جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے، وہ آ کر رہے گی اور تم (خدا کو) عاجز نہیں کر

کوئی کام رکا ہوا ہے۔ کسی کے ماننے سے نہ اُس کا کچھ بنتا ہے اور نہ انکار کر دینے سے کچھ بگڑتا ہے۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز اور اپنی مخلوقات سے مستغنی ہے۔ اُس نے یہ اہتمام صرف اس لیے کیا ہے کہ بے نیاز ہونے کے ساتھ وہ رحمت والا بھی ہے اور اُس کی اس صفت کا تقاضا ہے کہ اتمام حجت کے بغیر کسی کو نہ پکڑے۔ چنانچہ وہ پوری مہلت دیتا، ہر لحاظ سے خبردار کرتا اور اُس کے بعد ہی لوگوں کی گرفت کا فیصلہ سناتا ہے۔

۲۱۳ مدعا یہ ہے کہ اپنی تاریخ سے سبق لو۔ خدا اگر تمہارے آبا کی نسل سے تمہیں پیدا کر سکتا ہے تو دوسروں کو تمہاری جگہ لے آنا بھی اُس کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہ صرف اُس کی رحمت ہے جو تمہیں باقی رکھے ہوئے ہے۔ وہ پکڑ بھی سکتا ہے اور تمہیں فنا کے گھاٹ بھی اتار سکتا ہے۔ اُسے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ تم نہ رہے تو اُس کی دنیا بے آباد ہو جائے گی۔ وہ اپنی دنیا کے لیے جو مخلوق چاہے گا اور جب چاہے گا، پیدا کر لے گا۔

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے آیت میں زبان کے ایک نکتے کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

”...فرمایا کہ وَيَسْتَخْلِفُ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ، حالاں کہ بظاہر مَنْ يَشَاءُ ہونا

تھا، اس لیے کہ مَا کا غالب استعمال بے جان چیزوں ہی کے لیے ہے۔ میرے نزدیک مَنْ کی

جگہ مَا کا استعمال اللہ تعالیٰ نے اپنی کامل قدرت کے اظہار اور قریش کے غرور پر ضرب لگانے

کے لیے فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی قوت و سطوت پر کیا اترا رہے ہو، خدا کی قدرت تو وہ





الانعام  
۶

عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ مَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿۱۳۵﴾

سکتے۔ (اے پیغمبر)، کہہ دو کہ میری قوم کے لوگو، تم اپنے طریقے پر چلو، میں اپنے طریقے پر چل رہا ہوں۔ سو عنقریب تم جان لو گے کہ اگلے گھر کا اچھا انجام کس کے لیے ہے۔<sup>۲۱۶</sup> حقیقت یہی ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پائیں گے۔<sup>۲۱۷</sup> ۱۳۵-۱۳۸

ہے کہ وہ تمہارے اس صحرا کی جس چیز کو چاہے، تمہاری جگہ لینے کے لیے اٹھا کھڑی کرے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے بھی ایک جگہ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم اس بات پر گھمنڈ نہ کرو کہ تم ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہو، میرا خداوند چاہے تو ریگستان کے ذروں سے ابراہیم کے لیے اولاد کھڑی کرے۔ بعینہ یہی زور قرآن کے اس اسلوب میں مضمر ہے، بلکہ قرآن کا اسلوب اپنی تعلیم کے پہلو سے زیادہ زور دار ہے۔“ (تذبر قرآن ۳/۱۶۸)

۲۱۴ یعنی وہ عذاب بھی جو رسول کے مکذبین پر اسی دنیا میں آتا ہے اور وہ یوم الحساب بھی جس کے بوجھ سے آسمان پھٹا پڑ رہا ہے اور جس کے لیے کسی وقت بھی صور پھونکا جاسکتا ہے۔ ۲۱۵ آیت میں ایک مقابل حذف ہو گیا ہے، یعنی اِنِّیْ عَامِلٌ عَلٰی مَّكَانَتِیْ۔ لفظ مَّكَانَةٌ کے اصل معنی تو جگہ، منزلت اور مقام کے ہیں، لیکن طریقہ کا مفہوم چونکہ اس کے لوازم میں سے ہے، اس لیے موقع کلام کی رعایت سے اس کے اندر آپ سے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ صاف صاف اعلان براءت اور نہایت واضح دھمکی ہے جو آگے کے جملوں سے بالکل نمایاں ہو جاتی ہے۔

۲۱۶ اصل میں لفظ عَاقِبَةُ آیا ہے۔ اس کے معروف معنی انجام کے ہیں، لیکن بعض اوقات یہ انجام خیر و فلاح کے معنی میں بھی آ جاتا ہے، اس لیے کہ اصل انجام تو انجام فلاح و سعادت ہی ہوتا ہے۔

۲۱۷ یہ نہیں فرمایا کہ تم فلاح نہیں پاؤ گے یا ہم لازماً فلاح پائیں گے، بلکہ صرف یہ فرمایا ہے کہ



وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَذَا لِشُرَكَائِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَى شُرَكَائِهِمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿١٣٦﴾ وَكَذَلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَائِهِمْ

(ان کا ظلم اس حد کو پہنچ چکا ہے کہ) اللہ کے لیے انھوں نے خود اُسی کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور چوپایوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا ہے، بزعم خود، اور یہ ہمارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے۔ پھر جو ان کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے، وہ تو اللہ کو نہیں پہنچ سکتا اور جو اللہ کا ہے، وہ ان کے شریکوں کو پہنچ سکتا ہے۔ کیا ہی برے فیصلے ہیں جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے مشرکوں

ظالم کبھی فلاح نہیں پائیں گے۔ اس اسلوب میں کیا بلاغت ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”... یہ اسلوب بیان حکمت و دعوت کے نقطہ نظر سے بھی نہایت موثر ہے اور یہ اُس خشیت و توکل پر بھی دلیل ہے جو انبیاء و صالحین کے اندر ہوتی ہے۔ جو چیز پردہ غیب میں ہے، جس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے، جس کی راہ میں ابھی معلوم نہیں کتنی دشوار گزار گھاٹیاں پار کرنی اور کتنی پرخطر وادیاں قطع کرنی ہیں، اُس کے باب میں جو بات کہی جاسکتی ہے، وہ اسی حد تک کہی جاسکتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر کوئی دعویٰ کرنا بندگی اور خشیت الہی کے خلاف ہے۔“

(تدبر قرآن ۱۷۰/۳)

۲۱۸ اس کی صورت یہ تھی کہ بتوں کے نام کی بکری مر جائے یا چوری ہو جائے یا اُن کے نام کا غلہ چوہے کھا جائیں یا اور کوئی حادثہ ہو جائے تو اُس کی تلافی لازماً خدا کے حصے میں سے کر دی جائے گی، لیکن اگر اس طرح کی کوئی آفت خدا کے نام پر نکالے ہوئے حصے پر آ جائے تو اُس کی





الانعام  
۶

لِيُرَدُّوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ط وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ  
وَمَا يَفْتَرُونَ ﴿١٣٨﴾ وَقَالُوا هَذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرَّتْ حِجْرٌ ط لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا  
مَنْ نَشَاءُ بِنِعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَا يَذْكُرُونَ  
اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءٌ عَلَيْهِ ط سَيَجْزِيهِمْ بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿١٣٨﴾

کے لیے اُن کی اولاد کے قتل کو اُن کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں نے خوش نما بنا دیا ہے،  
اس لیے کہ اُن کو برباد کر ڈالیں اور اس لیے کہ اُن کے دین کو اُن کے لیے مشتبہ بنا دیں۔  
اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر پاتے۔ لہذا انھیں چھوڑو کہ اپنے اسی افترا میں پڑے رہیں۔  
کہتے ہیں کہ یہ چوپایے اور یہ کھیتی ممنوع ہیں، انھیں صرف وہی کھا سکتے ہیں جنھیں ہم کھلانا  
چاہیں، اپنے گمان کے مطابق۔ اسی طرح کچھ جانور ہیں جن کی پٹھیں (اُن کے نزدیک)  
حرام کر دی گئی ہیں اور کچھ جانور ہیں جن پر محض اللہ پر جھوٹ باندھ کر اللہ کا نام نہیں لیتے۔

تلافی بتوں کے حصے میں سے نہیں ہوگی۔ گویا مرجح حق اُن کے نزدیک بتوں اور شریکوں ہی کا تھا  
اور کیوں نہ ہو، دنیا کے تمام مشرکین کی نقد ضروریات اُن کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں سے وابستہ  
ہوتی ہیں۔ خدا سے اگر کچھ ملتا بھی ہے تو انھی کی وساطت سے ملتا ہے، بلکہ خدا نہ بھی دینا چاہے تو  
وہ دلوا کر چھوڑتے ہیں۔

۲۱۹ یہ سنگین جرم بعض مزعومہ جن بھوتوں کو راضی کرنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ عرب جاہلیت  
میں اُن کے استھان بنے ہوئے تھے اور اُن کے پروہت، کاہن اور مجاور لوگوں کو اُن کی ناراضی کا  
خوف دلا کر اس طرح کے جرائم اُن سے کراتے رہتے تھے۔

۲۲۰ یعنی اُس دین کو مشتبہ بنا دیں جو انھیں ابراہیم واسمعیل علیہما السلام کی وراثت میں ملا تھا۔

۲۲۱ لیکن اللہ نے نہیں چاہا، اس لیے کہ اس طرح کا جبر اُس اسکیم ہی کو باطل کر دیتا جو



وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَى  
 أَزْوَاجِنَا وَإِنْ يَكُنْ مَيِّتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ ۖ سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ  
 إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝۱۳۹ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ  
 عِلْمٍ وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ افْتِرَاءً عَلَى اللَّهِ ۖ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا  
 مُهْتَدِينَ ۝۱۴۰

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ

اللہ عنقریب اُن کی ان افترا پرداز یوں کا بدلہ اُن کو دے گا جو وہ کرتے رہے ہیں۔ اور کہتے  
 ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے، وہ ہمارے مردوں کے لیے خاص ہے  
 اور ہماری عورتوں کے لیے حرام ہے، لیکن اگر وہ مردہ ہو تو دونوں اُس (کے کھانے) میں  
 شریک ہو سکتے ہیں۔ اللہ عنقریب اُن کی ان باتوں کی سزا اُنھیں دے گا۔ بے شک، وہ  
 حکیم و علیم ہے۔<sup>۲۲۲</sup> یقیناً نامراد ہوئے وہ لوگ جنھوں نے اپنی اولاد کو محض بے وقوفی سے، بغیر  
 کسی علم کے قتل کیا اور اللہ نے جو رزق اُنھیں عطا فرمایا تھا، اُسے اللہ پر جھوٹ باندھ کر حرام  
 ٹھہرایا ہے۔<sup>۲۲۳</sup> وہ یقیناً بھٹک گئے ہیں اور ہرگز راہ راست پر نہیں رہے۔ ۱۳۶-۱۴۰

(ان کے ٹھہرائے ہوئے شریک نہیں، بلکہ) وہی اللہ ہے جس نے قسم قسم کے باغ

انسانوں کے امتحان کے لیے روبہ عمل ہے۔

<sup>۲۲۲</sup> یعنی چونکہ حکیم و علیم ہے، اس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ اُن لوگوں کو سزا نہ دے جو اُس کے  
 نام پر اس طرح کے جھوٹ گھڑتے ہیں۔

<sup>۲۲۳</sup> یہ اس لیے فرمایا ہے کہ اُن کے یہ خرافات اگر چہ مبنی تو تھے اُن کے مشرکانہ اوہام پر، لیکن  
 اُنھیں منسوب بہر حال اللہ کی طرف کیا جاتا تھا۔





وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أُكْلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۚ كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ۚ وَلَا

پیدا کیے ہیں، (ان میں سے) کچھ ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور کچھ نہیں چڑھائے جاتے۔ اسی طرح کھجور پیدا کی اور کھیتیاں اگائی ہیں جن کے طرح طرح کے پھل ہیں اور زیتون اور انار جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور الگ الگ بھی۔ ان کی پیداوار میں سے کھاؤ، جب یہ پھلیں اور ان کا حق ادا کرو، جس دن یہ کاٹے

۲۲۴ یعنی انگور وغیرہ جن کی بلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں۔

۲۲۵ یعنی خر بوزے، تربوز اور کلڑیاں جن کی بلیں زمین پر ہی پھلتی اور پھلتی پھولتی ہیں۔

سورہ عبس (۸۰) کی آیت ۲۸ میں یہی مضمون 'عَنِيبًا وَقَضْبًا' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

۲۲۶ یہاں چونکہ خدا کی توحید اور بندوں پر خدا کے حقوق کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے، اس لیے باغوں اور کھیتوں کی گونا گونی و بولمونی اور ان کی پیداوار کے تنوعات کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس کائنات میں کثرت کے اندر وحدت، گونا گونی کے اندر ہم آہنگی، اختلاف کے اندر سازگاری، ہر گوشے میں نمایاں ہے۔ مٹی، پانی، ہوا ایک ہی، لیکن اشیا گونا گوں قسم کی، رنگ مختلف قسم کے، مزے، خوشبو، قد و قامت الگ الگ۔ پھر یہ سب انسان کے لیے نعمت و برکت، غذا اور لذت ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس خالق نے ہمارے جسم کے اندر گلوکوز اور فولاد کا تقاضا ودیعت کیا، اُسی نے انار اور انگور کے دانوں کے اندر رس بھرے۔ جس نے ہماری زبان کے اندر مختلف ذائقے ودیعت کیے، اُسی نے ان اشیا کے اندر مختلف مزے پیدا کیے۔ جس نے ہماری نگاہوں کو حسن و جمال کا ذوق بخشا، اُسی نے ہر چیز کو حسن و رعنائی، دل کشی و دل ربائی کا پیکر بنا دیا۔ قرآن نے یہاں اشیا کے ظاہری تضاد و اختلاف کے اندر اسی وحدت مقصد کی



طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یہ چیز اس کائنات کے خالق اور اس کے مصرف کی توحید کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔“ (تدبر قرآن ۱۸۳/۳)

اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ بندہ اپنے پروردگار کا حق پہچانے اور اُس کا شکر گزار ہو کر زندگی بسر کرے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے، وہ بڑا ہی جواد و کریم، فیاض و مہربان، سخی اور بندہ نواز ہے۔ اُس نے بندوں میں رزق کی احتیاج رکھی تو یہ نہیں کیا کہ جیسا تیسرا پیٹ بھرنے کا سامان پیدا کر دیا ہو، بلکہ الوان نعمت کے انبار لگا دیے۔ باغ اگائے تو گونا گوں قسم کے، کھجور اور غلے پیدا کیے تو بے شمار اقسام کے، زیتون، انار اور دوسرے پھل پھول عنایت کیے تو نت نئے انواع کے۔ آخر مجرذ زندگی باقی رکھنے کے لیے تو یہ تنوعات، یہ بوقلمونیاں، شکلوں، رنگوں، ذائقوں اور مزوں کی یہ رنگ آرائیاں و رعنائیاں ناگزیر نہیں تھیں، لیکن اس دنیا کے خالق نے بغیر اس کے کہ اُس کی کوئی ضرورت ہم سے وابستہ ہو، ہمارے لیے اتنا وسیع دسترخوان بچھایا کہ ہم اُس کے لذائذ کے انواع و اقسام گننا چاہیں تو گن نہیں سکتے۔ سوچنے والوں کے لیے سوچنے کی بات ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ انسان یہ جانے کہ اُس کا رب منعم و کریم اور فیاض و مہربان ہے، جس نے بلا کسی استحقاق کے اُس کے لیے یہ سارے سامان مہیا فرمائے ہیں اور پھر اس کا فطری اثر اُس کے دل پر یہ طاری ہو کہ وہ اُس کا شکر گزار بندہ بنے اور اُس کا حق پہچانے۔ یہی شکر گزاری کا جذبہ اور حق شناسی کا احساس ہے جو تمام دین و شریعت کی بنیاد ہے۔“

(تدبر قرآن ۱۸۳/۳)

۲۲۷ اصل الفاظ ہیں: ”كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ“۔ یہاں بھی اور اس سے آگے ”يَوْمَ حَصَادِهِ“ میں بھی ضمیر واحد آئی ہے، لیکن اس سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کا ذکر ہوا ہے۔ عربی زبان میں اس طرح ضمیر یا فعل واحد آئے تو اس سے مقصود ایک ایک چیز کا حکم فرداً فرداً بیان کرنا ہوتا ہے۔





تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿٢٢٨﴾ وَمِنَ الْأَنْعَامِ حَمُولَةٌ  
وَفَرَسَاتٌ كُلُّوا مِنْ رِزْقِكُمُ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوتَ الشَّيْطَانِ

جائیں<sup>۲۲۸</sup> اور بے جا نہ اڑاؤ۔ اللہ<sup>۲۲۹</sup> (اس طرح) اڑا دینے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ سواری  
اور بار برداری کے چوپایے بھی اُسی نے پیدا کیے ہیں اور وہ بھی جو زمین سے لگے

۲۲۸ یعنی فصل کے درو کا وقت آئے تو اُس میں اللہ کا جو حق زکوٰۃ کی صورت میں قائم کیا گیا  
ہے، وہ ادا کرو۔ آیت سے واضح ہے کہ اس سے کوئی پیداوار بھی مستثنیٰ نہیں ہے، الا یہ کہ مسلمانوں  
کا نظم اجتماعی حالات کی رعایت سے کسی چیز کو مستثنیٰ قرار دے یا جن چیزوں پر زکوٰۃ وصول کرے،  
اُن کے لیے کوئی نصاب مقرر کر دے۔ یہ درحقیقت اُس نعمت الہی کا شکرانہ ہے جو کسان کو اُس کے  
پروردگار نے بخشی ہے۔ اس زمانے میں پیداوار کی جو دوسری صورتیں وجود میں آ گئی ہیں، مثلاً صنعتی  
پیداوار، فنیسیں، کرایہ اور معاوضہ خدمات وغیرہ، اُن کو بھی اس پر قیاس کرنا چاہیے اور زکوٰۃ کی وہی  
شرح اُن پر بھی عائد کرنی چاہیے جو زمین کی پیداوار کے لیے مقرر کی گئی ہے۔

۲۲۹ اس لیے کہ مال اللہ کی نعمت ہے اور اُس کے بارے میں صحیح رویہ یہی ہے کہ آدمی اعتدال  
اور کفایت شعاری کے ساتھ اُسے اپنی جائز ضرورتوں پر خرچ کرے اور جو کچھ بچائے، اُسے حق داروں  
کی امانت سمجھے اور اس امانت کو نہایت احتیاط کے ساتھ ادا کرے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... جو شخص مسرف اور فضول خرچ ہو، اُس کے اپنے ہی شوق پورے نہیں ہو پاتے، وہ  
دوسروں کے حقوق کیا ادا کرے گا۔ شیطان ارباب مال پر سب سے زیادہ حملہ اسی راہ سے کرتا  
ہے۔ وہ اُن کو طرح طرح کی آرزوؤں اور خواہشوں میں پھنساتا ہے اور وہ اُن خواہشات و  
تعیشات کے ایسے غلام ہو جاتے ہیں کہ اُن کے نزدیک ان کا درجہ ضروریات سے بھی کچھ بڑھ کر  
ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بھلا کس طرح سوچ سکتے ہیں کہ جس مال میں اُن کے یہ اللے تلے ہیں،  
اُس میں خدا کے دوسرے بندوں کے بھی حقوق ہیں؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے کتے، باز،  
شکرے تو آ سودہ رہتے ہیں، لیکن اُن کے پڑوسی بھوکے سوتے ہیں۔“ (مذہب قرآن ۱۸۵/۳)



إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿١٢١﴾

ثَمْنِيَّةَ أَزْوَاجٍ مِّنَ الصَّانِ أَثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعَزِ أَثْنَيْنِ ط قُلْ  
الذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ أُمُّ الْأَنْثَيْنِ أَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ أَرْحَامُ الْأَنْثَيْنِ ط  
نَبِّؤَنِي بِعِلْمٍ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٢٢﴾ وَمِنَ الْأِبِلِ أَثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ

ہوئے چلتے ہیں۔<sup>۲۳۱</sup> اللہ نے جو کچھ تمہیں بخشا ہے، اُس سے فائدہ اٹھاؤ اور شیطان کے  
نقش قدم کی پیروی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ ۱۲۱-۱۲۲

(تم ان چوپایوں میں سے) آٹھ نر و مادہ کو لو، دو بھیڑ کی قسم سے اور دو بکری کی قسم  
سے، پھر ان سے پوچھو کہ اللہ نے ان دونوں کے زحرام کیسے ہیں یا مادہ یا اُس بچے کو  
حرام ٹھہرایا ہے جو مادیوں کے پیٹ میں ہے؟<sup>۲۳۲</sup> مجھے کسی سند کے ساتھ بتاؤ، اگر تم سچے

۲۳۰ مثلاً، بھیڑیں اور بکریاں وغیرہ۔ باغات اور کھیتوں کا ذکر کرتے ہوئے مَعْرُوشَتٍ وَ غَيْرِ  
مَعْرُوشَتٍ کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ اُس کے مقابل میں چوپایوں کے لیے یہاں حُمُولَةٌ اور  
فَرْش کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ نہایت حسین تقابل ہے۔ یعنی جس طرح باغوں میں ایسی بلیں ہیں  
جو ٹیوں پر چڑھ جاتی ہیں، اور ایسی بھی جو زمین پر پھیلتی ہیں، اُسی طرح چوپایوں میں بڑے قد کے  
اونٹ، گھوڑے اور خچر بھی ہیں اور زمین سے لگ کر چرتے چلتے بھیڑ بکریوں کی قسم کے چھوٹے قد  
کے چوپایے بھی۔

۲۳۱ اصل میں لفظ کُلُّوا آیا ہے۔ یہ یہاں اپنے محدود معنی میں نہیں، بلکہ برتنے اور فائدہ  
اٹھانے کے وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

۲۳۲ یعنی اُس کی مشرکانہ و سوسہ اندازیوں سے متاثر ہو کر خدا کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام  
نہ ٹھہراؤ۔

۲۳۳ ثَمْنِيَّةَ أَزْوَاجٍ میں فعل امر محذوف ہے اور مدعا یہ ہے کہ یہ آٹھ نر و مادہ ہیں، ان





الانعام  
۶

اَشْنَيْنِ ط قُلْ اِنَّ الدَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اِمَّ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ  
اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ط اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ اِذْ وَصَّيْكُمْ اللّٰهُ بِهٰذَا ؕ فَمَنْ  
اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ط اِنَّ اللّٰهَ  
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

۲۳۵ ہو؟ اسی طرح دو اونٹ کی قسم سے اور دو گائے کی قسم سے، پھر پوچھو کہ اللہ نے ان  
دونوں کے زحرام کیے ہیں یا مادہ یا اُس بچے کو حرام ٹھہرایا ہے جو مادینوں کے پیٹ میں  
ہے؟ کیا تم اُس وقت حاضر تھے، جب اللہ نے تمہیں اس کی ہدایت فرمائی تھی؟ پھر  
اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے، اس لیے کہ بغیر کسی علم کے  
لوگوں کو گم راہ کرے؟ اللہ ایسے ظالم لوگوں کو کبھی راستہ نہیں دکھائے گا۔ ۱۲۳-۱۲۴

میں سے ایک ایک کو فرداً فرداً لے کر ان سے پوچھو۔

۲۳۴ مطلب یہ ہے کہ جب یہ بھی مانتے ہیں کہ اصلاً یہ جانور حلال ہیں تو پھر وہ حرمیں کہاں  
سے پیدا ہو جاتی ہیں جو ان احمقوں نے اپنے مشرکانہ توہمات سے پیدا کر رکھی ہیں کہ کسی کا کھانا  
جائز نہیں ہے، کسی پر سواری حرام ہے، کسی کو صرف مرد کھا سکتے ہیں، عورتیں نہیں کھا سکتیں اور کسی کو  
فلاں اور فلاں صورت میں دونوں کھا سکتے ہیں؟

۲۳۵ یعنی اس کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ تمہارے آباؤ ان چیزوں کو حرام سمجھتے  
رہے ہیں، بلکہ کوئی واضح علمی دلیل ہونی چاہیے جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ حرمیں عقل و فطرت  
کا تقاضا ہیں یا خدا کے کسی پیغمبر نے تمہیں اس کی ہدایت فرمائی تھی۔

۲۳۶ یہ اتمام حجت کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عقل و نقل میں تو کوئی چیز تمہارے دعووں  
کے حق میں نہیں ہے، پھر کیا یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم اُس وقت موجود تھے، جب اللہ نے ان حرموں کا  
حکم دیا تھا جو تم نے اپنے مزعومات کے تحت قائم کر رکھی ہیں؟



قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا  
 أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خَنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ  
 أَوْ فِسْقًا أُهْلًا لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ

ان سے کہہ دو، (اے پیغمبر کہ) جو وحی میرے پاس آئی ہے، اُس میں تو میں  
 نہیں دیکھتا کہ کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام کی گئی ہے، جسے وہ کھاتا ہے، سوائے<sup>۲۳۸</sup>  
 اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہو یا خون ہو یا سور کا گوشت ہو، اس لیے کہ یہ ناپاک ہیں، یا<sup>۲۳۹</sup>  
 خدا کی نافرمانی کر کے کسی جانور کو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ اس پر<sup>۲۴۰</sup>

۲۳۷ یعنی نہ اس پہلو سے راستہ دکھائے گا کہ اپنی ہدایت سے بہرہ یاب کرے اور نہ اس پہلو  
 سے کہ لوگوں کو گم راہ کر دینے کی جوہم یہ چلا رہے ہیں، اُسے کامیابی سے ہم کنار کر دے۔ اس لحاظ  
 سے دیکھیے تو یہ نہایت لطیف انداز میں دعوت حق کی کامیابی کی بشارت بھی ہے۔

۲۳۸ یعنی جو اصلاً من جملہ طیبات ہے اور کھانے والے اُسے کھانے کی چیز سمجھ کر ہمیشہ  
 کھاتے رہے ہیں۔ اس سے وہ چیزیں آپ سے آپ نکل گئیں جو ممنوعات فطرت ہیں اور انسان  
 ہمیشہ سے جانتا ہے کہ وہ کوئی کھانے کی چیز نہیں ہیں، مثلاً شیر، چیتے، ہاتھی، چیل، کوئے، گد،  
 عقاب، سانپ اور بچھو وغیرہ۔ یہی معاملہ بعض دوسرے خباثت کا بھی ہے۔

۲۳۹ اصل الفاظ ہیں: فَإِنَّهُ رِجْسٌ۔ ان میں ضمیر اگرچہ واحد ہے، لیکن اس کا تعلق تینوں ہی  
 چیزوں سے ہے۔ یہ واحد اس لیے آئی ہے کہ ایک ایک چیز کی طرف فرداً فرداً لوٹانا پیش نظر ہے۔

۲۴۰ لوگ جن چیزوں کو کھانے کی چیزیں سمجھ سکتے تھے، اُن میں سے یہی چار چیزیں اللہ تعالیٰ  
 نے حرام ٹھہرائی ہیں۔ خون کو اس لیے کہ درندگی کی طرف مائل کرتا ہے، مردار کو اس لیے کہ طبعی  
 موت مرنے سے خون رگوں ہی میں رہ جاتا ہے، سور کو اس لیے کہ اگرچہ انعام کی قسم کے بہائم  
 میں سے ہے، مگر درندوں کی طرح گوشت بھی کھاتا ہے اور ذبیحہ غیر اللہ کو اس لیے کہ یہ صریح شرک



رَبِّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٢٥﴾

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفْرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ  
وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا  
أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَٰلِكَ جَزَيْنَهُم بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا

بھی جو مجبور ہو جائے، نہ چاہنے والا ہو، نہ حد سے بڑھنے والا تو تیرا پروردگار بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۱۲۵

(یہ، البتہ ٹھیک ہے کہ) جن لوگوں نے یہودیت اختیار کر رکھی ہے، اُن پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیے تھے اور گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی تھی، سوائے اُس کے جو اُن کی پیٹھ یا انتڑیوں سے لگی ہو یا کسی ہڈی سے لگی ہوئی رہ جائے۔

ہے جس کا ارتکاب وہی کر سکتے ہیں جو خدا سے سرکش ہو گئے ہوں۔ چنانچہ جانور پاک بھی ہو تو علم و عقیدہ کی یہ نجاست اُسے ناپاک کر دیتی ہے۔ آیت میں 'فُسْقًا' کا لفظ اسی حقیقت کو بیان کرتا ہے۔

۲۴۱ اصل الفاظ ہیں: 'غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ'۔ اِن میں 'بَاغٍ' 'بَغْيٌ' سے اسم فاعل ہے۔ اِس پر 'عَادٍ' کے عطف سے واضح ہے کہ اِس کے معنی یہاں چاہنے اور طلب کرنے ہی کے ہیں۔ یہ اُس حالت اضطرار کے لیے رخصت ہے جو کھانے کی کوئی چیز میسر نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔

۲۴۲ یعنی وہ جانور جن کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ سم کی صورت میں بند ہیں اور اُن کے سامنے کے حصے پر ناخن ہیں۔ چنانچہ تورات میں اونٹ، سافان اور خرگوش کی حرمت کا ذکر اسی بنا پر ہوا ہے۔

۲۴۳ اِس کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: احبار ۳: ۱۵-۱۷ اور احبار ۷: ۲۲-۲۵۔



لَصْدِقُونَ ﴿١٣٦﴾ فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ  
وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٣٧﴾

یہ ہم نے اُن کی سرکشی کی سزا اُنھیں دی تھی اور ہم بالکل سچے ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر وہ تمھیں جھٹلائیں تو کہہ دو کہ تمھارے پروردگار کی رحمت میں بڑی وسعت ہے، لیکن (اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اُس کی دی ہوئی مہلت ختم ہو گئی تو) مجرم لوگوں سے اُس کا عذاب ٹالانا نہ جاسکے گا۔ ۱۳۶-۱۳۷

۲۴۴ مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں نہ خباثت ہیں اور نہ اصلاً کبھی حرام رہی ہیں۔ یہود کی سرکشی اور گردن کشتی تھی جس کی سزا کے طور پر یہ اُن پر حرام کی گئی تھیں۔ بائبل کے صحیفوں میں اس سرکشی کا ذکر جگہ جگہ ہوا ہے۔ سورہ بقرہ میں گائے کا قصہ بھی اسی کی مثال ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے جب ان کا حکم اُنھیں دیا تھا تو اُسی وقت وعدہ کیا تھا کہ نبی امی کی بعثت ہوگی اور وہ اُن پر ایمان لائیں گے تو یہ اصر و اغلال بھی اُن کے اوپر سے اتار دیے جائیں گے۔ چنانچہ ٹھیک اُس وعدے کے مطابق اب دین کو اصل ملت ابراہیمی پر بحال کر دیا گیا ہے اور صرف وہی حرمتیں باقی رہ گئی ہیں جو دین حق میں ہمیشہ سے رہی ہیں۔

۲۴۵ یہ الفاظ نہایت بلیغ ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے ہونے پر جو اتنا زور دیا ہے تو مقصود صرف اپنے سچے ہونے کا اظہار نہیں ہے، بلکہ اس میں حریف کے جھوٹے ہونے کا اعلان بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ملت ابراہیم اور شریعت بنی اسرائیل سے متعلق یہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے، ہم اُس میں بالکل سچے ہیں اور جو اثر خالی یہ قریش اور یہود کے مفسدین و اشرا کر رہے ہیں، یہ بالکل جھوٹے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۳/۱۹۳)

۲۴۶ اصل الفاظ ہیں: ”وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ“۔ رَبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ





الانعام  
۶

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا  
حَرَمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۖ كَذَلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّى ذَاقُوا  
بَاسَنَا ۖ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ  
إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ﴿١٣٨﴾ قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ  
فَلَوْ شَاءَ لَهَدَيْكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٣٩﴾ قُلْ هَلَمْ شُهِدَآءُكُمْ الَّذِينَ

(اس کے جواب میں) یہ مشرک اب کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے، نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھیراتے۔ اُن لوگوں نے بھی اسی طرح جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں، یہاں تک کہ اُنھوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھ لیا۔ ان سے پوچھو، تمہارے پاس کوئی علم ہے کہ ہمارے سامنے اُسے پیش کر سکو؟ (حقیقت یہ ہے کہ) تم محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔ ان سے کہو کہ اللہ کے پاس تو (تمہارے لیے) صرف حجت ہے، پہنچ جانے والی۔ پھر (یہ بھی سوچو کہ) وہ اگر چاہتا تو تم سب کو ہدایت پر لے آتا، (کبھی شرک اور گم راہی

وَأَسِيعَةً کے بعد یہ جملہ جس طریقے سے آیا ہے، اُس سے واضح ہے کہ اس کا عطف استدراک کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمہ اسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۲۳۷ یہ آخری بات ہے جو مشرکین بحث میں ہر طرف سے پسپا ہو جانے کے بعد کہتے تھے کہ اگر ہم غلطی کر رہے ہیں تو خدا کے اختیار میں تو سب کچھ ہے، وہ ہمیں اس غلطی سے روک کیوں نہیں دیتا؟ جب اُس نے نہیں روکا تو اس کے معنی یہی ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، خدا کی مرضی سے اور اُس کے حکم کے مطابق کر رہے ہیں۔

۲۳۸ یعنی خدا کی اُس اسکیم میں جو دنیا میں تمہارے امتحان کے لیے جاری کی گئی ہے، خدا کے



يَشْهَدُونَ أَنَّ اللَّهَ حَرَّمَ هَذَا ۖ فَإِنْ شَهِدُوا فَلَا تَشْهَدُ  
مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِنَا وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ  
بِالْآخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ ﴿١٥٠﴾  
قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبِّي عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا

میں نہ ڈالتا۔ ان سے کہو کہ لاؤ اپنے وہ گواہ جو (علم و عقل کی بنیاد پر) شہادت دیں  
کہ اللہ نے یہ چیز حرام ٹھیرائی ہے۔ پھر اگر وہ (ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹی) شہادت کے  
لیے کھڑے ہو جائیں تو تم اُن کے ساتھ یہ شہادت نہ دینا اور اُن لوگوں کی خواہشوں کی  
پیروی نہ کرنا۔ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلادیا ہے، جو آخرت کو نہیں مانتے اور اپنے  
پروردگار کے ہم سر ٹھیراتے ہیں۔ ۱۴۸-۱۵۰

ان سے کہو کہ آؤ، میں تمہیں سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام

پاس اب تمہارے لیے جبر نہیں، بلکہ صرف ایسی حجت ہے جو دل و دماغ میں اتر جانے والی ہے۔  
اس معاملے میں وہ تمہارے ارادہ و اختیار میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔ اُس نے تمہیں آزادی دے  
رکھی ہے۔ وہ صرف دلیل و حجت کے ذریعے سے رہنمائی فرماتا ہے۔

۲۴۹ یہ برسبیل تنزل فرمایا ہے کہ اگر خدا کو کچھ چاہنا تھا تو وہ لوگوں کی ہدایت چاہتا یا انہیں  
اپنے شریک ٹھیرانے کے لیے مجبور کرتا یا اس بات کے لیے مجبور کرتا کہ میرے پیدا کیے ہوئے  
طیبات کو حرام ٹھیراؤ؟ مطلب یہ ہے کہ احمقو، یہ تم کیسی باتیں کرتے ہو؟

۲۵۰ یعنی اُن خواہشوں کی پیروی نہ کرنا جو انہیں شرک و بدعت کی اس ضلالت میں مبتلا کر دینے  
کا باعث ہوئی ہیں۔ یہاں مشرکین کی بدعتوں کو خواہشوں کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے  
کہ جس چیز کے حق میں علم و عقل کی کوئی دلیل نہ ہو، اُس کی دلیل صرف خواہش ہی ہو سکتی ہے۔





وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۖ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِمَّنْ إِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ  
نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۖ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطْنٌ

ٹھیرایا ہے۔ یہ کہ کسی چیز کو اُس کا شریک نہ ٹھیراؤ اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، (اُن کے ساتھ کبھی کوئی برابر یہ اختیار نہ کرو) اور اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور اُن کو بھی دیں گے۔ اور فواحش کے

۲۵۱ مطلب یہ ہے کہ تمہارے پروردگار کی حرام کی ہوئی چیزیں وہ نہیں ہیں جو تم اپنے توہمات کی بنیاد پر حرام قرار دے رہے ہو، بلکہ اصل حرمتیں یہ ہیں جو اللہ نے اپنی شریعت میں قائم کی ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے جس دین پر تمہیں چھوڑا تھا، اُس میں بھی یہ سب چیزیں حرام تھیں۔ تمام شرائع الہیہ میں یہ ہمیشہ اسی طرح حرام مانی گئی ہیں۔

۲۵۲ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو الہ مانا جائے تو قرآن اپنی اصطلاح میں اُسے شرک سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو خدا کی ذات سے یا خدا کو اُس کی ذات سے سمجھا جائے یا خلق میں یا مخلوقات کی تدبیر امور میں کسی کا کوئی حصہ مانا جائے اور اس طرح کسی نہ کسی درجے میں اُسے اللہ کا ہم سر بنادیا جائے۔

پہلی صورت کی مثال سیدنا مسیح، سیدہ مریم اور فرشتوں کے بارے میں عیسائیوں اور مشرکین عرب کے عقائد ہیں۔ صوفیوں کا عقیدہ وحدت الوجود بھی اسی کے قبیل سے ہے۔

دوسری صورت کی مثال ہندوؤں میں برہما، وشنو، شیوا اور مسلمانوں میں غوث، قطب، ابدال، داتا اور غریب نواز جیسی ہستیوں کا عقیدہ ہے۔ ارواح خبیثہ، نجوم و کواکب اور شیاطین کے تصرفات پر ایمان کو بھی اسی کے ذیل میں سمجھنا چاہیے۔

۲۵۳ خدا کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا ہے۔ چنانچہ دوسرا حکم یہی بیان ہوا ہے۔ یہ اگرچہ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ ہی کے تحت ہے، لیکن قرآن نے اس کے لیے منفی کے بجائے مثبت اسلوب



اختیار کیا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...زیر بحث آیات میں اسلوب کی یہ ندرت قابل لحاظ ہے کہ بعض باتیں منفی پہلو سے بیان ہوئی ہیں، بعض مثبت پہلو سے۔ مثلاً شرک، قتل اولاد، فحشا، قتل نفس اور اکل مال یتیم کا ذکر تو منفی پہلو سے ہے اور والدین کے ساتھ احسان، ایفائے کیل و میزان، قول و عمل میں اہتمام عدل اور ایفائے عہد الہی کا ذکر مثبت اسلوب سے ہے۔ بعینہ یہی اسلوب، بعینہ انہی امور کے بیان میں بنی اسرائیل کی آیات ۲۲-۳۸ میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفی سے اثبات اور اثبات سے نفی کا استنباط ایک بدیہی چیز ہے۔ جب ایک شے کا اثباتی انداز میں حکم ہے تو اس کے لازمی معنی یہ ہیں کہ جو چیز اُس کی ضد ہے، اُس کی لازماً ممانعت ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ایک چیز کی ممانعت ہے تو اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ اُس کا مقابل پہلو مطلوب ہے۔ یعنی اگر شرک کی نہی ہے تو توحید مطلوب ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اگر والدین کے حقوق کی ادائیگی کا حکم ہے تو اُن کے ساتھ بدسلوکی اور اُن کی نافرمانی حرام ہے۔ اس اسلوب کی روشنی میں وہ تمام باتیں جو بیان تو ہوئی ہیں اثبات کے الفاظ میں، لیکن ہیں ظاہری تالیف کلام کے اعتبار سے ’حَرَم‘ ہی کے تحت، اُن سب کے ضد پہلو کو بھی مد نظر رکھیے۔ گویا پوری بات یوں ہے کہ نہ والدین کو اف کو، نہ جھڑکو، بلکہ اُن کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اس اسلوب کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں جو پہلو زیادہ زور و قوت سے ظاہر کرنے کا ہے، وہ تو الفاظ میں بیان ہو جاتا ہے اور اُس کا ضد پہلو بغیر الفاظ کی مدد کے مجرد فحوائے کلام اور اقتضائے نظام سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۱۹۸/۳)

۲۵۴ یہ عرب جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی اُس سنگ دلانہ رسم کی طرف اشارہ ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ عورت چونکہ کوئی کماؤ فرد نہیں ہے، اس لیے اُس کی پرورش کا بوجھ کیوں اٹھایا جائے۔ فرمایا ہے کہ انھیں قتل نہ کرو۔ تم اُن کے رازق نہیں ہو۔ اُن کا رزق تو درکنار، تم اپنا رزق بھی خدا ہی سے پاتے ہو۔ تمھاری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ پوری محنت کے ساتھ رزق کے اسباب پیدا کرو۔ اس کے بعد یہ خدا کا کام ہے کہ وہ ان اسباب سے تمھارے لیے کیا ثمرات و نتائج پیدا کرتا ہے۔





وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ذَلِكُمْ وَصُّكُمْ بِهِ  
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١٥١﴾ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ

قریب نہ جاؤ، خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے۔ اور کسی جان کو، جسے اللہ نے حرام ٹھیرایا ہے،  
ناحق قتل نہ کرو۔ یہ باتیں ہیں جن کی اللہ نے تمہیں ہدایت کی ہے تاکہ تم سمجھ سے کام  
لو۔ اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، مگر ایسے طریقے سے جو (اُس کے لیے)

۲۵۵ یعنی بدکاری علانیہ کی جائے یا چھپ کر، ہر حال میں حرام ہے۔ اس کے لیے جمع کا لفظ  
اس لیے استعمال فرمایا ہے کہ یہ زنا، لواطت، وطی بہائم اور اس نوعیت کے تمام جرائم کو شامل ہو  
جائے۔ پھر روکنے کے لیے 'لَا تَقْرَبُوا' کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ ایسی  
تمام باتوں سے دور رہو جو بدکاری کی محرک، اُس کی ترغیب دینے والی اور اُس کے قریب لے  
جانے والی ہوں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...لَا تَقْرَبُوا“ کا لفظ اُن برائیوں سے روکنے کے لیے قرآن میں استعمال ہوا ہے جن کا  
پرچھاواں بھی انسان کے لیے مہلک ہے، جو خود ہی نہیں، بلکہ جن کے دوائی و محرکات بھی نہایت  
خطرناک ہیں، جو بہت دور سے انسانوں پر اپنی کمند پھینکتی ہیں اور پھر اس طرح اُس کو گرفتار  
کر لیتی ہیں کہ اُن سے چھوٹنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسی برائیوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے  
میں آدمی کو کامیابی صرف اُسی صورت میں حاصل ہوتی ہے، جب وہ اپنی نگاہ، اپنی زبان، اپنے  
دل کی پوری پوری حفاظت کرے اور ہر اُس رخنے کو پوری ہوشیاری سے بند رکھے جس سے کوئی  
ترغیب اُس کے اندر راہ پاسکتی ہو اور ہر ایسے مقام سے پرے پرے رہے، جہاں کوئی لغزش ہو  
سکتی ہے۔“ (تذبر قرآن ۲۰۱/۳)

۲۵۶ انسانی جان کو جو حرمت ہر مذہب اور ہر اخلاقی نظام میں ہمیشہ حاصل رہی ہے، یہ اُس کا  
بیان ہے۔ سورہ مائدہ (۵) کی آیت ۳۲ میں صراحت ہے کہ کسی انسان کی جان دو ہی صورتوں میں لی جا





أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۚ وَأَوْفُوا بِالْكَيْلِ وَالْمِيزَانِ بِالْقِسْطِ ۚ  
لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ

بہتر ہو، یہاں تک کہ وہ سن رشد کو پہنچ جائے۔<sup>۲۵۸</sup> اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پوری رکھو۔<sup>۲۵۹</sup> ہم کسی جان پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔<sup>۲۶۰</sup> اور جب بات

سکتی ہے: ایک یہ کہ وہ کسی کو قتل کر دے، دوسرے یہ کہ نظم اجتماعی سے سرکشی کر کے وہ دوسروں کی جان و مال اور آبرو کے درپے ہو جائے۔ قرآن میں اسے فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے سوا ہر قتل ایک ناحق قتل ہے جو قرآن کی رو سے شرک کے بعد دوسرا بڑا گناہ ہے۔

۲۵۷ مطلب یہ ہے کہ سمجھ سے کام لو اور اپنی طرف سے حلت و حرمت کے فیصلے کرنے کے بجائے اصل ملت ابراہیمی کی طرف رجوع کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ احکام دیے تھے۔

۲۵۸ اس حکم کے الفاظ وہی ہیں جو اوپر فواحش سے روکنے کے لیے آئے ہیں۔ یعنی یتیم کی بہتری اور بہبود کے ارادے کے سوا اس کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ یاد رکھو کہ یتیم کے مال میں صرف وہی تصرف جائز ہے جو اس کی حفاظت اور نشوونما کی غرض سے کیا جائے اور اسی وقت تک کیا جائے، جب تک یتیم سن رشد کو پہنچ کر اپنے مال کی ذمہ داری خود سنبھالنے کے قابل نہیں ہو جاتا۔

۲۵۹ یہ ایک عظیم حکم ہے اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسی میزان انصاف کی فرع ہے جس پر یہ دنیا قائم ہے۔ چنانچہ اس سے انحراف اگر کوئی شخص کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عدل و قسط کے تصور میں اختلال واقع ہو چکا اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کا عقیدہ باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد، ظاہر ہے کہ معیشت اور معاشرت کا پورا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور تمدن کی کوئی اینٹ بھی اپنی جگہ پر قائم نہیں رہتی۔ سورہ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت ۳۵ میں اس کی برکات کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ نتیجے اور مال کار کے لحاظ سے یہی بہتر ہے اور لوگوں کے لیے اس میں بڑی برکتیں





ذَاقُرْبِي ۚ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ۖ ذَلِكُمْ وَصَّكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿١٥٦﴾

کہو تو حق کی بات کہو، اگرچہ معاملہ اپنے کسی رشتہ دار ہی کا ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ چیزیں ہیں جن کی اللہ نے تمہیں ہدایت کی ہے تاکہ تم یاد دہانی حاصل ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... آخرت میں اس کی برکات تو واضح ہیں ہی، دنیا میں بھی باعتبار مال... یہی رویہ معاش و معیشت، کاروبار اور تجارت اور عادلانہ تمدن کے فروغ کے نقطہ نظر سے بابرکت ہے۔ کوئی ڈنڈی مارنے والی قوم دنیا میں نہ فروغ پائی ہے، نہ پائے گی۔ یہ برائی کوئی منفرد برائی نہیں ہے، بلکہ یہ بہت سی برائیوں کے پائے جانے کی ایک علامت ہے۔ جس قوم کے اندر یہ برائی پائی جاتی ہے، خبر دیتی ہے کہ یہ قوم عدل و قسط کے تصور سے خالی ہے۔ اس وجہ سے یہ کسی صالح تمدن کے قیام کی صلاحیتوں سے نہ صرف محروم ہے، بلکہ یہ خدا کی زمین میں فساد کے بیج بونے والی ہے۔“ (تذبرقرآن ۳/۲۰۲)

۲۶۰ یہ ایک برسر موقع تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام بھی دیے ہیں، وہ لوگوں کی برداشت اور استطاعت سے زیادہ نہیں ہیں۔ اُس نے یہ احکام انسان کی صلاحیتوں اور اُس کی فطرت کو تول کر دیے ہیں۔ لہذا ان کو نہ اپنی استطاعت کے حدود خود طے کر کے کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور نہ احتیاط کے نام پر خود اُن کے حدود سے آگے بڑھانا چاہیے۔

۲۶۱ یہ وہی بات ہے جسے سورہ نساء (۴) کی آیت ۱۳۵ اور سورہ مائدہ (۵) کی آیت ۸ میں قیام بالقسط سے تعبیر فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بندہ مومن کو نہ صرف یہ کہ حق و انصاف پر قائم رہنا چاہیے، بلکہ یہ اگر گواہی کا مطالبہ کریں تو ان کا یہ مطالبہ لازماً پورا کرنا چاہیے۔ رشتے، ناتے، جذبات اور خواہشات، کسی چیز کو بھی اس میں رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہیے۔

۲۶۲ یہ ایک جامع بات ہے۔ عہد اللہ سے کیا جائے یا بندوں سے یا فطری طور پر بندھ جائے، وہ اللہ ہی کا عہد ہے، اس لیے کہ بندے عند اللہ اُس کے لیے مسئول ٹھہرائے گئے





وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ  
بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٥٢﴾  
ثُمَّ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ تَمَامًا عَلَى الَّذِي أَحْسَنَ

کرو۔ اور فرمایا ہے کہ یہی میرا راستہ ہے، سیدھا۔ سو اسی کی پیروی کرو اور دوسرے  
راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمہارے پروردگار کی راہ سے تمہیں الگ کر دیں۔ یہ باتیں ہیں  
جن کی اُس نے تمہیں ہدایت کی ہے تاکہ اُس کی گرفت سے بچے رہو۔ ۱۵۱-۱۵۳  
(یہ ابراہیم کا دین ہے، اس کے بعد) پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا فرمائی، اُس پر  
ہیں۔

۲۶۳ اصل الفاظ ہیں: 'لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ'۔ اوپر اسی سیاق میں 'تَعْقِلُونَ' اور آگے  
'تَتَّقُونَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...تَعْقُلُ، تَذَكَّرُ اور تَقْوٰی میں بڑا گہرا معنوی ربط ہے۔ انسان جب اندھی تقلید کی  
بیڑیوں سے آزاد ہو کر سنجیدگی سے ایک بات پر غور کرنے کا عزم کرتا ہے تو یہ تَعْقُلُ ہے۔ اس  
تَعْقُلُ سے وہ حقائق آشکارا ہوتے ہیں جو فطرت انسانی کے اندر ودیعت ہیں، لیکن انسان کی  
غفلت کی وجہ سے اُن پر ذہول کا پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے، ان حقائق کا آشکارا ہونا تَذَكَّرُ ہے۔  
یہ تَذَكَّرُ انسان کی رہنمائی تَقْوٰی کی منزل کی طرف کرتا ہے جو خلاصہ ہے تمام تعلیم و تزکیہ  
اور تمام قانون شریعت کا... اس وجہ سے جہاں تک دین کے مبادی اور اصول کا تعلق ہے، وہ  
خارج سے نہیں آتے، بلکہ انسان کی فطرت ہی سے برآمد ہوتے ہیں، بشرطیکہ انسان خدا  
کی تَذَكُّر سے بیدار ہو کر تَذَكَّرُ کرے۔ شریعت درحقیقت ہمارے ہی معدن فطرت کا  
برآمد شدہ خزانہ ہے جو ہماری گود میں ڈال دیا جاتا ہے، بشرطیکہ ہم اُس کی قدر کریں۔“

(تدبر قرآن ۳/۲۰۴)



وَتَفْصِيلاً لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ﴿١٥٣﴾

وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ

اپنی نعمت پوری کرنے کے لیے جس نے خوبی اختیار کی تھی، (دین و شریعت سے متعلق) ہر چیز کی تفصیل اور ہدایت و رحمت بنا کر، اس لیے کہ لوگ اپنے پروردگار کی ملاقات پر ایمان لائیں۔ ۱۵۴

اور اب یہ کتاب ہے، جو ہم نے اتاری ہے، خیر و برکت والی کتاب۔ سو اس کی

۲۶۴ اصل میں لفظ مُسْتَقِيمًا آیا ہے۔ اس کا نصب حال کے لیے ہے جس میں اسم اشارہ فعل کا عمل کر رہا ہے۔

۲۶۵ یہ الفاظ موسیٰ علیہ السلام کی صفت کے طور پر بالکل اُسی طرح آئے ہیں، جس طرح سورہ نجم (۵۳) کی آیت ۳۷ میں حضرت ابراہیم کے لیے 'الَّذِي وَفَّى' کے الفاظ ہیں۔ ان سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ اُن پر اگر اتمامِ نعمت ہوا ہے تو وہ اس کے مستحق تھے۔ اللہ تعالیٰ جب منصب نبوت کے لیے کسی کا انتخاب فرماتا ہے تو ایسے ہی جلیل القدر انسانوں کا انتخاب فرماتا ہے جو ظاہر و باطن میں اُس کی عنایتوں کا حق پہچانتے اور اُسے خوبی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

۲۶۶ یعنی اپنے مقصد کے لحاظ سے ہدایت اور ثمرات و نتائج کے لحاظ سے رحمت بنا کر عطا فرمائی تاکہ دنیا میں لوگ اُس کے ذریعے سے خدا کی ملاقات پر ایمان کی ہدایت پائیں اور قیامت کے دن خدا کی رحمت و عنایت کے سزاوار ہوں۔

۲۶۷ تورات کے بعد اب یہ قرآن کا حوالہ دیا ہے اور اُس کی صفت کے طور پر اصل میں لفظ مُبَارَك استعمال فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:



الانعام  
۶



تُرْحَمُونَ ﴿١٥٥﴾ اَنْ تَقُولُوا اِنَّمَا اُنْزِلَ الْكِتَابُ عَلٰى طَائِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۚ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغَفِلِينَ ﴿١٥٦﴾ اَوْ تَقُولُوا لَوْ اَنَّا اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتَابُ لَكُنَّا اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ بِآيَاتِ اللّٰهِ

پیروی کرو اور (خدا سے) ڈرتے رہو تا کہ تم پر رحمت کی جائے۔ اس لیے اتاری ہے کہ مبادا تم کہو کہ کتاب تو ہم سے پہلے کے دو گروہوں پر اتاری گئی تھی اور ہم اُن کے پڑھنے پڑھانے سے بالکل بے خبر تھے۔ یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم اُن سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ سو تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ ایک واضح حجت اور ہدایت و رحمت تمہارے پاس آگئی ہے، اب اُن سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو

”لفظ مُبْرَك“ اُس بارش کے لیے قرآن میں بار بار استعمال ہوا ہے جو زمین کی سیرابی، روئیدگی اور سرسبزی کا ذریعہ بنتی، اُس کے خزانوں اور اُس کی برکتوں کو ابھارتی اور اُس کے مردہ اور بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد اُس کو از سر نو حیات تازہ بخشتی ہے۔ قرآن کے لیے اس لفظ کے استعمال میں یہ استعارہ ہے کہ یہ بھی دنیا کو اُس کی روحانی موت کے بعد از سر نو حیات تازہ بخشنے اور شریعت و ہدایت کے خزاں رسیدہ چمن کو پھر سے بہار کی رونقوں سے معمور کرنے کے لیے نازل ہوا ہے۔“ (تذبر قرآن ۳/۲۰۶)

۲۶۸ اصل میں اَنْ تَقُولُوا کے الفاظ ہیں۔ ان سے پہلے ایک مضاف عربیت کے قاعدے سے حذف ہو گیا ہے، یعنی كَرَاهَةً اَنْ تَقُولُوا۔

۲۶۹ قرآن کے لیے یہ لفظ دو پہلوؤں سے استعمال ہوا ہے: ایک اس پہلو سے کہ قرآن آپ اپنی صداقت کی دلیل اور اس لحاظ سے بجائے خود حجت و برہان ہے۔ اُس کا کتاب الہی ہونا





الانعام  
۶

وَصَدَفَ عَنْهَا سَنَجَرِي الَّذِينَ يَصْدِفُونَ عَنْ آيَاتِنَا سُوءَ  
الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يَصْدِفُونَ ﴿١٥٥﴾ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ  
الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ  
رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ أَمِنَتْ مِنْ قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ  
فِي إِيْمَانِهَا خَيْرًا ۖ قُلِ انْتَضِرُوا إِنَّا مُمْتَظِرُونَ ﴿١٥٨﴾

اللہ کی آیتوں کو جھٹلا دیں اور اُن سے منہ موڑیں؟ جو لوگ ہماری آیتوں سے منہ موڑ  
رہے ہیں، انھیں اس روگردانی کی پاداش میں ہم عنقریب نہایت بری سزا دیں گے۔  
کیا وہ اسی کے منتظر ہیں کہ اُن کے پاس فرشتے آئیں یا تیرا پروردگار آجائے یا تیرے  
پروردگار کی نشانیوں میں سے کوئی خاص نشانی ظاہر ہو جائے؟ جس دن تیرے  
پروردگار کی نشانیوں میں سے (اس طرح کی) کوئی نشانی ظاہر ہو جائے گی، اُس دن  
کسی ایسے شخص کو اُس کا ایمان کچھ نفع نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو یا اپنے ایمان  
میں اُس نے کوئی بھلائی نہ کمائی ہو۔ کہہ دو کہ (اسی پر اصرار کرتے ہو تو) انتظار کرو، ہم  
بھی انتظار کر رہے ہیں۔ ۱۵۵-۱۵۸

کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں ہے۔ دوسرے اس پہلو سے کہ اپنی بات وہ ایسے وضوح اور قطعیت  
سے اور ایسے عقلی و فطری اور مضبوط و مستحکم دلائل کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ اُس کے مخاطبین کے  
پاس اُس کے مقابل میں کوئی عذر پیش کرنے کے لیے باقی نہیں رہ جاتا۔

۲۷۰۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اللہ کے نزدیک ایمان وہی معتبر ہے جو سمع و بصر اور دل و  
دماغ کی صلاحیتوں کو استعمال کر کے لایا جائے نہ کہ خدا اور اُس کے فرشتوں کو سامنے دیکھ کر۔



إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا أَلَسَتْ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ط  
إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿١٥٩﴾ مَنْ جَاءَ

(خدا کی بتائی ہوئی اس سیدھی راہ کو چھوڑ کر، اے پیغمبر)، جن لوگوں نے اپنے دین میں راہیں نکالیں اور فرقوں میں بٹ گئے ہیں، اُن سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں۔ اُن کا معاملہ بس اللہ کے حوالے ہے۔ سو وہی اُنھیں بتائے گا جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔

انسان کو یہ صلاحیتیں اسی لیے دی گئی ہیں کہ وہ بن دیکھے محض عقل و فطرت کے دلائل کی بنیاد پر ایمان لائے۔ قرآن میں اسی کو ایمان بالغیب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیز یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ نجات کے لیے ایمان اور عمل لازم و ملزوم ہیں۔ جس کے پاس عمل صالح کی کوئی کمائی نہیں ہے، اُسے اپنے ایمان سے بھی کسی نفع کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

۲۷۱ یعنی خدا کے اُس فیصلے کا انتظار کر رہے ہیں جو رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کے منکرین کے لیے لازماً صادر ہو جاتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...نبی اور اُس کے ساتھی جب اپنا حق ادا کر چکے ہیں، لیکن ضدی اور سرکش لوگ کسی طرح اُن باتوں پر کان نہیں دھرتے تو اُنھیں بھی فیصلہ الہی کا انتظار ہوتا ہے، کیونکہ اسی فیصلے کے ظہور کے ساتھ حق کا غلبہ وابستہ ہوتا ہے۔ اس انتظار میں اصلاً مخالفوں کی تباہی کی خواہش مضمر نہیں ہوتی، بلکہ حق کی فتح مندی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں تزکیہ و اصلاح کے مشن پر آتے ہیں۔ وہ اس کام میں اپنی پوری قوت نچوڑ دیتے ہیں۔ جن کے اندر خیر کی ادنیٰ رُمق بھی ہوتی ہے، وہ اصلاح قبول کر لیتے ہیں۔ جو بالکل اندھے بہرے بن جاتے ہیں، وہ مردوں کے حکم میں داخل ہیں جو زمین پر پڑے رہیں تو عفونت اور فساد کے سوا کچھ نہیں پھیلا سکتے۔ اس وجہ سے اُن کے فنا ہو جانے میں ہی خلق کی بہبود ہوتی ہے۔“ (تدبر قرآن ۲۰۸/۳)

۲۷۲ مطلب یہ ہے کہ خدا کی سیدھی راہ تو یہی ملت ابراہیم ہے جسے قرآن نے ایک مرتبہ پھر





الانعام  
۶

بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امْتَالِهَا ۚ وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا  
مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿١٦٠﴾

قُلْ إِنِّي هَدَيْتُ رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۚ دِينًا قِيمًا مِّلَّةَ  
إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٦١﴾ قُلْ إِنْ صَلَاتِي  
وَنُفْسِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٢﴾ لَا شَرِيكَ لَهُ ۚ

(پھر اُس کے حضور) جو نیکی لے کر آئے گا، اُس کے لیے دس گنا بدلہ ہے اور جو برائی  
لے کر آئے گا، اُس کو اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنی اُس کی برائی ہے اور ان لوگوں پر کوئی ظلم  
نہیں کیا جائے گا۔ ۱۵۹-۱۶۰

ان سے کہہ دو کہ مجھے تو میرے پروردگار نے ایک سیدھا راستہ دکھا دیا ہے —  
دینِ قیم، یعنی ملتِ ابراہیم کا راستہ، جو بالکل یک سو تھا اور ہر گز مشرکوں میں سے نہیں تھا۔  
کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا، سب اللہ پروردگارِ عالم  
واضح کر دیا ہے۔ اس کے پیرو ایک ہی جماعت تھے۔ یہود و نصاریٰ اور عرب کے مشرکین اگر اُس  
میں پگ ڈنڈیاں نکال کر گروہ گروہ بن گئے ہیں تو ان کو اب ان کے حال پر چھوڑ دو اور پوری مضبوطی  
کے ساتھ اس راہ پر قائم رہو۔ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ یہ نہیں مانتے تو تمہیں اس سے کچھ سروکار  
نہیں ہونا چاہیے۔

۲۷۳ یہ کم سے کم اجر ہے جس کا اللہ نے وعدہ فرمایا ہے۔ اس سے اُن افضال و عنایات کی نفی  
نہیں ہوتی جو دوسرے مقامات میں مذکور ہیں۔

۲۷۴ یعنی میرا راستہ یہی ہے۔ تم اگر اپنے نکالے ہوئے راستوں پر چلنے کے لیے مصر ہو تو  
چلتے رہو۔ میری بات ختم ہو گئی۔ اب جس کو خدا توفیق دے، وہ اس راستے پر آ جائے۔ مجھے تو



وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٦٣﴾ قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغَىٰ رَبًّا وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۖ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُم مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ

کے لیے ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں سب سے پہلے سراطاعت جھکانے والا ہوں۔ ان سے پوچھو، کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور پروردگار تلاش کروں، جب کہ وہی ہر چیز کا پروردگار ہے؟ (میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ تم نہیں مانتے تو جان لو کہ) ہر شخص جو کچھ کماتا ہے، اُس کا ذمہ دار وہ خود ہے اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ پھر تمھارے پروردگار ہی کی طرف تم سب کو پلٹنا ہر حال میں اسی پر چلنا ہے، اس لیے کہ میرے پروردگار نے بتا دیا ہے کہ یہی دین قیم اور یہی ملت ابراہیم ہے۔

۲۷۵ یہ نہایت خوبصورت تقابل ہے۔ بندہ مومن جیتا ہے تو روز و شب کی ہر کروٹ پر نماز میں ہوتا ہے اور مرتا ہے تو اسی آرزو میں کہ جان و مال کی جس قربانی کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہا، اُس کا پروردگار اُسے قبول کر لے۔ چنانچہ نماز کے مقابل میں زندگی اور قربانی کے مقابل میں موت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ اشارہ ہے کہ جو اس ملت پر ہے، وہ جیتا ہے تو خدا کے لیے اور مرتا ہے تو خدا کے لیے۔ اُس کی زندگی میں کوئی تقسیم نہیں ہے۔ یہ از ابتدا تا انتہا بالکل ہم رنگ اور ہم آہنگ ہے۔ خدا کا کوئی سا جھی نہیں، لَا شَرِيكَ لَهُ۔ اس وجہ سے بندے کی زندگی میں بھی کوئی سا جھی نہیں۔ یہ پوری کی پوری، بغیر کسی تقسیم و تجزیہ اور بغیر کسی تحفظ و استثناء کے صرف اللہ وحدہ لا شریک لہ کے لیے ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۱۱)

۲۷۶ یعنی یہی میری فطرت ہے اور اوپر سے بھی مجھے اسی کی ہدایت کی گئی ہے۔



تَحْتَلِفُونَ ﴿١٦٣﴾ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ  
فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ  
الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٦٤﴾

ہے۔ اُس وقت وہ تمہیں بتادے گا جس چیز میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔ (یاد رکھو کہ) وہی ہے جس نے تمہیں زمین کا اقتدار بخشا اور ایک کو دوسرے سے بلند درجے دیے تاکہ جو کچھ اُس نے تمہیں عطا فرمایا ہے، اُس میں تمہارا امتحان کرے۔<sup>۲۷۸</sup> (تم مطمئن رہو، اے پیغمبر)، تمہارا پروردگار سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بڑا بخشنے والا اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔<sup>۲۷۹</sup> ۱۶۱-۱۶۵

۲۷۷ اوپر جو کچھ فرمایا ہے، یہ اُس کی دلیل بیان کر دی ہے۔

۲۷۸ زمین کی بادشاہی ہو جو انسان کو انسان کی حیثیت سے دی گئی ہے یا مختلف قوموں اور افراد کی ایک دوسرے پر برتری، یہ سب اُسی پروردگار کی عطا کی ہوئی اور محض امتحان کے لیے ہے۔ لہذا نہ دینے میں کسی کا حصہ ہے کہ اُسے شریک ٹھہرایا جائے اور نہ استحقاق کی بنیاد پر ملی ہے کہ اس کے بل بوتے پر اطاعت کے بجائے استکبار اور سرکشی کا رویہ اختیار کیا جائے۔

۲۷۹ یہ آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات اور تسلی کے جملے پر سورہ ختم کر دی ہے کہ مطمئن رہو، یہ نہیں مانیں گے تو بہت جلد خدا کی گرفت میں ہوں گے اور مان لیں گے تو وہ غفور و رحیم ہے۔ سچے دل سے اُس کی طرف لوٹیں گے تو ان کے گناہ معاف کر دے گا اور انہیں اپنے دامن رحمت میں سمیٹ لے گا۔



## سورة الاعراف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْمَصَّ ۱ كِتَابٌ أَنْزَلَ إِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ  
مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهِ وَذِكْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ ۲ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ الْمَصَّ ہے۔ یہ کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے۔ سو اس سے، (اے پیغمبر)، تمہارے دل میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ اس لیے نازل کی گئی ہے کہ اس کے ذریعے سے (لوگوں کو) خبردار کرو اور ایمان والوں کو (اس سے) یاد دہانی ہو۔ (لوگو)،

۲۸۰ اس جملے میں مبتدا عربیت کی رو سے محذوف ہے۔ اسے کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی: 'هَذِهِ الْمَصَّ'۔ اصطلاح میں انھیں حروف مقطعات کہا جاتا ہے اور سورتوں کے شروع میں یہ ان کے نام کی حیثیت سے آئے ہیں۔ ان کے بارے میں اپنا نقطہ نظر ہم نے سورہ بقرہ (۲) کی ابتدا میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

۲۸۱ آیت کی ابتدا 'کِتَابٌ أَنْزَلَ إِلَيْكَ' کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ یہاں بھی مبتدا محذوف ہے۔ مدعا یہ ہے کہ تم نے یہ کتاب خدا سے درخواست کر کے اپنے اوپر نہیں اتروائی، بلکہ خدا نے اپنے فیصلے سے اور تمہاری کسی خواہش اور تمنا کے بغیر تم پر نازل کی ہے، اس لیے لوگ نہیں مانتے تو اس کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، سو تمہیں کوئی پریشانی بھی نہیں ہونی چاہیے۔ جس نے اسے نازل کیا ہے، وہی اس کی دعوت کو اتمام تک پہنچائے گا اور وہ سب کچھ فراہم کرے گا جو اس دعوت کو اتمام تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔ یہ وہی مضمون ہے جو سورہ طہ (۲۰) کی آیت 'مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَى' میں ہے۔





الاعراف

مَنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مَنْ دُونِهِ أُولَئِكَ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴿٣﴾  
وَكَمْ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا فَجَاءَهَا بَأْسُنَا بَيَاتًا أَوْ هُمْ قَائِلُونَ ﴿٤﴾  
فَمَا كَانَ دَعْوَاهُمْ إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا إِلَّا أَنْ قَالُوا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٥﴾  
فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ ﴿٦﴾  
فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَمَا كُنَّا غَائِبِينَ ﴿٧﴾ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ

تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تمہاری جانب اتارا گیا ہے، اُس کی پیروی کرو اور اپنے پروردگار کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کے پیچھے نہ چلو۔ (افسوس)، تم کم ہی یاد دہانی حاصل کرتے ہو۔ (اس سے پہلے) کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا تو ہمارا عذاب اُن پر رات میں اچانک ٹوٹ پڑا یا دن دھاڑے آ گیا، جب وہ آرام کر رہے تھے۔ پھر جب ہمارا عذاب اُن پر ٹوٹ پڑا تو اس کے سوا کچھ کہتے نہ بن پڑا کہ پکاراٹھے: بے شک، ہم ہی ظالم تھے۔ سو ہم اُن لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور خود رسولوں سے بھی ضرور پوچھیں گے کہ اُنھوں نے ہمارا پیغام پہنچایا تو اُنھیں کیا جواب ملا؟ پھر پورے علم کے ساتھ ہم تمام سرگذشت

۲۸۲ یعنی اس بات سے خبردار کرو کہ خدا کے پیغمبر کو جھٹلانے کے نتائج دنیا اور آخرت میں اُن کے لیے کیا ہو سکتے ہیں۔

۲۸۳ اصل الفاظ ہیں: 'وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ'۔ اس کا عطف 'لِتُنذِرَ بِهِ' پر ہے۔ یہ اضمار فعل سے منصوب اور تذکیر کے معنی میں اسم ہے، یعنی 'لِتُنذِرَ بِهِ وَتَذَكَّرَ كَبِيرًا'۔

۲۸۴ مطلب یہ ہے کہ رات کی تاریکیوں میں اور دن دھاڑے، جس وقت خدا نے چاہا، آگیا۔ اُسے نہ کوئی روک سکا اور نہ اپنے آپ کو اُس سے بچانے میں کامیاب ہوا۔



الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ ۝

انہیں کہہ سنائیں گے، آخر ہم کہیں غائب تو نہیں تھے۔ اور تول اُس روز بالکل ٹھیک ہو گی۔ پھر جن کے پلڑے بھاری ہوئے، وہی فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے رہے، وہی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا، اس لیے کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے اور اپنے اوپر ظلم ڈھاتے رہے۔ ۱-۹

۲۸۵ پیچھے اُس عذاب کا ذکر تھا جو رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد دنیا میں خدا کی دینونت کے ظہور سے آتا ہے۔ اُس سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جس طرح وہ آیا تو مجرموں کے پاس اپنے جرم کا اقرار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا، اُسی طرح جزا و سزا کا دن بھی آ کر رہے گا، جب لوگوں سے پرسش ہوگی اور رسولوں سے بھی پوچھا جائے گا کہ اُن کی دعوت کے جواب میں اُن کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا گیا؟

۲۸۶ یہ اس لیے کہ برائی کے لیے اُس روز سرے سے کوئی وزن نہ ہوگا۔ دوسرے مقامات میں یہ صراحت بھی ہے کہ قیامت میں وزن رکھنے والی چیز صرف وہ اعمال ہوں گے جو خدا کے لیے اور آخرت میں اُس کی رضا مندی حاصل کرنے کی خواہش اور ارادے کے ساتھ کیے گئے۔ اُن کے سوا تمام اعمال وہاں بے وزن ہو جائیں گے۔

۲۸۷ اصل الفاظ ہیں: 'بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ'۔ ان میں تضمین ہے، اس لیے کہ صلے اور فعل میں مناسبت نہیں ہے۔ اسے کھول دیجیے تو پوری بات اس طرح ہے: 'بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِنَا وَيَظْلِمُونَ أَنفُسَهُمْ'۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ تھوڑے الفاظ نے ایک وسیع مفہوم کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔





الاعراف

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ط  
قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ⑩

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا  
لِآدَمَ ۖ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ ط لَمْ يَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ⑪ قَالَ

(لوگو)، ہم نے اس سرزمین میں تمہیں اقتدار عطا فرمایا اور تمہارے لیے اس میں  
معاش کی راہیں کھول دی ہیں، پر تم کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔ ۱۰

(تمہاری سرگذشت یہ ہے کہ) ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا، پھر تمہاری صورتیں بنائی  
تھیں، پھر فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ۔ ۲۹۱۔ سوا بلیس کے سوا سب

۲۸۸ یعنی سرزمین حرم میں، جہاں قریش کو اختیار و اقتدار حاصل تھا۔ سورہ کے مخاطب چونکہ  
وہی ہیں، اس لیے یہاں سے تمہید اٹھائی ہے۔

۲۸۹ یہ اُن راہوں کی طرف اشارہ ہے جو ابراہیم و اسمعیل علیہما السلام کی دعاؤں اور بیت اللہ  
کے طفیل اُن کے لیے کھولی گئیں۔

۲۹۰ اس کی تفصیل قرآن کے دوسرے مقامات سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ پہلے زمین کے  
پیٹ میں انسان کا حیوانی وجود تخلیق ہوا، پھر اُس میں اپنی نسل آپ پیدا کر لینے کی صلاحیت ودیعت  
ہوئی، پھر اُس کا تسویہ کیا گیا، اس طریقے سے جو مخلوق وجود میں آئی، اُس میں سے دو کا انتخاب  
کر کے پھر اُن میں روح پھونکی گئی جس سے آدم و حوا کی صورت میں نطق و بیان کی صلاحیت اور عقل و  
شعور سے بہرہ یاب ایک نئی مخلوق، یعنی انسان کی ابتدا ہو گئی۔ یہ نوع انسانی پر گزرنے والے مختلف  
مراحل کی تفصیل ہے جن میں سے ہر مرحلے کی مدت ہزاروں سال ہو سکتی ہے۔ ہڈیوں، کھوپڑیوں اور  
ڈھانچوں کے اوراق میں سائنس دان جو کچھ پڑھ رہے ہیں، وہ یہی سرگذشت ہے، اس کا ارتقا  
کے اُس تصور سے کوئی تعلق نہیں ہے جو ڈارون نے پیش کیا تھا۔



مَا مَنَعَكَ إِلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ط قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي

سجدہ ریز ہو گئے۔ وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوا۔<sup>۲۹۳</sup> فرمایا: تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روک دیا،<sup>۲۹۲</sup> جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا؟<sup>۲۹۵</sup> بولا: میں اُس سے بہتر ہوں، تو نے

۲۹۱ یہ سجدہ تعظیم کے لیے تھا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا، اس لیے اس میں شرک کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی اطاعت کا یہ امتحان جس وجہ سے لیا، وہ یہ تھی کہ اولاً، آدم پر واضح ہو جائے کہ اصلی سرفرازی نور یا نار سے پیدا ہونے میں نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں ہے۔ لہذا اُسے بھی اپنی انانیت کو ایک طرف رکھ کر ہمیشہ حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ ثانیاً، وہ یہ سمجھ لے کہ اُسے جب اللہ تعالیٰ نے یہ درجہ دیا ہے کہ فرشتوں نے اُس کو سجدہ کیا تو یہ بات کسی طرح اُس کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ کسی برتر سے برتر مخلوق کو بھی خدا کا شریک سمجھ کر اُس کی پرستش کرے۔ بندگی اور پرستش اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے۔ وہ اگر اس حق میں کسی کو شریک کرتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کی اہانت نہیں کرتا، بلکہ خود اپنی بھی اہانت کرتا ہے۔

۲۹۲ یہ 'أَبْلَس' سے 'إِفْعِيل' کے وزن پر اُس جن کا لقب ہے جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ 'أَبْلَس' کے معنی مایوس اور غم زدہ ہونے کے ہیں۔ بعض لوگ اسے فرشتہ سمجھتے ہیں، لیکن قرآن میں صراحت ہے کہ یہ جنات میں سے تھا۔

۲۹۳ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات چونکہ اپنی خلقت کے لحاظ سے فرشتوں سے زیادہ دور نہیں ہیں، اس لیے انھیں جب سجدہ کا حکم دیا گیا تو علی السبیل التغلیب جنات بھی اس حکم میں شامل تھے۔

۲۹۴ اصل میں 'مَا مَنَعَكَ إِلَّا تَسْجُدَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'مَا مَنَعَكَ' کے بعد 'لَا' کا لانا ضروری نہیں تھا، اس لیے کہ اُس میں خود 'لَا' کا مضمون موجود ہے، لیکن لایا گیا ہے تو اس سے شدت نکیر کا مضمون پیدا ہو گیا ہے۔ یہ اسلوب ہماری اپنی زبان میں بھی موجود ہے۔





الاعراف

مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ۝۱۲ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصُّغَرِينَ ۝۱۳ قَالَ أَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمٍ يُبْعَثُونَ ۝۱۴ قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ۝۱۵ قَالَ فَبِمَا

مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُس کو مٹی سے۔<sup>۲۹۶</sup> فرمایا: اچھا تو یہاں سے اتر، اُس لیے کہ تجھے یہ حق نہیں کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے، سو نکل جا، یقیناً تو ذلیل ہے۔<sup>۲۹۸</sup> بولا: مجھے اُس دن تک مہلت دے،<sup>۲۹۹</sup> جب لوگ اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا: تجھے مہلت ہے۔<sup>۳۰۰</sup> بولا:

۲۹۵ مطلب یہ ہے کہ اِس سجدے کا حکم چونکہ میں نے دیا تھا، اِس لیے یہ سجدہ آدم کو نہیں، بلکہ درحقیقت مجھے تھا۔ لیکن اِس کے باوجود امتثال امر کے بجائے تو نے سرکشی اختیار کی، آخر کیوں؟

۲۹۶ اِس سے واضح ہے کہ عز و شرف کو نسل و نسب پر مبنی سمجھنے کا فلسفہ ابلیس کی ایجادات میں سے ہے۔ جو لوگ اِس بنیاد پر اکڑتے اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں، وہ درحقیقت اُسی کے پیرو ہیں۔  
۲۹۷ یہ خدا کی بارگاہ سے اترنے کا حکم ہے، جہاں جنات اور فرشتے، سب اُس کے حضور میں اُس سے ہم کلام تھے۔

۲۹۸ مطلب یہ ہے کہ ہماری بارگاہ میں سرکشی اور تکبر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اِس جرم کا ارتکاب کر رہے ہو تو اِس کی سزا دائمی ذلت ہے۔ یہاں سے نکل جاؤ، اب اِسی ذلت میں رہو گے۔ ہماری بارگاہ کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے ہیں۔

۲۹۹ یعنی اِس بات کی مہلت کہ میں یہ ثابت کر سکوں کہ انسان کو جو شرف بخشا گیا ہے، وہ فی الواقع اُس کا اہل نہیں ہے۔

۳۰۰ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ابلیس اور اُس کی ذریت کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے یہ مہلت دے دی ہے کہ وہ انسان کو بہکانے اور ورغلانے کے لیے جو کچھ کر سکتا ہے، کر لے۔ انسان



أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ ثُمَّ لَا تَجِدُنَهُمْ  
مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ

پھر اس لیے کہ تو نے مجھے گم راہی میں ڈالا ہے، اب میں بھی اولاد آدم کے لیے ضرور تیری  
سیدھی راہ پر گھات میں بیٹھوں گا۔ پھر ان کے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر

کے شرف و مزیت کے معاملے کا فیصلہ اس کے نتیجے میں قیامت پر ملتوی ہو گیا ہے۔ اب وہیں  
معلوم ہوگا کہ اس جنگ میں کون جیتتا اور کون ہارتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہی وہ موڑ ہے، جہاں سے انسان کی زندگی کا رزار امتحان میں داخل ہوتی ہے۔ شیطان  
نے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، اپنا پورا زور اس بات کے لیے لگانے کا منصوبہ بنایا کہ وہ انسان کو  
نااہل و نالائق ثابت کر دے اور انسان کی سعادت و کامرانی اس بات میں ٹھیری کہ وہ یہ ثابت  
کرے کہ فی الواقع وہ اس کا اہل ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۳۲)

۳۰۱ یعنی میں خود گم راہ نہیں ہوا، بلکہ تو نے حکم ہی ایسا دیا تھا جس کا امتثال میرے لیے ممکن  
نہیں تھا۔ چنانچہ میں اگر گم راہ ہوا ہوں تو اس گم راہی پر، معاذ اللہ، تو نے مجھے مجبور کیا ہے۔ آگے کی  
آیات سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ  
یہ ایک کھلی ہوئی سفیہانہ بات تھی جس کا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

۳۰۲ اس سے توحید کی راہ مراد ہے اور ابلیس نے یہ چیلنج اللہ تعالیٰ کو دیا ہے کہ وہ جنت الفردوس  
کے لیے صالحین کے انتخاب کی اُس اسکیم کو ناکام بنا دے گا جو انسان کی تخلیق سے اللہ کے پیش نظر  
ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... انسان کی فطرت اور خدا میں براہ راست ربط ہے۔ فطرت کی راہ میں غیر فطری کج بیچ نہ  
پیدا کر دیے جائیں تو انسان توحید کے سوا کوئی اور راہ نہیں اختیار کر سکتا۔ اس وجہ سے توحید کو  
قرآن میں بھی اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں بھی صِرَاطُ مُسْتَقِيمٍ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔  
جب تک انسان اس راہ پر قائم رہتا ہے، اُس وقت تک وہ سست رو اور آبلہ پا ہو کر بھی رو بہ منزل





الاعراف

وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ﴿١٤﴾ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا  
مَّدْحُورًا ۚ لِمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمَلُنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٥﴾

طرف سے ضرور ان پر تاخت کروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔ فرمایا: نکل جا یہاں سے، ذلیل اور راندہ۔ (یاد رکھ کہ) ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے، میں بھی ضرور تم سب سے اکٹھے جہنم کو بھر دوں گا۔ ۱۱-۱۸

رہتا ہے، اس وجہ سے دیر سویر منزل پر پہنچ ہی جاتا ہے۔ برعکس اس کے، اگر وہ شرک کے کسی موڑ کی طرف مڑ جائے تو اصل منزل سے روگرداں ہو جاتا ہے اور پھر جتنے قدم بھی وہ آگے بڑھتا ہے، اُس کا سفر کسی 'ضَلَالٌ بَعِيدٌ' ہی کی راہ میں ہوتا ہے۔ یہ رمز ہے جس کے سبب سے شیطان کو انسان پر پوری فتح حاصل کرنے کا اُس وقت تک موقع نہیں ملتا، جب تک وہ اُس کو توحید کی شاہراہ سے ہٹا کر شرک کی کسی پگ ڈنڈی پر نہ ڈال دے۔ چنانچہ اُس نے اپنے چیلنج میں آشکارا الفاظ میں بتا دیا کہ وہ انسان کی گھات میں توحید کی راہ پر بیٹھے گا اور اس راہ سے اُس کو بے راہ کرنے کی کوشش کرے گا۔" (تدبر قرآن ۳/۲۳۲)

۳۰۳ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شیطان نے یہ چیلنج کس عزم و ارادے سے اور کس زور اور طنطنے کے ساتھ دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ بیان ہے شیطان کے حملے کی قوت، وسعت اور ہمہ گیری کا خود اُس کی زبان سے۔ وہ ہر جہت، ہر سمت، ہر پہلو سے انسان پر حملہ کرے گا۔ وہ اُس کے مشاہدات، احساسات، جذبات، خواہشات ہر منفذ سے اُس کے اندر گھسنے کی کوشش کرے گا۔ وہ اُس کے فکر، فلسفہ، علم، ادراک ہر چیز کو مسموم کرے گا۔ وہ اُس کی تحقیق، تنقید، تصنیف، تالیف، ادب، آرٹ، لٹریچر، ہر چیز میں اپنا زہر گھولے گا، وہ اُس کے تہذیب، تمدن، معیشت، معاشرت، فیشن، کلچر، سیاست اور مذہب ہر چیز کے اندر فساد برپا کرے گا۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۳۳)

۳۰۴ اس جملے کا ٹھیک ٹھیک مطلب یہ ہے کہ تو اُن کی اکثریت کو توحید پر قائم نہیں پائے گا۔



وَيَادُمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا  
وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ①۹ فَوَسَّوَسَ لَهُمَا  
الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوَاتِهِمَا وَقَالَ

(ہم نے آدم سے کہا): اے آدم، تم اور تمھاری بیوی، دونوں اس باغ میں رہو اور  
اس میں سے جہاں سے چاہو، کھاؤ۔ ہاں، البتہ تم دونوں اس درخت کے پاس نہ جانا،  
ورنہ ظالم ٹھہرو گے۔ پھر شیطان نے انھیں بہکایا کہ اُن کی شرم گاہوں میں سے جو چیز اُن

اس لیے کہ وہ جب خدا کی نعمتوں اور اُس کے افضال و عنایات کے لیے اُس کے شکر گزار نہیں ہوں  
گے تو دوسروں کے ہوں گے اور انھیں معبود بنا کر اُن کی پرستش کرنے لگیں گے۔

۳۰۵ یہ پوری بے نیازی اور شان کبریائی کے ساتھ شیطان کے چیلنج کا جواب بھی ہے اور اُس  
فیصلے کا دو ٹوک اظہار بھی جس میں کسی رو رعایت کی گنجائش نہیں ہے۔

۳۰۶ یہ غالباً اسی دنیا کا کوئی باغ تھا جسے آدم و حوا کا مستقر قرار دیا گیا۔ اس میں جو امتحان  
انھیں پیش آیا، اُس سے دونوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ شیطان اُن پر حملہ کرے گا تو کہاں سے  
کرے گا۔

۳۰۷ سورہ طہ (۲۰) کی آیت ۱۲۰ میں اسے 'شَجَرَةُ الْخُلْدِ' کہا گیا ہے۔ اس سے واضح  
ہے کہ لفظ 'الشَّجَرَةُ' یہاں مجازی مفہوم میں ہے۔ 'شَجَرَةُ الْخُلْدِ' کے لفظ سے جو معنی ظاہر  
ہوتے ہیں اور اس درخت کا پھل کھانے کے جو اثرات آگے بیان ہوئے ہیں، دونوں اس بات کی  
طرف صاف اشارہ کرتے ہیں کہ اس سے مراد وہی شجرہ تناسل ہے جس کا پھل کھانے کے  
باعث انسان اس دنیا میں اپنے آپ کو باقی رکھے ہوئے ہے، لیکن آج بھی دنیا میں اُس کے لیے  
سب سے بڑی آزمائش اگر کوئی ہے تو یہی درخت ہے۔ آگے کی آیتوں سے مزید واضح ہو جائے  
گا کہ شیطان سب سے بڑھ کر اسی کو فتنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کو ایک





الاعراف

مَا نَهَكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَنْ تَكُونَا مَلَكَينِ أَوْ تَكُونَا  
مِنَ الْخَالِدِينَ ۝ وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ ۝

سے چھپائی گئی تھی، وہ اُن کے لیے کھول دئے۔ اُس نے اُن سے کہا: تمہارے رب  
نے تمہیں اس درخت سے صرف اس وجہ سے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمہیں  
ہمیشہ کی زندگی حاصل نہ ہو جائے۔ اُس نے قسمیں کھا کر اُن سے کہا کہ میں تمہارا سچا

دوسرے کا لباس قرار دیا اور اُنہیں اجازت دی کہ وہ یہ لباس پہن کر اس درخت کا پھل کھائیں،  
لیکن شیطان ہمیشہ اُنہیں اس لباس کے بغیر ہی اس کا پھل کھانے کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔  
۳۰۸ یعنی جنسی تِلْذُذْ جس سے آدم و حوا ابھی واقف نہیں ہوئے تھے۔

۳۰۹ ابلیس نے یہ لالچ دے کر آدم و حوا کو اُس درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی۔ چنانچہ  
اس پھل کی خواہش میں جو غیر معمولی کیفیت انسان پر طاری ہو جاتی ہے، اُس سے مغلوب ہو کر وہ  
شیطان کے فریب میں آگئے اور یہ پھل کھا بیٹھے۔ شیطان کی اس بات میں، اگر غور کیجیے تو اتنی سچائی  
بھی ہے کہ یہ اُسی درخت کا پھل ہے جس کے کھانے سے دنیا میں انسان کی زندگی کا تسلسل قائم  
ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کے ایک اور پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے  
ہیں:

”... اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے سجدے سے مشرف ہونے کے باوجود آدم علیہ  
السلام فرشتوں کے مرتبے کو اپنے سے اونچا سمجھتے تھے۔ نیز وہ یہ جانتے تھے کہ یہ زندگی جو اُن کو  
حاصل ہوئی ہے، ابدی زندگی نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شیطان اُن کو ان دونوں چیزوں کے نام  
پر ورغلانے کی کوشش میں کامیاب نہ ہوتا۔“ (تذبر قرآن ۳/۲۳۵)

۳۱۰ اصل میں 'قَاسَمَهُمَا' کا لفظ آیا ہے۔ 'أقسم' کے بجائے اس لفظ کا استعمال یہاں  
تکثیر اور مبالغے کے لیے ہے، یعنی بار بار قسمیں کھا کر یقین دلایا۔ عربی زبان کے افعال میں  
حروف کی زیادتی جس طرح معنی میں فرق پیدا کرتی ہے، اُسی طرح لفظ کے معنی میں محض شدت،



فَدَلُّهُمَا بِغُرُورٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا  
يَخْصِفْنَ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۖ وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا  
عَنْ تِلْكَمَا الشَّجَرَةِ وَأَقُلُّ لَكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ ٢٢  
قَالَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا ۖ وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ  
الْخَاسِرِينَ

خیر خواہ ہوں۔ اس طرح فریب دے کر اُس نے دونوں کو رفتہ رفتہ مائل کر لیا۔ پھر جب اُنھوں نے درخت کا پھل چکھا تو اُن کی شرم گاہیں اُن پر کھل گئیں اور وہ اُس باغ کے پتوں سے اپنے جسم ڈھانکنے لگے۔ (اُس وقت) اُن کے پروردگار نے اُنھیں پکارا کہ کیا میں نے تمھیں اس درخت سے روکا نہیں تھا اور تم سے کہا نہیں تھا کہ شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے؟ دونوں بول اٹھے: پروردگار، ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اب اگر تو

تکثیر اور مبالغے کا فائدہ بھی دیتی ہے۔

۱۱۱ اصل الفاظ ہیں: 'فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ'۔ ان میں مضاف عربیت کے قاعدے سے

محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۱۱۲ یعنی اُن کے بارے میں یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ صرف رفع حاجت کا ذریعہ نہیں ہیں،

بلکہ ایک دوسری چیز بھی ان کے اندر چھپی ہوئی ہے جو ان کا پھل کھانے کے بعد ہی کھلتی ہے۔

۱۱۳ اس سے واضح ہے کہ جنس اور جنسی اعضا کے ساتھ شرم کا احساس انسان کی فطرت میں

ودیعت ہے۔ یہ کوئی اکتسابی چیز نہیں ہے اور نہ تہذیب کے ارتقا سے مصنوعی طور پر پیدا ہوئی ہے،

بلکہ ایک ایسا احساس ہے جو خدا نے انسان کے اندر الہام کر دیا ہے۔ جنس کے معاملات سے

واقف ہوتے ہی یہ آپ سے آپ نمایاں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انسان اپنے اُن اعضا کو ڈھانکنے کی

کوشش کرتا ہے جو اُس کے لیے جنسی تلذذ کا ذریعہ بنتے ہیں۔

۱۱۴ یہ اُن تنبیہات کا حوالہ دیا ہے جو اوپر آیات ۱۷-۱۹ میں گزر چکی ہیں۔



الْخَسِرِينَ ﴿٢٣﴾ قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ  
مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٢٤﴾ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ  
تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ﴿٢٥﴾



الاعراف

ہماری مغفرت نہ فرمائے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم ضرور نا مراد ہو جائیں گے۔<sup>۳۱۵</sup>  
فرمایا: (یہاں سے) اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو<sup>۳۱۶</sup> اور تمہیں ایک خاص وقت  
تک زمین پر ٹھہرنا ہے اور وہیں گزر بسر کرنی ہے۔ فرمایا: تم اسی میں جیو گے، اسی میں  
مرو گے اور اسی سے نکالے جاؤ گے۔<sup>۳۱۸</sup> ۱۹-۲۵

۳۱۵ یہ اُس توبہ کی بہترین مثال ہے جس کا ذکر سورہ نساء (۴) کی آیت ۱۷ میں ہوا ہے اور  
جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ اُسے لازماً قبول کر لیتا ہے۔

۳۱۶ اصل میں لفظ 'اهبطوا' استعمال ہوا ہے۔ اس میں اترو کا مفہوم وہی ہے جو سورہ بقرہ  
(۲) کی آیت ۶۱ کے الفاظ 'اهبطوا مضراً' میں ہے، یعنی اے آدم و حوا اور ابلیس، تم سب اس  
باغ سے نکل کر زمین میں اتر جاؤ۔

۳۱۷ یعنی ابلیس تمہارا دشمن ہے اور تم اُس کے دشمن ہو۔ تمہارے اور اُس کے درمیان فطری  
تعلق دشمنی کا ہے، لہذا تم کو ہمیشہ اُسے اپنا دشمن ہی سمجھنا چاہیے۔

۳۱۸ آدم و ابلیس کی سرگذشت یہاں تمام ہوئی۔ اس سے جو حقائق مخاطبین پر واضح کرنا  
مقصود ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ سرکشی اور تکبر خدا کے نزدیک سب سے بڑا جرم ہے۔ اس کا ارتکاب کر لینے کے بعد انسان  
ہمیشہ کے لیے راندہ درگاہ ہو سکتا ہے۔ ابلیس نے اسی جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ فرشتے اپنی خلقت کے  
لحاظ سے اُس سے برتر تھے، لیکن انہوں نے خدا کے حکم کو اس سے بڑا سمجھا اور بغیر کسی تردد کے اُس  
کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ خدا کی تمام مخلوقات کے لیے صحیح رویہ یہی ہے۔ دولت و ثروت اور



عز و جاہ، سب خدا کی عطا ہے۔ اس کے زعم میں مبتلا ہو کر سرکشی اور تکبر کا رویہ اختیار کیا جائے گا تو یہ انسان کے لیے ابدی خسران کا باعث بن جائے گا۔

۲۔ ابلیس جس انجام کو خود پہنچا ہے، وہ انسان کو بھی اُسی انجام تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اُس نے خدا سے اُسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مہلت لی ہے۔ اُس کا اصلی ہدف عقیدہ توحید ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ مشرکین کے لیے خدا کی جنت میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ یہ ثابت کر دینا چاہتا ہے کہ جس کے سامنے اُسے جھکنے کے لیے کہا گیا تھا، وہ اس کا اہل بھی نہیں ہے کہ اپنے پروردگار کی ذات و صفات کی صحیح معرفت کے ساتھ اُس کی بندگی کر سکے۔

۳۔ انسان کی سب سے بڑی کمزوری اُس کی جنسی جبلت ہے۔ ابلیس اس بات سے واقف ہے کہ انسان کو اپنی گرفت میں لینے کا سب سے آسان راستہ یہی ہے کہ اُسے اس جبلت کی تسکین پر خدا کی عائد کردہ پابندیوں کو توڑ دینے کے لیے آمادہ کیا جائے۔ وہ آدم و حوا پر اسی راستے سے حملہ آور ہوا تھا۔ اس کے لیے وہ ہر داؤں، ہر فریب اور ہر چرتر استعمال کرنے کے لیے تیار رہتا ہے اور لوگوں کو اُسی طرح شیشے میں اتار لیتا ہے، جس طرح ابدیت کا لالچ دے کر اُس نے آدم و حوا کو شیشے میں اتارا تھا۔ اپنے حریف کے محاذ میں یہ کمزور ترین مقام ہے جو اُس نے پہلے دن سے حملے کے لیے تلاش کر رکھا ہے۔

۴۔ غلطی ابلیس نے بھی کی اور غلطی آدم و حوا سے بھی ہوئی، لیکن دونوں میں فرق ہے۔ ابلیس کو غلطی پر توجہ دلائی گئی تو وہ اکڑ بیٹھا اور بندگی سے منہ موڑ کر سرکشی کا رویہ اختیار کر لیا۔ مگر آدم و حوا نے یہ نہیں کیا۔ انھیں جب احساس ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی ہے تو ندامت اور شرم ساری کے ساتھ وہ فوراً اپنے رب کی طرف پلٹے اور معافی مانگ کر اُس کے دامن رحمت میں پناہ ڈھونڈنے لگے۔ چنانچہ ابلیس ہمیشہ کے لیے راندہ درگاہ ہے اور بنی آدم کے لیے جنت کے دروازے کھلے ہیں۔ وہ جب چاہیں، نیکی، خیر اور توبہ و استغفار کا زاد راہ لے کر اُن میں داخل ہونے کے لیے سفر کی ابتدا کر سکتے ہیں۔





الاعراف

يٰۤاٰدَمُ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ لِبَاسًا يُّوَارِي سَوْآتِكَمْ وَرِيشًا

آدم کے بیٹوں، ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے جو تمہاری شرم گاہوں کو ڈھانکنے والا

۳۱۹ خطاب کے لیے یہ اسلوب، اگر غور کیجیے تو نہایت بلیغ اختیار فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے

ہیں:

”... باپ کی زندگی کے حوادث و تجربات اولاد کے لیے سب سے زیادہ سبق آموز ہوتے ہیں۔ اُس کی سرگذشت کسی دوسرے کی کہانی نہیں، بلکہ اپنی ہی حکایت ہوتی ہے۔ باپ کے دوستوں سے دوستی، اُس کے دشمنوں سے دشمنی باوفا اولاد خاندان کی ناقابل فراموش روایت کی طرح محفوظ رکھتی ہے۔ اخلاف اُس کو یاد رکھتے ہیں اور اپنے بعد والوں کی طرف اُس کو منتقل کرتے اور برابر منتقل کرتے رہنے کی وصیت کرتے ہیں۔ اہل عرب میں تو یہ روایت اتنی محبوب رہی ہے کہ اُس میں حق و باطل کا امتیاز بھی باقی نہیں رہا تھا۔ باپ دادا کا دشمن بہر حال پشت ہا پشت دشمن ہی سمجھا جاتا، اگرچہ اُس کی دشمنی برحق ہی کیوں نہ رہی ہو۔ پھر کس قدر حیف کی بات ہے کہ آدم کی اولاد اپنے باپ کے ساتھ شیطان اور اُس کی ذریت کی اس دشمنی کو بھول جائے جو سراسر کینہ اور حسد پر مبنی تھی، جو مخفی نہیں، بلکہ بالکل علانیہ تھی اور جو صرف مخصوص آدم و حوا کے ساتھ ہی نہیں، بلکہ قیامت تک کے لیے اُن کی تمام ذریت کے ساتھ تھی۔ پھر معاملہ صرف بھول جانے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اولاد کی ناخلفی، ناہنجاری اور نابکاری اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ کتنے ہیں جو اُس دشمن اور اُس کے ساتھیوں ہی کو اپنا دوست، خیر خواہ اور معتمد بنائے بیٹھے ہیں اور اُس کے کہے پر ٹھیک ٹھیک اپنے لیے اُنھی تباہیوں کے گڑھے کھود رہے ہیں جن میں اُس نے آدم کو گرانا چاہا تھا اور وہ اُس میں گر چکے تھے، اگر اللہ کی رحمت نے اُن کو بچایا نہ ہوتا — قرآن کی بلاغت بیان کے قربان جائیے کہ صرف 'يٰۤاٰدَمُ' کے خطاب کے دو لفظوں کے اندر اُس نے یہ سارے مضمرات محفوظ کر دیے ہیں۔ آدم علیہ السلام کا جو غیور و باوفا بیٹا اس خطاب کے ساتھ قرآن کی ان یاد دہانیوں کو سنتا ہے، اُس کی رگ رگ شیطان کے خلاف جوش حمیت و غیرت سے پھڑک اٹھتی ہے۔ صرف بے غیرت اور ناخلف ہی ہیں جو اس خطاب کے



وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ ۖ ذَٰلِكَ مِمَّا آتَتْهُ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿٣٦﴾  
يَبْنِيٰٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنٰكُمْ الشَّيْطٰنُ كَمَا اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنْ

بھی ہے اور تمھارے لیے زینت بھی، اور تقویٰ کا لباس، وہ اس سے بڑھ کر ہے۔<sup>۳۲۲</sup>

بعد بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔“ (تدبر قرآن ۲۴۵/۳)

۳۲۰ زمین کی ہر چیز خدا کے حکم سے پیدا ہوئی ہے، اس لیے درحقیقت اُس کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔ چنانچہ سورہ حدید (۵۷) کی آیت ۲۵ میں لوہے کے بارے میں بھی فرمایا ہے کہ  
’اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ‘

۳۲۱ پہلی چیز ضرورت ہے اور دوسری اتمام نعمت۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو چیزیں بھی بنائی ہیں، اُن میں بالعموم یہ دونوں پہلو ملحوظ ہیں۔ چنانچہ لباس ستر پوش بھی ہوتا ہے، سردی اور گرمی سے ہماری حفاظت بھی کرتا ہے اور ہمارے لیے ذریعہ تزئین بھی ہے۔ ہم اس سے اپنی شخصیت، اپنے حسن و وقار اور اپنی شان میں اضافہ کرتے ہیں۔

۳۲۲ مطلب یہ ہے کہ خدا نے جس طرح انسان کے لیے وہ چیزیں پیدا کی ہیں جن سے اُس کا ظاہری لباس تیار ہوتا ہے، اُسی طرح وہ چیزیں بھی اُس کے نفس میں الہام کر دی ہیں جن سے اُس کا باطنی لباس تیار ہوتا ہے۔ یہ تقویٰ کا لباس ہے جو انسان کو پہنا کر دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ خدا نے اس کے لیے اپنی خشیت، احساسِ عبدیت اور شرم و حیا کا جذبہ انسان کی فطرت میں ودیعت فرمایا ہے۔ یہ انھی اجزا سے بنتا ہے اور ظاہری لباس سے کہیں بڑھ کر ہے، بلکہ ظاہری لباس بھی اسی باطن کی تحریک سے پیدا ہوتا ہے تو انسانوں کو انسانیت کا حسن عطا کرتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... جس کے قامت پر اللہ اپنی عنایت کی یہ ردا ڈال دیتا ہے، دیکھنے کے قابل وقار و جمال اُسی کا ہوتا ہے، یہ انسانوں کے لباس میں مقدس فرشتہ ہوتا ہے۔ جو بھی اُس کو دیکھتا ہے، بے تحاشا ’مَا هٰذَا بَشَرًا، اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ‘ پکارا اٹھتا ہے۔“

(تدبر قرآن ۲۴۵/۳)





الاعراف

الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْآتِهِمَا إِنَّهُ يَرِيكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ

وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے تاکہ لوگ یاد دہانی حاصل کریں۔ آدم کے بیٹو، ایسا ہرگز نہ ہو کہ شیطان تمہیں اُسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے، جس طرح اُس نے تمہارے ماں باپ کو اُس باغ سے نکلوا دیا، (جس میں خدا نے اُنہیں ٹھیرایا تھا)، اُن کا یہی لباس اتروا کر کہ اُن کی شرم گاہیں اُن پر کھول دے۔ (یاد رکھو)، وہ اور اُس

۳۲۳ یعنی اس بات کی یاد دہانی حاصل کریں کہ انسان کے ظاہری لباس کو بھی اسی کے مطابق ہونا چاہیے۔ خدا کی آیتیں آفاق میں بھی ہیں اور انفس میں بھی۔ یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اُن سے رہنمائی حاصل کرے۔ قرآن کی آیتیں اُس کو جگہ جگہ انہی آیتوں کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

۳۲۴ پیچھے جس لباس تقویٰ کا ذکر ہے، یہ اُسی کی طرف اشارہ ہے۔ شیطان چاہتا تھا کہ آدم و حوا کی شرم گاہوں کا وہ پہلو اُن پر کھول دے جو اُن سے چھپایا گیا تھا۔ اُس نے اپنا یہ مقصد اُن کا یہی لباس اتروا کر حاصل کیا۔ چنانچہ تنبیہ فرمائی ہے کہ اپنے آپ کو بچا کر رکھو، وہ یہ کام آج بھی اسی طریقے سے کرتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...وہ اپنی وسوسہ اندازیوں سے پہلے لوگوں کو اُس لباس تقویٰ و خشیت سے محروم کرتا ہے جو اللہ نے بنی آدم کے لیے اس ظاہری لباس کے ساتھ ایک تشریف باطنی کی حیثیت سے اتارا ہے اور جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ جب یہ باطنی جامہ اتر جاتا ہے تو وہ حیا ختم ہو جاتی ہے جو اس ظاہری لباس کی اصل محرک ہے۔ پھر یہ ظاہری لباس ایک بوجھ معلوم ہونے لگتا ہے۔ بے حیائی صنفی اعضا میں، جن کا چھپانا تقاضاے فطرت ہے، عریاں ہونے کے لیے تڑپ پیدا کرتی ہے، پھر فیشن اُس کو سہارا دیتا ہے اور وہ لباس کی تراش خراش میں نت نئی اختراعات سے ایسے ایسے اسلوب پیدا کرتا ہے کہ آدم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں کپڑے پہن کر بھی لباس کے بنیادی مقصد، یعنی ستر پوشی کے اعتبار سے گویا ننگے ہی رہتے ہیں۔ پھر لباس میں صرف زینت اور



## لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٢٤﴾

کے ساتھی تم کو وہاں سے دیکھتے ہیں، جہاں سے تم اُنھیں نہیں دیکھ سکتے۔<sup>۳۲۵</sup> حقیقت یہ ہے کہ ان شیطانوں کو ہم نے اُن لوگوں کا رفیق بنا دیا ہے جو ایمان نہیں رکھتے۔<sup>۳۲۶</sup> ۲۶-۲۷

آرائش کا پہلو باقی رہ جاتا ہے اور اُس میں بھی اصل مدعا یہ ہوتا ہے کہ بے حیائی زیادہ سے زیادہ دل کش زاویے سے نمایاں ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ عقل اس طرح ماؤف ہو جاتی ہے کہ عریانی تہذیب کا نام پاتی ہے اور ساتر لباس وحشت و دقیا نو سیت کا۔ پھر پڑھے لکھے شیاطین اٹھتے ہیں اور تاریخ کی روشنی میں یہ فلسفہ پیدا کرتے ہیں کہ انسان کی اصل فطرت تو عریانی ہی ہے۔ لباس تو اُس نے رسوم و رواج کی پابندیوں کے تحت اختیار کیا ہے۔ یہ مرحلہ ہے جب دیدوں کا پانی مرجاتا ہے اور پورا تمدن شہوانیت کے زہر سے مسموم ہو جاتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۴۶)

۳۲۵ مطلب یہ ہے کہ اُن راستوں سے حملہ آور ہوتے ہیں، جہاں سے تم سوچ نہیں سکتے۔

استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یہ شیطان اور اُس کے جتھے کی چالاکی، کیادی اور فتنہ سامانی کی طرف اشارہ ہے کہ اُن کے حملے کے راستے اور اُن کے ظہور کے بھیس اتنے بے شمار ہیں کہ تم اُن سارے راستوں پر نہ پہرا بٹھا سکتے، نہ ہر بھیس میں اُن کو پہچان ہی سکتے۔ اُس کے لشکر میں جن بھی ہیں اور انسان بھی۔ وہ وہاں سے گھات لگائیں گے، جہاں سے تم دیکھ نہیں سکو گے اور تمھارے لیے وہ بہروپ بھریں گے کہ تم پہچان نہ سکو گے۔ تم اُنھیں دوست، ناصح، خیر سگال، مرشد، لیڈر اور نہ جانے کیا کیا سمجھو گے اور وہ تمھارے دین و ایمان کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں گے۔ تم گمان کرو گے کہ وہ تمھارے لیے تہذیب و ترقی کی راہیں کھول رہے ہیں، لیکن وہ تم کو وہاں لے جا کر ماریں گے، جہاں پانی بھی نہ پاؤ گے۔ اُن کو تمھارے باطن کی ساری کمزور رگیں معلوم ہوں گی اور وہ اپنی اندرونی وسوسہ اندازیوں سے بھی تم کو شکار کرنے کی کوشش کریں گے اور اپنی ظاہری عشوہ گریوں سے بھی تم پر اپنے جال پھینکیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دشمن کو معمولی دشمن نہ سمجھنا، ہر وقت اس سے چوکے رہنا۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۴۷)







الاعراف

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا

(یہ اسی رفاقت کا نتیجہ ہے، اے پیغمبر کہ تمہاری قوم کے) یہ لوگ جب کسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقے پر

۳۲۶ یعنی شیطان کے یہ داؤں اُنھی پر چلتے ہیں جو خدا اور اُس کی ہدایت پر ایمان سے محروم ہوتے ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو سورہ زخرف (۴۳) کی آیت ۳۶ میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ جو رحمن کی یاد سے بے پروا ہو جاتے ہیں، اُن پر ہم ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، پھر وہی اُن کا رفیق بن جاتا ہے۔ اس سے آپ سے آپ واضح ہوا کہ خدا کے جو بندے ایمان و ہدایت پر مضبوطی سے جمے رہتے ہیں، اُن پر شیطان کا کوئی داؤں نہیں چلتا۔ اُن کا پروردگار اُنھیں اُس سے اور اُس کے ساتھیوں کے حملوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ہے: إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ\*

۳۲۷ اصل میں لفظ فاحِشۃ استعمال ہوا ہے۔ آگے کی آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے بے حیائی کے اُن کاموں کی طرف اشارہ کیا ہے جو مذہب کے نام پر کیے جاتے تھے۔ اس طرح کی چیزیں مشرکین کے معبدوں اور صوفیانہ مذاہب کی درگاہوں اور عبادت گاہوں میں عام رہی ہیں۔ یہ پروہتوں، پجاریوں اور مجاوروں کی شیطنیت سے وجود میں آتی تھیں۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب جاہلی میں بھی اسی نوعیت کی ایک بدعت بیت اللہ کے برہنہ طواف کی رائج تھی۔ لوگ اسے مذہبی فعل سمجھ کر کرتے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ اُنھیں خدا نے اس کا حکم دیا ہے۔ قریش بیت اللہ کے پروہت تھے اور اُنھوں نے فتویٰ دے رکھا تھا کہ اُن سے باہر کے عرب اپنے کپڑوں میں کعبے کا طواف نہیں کر سکتے۔ اُن کے لیے ضروری ہے کہ یا قریش میں سے کسی سے اس کام کے لیے کپڑے مستعار لیں یا ننگے طواف کریں۔ گویا دوسروں کے کپڑے ایسی آلائش ہیں جن کے ساتھ یہ غیر معمولی عبادت نہیں ہو سکتی۔

\* النحل ۹۹:۱۶۔



بِهَاطُّ قُلِّ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ اتَّقُوا اللَّهَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٢٨﴾ قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ ۚ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ﴿٣٢٩﴾

پایا ہے اور خدا نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ ان سے کہو، اللہ کبھی بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔<sup>۳۲۸</sup> کیا تم اللہ پر افترا کر کے ایسی باتیں کہتے ہو جنہیں تم نہیں جانتے؟ ان سے کہو، میرے پروردگار نے (ہر معاملے میں) راستی کا حکم دیا ہے۔ اُس نے فرمایا ہے کہ ہر مسجد کے پاس اپنا رخ اُسی کی طرف کرو اور اطاعت کو اُس کے لیے خالص

۳۲۸ اس لیے کہ جس چیز کو کوئی سلیم الفطرت انسان گوارا نہیں کر سکتا، اُسے خداوند قدوس کس طرح گوارا کر سکتا ہے، کجایہ کہ وہ اُس کا حکم دے۔ اُس کے تمام احکام اُس کی صفات اور انسان کی فطرت کے تقاضوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ کسی بے ہودگی کا حکم نہیں دے سکتا۔

۳۲۹ اصل میں لفظ قِسْطُ آیا ہے، یعنی ٹھیک انصاف کی بات۔ یہ ظاہر ہے کہ وہی بات ہو سکتی ہے جو خدا کی صفات اور انسان کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہو، جس میں کوئی افراط و تفریط نہ ہو اور جو اُن مقاصد کو پورا کر دے جن کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پوری شریعت اسی قسط پر مبنی ہے۔ وہ خود قائم بالقسط ہے اور اپنی کتابوں کے بارے میں بھی اُس کا ارشاد ہے کہ وہ اس لیے نازل کی گئی ہیں کہ اُن کے ذریعے سے لوگ دین کے معاملے میں ٹھیک انصاف پر قائم ہو جائیں۔ چنانچہ آگے کے تمام احکام اسی پر مبنی کر کے بیان فرمائے ہیں۔

۳۳۰ اصل الفاظ ہیں: وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ۔ ان کے بعد اِلٰی اللہ وحدہ یا ان کے ہم معنی الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں۔ اگلے جملے میں مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ کے الفاظ اسی کے مقابل میں آئے ہیں۔ اوپر جس قسط کا ذکر ہے، یہ اُس کا اولین تقاضا بیان ہوا ہے کہ ہر مسجد اللہ کی عبادت کے لیے خاص رہنی چاہیے اور بندہ مومن کو بھی اپنا رخ ہر مسجد میں





الاعراف

فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ إِنَّهُمْ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ  
أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُّهْتَدُونَ ﴿٣٠﴾ يَبْنِي أَدَمَ  
حُذُوًا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ

رکھ کر اُسی کو پکارو۔ تم (اُس کی طرف) اُسی طرح لوٹو گے، جس طرح اُس نے تمہاری  
ابتدا کی تھی۔ <sup>۳۳۱</sup> ایک گروہ کو اُس نے ہدایت بخشی، (وہ ان سب باتوں کو مانتا ہے)  
اور ایک گروہ پر گم راہی مسلط ہو گئی، اس لیے کہ اُنھوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں  
کو اپنا رفیق بنا لیا اور سمجھتے یہ ہیں کہ راہ ہدایت پر ہیں۔ <sup>۳۳۲</sup> آدم کے بیٹے، ہر مسجد کی  
حاضری کے وقت اپنی زینت کے ساتھ آؤ، <sup>۳۳۳</sup> اور کھاؤ پیو، مگر حد سے آگے نہ بڑھو۔ <sup>۳۳۴</sup> اللہ

صرف اللہ وحدہ لا شریک کی طرف رکھنا چاہیے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، جب خالق و مالک خدا  
ہے تو یہ قسط کے خلاف ہے کہ عبادت کی پیشانی کسی اور کے سجدے سے آلودہ ہو۔

<sup>۳۳۱</sup> یہ توحید کے مضمون کی توثیق مزید ہے۔ یعنی جس طرح تنہا آئے تھے، اُسی طرح تنہا خدا  
کی طرف لوٹو گے۔ جن کو تم شریکوں اور سفارشیوں کی حیثیت دیے بیٹھے ہو، اُن میں سے کوئی بھی  
تمہارے ساتھ نہیں ہوگا۔ آیت میں اس کے لیے 'کَمَا بَدَأْتُكُمْ تَعُودُونَ' کے الفاظ ہیں۔ استاذ  
امام لکھتے ہیں:

”...قرآن کی اس بلاغت کے قربان جائیے کہ کل دو لفظ ہیں اور دو لفظوں میں اُس نے  
آخرت اور توحید، دونوں کا تعلق بھی واضح کر دیا اور آخرت کی ایک نہایت واضح دلیل بھی بیان  
فرمادی۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۵۰)

<sup>۳۳۲</sup> اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ 'إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ' سے اوپر کا مضمون  
کس طرح پیدا ہوا تھا اور یہ بھی کہ اللہ شیاطین کو اُنھی کا رفیق بناتا ہے جو اللہ کو چھوڑ کر خود شیاطین کی  
رفاقت اختیار کرنا چاہتے ہیں۔



الْمُسْرِفِينَ ۝ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ ۖ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ

حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان سے پوچھو، (اے پیغمبر)، اللہ کی اُس زینت کو کس نے حرام کر دیا جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی تھی اور کھانے کی پاکیزہ چیزوں کو کس نے ممنوع ٹھہرایا ہے؟ ان سے کہو، وہ دنیا کی زندگی میں بھی

۳۳۳ یعنی مسجد خدا کے کسی پیغمبر نے بنائی ہو یا عام انسانوں نے، اُس میں اپنا لباس پہن کر آؤ۔ لباس میں سادگی اور درویشی احرام کے آداب میں سے ہے اور جتنی مطلوب ہے، حج و عمرہ میں اختیار کر لی گئی ہے۔ خدا کے دین میں اس کے سوا ہر موقع کے لیے یہی حکم ہے کہ معمول میں جو لباس پہنتے ہو، اُسے پہن کر عبادت کے لیے آؤ۔ ایسی کوئی مسجد نہیں ہے جس کی حاضری کے لیے یہ شرط ہو کہ لوگ کپڑے اتار کر حاضر ہوں۔

۳۳۴ مطلب یہ ہے کہ پہننا ہو یا کھانا پینا، ان میں سے کوئی چیز بھی ممنوع نہیں ہے۔ خدا کی شریعت میں ممنوع صرف اسراف ہے، اُس سے ہر حال میں بچنا چاہیے۔ استاذ امام لکھتے ہیں: ”...اللہ تعالیٰ قَائِمٌ بِالْقِسْطِ“ ہے۔ اس وجہ سے وہ مُقْسِطٌ، یعنی عدل و اعتدال پر قائم رہنے والوں کو پسند کرتا ہے، ”مُسْرِفِينَ“، یعنی عدل و اعتدال سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ بے اعتدالی افراط کی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہے، تفریط کی نوعیت کی بھی، اور یہ دونوں ہی باتیں خدا کی پسند کے خلاف ہیں۔ نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ آدمی کھانے پینے پہننے ہی کو مقصود بنا لے اور رات دن اسی کی سرگرمیوں میں مشغول رہے اور نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ ان چیزوں کو راہوں اور جوگیوں کی طرح تیاگ دے۔ تہذیر اور تفریط، دونوں ہی شیطان کی نکالی ہوئی راہیں ہیں۔ خدا زندگی کے ہر پہلو میں عدل و اعتدال کو پسند فرماتا ہے۔“

(تذبر قرآن ۳/۲۵۱)

۳۳۵ یہ الفاظ معمولی نہیں ہیں، اس لیے کہ خدا جس کو پسند نہیں کرتا، لازماً اُسے مبغوض رکھتا







الاعراف

## الْقِيَمَةُ ٣٣٦ كَذَلِكَ نَفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ٣٣٧ قُلْ إِنَّمَا

ایمان والوں کے لیے ہیں، (لیکن خدا نے منکروں کو بھی اُن میں شریک کر دیا ہے) اور قیامت کے دن تو خاص اُنھی کے لیے ہوں گی، (منکروں کا اُن میں کوئی حصہ نہ ہوگا)۔ ہم اُن لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں، اپنی آیتوں کی اسی طرح تفصیل کرتے ہیں۔

ہے۔

۳۳۶ زینت کا لفظ عربی زبان میں اُن چیزوں کے لیے آتا ہے جن سے انسان اپنی حس جمالیات کی تسکین کے لیے کسی چیز کو سجااتا بناتا ہے۔ چنانچہ لباس، زیورات وغیرہ بدن کی زینت ہیں؛ پردے، صوفے، قالین، غالیچے، تماثیل، تصویریں اور دوسرا فرنیچر گھروں کی زینت ہے؛ باغات، عمارتیں اور اس نوعیت کی دوسری چیزیں شہروں کی زینت ہیں؛ غنا اور موسیقی آواز کی زینت ہے؛ شاعری کلام کی زینت ہے۔ دین کی صوفیانہ تعبیر اور صوفیانہ مذاہب تو ان سب چیزوں کو مایا کا جال سمجھتے اور بالعموم حرام یا مکروہ یا قابل ترک اور ارتقاے روحانی میں سدراہ قرار دیتے ہیں، مگر قرآن کا نقطہ نظر یہ نہیں ہے۔ اُس نے اس آیت میں نہایت سخت تنبیہ اور تہدید کے انداز میں پوچھا ہے کہ کون ہے جو رزق کے طیبات اور زینت کی اُن چیزوں کو حرام قرار دینے کی جسارت کرتا ہے جو خدا نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں؟ یہ آخری الفاظ بطور دلیل ہیں کہ خدا کا کوئی کام عبث نہیں ہوتا۔ اُس نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں تو اسی لیے پیدا کی ہیں کہ حدود الہی کے اندر رہ کر اُس کے بندے انھیں استعمال کریں۔ ان کا وجود ہی اس بات کی شہادت ہے کہ ان کے استعمال پر کوئی ناروا پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔

۳۳۷ ان فقرہوں میں مقابل کے الفاظ عربیت کے اسلوب پر حذف کر دیے گئے ہیں۔ ہم نے ترجمے میں انھیں کھول دیا ہے۔ اس سے مزید وضاحت ہوگئی ہے کہ اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا نہ ایمان کے منافی ہے، نہ دین داری کے، نہ تقویٰ کے۔ اللہ نے تو یہ چیزیں پیدا ہی اہل ایمان کے



حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ  
بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا

کہہ دو، میرے پروردگار نے تو صرف فواحش کو حرام کیا ہے، خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے <sup>۳۳۸</sup>  
اور حق تلفی اور ناحق زیادتی کو حرام کیا ہے اور اس کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک  
ٹھیراؤ، جس کے لیے اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی <sup>۳۳۹</sup> اور اس کو کہ تم اللہ پر افترا کر کے

لیے کی ہیں، لہذا اصلاً اُنھی کا حق ہیں۔ اُس کے منکروں کو تو یہ اُن کے طفیل اور اُس مہلت کی وجہ  
سے ملتی ہیں جو دنیا کی آزمائش کے لیے اُنھیں دی گئی ہے۔ چنانچہ آخرت میں یہ تمام تراہل ایمان  
کے لیے خاص ہوں گی، منکروں کے لیے ان میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، وہ ہمیشہ کے لیے ان سے  
محروم کر دیے جائیں گے۔

قرآن کا یہ اعلان، اگر غور کیجیے تو ایک حیرت انگیز اعلان ہے۔ عام مذہبی تصورات اور صوفیانہ  
مذہب کی تعلیمات کے برخلاف قرآن دینی زندگی کا ایک بالکل ہی دوسرا تصور پیش کرتا ہے۔  
تقرب الہی اور وصول الی اللہ کے لیے دنیا کی زینتوں سے دست برداری کی تلقین کے بجائے وہ  
ایمان والوں کو ترغیب دیتا ہے کہ اسراف و تبذیر سے بچ کر اور حدود الہی کے اندر رہ کر زینت کی  
سب چیزیں وہ بغیر کسی تردد کے استعمال کریں اور خدا کی ان نعمتوں پر اُس کا شکر بجالائیں۔

<sup>۳۳۸</sup> یعنی بدکاری علانیہ کی جائے یا چھپ کر، ہر حال میں حرام ہے۔ اس کے لیے جمع کا لفظ  
اس لیے استعمال فرمایا ہے کہ یہ زنا، لواطت، وطی بہائم اور اس نوعیت کے تمام جرائم کو شامل ہو  
جائے۔ جنسی اعضا دوسروں کے سامنے کھولے جائیں، جنسی معاملات کا افشا کیا جائے یا بدکاری کا  
ارتکاب ہو، لفظ فَوَاحِش ان سب کا احاطہ کرتا ہے۔

<sup>۳۳۹</sup> زیادتی کے ساتھ ناحق کا اضافہ اُس کے گھونے پن کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ اس  
کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی زیادتی برحق بھی ہوتی ہے۔ ہر زیادتی بجائے خود ناحق ہے۔ چنانچہ انبیا





عَلَى اللَّهِ مَالًا تَعْلَمُونَ ﴿٣٣﴾ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا  
يَسْتَخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٤﴾

کوئی ایسی بات کہو جسے تم نہیں جانتے۔ (اس وقت بے خوف ہو رہے ہو، لیکن ان سب حرمتوں کے معاملے میں تمہاری سرکشی پر وہ تمہیں بھی ایک دن لازماً پکڑے گا، اس لیے کہ) ہر قوم کے لیے ایک مدت مقرر ہے، پھر جب اُن کی مدت پوری ہو جاتی ہے تو نہ وہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکتے ہیں، نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ ۳۳۲-۳۴

علیہم السلام کے قتل کے جرم کے ساتھ بھی یہ لفظ اسی طرح استعمال ہوا ہے۔

۳۴۰ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ شرک کے حق میں کوئی عقلی یا نقلی یا فطری دلیل نہ کبھی پیش کی جا سکی ہے اور نہ پیش کی جاسکتی ہے۔

۳۴۱ اصل الفاظ ہیں: اَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَالًا تَعْلَمُونَ۔ 'تَقُولُوا' کے بعد 'عَلَى' کا صلہ بتا رہا ہے کہ یہاں تضمین ہے، یعنی 'مُفْتَرِينَ عَلَى اللَّهِ'۔ اپنی طرف سے حلال و حرام کے فتوے دیے جائیں یا اپنی خواہشات کی پیروی میں بدعتیں ایجاد کی جائیں یا اپنی طرف سے شریعت تصنیف کی جائے اور اُسے خدا سے منسوب کر دیا جائے تو یہ سب چیزیں اسی کے تحت ہوں گی۔

زینتوں کے بارے میں اوپر جو حکم بیان ہوا ہے، اُس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی شریعت میں حرام پھر کیا ہے؟ آیہ زیر بحث میں قرآن نے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ اللہ نے صرف پانچ چیزیں حرام قرار دی ہیں: ایک فواحش، دوسرے حق تلفی، تیسرے ناحق زیادتی، چوتھے شرک اور پانچویں بدعت۔

خدا کی شریعت میں یہی پانچ چیزیں حرام ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی چیز حرام نہیں ہے۔ حلال و حرام کے معاملے میں یہ خدا کا اعلان ہے، لہذا کسی کو بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان کے علاوہ کسی چیز کو حرام ٹھہرائے۔ چنانچہ اب اگر کوئی چیز حرام ہوگی تو اُسی وقت ہوگی، جب ان میں سے کوئی چیز اُس میں



يٰۤاٰدَمُ اِمَّا يٰتِيْنٰكَم رُّسُلٌ مِّنْكُمْ يَقْصُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ  
فَمِنْ اَتَقٰى وَاصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۳۵ وَالَّذِيْنَ  
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا

آدم کے بیٹو، (میں نے پہلے دن تمہیں بتا دیا تھا کہ) اگر تمہارے پاس خود تمہارے  
اندر سے پیغمبر آئیں تم کو میری آیتیں سناتے ہوئے تو اُن کی بات ماننا، اس لیے کہ جو  
خدا سے ڈرے اور اُنھوں نے اپنی اصلاح کر لی، اُن کے لیے پھر نہ کوئی خوف ہے اور نہ  
وہ کبھی غم زدہ ہوں گے۔ اس کے برخلاف جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور تکبر کر کے

پائی جائے گی۔ روایتیں، آثار، حدیثیں اور پچھلے صحیفوں کے بیانات، سب قرآن کے اسی ارشاد  
کی روشنی میں سمجھے جائیں گے۔ اس سے ہٹ کر یا اس کے خلاف کوئی چیز بھی قابل قبول نہ ہوگی۔  
۳۴۲ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح افراد کے لیے اجل ہے، اُسی طرح قوموں کے لیے  
بھی اجل ہے۔ یہ اجل علم و اخلاق میں اُن کے اضمحلال کی رعایت سے مقرر کی جاتی ہے۔ رسولوں  
کے ذریعے سے اتمام حجت ہو جائے تو اللہ اُن پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں اور نہ ہو تو علم و  
اخلاق میں زوال کی آخری حد کو پہنچ جانے کے بعد اُسی طرح ہلاک ہو جاتی ہیں، جس طرح افراد  
مرتے ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت ۵۸ میں اسی بنا پر فرمایا ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں جسے  
ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا سخت عذاب نہ دیں۔ یہ نوشتہ الہی میں لکھا ہوا ہے۔ تاریخ  
بتاتی ہے کہ پہلے حام اور سام کی اولاد اس قانون کی زد میں آئی اور اب یافت کی اولاد معرض امتحان  
میں ہے۔ یہ آخری اقوام ہیں جن پر تاریخ کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ اس کے بعد  
قیامت برپا ہو جائے گی۔ یہاں مخاطب قریش ہیں۔ اُن کے لیے یہ فیصلہ اُس وقت صادر ہوا،  
جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد سورہ توبہ (۹) میں اُن کے  
استیصال کا حکم دے دیا گیا۔





الاعراف

خُلِدُونَ ﴿٣٦﴾ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ  
أُولَٰئِكَ يَنَالُهُمُ نَصِيبُهُم مِّنَ الْكِتَابِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُمْ رَسُولُنَا  
يَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوا إِنَّا مَّا كُنْتُمْ تَدْعُونَنَا مِن دُونِ اللَّهِ ۖ قَالُوا ضَلُّوا  
عَنَّا وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ ﴿٣٧﴾ قَالَ ادْخُلُوا فِي  
أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ فِي النَّارِ كُلَّمَا دَخَلَتْ  
أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا ۖ حَتَّىٰ إِذَا دَارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا ۖ قَالَتْ أُخْرَاهُمْ

اُن سے منہ موڑ لیا، وہی دوزخ کے لوگ ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ سو اُن سے  
بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھیں یا اُس کی آیتوں کو جھٹلا دیں۔ اُن کے  
نوشتے میں جو حصہ اُن کے لیے (دنیا کی زندگی میں لکھ دیا گیا) ہے، وہ اُنھیں پہنچے  
گا۔ یہاں تک کہ جب ہمارے فرشتے اُن کی رو حیں قبض کرنے کے لیے اُن کے  
پاس آئیں گے تو پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے تھے، وہ کہاں ہیں؟ وہ کہیں  
گے کہ وہ سب تو ہم سے کھوئے گئے اور اپنے خلاف خود گواہی دیں گے کہ وہ فی الواقع  
منکر تھے۔ اللہ فرمائے گا: جنوں اور انسانوں میں سے جو گروہ تم سے پہلے گزرے ہیں،

۳۴۳ یہ اُس وعدے کی یاد دہانی ہے جس کا ذکر سورہ بقرہ (۲) کی آیت ۳۸ میں ہوا ہے۔  
یہاں مخاطب چونکہ قریش ہیں، اس لیے مدعا یہ ہے کہ اُسی وعدے کے مطابق تمہارے اندر بھی  
ایک رسول کی بعثت ہو چکی ہے، لہذا شیطان کے فتنوں سے امان چاہتے ہو تو اُس کی پیروی کرو۔  
۳۴۴ اصل میں اُسْتِکْبَار کا لفظ آیا ہے جس کے ساتھ عَنْ کا صلہ ہے۔ یہ اس بات کی  
دلیل ہے کہ یہاں تضمین ہے۔ ہم نے ترجمے میں اسے کھول دیا ہے۔

۳۴۵ اوپر جس اِفْتِرَاء عَلٰی اللہ کا ذکر ہے، یہ اُس کی وضاحت ہو گئی ہے۔



لَا وَلَهُمْ رَبَّنَا هَؤُلَاءِ أَضَلُّونَا فَاتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ  
قَالَ لِكُلِّ ضِعْفٍ وَلَكِن لَّا تَعْلَمُونَ ﴿٣٢٦﴾ وَقَالَتْ أُولَهُمْ لِأَخْرِهِمْ  
فَمَا كَانَتْ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا

اُن کے ساتھ تم بھی دوزخ میں داخل ہو جاؤ۔<sup>۳۲۶</sup> ان میں سے ہر گروہ جب داخل ہوگا تو اپنے ساتھی گروہ پر لعنت کرے گا، یہاں تک کہ جب سب وہاں اکٹھے ہو جائیں گے تو اُن کے پچھلے اگلوں کے بارے میں کہیں گے: پروردگار، یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہمیں گم راہ کیا، اس لیے انہیں آگ کا دہرا عذاب دے۔ ارشاد ہوگا: تم سب کے لیے دہرا عذاب ہے، مگر تم جانتے نہیں ہو۔<sup>۳۲۸</sup> اس پر اگلے پچھلوں سے کہیں گے: (ہم

۳۲۶ یعنی شیطان کے یہ پیرو تمہارے ساتھی ہوں گے اور تمہارا ٹھکانا بھی انہی کے ساتھ دوزخ ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، گویا ساتھی بھی بدترین اور جگہ بھی بدترین۔

۳۲۷ اصل الفاظ ہیں: 'حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا، قَالَتْ أُخْرِهِمْ لَأُولَهُمْ'۔ ان میں 'إِذَا ادَّارَكُوا' عربیت کے قاعدے سے 'تدارکوا' میں تبدیلی سے بنا ہے اور 'قَالَتْ أُخْرِهِمْ لَأُولَهُمْ' میں 'ل' 'فی' کے معنی میں ہے۔ آیت کا مدعا یہ ہے کہ پہلی مرتبہ دیکھیں گے تو ایک دوسرے پر لعنت کریں گے اور جب اکٹھے ہو جائیں گے تو اخلاف اپنے اسلاف کے بارے میں استغاثہ پیش کر دیں گے۔ آگے اسی کی وضاحت ہے۔

۳۲۸ یعنی ایک عذاب خود گم راہی اختیار کرنے کا اور دوسرا عذاب دوسروں کو گم راہ کرنے اور جرائم پیشگی کی میراث چھوڑنے کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیکی اور بدی، دونوں متعدی چیزیں ہیں۔ ان کے اثرات سلف سے خلف تک منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ہر قتل جس طرح قاتل کے حساب میں درج ہوتا ہے، اُسی طرح آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل کے حساب میں بھی آپ سے آپ درج ہو جاتا ہے، جس نے خدا کی زمین پر پہلا قتل کیا تھا۔ پھر یہ قاتل بعد میں آنے والوں







الاعراف

كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٣٩﴾

إِنَّ الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ  
أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّى يَلْبِغَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ

مجرم ہیں) تو تمہیں بھی ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوئی، سوچکھو اپنے کیے کی پاداش  
میں عذاب کا مزہ۔ ۳۵-۳۹

یہ قطعی ہے کہ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور تکبر کر کے اُن سے منہ موڑا ہے،  
اُن کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ ہرگز جنت میں داخل نہیں

کے لیے قابیل بن جاتا ہے اور سلف سے خلف تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا  
ہے کہ ہر ایک کے لیے دہرا عذاب ہے۔ ہر گروہ کو اپنے گناہوں کے ساتھ ساتھ اُن گناہوں کا  
حصہ بھی لینا ہے جن کے ارتکاب سے اُس نے دوسروں کے لیے بری مثال قائم کی۔ اسلاف اگر  
اپنی چھوڑی ہوئی میراث کے برے نتائج سے نہیں بچ سکتے تو اخلاف کو بھی اپنے اُس تخم فساد کی  
فصل لازماً کاٹنی ہے جو انہوں نے دوسروں کے لیے بویا ہے، اس لیے کہ ہر گروہ کسی کا خلف ہے تو  
کسی کا سلف بھی ہے۔

۳۴۹ اس لیے کہ تم نے بھی اُسی جرم کا ارتکاب کیا جو ہم نے کیا تھا۔ ہمارے مقابل میں تم یقیناً  
ترجیح اور فضیلت کے حق دار ہوتے، اگر تم نے کوئی اچھی مثال قائم کی ہوتی۔ لیکن جب تم بھی وہی  
کچھ کر کے آئے ہو جو ہم کر کے آئے ہیں تو کسی فضیلت یا رعایت کا تقاضا کس طرح کر سکتے ہو؟

۳۵۰ لفظ 'اسْتَكْبَرُوا' کے ساتھ یہاں بھی 'عَنْ' کا صلہ ہے۔ اس کا فائدہ ہم اوپر واضح کر

چکے ہیں۔

۳۵۱ یہ نفس فعل کی نہیں، بلکہ اُس کے لازم کی نفی ہے۔ یعنی آسمان میں اُن کا خیر مقدم نہیں  
ہوگا کہ اُس کے دروازے سلام و تحیت اور اہلاً و سہلاً کے ساتھ اُن کے لیے کھولے جائیں، بلکہ



الْخِيَاطُ ۖ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ۝ لَّهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ  
وَمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۖ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ۝ وَالَّذِينَ  
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ أُولَٰئِكَ  
أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ

ہوں گے، جب تک اونٹ سوئی کے ناکے سے نہ گزر جائے۔ (سن لو)، ہم مجرموں کو اسی  
طرح سزا دیتے ہیں۔ اُن کے لیے دوزخ کا بچھونا اور اوپر سے اُسی کا اوڑھنا ہوگا۔ (سن  
لو)، ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف جو لوگ ایمان لائے ہیں اور  
جنہوں نے اچھے کام کیے ہیں — اور ہم (اس باب میں) کسی جان پر اُس کی استطاعت  
سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔ وہی جنت کے لوگ ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اُن

ذلت و فضیلت کے ساتھ وہ اُس کے پھاٹکوں میں دھکیل دیے جائیں گے۔

۳۵۲ یہ تعلق بالحوال کا اسلوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کا جنت میں جانا اتنا ہی محال ہے،  
جتنا سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا محال ہے۔ قرآن نے یہ بات اُن کے اصل جرم، یعنی  
استکبار کے حوالے سے کہی ہے اور سیدنا مسیح علیہ السلام نے سبب استکبار، یعنی دولت کے حوالے  
سے۔ اُن کا ارشاد ہے:

”...میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہی میں داخل ہونا مشکل ہے۔ اور پھر تم  
سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی  
بادشاہی میں داخل ہو۔“ (متی ۱۹: ۲۳-۲۴)

۳۵۳ یہ جملہ معترضہ ہے جس سے برسر موقع اطمینان دلادیا ہے کہ ایمان اور عمل صالح کی جو  
ذمہ داری بندوں پر ڈالی گئی ہے، وہ اُسی حد تک ہے، جس حد تک اُن کے امکان میں ہے۔ وہ اُن  
کی حدود سے زیادہ نہیں ہے۔





الاعراف

مِّنْ غَلٍّ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي  
هَدَانَا لِهَذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنَّ هَدَانَا اللَّهُ لَقَدْ جَاءَتْ  
رُسُلٌ رَبِّنَا بِالْحَقِّ وَنُودُوا أَنَّ تِلْكَمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا  
كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٥٣﴾

کے دلوں کی ہر رنجش ہم نکال دیں گے۔ اُن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی اور وہ کہیں  
گے: اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں اس راستے کی ہدایت بخشی، اور اگر اللہ ہم کو ہدایت  
نہ بخشا تو ہم یہ راستہ خود نہیں پاسکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پروردگار کے بھیجے  
ہوئے رسول بالکل سچی بات لے کر آئے تھے۔ (اُس وقت) انھیں ندا آئے گی کہ یہی  
جنت ہے، اس کے تم اپنے اعمال کے صلے میں وارث بنائے گئے ہو۔ ۳۵۶-۴۰-۴۳

۳۵۴ یہاں بھی لازم مراد ہے، یعنی دوزخ میں تو ایک دوسرے پر لعنت ملامت ہو رہی ہو  
گی، لیکن جنت میں اس کے برخلاف لوگ آپس میں تبادلہ مہر و محبت کریں گے، دنیا کی رنجشیں اور  
کدورتیں دور ہو چکی ہوں گی، ایک دوسرے کے لیے تپاک اور محبت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

۳۵۵ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ حاصل ہوا ہے، خدا کی توفیق اور پیغمبروں کی تذکیر سے حاصل  
ہوا ہے۔ یہ عنایت اور یہ اہتمام نہ ہوتا تو ہم جنت کا یہ راستہ نہیں پاسکتے تھے۔ دنیا کا سفر ایک پر  
صعوبت سفر تھا، بہ خیر و خوبی انجام کو پہنچ گیا۔ یہ خدا کا فضل ہے کہ آج اُن نعمتوں سے بہرہ یاب  
ہو رہے ہیں جو ہماری توقعات، قیاسات اور اندازوں سے اتنی زیادہ ہیں کہ اپنی سعی و عمل سے ہم  
کسی طرح اُن کا استحقاق پیدا نہیں کر سکتے تھے۔

۳۵۶ یہ شاباش کا جملہ ہے کہ بے شک، تم نے بازی جیت لی اور اپنے باپ کی کھوئی ہوئی  
جنت دوبارہ حاصل کر لی۔ یہ تمہاری میراث تھی اور اپنی جد و جہد سے تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم حق دار



وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ أَنِ قَدْ وَجَدْنَا مَا  
وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا قَالُوا نَعَمْ فَأَذَّنَ

جنت کے لوگ (اس موقع پر) دوزخ والوں کو پکار کر پوچھیں گے کہ ہم نے تو  
اُس وعدے کو بالکل سچا پایا جو ہمارے پروردگار نے ہم سے کیا تھا، پھر کیا تم نے بھی  
اُس وعدے کو سچا پایا جو تمہارے پروردگار نے تم سے کیا تھا؟<sup>۳۵۷</sup> وہ جواب دیں گے:

ہو کہ تمہاری یہ میراث تمہیں لوٹا دی جائے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اہل جنت کا خود اپنا احساس تو اوپر یہ نقل ہوا ہے کہ وہ اس جنت کو اپنی سعی و عمل کے بجائے  
صرف خدا کے فضل و احسان کا ثمرہ سمجھیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ اس کو اُن کے سعی و عمل کا ثمرہ قرار  
دے گا۔ یہ تکمیل نعمت کی معراج ہے۔ بندوں کے اعمال کا درجہ اس آیت نے اتنا اونچا کر دیا  
ہے کہ اس سے زیادہ اونچے درجے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا میں ہم جو کچھ پاتے ہیں، خدا  
کے فضل ہی سے پاتے ہیں۔ آخرت میں بھی خدا کے فضل ہی سے پائیں گے، لیکن رب کریم  
اس کو ہمارا حق اور ہماری محنت کا ثمرہ قرار دے گا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اُس ابدی بادشاہی کا  
جس کے متعلق ہر شخص کا شعور یہ ہو گا کہ یہ اُس نے اپنی کوششوں سے بنائی ہے اور یہ لازوال  
ہے! انسان صرف یہی نہیں چاہتا کہ اُس کو نعمتیں حاصل ہوں، بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ نعمتیں  
اُس کی اپنی ہوں۔ اس احساس کے بغیر وہ کسی نعمت کا صحیح لطف نہیں اٹھا سکتا۔ اللہ تعالیٰ جنت  
میں اُس کی فطرت کا یہ تقاضا بھی پورا کر دے گا۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۵۹)

۳۵۷۔ یہ سوال تفسیر کے لیے ہے۔ آگے اس کا جواب نقل ہوا ہے۔ وہ بھی، اگر غور کیجیے تو  
مجرموں کا آخری اعتراف ہے جس کے بعد اُن کے اور اُن کی سزا کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں رہ  
جائے گی۔ جنت اور دوزخ کے لوگوں میں اس سوال و جواب سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہاں پہنچ  
کر انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں میں کیا انقلاب برپا ہو جائے گا کہ لوگ جب چاہیں گے اور  
جہاں سے چاہیں گے، ایک دوسرے کو مخاطب کر لیں گے۔





الاعراف

مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ أَنْ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿٣٣﴾ الَّذِينَ يَصُدُّونَ  
عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا ۖ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ كَفِرُونَ ﴿٣٥﴾  
وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۖ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا

ہاں۔ پھر ایک پکارنے والا اُن کے درمیان پکارے گا کہ خدا کی لعنت ان ظالموں پر  
— (فرمایا): ان پر جو (آج) اللہ کی راہ سے روکتے اور اُس میں کجی پیدا کرنا چاہتے  
ہیں اور آخرت کے منکر ہیں۔ ۳۶۰-۳۵۹

ان دونوں گروہوں کے درمیان پردے کی دیوار ہوگی اور دیوار کی برجیوں پر کچھ

۳۵۸ اصل میں لفظ یَصُدُّونَ آیا ہے۔ یہ لازم اور متعدی، دونوں معنوں میں آتا ہے۔  
ترجیح کا قرینہ نہ ہو تو اسے متعدی مفہوم میں لینا چاہیے، اس لیے کہ متعدی لازم کو بھی شامل ہو جاتا  
ہے۔

۳۵۹ قرآن کے نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ توحید کی صراط مستقیم میں کجی پیدا کر کے شرک  
کی پگ ڈنڈیاں نکالنے کی تعبیر ہے۔

۳۶۰ 'الَّذِينَ يَصُدُّونَ' سے یہاں تک یہ پورا ٹکڑا منادی کے اعلان کا حصہ نہیں ہے۔ اُس  
کا اعلان آیت میں 'الظَّالِمِينَ' پر ختم ہو گیا ہے۔ اُس کے بعد یہ ٹکڑا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور  
تضمین ہے جس نے کلام کو بالکل مطابق حال کر دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس تضمین سے گویا یہ وضاحت ہوگئی کہ ظالمین سے مراد کون لوگ ہوں گے۔ فرمایا کہ  
وہی لوگ جو آج اللہ کی راہ سے لوگوں کو روک رہے ہیں، جو اُس میں کجی پیدا کرنے کے لیے  
ساعی ہیں اور آخرت کے منکر ہیں۔ اس وضاحت کے بعد آخرت میں ہونے والی منادی  
وقت کے قریش پر ٹھیک ٹھیک اس طرح چسپاں ہوگئی، گویا جامہ بود کہ برقامت او دوختہ  
بود۔“ (تذبرقرآن ۳/۲۶۵)



بِسْمِهِمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلِّمُوا عَلَيْكُمْ ۖ لَمْ يَدْخُلُوهَا  
وَهُمْ يَطْمَعُونَ ﴿٣٦٢﴾ وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ ۖ

نمایاں اور ممتاز لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو اُس کی علامت سے پہچانیں گے اور جنت  
کے لوگوں کو پکار کر کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو — یہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے  
ہوں گے، مگر امیدوار ہوں گے (کہ داخل ہو جائیں گے)۔ اُن کی نگاہیں جب دوزخ

۳۶۱ اصل میں لفظ حِجَاب استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد وہ دیوار ہے جو دوزخ اور جنت  
کے درمیان کھڑی کر دی جائے گی۔ سورہ حدید (۵۷) کی آیت ۱۳ میں اس کا ذکر ہے۔

۳۶۲ آیت کے الفاظ ہیں: 'وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ'۔ لفظ 'أَعْرَاف' کے معنی بلندیوں  
کے ہیں۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں یہ اُن برجیوں اور دیدبانوں کے لیے آیا ہے جو اطراف و  
جوانب کو دیکھنے کے لیے اُس دیوار پر بنی ہوں گی جو دوزخ اور جنت کے درمیان کھڑی کی جائے  
گی۔ لفظ 'رِجَال' جب اس طریقے سے آتا ہے، جس طرح یہاں آیا ہے تو اس سے نمایاں اور ممتاز  
شخصیتیں مراد ہوتی ہیں۔ یہاں اس سے امتوں کے رجال مراد ہیں جو دنیا میں حق کے علم بردار اور  
خیر کے داعی بن کر کھڑے ہوئے۔

۳۶۳ یعنی اُس علامت سے جو لوگوں کے اعمال کے اثرات سے اُن کے چہروں پر نمایاں  
ہو جائے گی۔ روایتوں میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو وضو کے آثار سے  
پہچانیں گے، جن سے اُن کی پیشانیاں اور چہرے چمک رہے ہوں گے۔ اس نوعیت کے بعض  
اشارات قرآن میں بھی ہیں۔

۳۶۴ یہ الفاظ اُن کی ذہنی کیفیت کے لحاظ سے استعمال ہوئے ہیں کہ یہ سارا اعزاز و اکرام  
دیکھنے کے باوجود اپنی تواضع اور فروتنی کے سبب سے وہ یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ پروردگار کا فیصلہ

\* مسلم، رقم ۵۰۳۔





الاعراف

قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٣٦٥﴾ وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ  
رِجَالًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ  
تَسْتَكْبِرُونَ ﴿٣٦٦﴾ أَهَؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللَّهُ بِرَحْمَةٍ

والوں کی طرف پھیری جائیں گی تو (بے اختیار) کہیں گے: پروردگار، ہمیں ان ظالم لوگوں کا ساتھی نہ بنانا۔ (اس کے بعد) یہ برجیوں والے (دوزخ کے) کچھ نمایاں لوگوں کو پکاریں گے، جنہیں یہ اُن کی علامت سے پہچانتے ہوں گے۔ یہ اُن سے کہیں گے: تمہارے کیا کام آئے تمہارے جتھے اور تمہارا وہ تکبر جو تم کیا کرتے تھے! (ذرا جب تک صادر نہیں ہو جاتا، اُس کی رحمت کی امید ہی کی جاسکتی ہے۔

﴿٣٦٥﴾ آیت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ جنت کے نظارے میں اُن کی محویت کو دیکھ کر اُنہیں توجہ دلائی جائے گی کہ ذرا ایک نظر ان اہل دوزخ پر بھی ڈال لیجیے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ جنت اور دوزخ کا یہ مشاہدہ اُنہیں اس لیے کرایا جائے گا کہ حق و باطل، دونوں کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور اہل حق کو بشارت دیں اور حق کے دشمنوں کی فضیحت کے لیے اُن کو سرزنش کریں۔

﴿٣٦٦﴾ یہ تعوذ کے الفاظ ہیں جو دوزخ والوں پر نظر پڑتے ہی بے اختیار اُن کی زبان سے نکلیں گے۔ ان سے جہنم کے مناظر کی ہول نا کی بھی ظاہر ہوتی ہے اور وہ کمال خشتیت بھی جس کے ساتھ وہ ان مناظر کو دیکھ رہے ہوں گے۔

﴿٣٦٧﴾ یہاں بھی اصل میں وہی لفظ 'رَجَال' ہے جس کے بارے میں ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ یہ جب اس طریقے سے آتا ہے، جس طرح ان آیتوں میں آیا ہے تو اس سے کسی گروہ یا جماعت کے بڑے اور نمایاں لوگ مراد ہوتے ہیں۔ آگے وضاحت ہے کہ ان کی علامتیں اُنہیں دوسروں سے ممتاز کر دیں گی، لہذا پہچانے جائیں گے کہ یہ فرعون ہے، یہ ابو جہل اور ابولہب ہے اور



أَدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿٣٩﴾  
وَنَادَىٰ أَصْحَابُ النَّارِ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ  
الْمَاءِ أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ ۖ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكَافِرِينَ ۝  
الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَهْوًا وَلَعِبًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۖ فَالْيَوْمَ

جنت کی طرف دیکھو)، کیا یہی ہیں وہ لوگ جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ یہ اللہ کی کسی رحمت کے مستحق نہیں ہو سکتے؟ (جنت کے لوگو)، تم (اپنی اس) جنت میں داخل رہو، اب نہ تمہارے لیے کوئی خوف ہے اور نہ تم کبھی غم زدہ ہو گے۔ ۴۶-۴۹

اہل جنت کو (دیکھ کر) یہ دوزخ والے آواز دیں گے کہ اپنے ہاں کا کچھ پانی ہم پر بھی انڈیل دو یا کچھ روزی جو اللہ نے تمہیں عطا فرمائی ہے، ہمیں بھی عنایت کرو۔ وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں منکروں کے لیے حرام کر رکھی ہیں۔

یہ فلاں اور فلاں ہے۔

۳۶۸ قرآن میں کئی جگہ بیان ہوا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے منکرین نے اُن کے پیروں کو اُن کی غریبی اور کمزوری کے سبب سے بالعموم اسی نظر سے دیکھا اور اُن کے بارے میں اسی اعتماد سے دعوے کیے ہیں کہ جنہیں خدا نے دنیا میں کچھ نہیں دیا، وہ آخرت میں اُس کی رحمتوں کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں؟

۳۶۹ اصل میں لفظ اَدْخُلُوا آیا ہے۔ یہ اپنے ابتدائی معنی میں نہیں، بلکہ تمکن و استمرار کے مفہوم میں ہے۔ سورہ یوسف کی آیت اَدْخُلُوا مِصْرَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِينَ\* میں بھی یہی مفہوم

\* یوسف ۹۹:۱۲۔





الاعراف  
۷

نَنسَهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هَذَا ۖ وَمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿٥١﴾  
وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ  
يُؤْمِنُونَ ﴿٥٢﴾ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ ۚ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلَهُ يَقُولُ

(فرمایا): اُن کے لیے جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا لیا اور جنھیں دنیا کی زندگی  
نے دھوکے میں مبتلا کیے رکھا۔ سو آج ہم انھیں اُسی طرح بھلا دیں گے، جس طرح وہ  
اپنے اس دن کی ملاقات کو بھولے رہے اور جس طرح وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے  
رہے۔ (اس وقت، اے پیغمبر)، ہم (تیری قوم کے) ان لوگوں کے پاس ایک ایسی  
ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے تمھیں جنت سے سرفراز فرمایا ہے، تم اس میں سرفراز رہو، تمھارے  
لیے اب نعمت ہی نعمت ہے۔

۳۷۰ مطلب یہ ہے کہ انھیں حتمی طور پر ان سے محروم رکھنے کا فیصلہ کر دیا ہے، اس لیے یہ  
نعمتیں نہ اُن کو پہنچ سکتی اور نہ وہ کسی طرح انھیں پاسکتے ہیں۔  
۳۷۱ یہاں سے آگے پھر ایک تضمین ہے۔ قریش کی تنبیہ کے لیے اہل جنت کے جواب کے  
ساتھ ملا کر اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمادی ہے کہ منکرین سے کون لوگ مراد ہیں۔  
۳۷۲ یہ وجہ بیان ہوئی ہے کہ انھوں نے اس طرح کالا بالیا نہ طرز عمل کیوں اختیار کیا۔ فرمایا:  
اس لیے کہ دنیا میں عیش اور آزادی کے ساتھ جینے کی جو مہلت انھیں دی گئی، وہی انھیں دھوکے  
میں ڈالنے کا باعث بن گئی اور انھوں نے خیال کیا کہ دنیا بس اسی لیے پیدا ہوئی ہے کہ بابر بہ عیش  
کوش۔

۳۷۳ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو بھولتا نہیں، چنانچہ لازم مقصود ہے، یعنی نظر انداز کر دیں گے۔  
۳۷۴ اصل الفاظ ہیں: 'مَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ'۔ پچھلے جملے پر عطف نے اس فقرے  
میں 'کما کانوا' کا مفہوم پیدا کر دیا ہے۔ ہم نے ترجمہ اسی کے لحاظ سے کیا ہے۔



الَّذِينَ نَسُوهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَنَا  
مِنْ شُفْعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا أَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ  
قَدْ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٥٣﴾

کتاب لے آئے ہیں، جس کی تفصیل ہم نے علم قطعی کی بنیاد پر کی ہے، اُن لوگوں کے لیے ہدایت و رحمت بنا کر جو ایمان لائیں۔ کیا یہ اسی کے منتظر ہیں کہ جس چیز کی خبر دی جا رہی ہے، اُس کی حقیقت سامنے آ جائے؟ جس دن اُس کی حقیقت سامنے آ جائے گی تو یہی لوگ جنھوں نے اس سے پہلے اُسے نظر انداز کر دیا تھا، کہیں گے کہ بے شک، ہمارے پروردگار کے بھیجے ہوئے پیغمبر بالکل سچی بات لے کر آئے تھے۔ پھر کیا ہیں کوئی ہمارے سفارشی کہ ہمارے حق میں سفارش کر دیں یا ہے کوئی صورت کہ ہمیں لوٹا دیا جائے کہ ہم اُس کے خلاف عمل کریں جو پہلے کرتے رہے ہیں! (افسوس)، ان لوگوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال لیا اور جو کچھ افترا یہ کرتے رہے، وہ سب ان سے جاتے رہے ہیں۔ ۵۳-۵۰

۳۷۵ یہاں سے آگے روئے سخن قریش کی طرف ہے۔ یہ انداز کی سورہ ہے اور اس کے مخاطب بھی وہی ہیں، اس لیے کلام بار بار اُن کی طرف لوٹتا ہے۔  
۳۷۶ یعنی ایسے علم کی بنیاد پر جو ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے اور بالکل اٹل ہے۔ آیت میں اس کے لیے لفظ 'عِلْم' آیا ہے جس کی تنکیر تَحْمِیْمِ شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کی صورت میں ایک ایسی کتاب ان کے پاس آئی ہے جس میں ہم نے اپنے علم قطعی کی روشنی میں اُن تمام امور کی تفصیل کر دی ہے جن کو ماننا اور جن پر عمل کرنا آخرت کی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔  
۳۷۷ اصل الفاظ ہیں: 'هُدًى وَ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ'۔ ان میں فعل ارادہ فعل کے



إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ  
ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۚ يُغْشَىٰ اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا ۚ

(لوگو)، حقیقت یہ ہے کہ تمہارا پروردگار وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو  
چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر اپنے عرش پر متمکن ہوا۔ وہ رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے جو

معنی میں ہے، یعنی جو ماننا چاہیں، اُن کے لیے دنیا میں ہدایت اور نتیجے کے طور پر آخرت میں  
رحمت بنا کر۔

۳۷۸ یعنی خدا پر جھوٹ باندھ کر اُس کے شریک ٹھہراتے اور اپنی طرف سے بدعتیں ایجاد  
کرتے رہے۔

۳۷۹ یہ اللہ کے ایام ہیں جن کے بارے میں قرآن نے صراحت فرمائی ہے کہ ہمارے  
حساب سے ہزار سال کے برابر بھی ہوتے ہیں اور پچاس ہزار سال کے برابر بھی۔ مدعا یہ ہے کہ  
جس کو کائنات کا خالق مانتے ہو، وہی کائنات کا رب بھی ہے۔ اُس نے دنیا کو پیدا کر کے تمہارے  
مزعومہ شرکا و شفعا کے حوالے نہیں کر دیا جنہیں تم رب بنائے بیٹھے ہو اور اسی بنا پر اُن کی عبادت کرتے  
ہو۔ وہ اُس کا انتظام و انصرام خود دیکھ رہا ہے۔ اس عالم کو وہ اپنے کلمہ ”کُنْ“ سے چشم زدن میں بھی  
پیدا کر سکتا تھا، مگر اُس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ اسے اہتمام و تدریج کے ساتھ اور چھ ادوار میں  
پیدا کرے تاکہ اُس کے کمال قدرت کے ساتھ اُس کی ربوبیت اور رحمت کی شانیں بھی نمایاں  
ہوں اور تم اپنے خالق کو اُس کی ابدی رحمتوں کے ساتھ اپنے پروردگار کی حیثیت سے بھی پہچان لو۔  
استاذ امام لکھتے ہیں:

”...خدا کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں تھی کہ ہماری غذا کے لیے براہ راست آسمان سے  
روٹی برستی، پھر یہ کیوں ضروری ہوا کہ ہوائیں چلیں، بادل اٹھیں، مینہ برسے، کھیتوں میں ہل  
چلیں، گندم بوئی جائے، انکھوے نکلیں، ڈنٹھل پیدا ہوں، اُس میں برگ و بار نمایاں ہوں، فصل  
ایچے، خوشے نمودار ہوں، پھر اُن میں دانے بیٹھیں، پھر گرم و خشک ہوائیں چلیں جو ان دانوں کو





وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مَسْخَرَاتٍ بِأَمْرِهِ طَالَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ  
تَبْرَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٥٧﴾ ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ

اُس کے پیچھے دوڑتی چلی آتی ہے۔ اور اُس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کیے ہیں جو اُس کی حکم برداری میں لگے ہوئے ہیں۔ سنو، خلق بھی اُسی کی ہے اور حکم بھی اُسی

پکائیں اور اس طرح کہیں چھ مہینے کے گرم و سرد مراحل سے گزر کر گندم کا دانہ کھیت سے کسان کے کھتے تک پہنچے؟ یہ سب اس لیے ہے کہ اس طرح اس کائنات کی ایک ایک چیز خدا کی آیات خلق و تدبیر اور اُس کے عجائب قدرت و حکمت کا ایک دفتر بن گئی ہے۔ انسان اس کے جس گوشے پر بھی نظر ڈالتا ہے، اگر آنکھیں کھلی ہوئی اور عقل بیدار ہو تو معرفت الہی کا ایک دبستان کھل جاتا ہے۔ ایک ایک شے نہ جانے کتنے بھیس بدلتی اور کتنے جاے تبدیل کرتی ہے تاکہ وہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرے اور ہم اُن کے اندر خدا کی نشانیوں کو دیکھیں اور اُن سے سبق حاصل کریں۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۷۷)

۳۸۰ اصل الفاظ ہیں: ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ۔ یہ خدا کے اقتدار کی تعبیر ہے اور اسْتَوَىٰ کے ساتھ عَلٰی نے اس میں تمکن کے معنی پیدا کر دیے ہیں۔ اس سے وہ بات مزید واضح ہو گئی ہے جو پچھلے جملے میں مضمر تھی کہ خدا محض علت العلل نہیں ہے کہ محرک اول کی حیثیت سے اُس نے ایک حرکت تو پیدا کر دی، مگر اس کے بعد کسی گوشے میں جا کر بیٹھ گیا ہے۔ ہرگز نہیں، وہ اپنی کائنات کے تحت حکومت پر متمکن ہے اور اُس کے تمام معاملات براہ راست اُس کی نگرانی میں انجام پا رہے ہیں۔

۳۸۱ یہ اُس تدبیر و انتظام کی وضاحت کی ہے جو اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ کے جملے میں بالاجمال بیان ہوا ہے۔ یعنی ہر چیز اپنے مفوضہ فرائض پورے جوش اور سرگرمی کے ساتھ انجام دے رہی ہے۔ نہ کوئی چیز اپنی ذمہ داری سے غافل ہو سکتی ہے اور نہ بال برابر اپنے حدود سے تجاوز کرتی ہے۔ مہ و آفتاب ہوں یا نجوم و کواکب، سب اپنے خالق کے فرماں بردار ہیں، اُس کے حکم



الْمُعْتَدِينَ ۝ وَلَا تَفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا

کا ہے۔ بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، جہانوں کا پروردگار۔ تم اپنے پروردگار کو گڑ گڑاتے، ہوئے اور چپکے چپکے پکارو، اُس کے سامنے یہی زیبا ہے، اس لیے کہ وہ حد سے بڑھنے، سے سرمو انحراف نہیں کرتے۔

۳۸۲ یعنی نہ خلق میں اُس کا کوئی شریک ہے اور نہ مخلوقات کی تدبیر امور میں۔ وہی خالق ہے، وہی مالک ہے اور اُسی کا امر و حکم کائنات کے گوشے گوشے میں جاری ہے۔ کسی فرشتے، کسی جن، کسی پیغمبر، کسی ولی کا اس معاملے میں کوئی حصہ نہیں ہے، سب اُس کے حکم کے پابند اور اُس کے سامنے مجبور محض ہیں۔

۳۸۳ چنانچہ اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ اُس کی بارگاہ تک رسائی کے لیے وسائل و وسائط تلاش کیے جائیں۔ اُس کی عظمت و جبروت کے ساتھ اُس کی رحمت و برکت بھی بے پایاں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ خدا کے باب میں اُس غلط فہمی کا ازالہ ہے جس میں مشرک قومیں بالعموم مبتلا ہوئیں کہ انھوں نے خدا کی عظمت و جبروت کا تصور اس قدر بڑھایا کہ اُس کی صفات رحمت و برکت کا تصور اُس کے نیچے بالکل دب کر رہ گیا۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بندوں کے لیے خدا سے براہ راست تعلق و توسل ناممکن سمجھ لیا گیا اور پھر ایسے وسائل و وسائط کی تلاش ہوئی جو خدا سے مقصد برآری کا ذریعہ بن سکیں... صفات الہی کے باب میں یہ گم راہی شرک کے عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل ہے۔ مشرکین نے بہت سے فرضی معبودوں کی پرستش، بالخصوص ملائکہ کی پرستش، اسی وجہ سے کرنی شروع کی کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں، یہ ہم سے راضی رہیں تو یہ اپنے باپ کو ہم سے راضی رکھیں گی اور پھر سارا جہان ہم پر مہربان ہو جائے گا۔“ (تدبر قرآن ۲۷۹/۳)

۳۸۴ مطلب یہ ہے کہ جب خلق بھی اُسی کی ہے اور امر و حکم بھی اُسی کا ہے تو اُس کے حضور میں رعونت اور استکبار کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد تو ہر سلیم الفطرت انسان کو اپنا فرض سمجھنا



الاعراف



وَطَمَعًا إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾

والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور زمین کی اصلاح کے بعد اُس میں فساد برپا نہ کرو اور اُسی کو پکارو،<sup>۳۸۵</sup>  
بیم ورجا، دونوں حالتوں میں۔<sup>۳۸۶</sup> یہی خوبی کا راستہ ہے، تم اسی پر چلو، اس لیے کہ اللہ کی  
رحمت اُن لوگوں سے قریب ہے جو خوبی اختیار کرنے والے ہیں۔<sup>۳۸۸</sup> ۵۶-۵۴

چاہیے کہ اُسے کمال عاجزی اور لجاجت کے ساتھ پکارے۔ اُس کی اداؤں اور حرکات سے بھی اسی  
کا اظہار ہونا چاہیے اور الفاظ و عبارات سے بھی۔ پھر اس عاجزی اور لجاجت میں وقار بھی ہونا  
چاہیے اور اخلاص بھی۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ لوگوں کو دکھا کر نہیں، اُسے چپکے چپکے پکارو۔ وہ تمہارے  
دلوں کی حالت کو جانتا اور تمہاری سرگوشیوں کو سنتا ہے۔ اُس کے حضور نہ چیخنے چلانے کی ضرورت  
ہے اور نہ دکھاوے کا کوئی موقع، وہ سمیع و علیم ہے۔

۳۸۵ یعنی اُن کو پسند نہیں کرتا جو اکڑیں اور اپنے حدود سے تجاوز کر کے اپنے آپ کو بڑی چیز  
سمجھنے لگیں۔ اُس کے سامنے عاجزی اور تضرع ہی زیبا ہے۔

۳۸۶ قرآن مجید میں یہ تعبیر نظم اجتماعی کے خلاف سرکشی کے لیے بھی اختیار کی گئی ہے اور خدا  
اور اُس کے رسولوں کے مقابلے میں سرکشی کے لیے بھی۔ یہاں اسی دوسرے مفہوم میں ہے۔  
انسان نے زمین پر زندگی کی ابتدا کی تو وہ اس فساد سے پاک تھی۔ بعد کے زمانوں میں بھی رسولوں  
کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اسے بار بار پاک کیا گیا۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ اس کی اصلاح  
کے بعد اس میں فساد برپا نہ کرو۔

۳۸۷ یعنی جن چیزوں کے آرزو مند ہو، اُن کے لیے بھی اُسی کو پکارو اور جن سے بچنا چاہتے  
ہو، اُن کے لیے بھی اُسی کی پناہ ڈھونڈو۔ پیچھے خدا کو پکارنے کی ہیئت بتائی تھی۔ یہ اُس کا محرک بتا  
دیا ہے کہ خوف و طمع کی ہر حالت میں تمہارا مرجع و مولیٰ صرف اُسی پروردگار کو ہونا چاہیے جو تمہارا اور  
تمہارے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی کائنات کا خالق بھی ہے اور اپنی مخلوقات کی تدبیر امور کرنے والا  
بھی۔





الاعراف

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٣٨٨﴾  
وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرِجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرِجُ

وہی ہے جو اپنی رحمت (برسانے) سے پہلے ہواؤں کو خوش خبری بنا کر بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھا لیتی ہیں تو ہم اُسے کسی مردہ زمین کی طرف ہانک لے جاتے ہیں اور وہاں مینہ برسا دیتے ہیں، پھر اُس سے طرح طرح کے پھل پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم مردوں کو بھی اٹھا کھڑا کریں گے، شاید تم یاد دہانی حاصل کرو۔ جو زمین اچھی ہوتی ہے، وہ اپنے پروردگار کے حکم سے خوب

۳۸۸ اس سے معلوم ہوا کہ خوبی اور احسان کے مقام پر فائز رہنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان بیم ورجاء دونوں حالتوں میں اپنے پروردگار کی طرف یک سو رہے اور ہر مشکل کے وقت اُسی سے دعا و مناجات کرے۔

۳۸۹ اوپر فرمایا تھا کہ ہر حال میں اللہ ہی سے لو لگاؤ، اُس کی رحمت اُن لوگوں کے قریب ہے جو اللہ سے لو لگاتے ہیں۔ یہ اُس کی تمثیل بیان کر دی ہے کہ جس دن پورے عالم کے لیے اس رحمت خداوندی کا ظہور ہوگا، اُسے دور نہ سمجھو۔ جس کی ہوائیں چل رہی ہیں، وہ ابر رحمت بھی عنقریب برس جائے گا اور اُس سے فیض یاب ہونے کے لیے ہم مردوں کو اُسی طرح اٹھا کھڑا کریں گے، جس طرح بارش سے مردہ زمین کو زندہ کر دیتے ہیں۔

آیت میں 'سُقْنَهُ' کی ضمیر 'سَحَاب' کے لیے ہے۔ یہ اگرچہ 'سَحَابَةُ' کی جمع ہے، مگر صورت کے لحاظ سے واحد ہے، اس لیے ضمیر واحد آگئی ہے۔ 'أَنْزَلْنَا بِهِ' میں 'ب' ظرفیہ ہے۔



## إِلَّا نَكِدًا ۖ كَذَلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿٥٨﴾

پھل پھول لاتی ہے اور جو ناقص ہوتی ہے، اُس کی پیداوار بھی ناقص ہی ہوتی ہے۔  
(یہی تمہارا معاملہ ہے) <sup>۳۹۱</sup>، ہم (اس قرآن کی آیتوں میں) اپنی نشانیاں اسی طرح گونا گوں پہلوؤں سے دکھاتے ہیں، اُن لوگوں کے لیے جو شکر گزار بننا چاہیں <sup>۳۹۲</sup>۔ ۵۷-۵۸

ہم نے ترجمہ اسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۳۹۰ یعنی زمین کی ان نشانیوں میں سے اُس دن کی یاد دہانی حاصل کرو جس میں مردے زندہ کیے جائیں گے۔

۳۹۱ یہ اُسی تمثیل کو آگے بڑھا کر اُس رحمت کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو قرآن کی صورت میں نازل ہوئی ہے کہ اُس کا فیض بھی ہر شخص کو یکساں نہیں پہنچے گا۔ دلوں کی زمین زرخیز ہوگی تو باغ و چمن لہلہا اٹھیں گے اور شور زمینوں سے اگر کچھ اگا بھی تو یونہی کچھ خار و خس اگ جائیں گے۔ اس سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔ آخر میں 'لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا' کے الفاظ ہیں۔ جملے کے پچھلے حصے میں 'نَكِد' کا مقابل لفظ عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گیا ہے۔ اُس سے جو مفہوم پیدا ہوتا ہے، ہم نے ترجمے میں اُسے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ تمثیل کس قدر حقیقت افروز اور قرآن کی بلاغت کا کیسا عمدہ نمونہ ہے؟ استاذ امام نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”... ایک ہی بارش کی تمثیل سے کتنے حقائق آشکارا ہو گئے! توحید کی دلیل بھی سامنے آ گئی، امکان معاد اور وقوع قیامت کی نظیر بھی مل گئی اور ہدایت و ضلالت کے باب میں جو سنت اللہ مقرر ہے، وہ بھی نمایاں ہو گئی۔ گویا سورہ کے آغاز سے یہاں تک جو مسائل زیر بحث آئے تھے، اصولاً وہ سب ہی بے نقاب ہو گئے... یہ کائنات پروردگار نے بنائی ہی ایسی شکل میں ہے کہ اگر انسان دیدہ بینا رکھتا ہو تو پتا پتا، بوٹا بوٹا اُن حقائق کی شہادت دے رہا ہے جن کی دعوت قرآن دے رہا ہے، لیکن دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان کہاں ہیں؟“ (تذبر قرآن ۳/۲۸۵)







الاعراف  
۷

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يُقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلَهِ غَيْرُهُ ۖ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٥٩﴾ قَالَ الْمَلَأُ

(تمھاری تاریخ بھی انھی حقائق کی گواہی دیتی ہے)۔

ہم نے نوح کو اُس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا تو اُس نے انھیں دعوت دی کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔

۳۹۲ اصل الفاظ ہیں: 'لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ'۔ ان میں فعل ارادہ فعل کے لیے ہے۔ شکر کی حقیقت قدر دانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن میں خدا نے اپنی نشانیوں کی طرف گونا گوں پہلوؤں سے جو توجہ دلائی ہے، یہ اُس کا بہت بڑا احسان ہے۔ تم اس کی قدر کرو گے اور اس کے نتیجے میں خدا کے شکر گزار بننا چاہو گے تو تمھارے دلوں کی زمین بھی سرسبز و شاداب ہو جائے گی۔

۳۹۳ سورہ کے مخاطب چونکہ قریش ہیں، اس لیے آگے استدلال کے غرض سے انھی قوموں کی سرگزشتیں سنائی ہیں جن سے وہ واقف تھے اور ان کی سرگزشتوں میں سے بھی صرف اتنا حصہ نمایاں کیا ہے جو انذار کے مقصد سے ضروری تھا۔ مدعا یہ ہے کہ عقل و فطرت کے دلائل سے نہیں مانو گے تو ہمارے پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد تم بھی اُسی انجام کو پہنچ جاؤ گے جس کو تم سے پہلے رسولوں کی قومیں پہنچی ہیں۔

۳۹۴ یہی دعوت پیچھے قریش کو دی گئی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تمام جدوجہد کا مقصود اسی توحید کا قیام تھا۔ وہ اسی لیے بھیجے گئے کہ خدا کے بندوں کو دوسروں کی بندگی سے چھڑا کر خالص خدا کے بندے بنادیں۔ قرآن نے سب سے زیادہ تاکید اور وضاحت کے ساتھ اسی کو بیان کیا ہے، یہاں تک کہ اس صحیفہ آسمانی کا آخری باب اپنے مضمون کے لحاظ سے جس سورہ پر ختم ہوا ہے، اُس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو یہی ہدایت فرمائی ہے کہ لوگوں کے سامنے برملا اعلان کر دیا جائے کہ اللہ یکتا، یگانہ اور بے ہمتا ہے، سب کے لیے پناہ کی چٹان ہے، وہ نہ باپ ہے نہ بیٹا اور



مِنْ قَوْمِهِ اِنَّا لَنُرِيكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٦٠﴾ قَالَ يَقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ  
وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦١﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلَتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ  
لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾ اَوْ عَجِبْتُمْ اَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ

تم پر ایک ہول ناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اُس کی قوم کے بڑوں نے جواب  
دیا: ہم تو تمہیں صریح گم راہی میں دیکھ رہے ہیں۔ اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو، میں  
کسی گم راہی میں نہیں ہوں، بلکہ رب العالمین کا رسول ہوں، تمہیں اپنے پروردگار کے  
پیغامات پہنچا رہا ہوں، تمہاری خیر خواہی کر رہا ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا

نہ زمین و آسمان میں کوئی اُس کی برابری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ یہ توحید تقاضا کرتی ہے کہ لوگ بالکل  
اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیں، اُس کی ذات و صفات اور اُس کے حقوق میں اُس کی یکتائی  
تسلیم کریں، اُسی سے مدد چاہیں، نعمت ملے تو اُسی کا شکر ادا کریں، مصیبت آئے تو اُسی سے فریاد  
کریں، بیم ورجا، ہر حال میں اُسی کو پکاریں اور کسی فرشتے، جن، پینمبر، ولی یا کسی بھی مخلوق کو کسی پہلو  
سے اُس کا شریک نہ ٹھیرائیں۔

۳۹۵ یہ اُس عذاب سے انداز ہے جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں لازماً آتا ہے اور اُن کی  
قوموں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت زمین پر خدا کی  
دینونت کا ظہور ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں ایک قیامت صغریٰ لوگوں کو اسی دنیا میں برپا کر کے دکھا  
دی جاتی ہے تاکہ آخرت کا تصور بھی اُسی معیار پر ثابت کر دیا جائے جس معیار پر سائنسی حقائق  
معمل (laboratory) کے تجربات سے ثابت کیے جاتے ہیں۔

۳۹۶ اس لیے کہ تم اُس راستے سے منحرف ہو گئے ہو جس پر ہمارے باپ دادا ہمیشہ سے چلتے  
آئے ہیں۔ تم اُن کے دین کی تحقیر کر رہے ہو اور مزید یہ کہ ہمیں عذاب کی دھمکیاں بھی سنارہے  
ہو۔ یہ صریح گم راہی ہے جس میں تم مبتلا ہو گئے ہو۔





الاعراف

مَنْ رَبِّكُمْ عَلَى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٦٢﴾  
فَكَذَّبُوهُ فَأَنْجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ فِي الْفُلِّ وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا  
بِآيَاتِنَا إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا عَمِينَ ﴿٦٣﴾

ہوں جو تم نہیں جانتے۔ کیا اس بات پر تعجب کر رہے ہو کہ تمہارے پاس خود تمہارے اندر کے ایک شخص کے ذریعے سے تمہارے پروردگار کی یاد دہانی آئی ہے، اس لیے کہ تمہیں خبردار کرے اور اس لیے کہ تم (اللہ سے) ڈرو اور اس لیے کہ تم پر رحم کیا جائے؟<sup>۳۹۷</sup> انہوں نے پھر بھی اُسے جھٹلادیا تو ہم نے اُسے اور جو کشتی میں اُس کے ساتھ تھے، انہیں نجات دی اور اُن سب لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا۔<sup>۳۹۸</sup> یقیناً وہ (دل و دماغ کے) اندھے لوگ تھے۔ ۵۹-۶۳

۳۹۷ قرآن نے سوال اٹھایا ہے، لیکن جواب نہیں دیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس لیے کہ انداز کلام اظہار حسرت و افسوس کا ہے۔ اس اسلوب بیان میں یہ بات مضمحل ہے کہ اگر تم سوچتے، غرور و انانیت کو راہ نہ دیتے تو یہ چیز تمہارے لیے تعجب اور استکبار کے بجائے ممنونیت اور شکرگزاری کا باعث ہوتی کہ خدا نے تمہارے ہی اندر سے ایک شخص کو تمہیں نجات کی راہ دکھانے کے لیے اٹھایا۔ میں تمہارے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں، میرا ماضی و حاضر اور میرا اخلاق و کردار، سب تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میری زبان تمہاری زبان اور میرا دل تمہاری اپنی فطرت کا ترجمان ہے تو کیا یہ بہتر ہوتا کہ تم پر اتمام حجت کے لیے آسمان سے کوئی فرشتہ اترتا یا یہ بہتر ہے کہ تمہاری اپنی ہی زبان اور تمہارا اپنا ہی درد آشنایا دل تم پر گواہی دے؟ اسلوب کلام میں یہ ساری داستان مضمحل ہے اور یہ اضمار ہی اس محل میں تقاضاے بلاغت ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۹۵)

۳۹۸ اس سے واضح ہے کہ یہ عذاب اُسی علاقے میں اور انہی لوگوں پر آیا جن پر نوح علیہ السلام



وَالِی عَادِ أَخَاهُمْ هُودًا ۖ قَالَ یَقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ إِلَٰهِ

عاد کی طرف ہم نے اسی طرح اُن کے بھائی ہود کو بھیجا تھا۔ اُس نے دعوت دی

نے اتمام حجت کیا تھا۔ یہ دجلہ و فرات کے دو آبے کا علاقہ تھا۔ چنانچہ آرمینیا کی سرحد پر کوہ اراراط کے نواح میں لوگ اب بھی نوح علیہ السلام کے بعض آثار کی نشان دہی کرتے ہیں۔ قرآن میں اس کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم میں رہے اور پوری درد مندی کے ساتھ اُسے متنبہ کرتے رہے۔ لیکن اس طویل جدوجہد کے بعد بھی جب قوم نے اُن کی تکذیب کر دی اور اپنے رویے کی اصلاح پر آمادہ نہیں ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایک کشتی بنائی جائے۔ یہ قوم کے لیے گویا الٹی میٹم تھا کہ کشتی کی تکمیل کے ساتھ ہی اُس کا پیمانہ عمر بھی لبریز ہو جائے گا۔ چنانچہ کشتی بن گئی اور ماننے والے اُس میں سوار ہو گئے تو ایک عظیم طوفان ابل پڑا۔ زمین کو حکم دیا گیا کہ اپنا سارا پانی اگل دے اور آسمان کو حکم دیا گیا کہ اپنا سارا پانی برسا دے۔ پھر جو نشان مقرر کر دیا گیا تھا، پانی اُس پر جا کر ٹھیر گیا اور پوری قوم اُس میں غرق ہو گئی، یہاں تک کہ نوح علیہ السلام کا بیٹا کنعان بھی اپنی ہٹ دھرمی کے باعث اُس کی نذر ہو گیا۔ یہ ایک عبرت انگیز منظر تھا۔ طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ پہاڑوں کی طرح موجیں اٹھ رہی تھیں۔ نوح کی کشتی اُن کے تھپیڑوں سے نبرد آزما تھی کہ اتنے میں باپ نے دیکھا کہ سامنے بیٹا حیران و ششدر کھڑا ہے۔ اُس کو دیکھ کر شفقت پداری نے جوش مارا، پکارا اٹھے کہ جان پدر، اب بھی موقع ہے، ان منکروں کو چھوڑ کر کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ لیکن اس ہول ناک منظر کو دیکھ کر بھی اُس کی ضد میں کچھ فرق نہیں آیا۔ اُس نے کہا: میں کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا۔ نوح علیہ السلام نے کہا: یہ پانی نہیں، قہر الہی ہے۔ اس سے خدا کے سوا آج کوئی بچانے والا نہیں ہو سکتا۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ اچانک ایک موج اٹھی اور بیٹے کو بہا لے گئی۔

۳۹۹ عَادِ عَرَبِ کِی قَدِیْمِ تَرِیْنِ قَوْمِ ہِے۔ یَہِ سَامِیْ نَسْلِ سَے تَعْلُقِ رَکھتے تھَے۔ اِن کا مَسکن اَحْقَافِ





غَيْرُهُ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٦٥﴾ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرِيكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿٦٦﴾ قَالَ يَقَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٦٧﴾ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ ﴿٦٨﴾ أَوْ عَجِبْتُمْ أَن جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَبِّكُمْ

کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر کیا ڈرتے نہیں ہو؟ اُس کی قوم کے بڑوں نے جو منکر ہو رہے تھے، اُسے جواب دیا: ہم تو یقیناً تمہیں حماقت میں مبتلا دیکھتے ہیں اور ہمارا پختہ خیال ہے کہ تم جھوٹے ہو۔ اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو، میں کسی حماقت میں مبتلا نہیں ہوں، بلکہ رب العالمین کا رسول ہوں، تمہیں اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور پوری

کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان الربع الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ عرب کے لڑیچر میں یہ اپنی قدامت کے لیے بھی ضرب المثل ہیں اور اپنی قوت و شوکت کے لیے بھی۔ حضرت ہود انہی کے ایک فرد تھے جنہیں رسول کی حیثیت سے ان کی طرف مبعوث کیا گیا۔ قرآن نے امتنان و احسان کے لیے فرمایا ہے کہ عادی طرف ہم نے کسی اجنبی شخص کو نہیں، بلکہ انہی کے بھائی ہود کو بھیجا تا کہ اُن پر ہماری حجت ہر لحاظ سے پوری ہو جائے۔

۴۰۰ یعنی کیا ڈرتے نہیں ہو کہ پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد بھی شرک پر اصرار کرو گے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟

۴۰۱ مطلب یہ ہے کہ ہماری یہ شان و شوکت اور ترقی و استحکام دیکھ رہے ہو اور اس کے باوجود ہمیں عذاب کی وعیدیں سناتے ہو۔ اس کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ خرد باختہ ہو چکے ہو اور جھوٹی باتیں سنا کر ہمیں ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔



عَلَى رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ ۖ وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً ۚ فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَ مَا كَانَ

دیانت کے ساتھ تمھاری خیر خواہی کرنے والا ہوں۔ کیا اس بات پر تعجب کر رہے ہو کہ تمھارے پاس خود تمھارے اندر کے ایک شخص کے ذریعے سے تمھارے پروردگار کی یاد دہانی آئی ہے کہ تمھیں خبردار کرے؟ یاد کرو، جب اُس نے نوح کی قوم کے بعد تمھیں بادشاہی دی اور تمھاری ساخت میں تمھیں خوب محکم اور تنومند کیا۔ سو اللہ کی شانوں کو یاد کرو تا کہ فلاح پاؤ۔ اُنھوں نے جواب دیا: کیا ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم اکیلے خدا کی عبادت کریں اور اُنھیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے

۴۰۲ اصل میں لفظ 'خُلَفَاء' استعمال ہوا ہے۔ یہ جس طرح نائب اور جانشین کے معنی میں آتا ہے، اُسی طرح نیابت اور جانشینی کے مفہوم سے مجرد ہو کر محض صاحب اقتدار کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ سورہ ص (۳۸) کی آیت ۲۶ میں اس کی نظیر موجود ہے۔ ہم نے اسی لحاظ سے اس کا ترجمہ بادشاہی کیا ہے۔ لفظ کے اس طرح اپنے معنی کے کسی پہلو سے مجرد ہو کر آنے کی مثالیں عربی زبان میں اور بھی ہیں۔

۴۰۳ یعنی عقلی لحاظ سے محکم اور جسمانی لحاظ سے تنومند۔ اس کے لیے اصل میں 'زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'خَلْق' کے معنی یہاں ساخت کے ہیں جو باطنی اور ظاہری، دونوں طرح کی ہو سکتی ہے۔ عرب کی روایتوں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ قوم عاد و نون ہی اعتبارات سے بڑی نمایاں تھی۔

۴۰۴ یہ جملہ بتا رہا ہے کہ پیچھے جو بات کہی گئی ہے، وہ اپنے اندر امتنان اور تنبیہ، دونوں ہی کے پہلو رکھتی ہے۔





الاعراف

يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَاتَّبَعْنَاهُمْ مَا تَعَدُّنَا إِنْ كُنْتُمْ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ قَالَ  
قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ أَتُجَادِلُونَنِي فِي أَسْمَاءِ  
سَيِّئَاتٍ لَهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا نَزَّلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ ط

۴۰۵ ہیں؟ یہی بات ہے تو جس عذاب کی دھمکی ہمیں سنارہے ہو، اُسے ہم پر لے آؤ، اگر تم سچے  
ہو۔ اُس نے کہا: تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر گندگی آ پڑی اور (اُس کا) غضب  
ٹوٹ پڑا ہے۔ کیا تم مجھ سے اُن ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں  
نے رکھ لیے ہیں، جن کے لیے خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ اچھا، انتظار کرو، میں

۴۰۵ اس میں غصہ بھی ہے اور طنز بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اس لیے پیغمبر بن کر کھڑے ہو گئے ہو  
کہ ہم اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر تمہارے پیرو بن جائیں؟  
۴۰۶ یعنی فیصلہ ہو گیا کہ کفر و شرک کی اسی گندگی میں پڑے رہو گے اور اس کے نتیجے میں خدا  
کے غضب کے مستحق ٹھہرو گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مطلب یہ ہے کہ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو اب اس میں دیر نہیں ہے، اس کو آیا ہی  
سمجھو، اس لیے کہ جس ناپاکی و گندگی سے خدا کا غضب بھڑکتا ہے، اُس کی بہت بڑی کھیپ تم  
نے اپنے اوپر لاد لی ہے۔ رِجْس کا اتنا بڑا انبار جمع کر لینے کے بعد اب خدا کے صاعقہ عذاب  
کو دور نہ سمجھو۔“ (تذکر قرآن ۳/۲۹۹)

۴۰۷ لوگ جن ہستیوں کو معبود بناتے اور اُن سے حاجتیں طلب کرتے ہیں، وہ درحقیقت اُن  
کے رکھے ہوئے نام ہی ہوتے ہیں جن کے پیچھے کوئی مسمیٰ نہیں ہوتا۔ اپنی طرف سے نام دے کر  
ایسے ایسے بت تراش لیے جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے پوری کائنات کا نظم وہی چلا رہے ہیں، جب کہ  
درحقیقت اُن میں نہ کوئی بارش کا رب ہوتا ہے، نہ ہوا کا، نہ دولت کا، نہ صحت اور تندرستی کا اور نہ کوئی  
مشکل کشا، گنج بخش، داتا اور غریب نواز ہوتا ہے کہ انہیں کچھ دے سکے یا اُن کے کسی کام آ سکے۔



فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ۝ فَاَنْجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ  
بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَّعْنَا دَابِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَمَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ ۝  
وَإِلَى ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ  
إِلَهِ غَيْرِهِ ۖ قَدْ جَاءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۚ هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةٌ

بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ آخر کار ہم نے اُس کو اور انھیں جو اُس کے ساتھ  
تھے، اپنی رحمت سے بچا لیا اور اُن لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنہوں نے ہماری آیتوں کو  
جھٹلایا اور ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ۶۵-۷۲

اسی طرح ثمود کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالح کو بھیجا تھا۔ اُس نے  
دعوت دی کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں  
ہے۔ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح نشانی آگئی ہے۔ یہ

۷۸؎ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ شرک کے حق میں کوئی عقلی یا نقلی یا فطری دلیل نہ کبھی پیش کی جا  
سکی ہے اور نہ پیش کی جاسکتی ہے۔

۷۹؎ یہ عاد کے بقایا میں سے ہیں۔ اسی بنا پر انھیں عاد ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ عرب کی قدیم  
اقوام میں سے یہ دوسری قوم ہے جس نے عاد کے بعد غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ ان کا مسکن  
شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ ہے جسے الحجر کہا جاتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...ہو سکتا ہے کہ قوم عاد کی تباہی کے وقت جو لوگ عذاب سے محفوظ رہے ہوں، انھوں نے

جنوب سے شمال مغرب کی طرف ہجرت کی ہو اور پھر حجر میں سکونت اختیار کر لی ہو۔ عاد و ثمود

کے اوصاف قرآن میں بھی اور عرب کی روایات میں بھی تقریباً ایک ہی سے بیان ہوئے ہیں۔

بعض شاعر تو ان دونوں قوموں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں، گویا ان کے درمیان کوئی فرق

سرے سے ہے ہی نہیں۔ دونوں کے لیڈر — قیل اور قدار — جن کے ہاتھوں ان قوموں







الاعراف

فَذُرُّوهَا تَاكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمْسُوْهَا بِسَوْءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ  
الْعَذَابِ ۝۴۱ وَادْكُرُوا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِي  
الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا  
فَاذْكُرُوا اِلَّاۤءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْتَوْاۤ فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝۴۲ قَالَ الْمَلَاۤئِكَةُ  
اَسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمٍ لِّلَّذِيْنَ اَسْتَضَعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ

اللہ کی اونٹنی ہے، تمہارے لیے نشانی کے طور پر، لہذا اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں  
چرتی پھرے اور کسی برے ارادے سے اس کو ہاتھ نہ لگانا، ورنہ ایک دردناک عذاب  
تمہیں آپکڑے گا۔ یاد کرو، جب قوم عاد کے بعد اللہ نے تمہیں بادشاہی دی اور زمین  
میں تمہیں عطا فرمایا، تم اُس کے میدانوں میں عالی شان محل بناتے اور پہاڑوں کو گھروں  
کی صورت میں تراش لیتے ہو۔ سو اللہ کی شانوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد نہ مچاتے  
پھرو۔ اُس کی قوم کے بڑوں نے جو متکبر ہو چکے تھے، اپنی قوم کے اُن زیر دستوں سے

پر تباہی آئی، عربی ادب میں ضرب المثل ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بالکل ایک ہی سانچے  
میں ڈھلے ہوئے تھے۔“ (تذکر قرآن ۳/۳۰۰)

۴۱۰ یہ قوم کے مطالبہ عذاب کا جواب ہے کہ خدا کے حکم پر میں نے اپنی اونٹنیوں میں سے  
ایک اونٹنی نامزد کر دی ہے۔ یہ خدا کی نذر ہے، چنانچہ اس لحاظ سے اللہ کی اونٹنی ہے۔ تمہارے لیے  
یہ خدا کے عذاب کی نشانی ہے۔ اس کو گزند پہنچاؤ گے تو سمجھ لو کہ امان کی دیوار گر گئی۔ اس کے بعد  
قہر الہی کے سیلاب کو کوئی چیز تمہاری بستیوں میں داخل ہونے سے نہیں روک سکے گی۔

۴۱۱ اپنے اس فن میں یہ لوگ جس کمال کو پہنچے ہوئے تھے، اُس کے آثار آج بھی مدائن صالح  
میں موجود ہیں۔ یہ آثار ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں اور کم و بیش ویسے ہی ہیں،



اتَعْلَمُونَ أَنَّ صَاحِبًا مَّرْسَلٌ مِّن رَّبِّهِ ط قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ  
مُؤْمِنُونَ ۝ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ۝۴۹

جو ایمان لے آئے تھے، کہا: کیا تم سمجھتے ہو کہ صالح اپنے رب کا بھیجا ہوا ہے؟<sup>۴۱۲</sup>  
اُنھوں نے جواب دیا: ہم تو اُس پیغام کو مانتے ہیں جس کے ساتھ اُسے بھیجا گیا ہے۔<sup>۴۱۵</sup>  
اس پر اُن متکبروں نے کہا: (لیکن) ہم اُس کے منکر ہیں جس پر تم ایمان لے آئے

جیسے ہندوستان میں ایلورا، اسجنفا اور بعض دوسرے مقامات میں پائے جاتے ہیں۔

۴۱۲ یعنی اس ترقی و کمال اور عروج و اقتدار کو خدا کی شان کا ظہور سمجھ کر اُس کا شکر بجالاؤ اور  
اُس کے مقابلے میں تمرد اور سرکشی کا رویہ اختیار نہ کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ مادی ترقی کوئی جرم  
نہیں ہے اور نہ فلک بوس عمارتیں بنانا کسی فساد کی نشانی ہے۔ اس میں فساد اُس وقت پیدا ہوتا ہے،  
جب انسان ان کمالات میں خدا کی شانیں دیکھنے کے بجائے خدا فراموشی کا رویہ اختیار کر لیتا اور خدا  
کے قائم کردہ حدود سے تجاوز کر کے سرکشی اور تمرد پر اتر آتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو سیدنا سلیمان علیہ السلام  
کے صَرَخٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيرَ کی طرح یہی عمارتیں معرفت الہی کی نشانی بن جاتی ہیں۔

۴۱۳ انبیاء علیہم السلام کی دعوت قبول کرنے میں بالعموم غریبوں، ضعیفوں اور دے ہوئے  
لوگوں ہی نے سبقت کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن میں دولت و اقتدار کا غرور نہیں ہوتا کہ قبول  
حق میں رکاوٹ بن جائے۔

۴۱۴ یہ سوال استنکار کی نوعیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا فی الواقع اُسے خدا کا رسول سمجھتے  
ہو؟ اس کے معنی تو ہیں کہ بالکل ہی بے وقوف ہو گئے ہو۔

۴۱۵ یعنی صرف یہی نہیں، بلکہ اُس پیغام کو بھی پورے شرح صدر کے ساتھ مان چکے ہیں جو  
خدا نے اُس کے ذریعے سے بھیجا ہے اور اب عزم و جزم کے ساتھ اُس کی گواہی دے رہے ہیں۔  
ہمارے لیے اس پیغام کی قوت و حجت ہی کافی تھی۔ ہم تمھاری طرح معجزوں اور کرشموں کے منتظر





الاعراف

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا يُصْلِحُ ائْتِنَابًا تَعْدُنَا  
إِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٤٤﴾ فَآخَذَتْهُمْ الرِّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي  
دَارِهِمْ جِثْمِينَ ﴿٤٥﴾ فَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَاقَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ

۴۱۶ ہو۔ پھر انھوں نے اونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں اور پورے تہمرد کے ساتھ اپنے پروردگار  
کے حکم سے سرتابی کی اور کہہ دیا کہ اے صالح، اگر تم خدا کے بھیجے ہوئے ہو تو ہم پر لے آؤ  
وہ عذاب جس کی تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو۔ آخر ایک سخت تھرتھراہٹ نے انھیں آ لیا  
اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ اُس وقت صالح یہ کہتا ہوا

نہیں رہے کہ بدبختی کے اُس مقام تک پہنچ جاتے، جہاں تم کھڑے ہو۔

۴۱۶ یہ آخری جھنجھلاہٹ کا اظہار ہے کہ مانتے ہو تو مانتے رہو۔ تمہارے ماننے سے کیا ہوتا  
ہے۔ ماننا تو درحقیقت ہمارا ماننا ہے اور ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کا انکار ہی کریں گے۔ ہم اس  
شخص کو ہرگز ماننے والے نہیں ہیں۔

۴۱۷ اصل میں لفظ 'عَتَوْا' آیا ہے اور اُس کے ساتھ 'عَنْ' کا صلہ ہے۔ اُس سے یہ سرکشی اور  
سرتابی، دونوں کے مفہوم پر متضمن ہو گیا ہے۔ اونٹنی کو مارنے کا جرم اگرچہ اُن کے ایک سرکش سردار  
نے کیا تھا، مگر قرآن نے اُسے پوری قوم کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باقی  
متمردین بھی اس پر راضی تھے۔ یہ اونٹنی اُن کی سرکشی کو جانچنے کا ایک پیمانہ تھی۔ اس کے مارنے  
سے واضح ہو گیا کہ انھیں مزید مہلت دی گئی تو اُن کا اگلا ہدف خود حضرت صالح ہوں گے۔

۴۱۸ اس لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ زلزلے کا عذاب تھا۔ قرآن کے اشارات سے معلوم  
ہوتا ہے کہ قوم عاد پر آنے والے عذاب کی طرح یہ بھی رعد و برق کا عذاب تھا جس میں شمال کی  
باد صرکئی دنوں تک مسلط رہی اور بادلوں کی ہولناک کڑک اور بہرا کر دینے والی چیخوں نے ہر چیز  
کو ہلا کر رکھ دیا۔ امام حمید الدین فراہی نے سورہ ذاریات کی تفسیر میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔



رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلَكِنْ لَا تُحِبُّونَ النَّصِيحِينَ ﴿٤٩﴾  
وَلَوْ طَآ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ

اُنھیں چھوڑ کر چل دیا کہ میری قوم کے لوگو، میں نے تو اپنے پروردگار کا پیغام تمھیں پہنچا دیا اور تمھاری بہت خیر خواہی کر دی، مگر تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔ ۴۲۰-۷۳-۷۹  
اسی طرح لوط کو بھیجا، جب اُس نے اپنی قوم سے کہا: کیا اس بے حیائی کا

۴۱۹ یعنی عذاب سے ذرا پہلے جب قوم نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ استاذ امام لکھتے

ہیں:

”یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترتیب بیان میں اس بات کو عذاب کے ذکر کے بعد کیوں کر دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ترتیب میں یہ تقدیم و تاخیر تقاضاے بلاغت سے ہوئی ہے۔ ارتکاب جرم اور اُس کے نتیجہ کے فوری ظہور کو نمایاں کرنے کے لیے یہاں عذاب کو قتل ناقہ کے ساتھ متصل کر دیا اور حضرت صالح کی ہجرت کے ذکر کو پیچھے کر دیا۔ گویا جوں ہی اُنھوں نے ناقہ کو گزند پہنچا کر خدا کو چیلنج کیا، عذاب آدھمکا۔ عذاب کی یہ سبقت و مبادرت اچھی طرح ظاہر نہ ہو سکتی، اگر اس بیچ میں کوئی اور بات ذکر میں آ جاتی۔“

(تذبرقرآن ۳/۳۰۵)

۴۲۰ کسی قوم کے بگاڑ کی یہی وہ آخری حد ہوتی ہے جس کے بعد اُس کی اصلاح کا امکان باقی نہیں رہتا۔ اُس وقت خیر خواہ ہدف ملامت اور بدخواہ اُس کے لیڈر اور ہیرو بن جاتے ہیں۔

۴۲۱ حضرت لوط سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ اُن کی قوم اُس علاقے میں رہتی تھی جو شام کے جنوب میں عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے اور آج کل شرق اردن کہلاتا ہے۔ بانیل میں اُن کے سب سے بڑے شہر کا نام سدوم بتایا گیا ہے۔ لوط علیہ السلام اُن کے اندر رہے تو





أَحَدٍ مِّنَ الْعُلَمَاءِ ۖ ۝۸۰ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُونِ  
النِّسَاءِ ۖ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ۝۸۱ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا

ارتکاب کرتے ہو؟ تم سے پہلے دنیا میں کسی قوم نے اس کا ارتکاب نہیں کیا۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔ (حقیقت یہ ہے کہ تم بڑے

رہے تھے، لیکن اُن کے اندر سے نہیں تھے۔ اُن کا تعلق اُس قوم کے ساتھ وہی تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قوم فرعون کے ساتھ تھا۔ آگے اُن کی بیوی کا ذکر جس اسلوب میں ہوا ہے، اُس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اُن کی شادی اُسی قوم کے اندر ہوئی تھی اور اس لحاظ سے وہ اُنھی کے ایک فرد بن چکے تھے۔ قوم لوط کے الفاظ قرآن میں اسی رعایت سے آئے ہیں۔

۲۲۲ یہ استفہام اظہار نفرت و کراہت کے لیے ہے اور آیت میں 'الْفَاحِشَةُ' کا لفظ بتا رہا ہے کہ بدکاری کی یہ صورت اُس قوم میں اس درجہ عام تھی کہ متکلم اور مخاطب، دونوں نام لیے بغیر محض حرف تعریف سے سمجھ سکتے تھے کہ اس سے کیا مراد ہے۔

۲۲۳ پہلے جملے کی طرح یہ جملہ بھی اظہار نفرت و کراہت کے لیے ہے اور اسلوب تعجب کا ہے۔ آیت میں 'أَحَدٍ مِّنَ الْعُلَمَاءِ' کے جو الفاظ آئے ہیں، یہ افراد میں سے کسی فرد کے معنی میں بھی آسکتے ہیں اور قوموں میں سے کسی قوم کے معنی میں بھی۔ یہاں قوم کے لیے ہیں اور استاذ امام کے الفاظ میں مدعا یہ ہے کہ تم سے پہلے کوئی شامت زدہ سوسائٹی ایسی نہیں گزری جس نے اس غلاظت کو تمھاری طرح اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہو۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس برائی نے اُن کے اندر ایک فیشن اور تہذیبی روایت کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اس کے مرتکبین اپنی محافل میں برملا اس کا اظہار کرتے اور اس پر کوئی شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ دوسرے پیغمبروں کی طرح توحید سے اپنی بات کی ابتدا کرنے کے بجائے لوط علیہ السلام نے سب سے پہلے اسی پر تنبیہ فرمائی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:



أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۖ إِنَّهُمْ أَنَاسٌ يَّتَطَهَّرُونَ ﴿٨٢﴾ فَأَنجَيْنَاهُ

اوندھے)، بلکہ بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ مگر اُس کی قوم نے جواب

”... ایک برائی تو وہ ہوتی ہے، جو خواہ کتنی ہی سنگین ہو، لیکن وہ انسانی عوارض میں سے ہے اور انسانوں کے اندر پائی جاتی ہے یا پائی جاسکتی ہے، دوسری برائی وہ ہے جس کا گھنونا پن اس قدر واضح ہے کہ کسی انسان کے اندر عادت کی حیثیت سے اور کسی سوسائٹی کے اندر فیشن کی حیثیت سے اُس کا پایا جانا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ اُس انسان یا اُس سوسائٹی کی فطرت بالکل مسخ ہوگئی ہو۔ جہاں اس طرح کے لوگوں سے سابقہ ہو، وہاں اصل قابل توجہ چیز وہی برائی ہوتی ہے، دوسری باتیں، خواہ کتنی ہی اہمیت رکھنے والی ہوں، سب ثانوی درجے میں آ جاتی ہیں۔ آپ ایک شخص کے پاس اُس کی اصلاح کی غرض سے جائیں اور دیکھیں کہ وہ کھڑا ہوا غلیظ کھارہا ہے تو آپ اُس کو ایمان و اسلام کی تلقین کریں گے یا سب سے پہلے اُس کی یہ عبرت انگیز حالت آپ کو متوجہ کرے گی؟ حضرت لوط علیہ السلام کو اسی صورت حال سے سابقہ پیش آیا۔ اُن کی قوم کے اندر شرک و کفر کی برائی بھی موجود تھی اور دوسری تمام برائیاں بھی، جو شرک و کفر کے لوازم میں سے ہیں، موجود تھیں، لیکن جن کی فطرت اتنی اوندھی ہوگئی ہو کہ مرد مردوں ہی کو شہوت رانی کا محل بنائے ہوئے ہوں، اُن کو تو سب سے پہلے اس غلاظت کی دلدل سے نکالنے کی ضرورت تھی، اُن سے کوئی دوسری بات کرنے کا مرحلہ تو بہر حال اس کے بعد ہی آ سکتا تھا۔“

(تذبرقرآن ۳۰۷/۳)

۲۲۴ یہ تیسرا جملہ ہے جس سے لوط علیہ السلام نے اپنی نفرت و کراہت اور قوم کی دیوشیت پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے اس مقصد کے لیے زن و مرد کے جوڑے پیدا کیے تھے۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر کس اوندھی فطرت کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ پھر لڑکے تولڈ کے، تمھارے مرد تک اسی لعنت میں گرفتار ہیں۔ یہ کیسا فساد طبیعت ہے جس نے تمھیں اس مرض خبیث میں مبتلا کر دیا ہے؟ اس قدر شدید نفرت و کراہت اور اظہار تعجب کی وجہ یہ ہے کہ زنا اپنے تمام مفاسد کے باوجود نفس انسانی کی بنیادی ترکیب میں کوئی خلل پیدا نہیں کرتا، لیکن یہ بیماری لاحق ہو جائے تو اسی



وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ﴿٨٣﴾ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا  
فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ﴿٨٤﴾

دیا تو یہ دیا کہ انھیں اپنی بستی سے نکالو، یہ لوگ بڑے پاکباز بنتے ہیں۔ سو ہم نے اُسے  
اور اُس کے گھر والوں کو بچا لیا، اُس کی بیوی کے سوا، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں رہ  
گئی، اور اُس قوم پر (پتھروں کی) بارش برسا دی، جس طرح کہ برسانے کا حق تھا۔  
پھر دیکھو کہ اُن مجرموں کا کیا انجام ہوا۔ ۸۴-۸۰

ترکیب میں خلل عظیم برپا کر دیتی ہے۔

۲۲۵ یہ کسی معاشرے کے بگاڑ کی آخری حد ہے جس تک پہنچ جانے کے بعد برائی تہذیب  
اور فیشن کا تقاضا اور نیکی باعث طعن بن جاتی ہے۔ لوگ یہ جاننے کے باوجود کہ پاکیزگی کیا ہے،  
اُسے اپنے اندر برداشت نہیں کرتے اور اُس کے علم برداروں کو اپنی بستیوں سے نکال پھینکنا چاہتے  
ہیں تاکہ جس طرح اُنھوں نے کپڑے اتار دیے ہیں، باقی سب بھی ننگے ہو جائیں اور کوئی یہ  
احساس دلانے والا نہ ہو کہ لباس بھی کوئی چیز ہوتی ہے جسے انسان کبھی پہنا کرتے تھے۔

۲۲۶ پیچھے اُناسُ یَتَطَهَّرُونَ کے الفاظ آئے ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوط  
علیہ السلام کے ساتھ کچھ ایمان والے بھی تھے، مگر یہ آیت بتاتی ہے کہ یہ ایمان والے بھی اُن کے  
اہل و عیال ہی تھے۔ اُن سے باہر کا کوئی شخص اُن پر ایمان نہیں لایا۔

۲۲۷ یہ خدا کے بے لاگ انصاف کا اظہار ہے۔ لوط علیہ السلام کی بیوی غالباً اپنی قوم اور  
خاندان کی عصبیت کے باعث حق کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئی تو پیغمبر کی بیوی ہونا اُس کے لیے  
کچھ بھی نافع نہیں ہو سکا۔ حضرت نوح کے بیٹے اور حضرت ابراہیم کے باپ کی طرح وہ بھی اُسی  
انجام کو پہنچ گئی جو اُس کی قوم کے لیے مقرر ہو چکا تھا۔

۲۲۸ پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کی قومیں بالعموم کنکر پتھر برسانے والی





وَالِی مَدِیْنِ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ط قَالَ یَقُوْمُ اَعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰهِ غَیْرِهِ ط قَدْ جَاءَ تَکْمٌ بَیْنَهُ مِّنْ رَّبِّکُمْ فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُو النَّاسَ اَشْیَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ

اور مدین کی طرف اُن کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اُس نے دعوت دی کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک واضح حجت آگئی ہے، لہذا وزن اور پیمانے پورے رکھو، لوگوں کو اُن کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین کی اصلاح کے بعد اُس میں فساد برپا نہ آندھی سے تباہ کی گئی ہیں۔ قرآن نے دوسری جگہ اسے 'حَاصِب' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اُسی کا بیان ہے۔

۲۲۹ یہ بستی ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے مدیان کے نام پر مدین یا مدیان کہلاتی تھی، جو اُن کی تیسری بیوی قطورا کے بطن سے تھے۔ اس میں زیادہ تر اُنھی کی نسل آباد تھی۔ اس کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا، مگر اس کا کچھ سلسلہ جزیرہ نماے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی پھیلا ہوا تھا۔ اُس زمانے کی دو بڑی تجارتی شاہ راہیں اسی علاقے سے گزرتی تھیں، اس وجہ سے مدین کے لوگوں نے بھی تجارت میں بہت ترقی کر لی تھی۔

۲۳۰ یعنی خدا کے پیغمبر کی دعوت جو اپنے ساتھ خدا کی معیت کے ناقابل تردید شواہد لے کر آتی ہے۔ اسے واضح حجت اسی بنا پر کہا ہے۔

۲۳۱ یہ چونکہ تجارت پیشہ قوم تھی، اس لیے اس کے باطنی فساد کا ظہور ناپ تول میں خیانت کی صورت میں بھی ہوا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ پوری قوم کے اندر عدل و قسط کا تصور محفل ہو چکا اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کا عقیدہ باقی نہیں رہا۔







الاعراف  
۷

إِصْلَاحَهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ  
صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ  
وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ وَادْكُرُوا إِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا فَكَثَرَكُمْ ۚ وَانْظُرُوا كَيْفَ  
كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ۝ وَإِنْ كَانَ طَائِفَةٌ مِّنْكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي

۲۳۲ کرو۔ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے، اگر تم ایمان لائے ہوئے ہو۔ اور نہ ہر راستے پر اس  
طرح بیٹھو کہ لوگوں کو ڈرا رہے ہو اور خدا کی راہ سے اُس پر ایمان لانے والوں کو روک  
رہے ہو اور اُس کی راہ میں عیب ڈھونڈ رہے ہو۔ یاد کرو، جب تم تھوڑے تھے، پھر خدا  
نے تمہیں بڑھا دیا اور دیکھو کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جو فساد کرنے والے تھے۔ اگر تم

۲۳۲ یعنی خدا کے مقابلے میں سرکشی اور تمرد اختیار نہ کرو، جب کہ رسولوں کے ذریعے  
سے اتمام حجت کے بعد خدا کی زمین کو یہ رویہ اختیار کرنے والوں سے کئی مرتبہ پاک کر کے اُس کی  
اصلاح کی جا چکی ہے۔

۲۳۳ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ مدین کے لوگ نہ صرف یہ کہ حضرت ابراہیم کے خاندان سے  
نسبت رکھتے تھے، بلکہ نبیوں کی تعلیم کے حامل ہونے کے مدعی بھی تھے۔ یہ ایک بگڑی ہوئی مسلمان  
قوم تھی اور شعیب علیہ السلام کی بعثت کے وقت اس کی حالت وہی تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے ظہور  
کے وقت بنی اسرائیل کی حالت تھی۔

۲۳۴ یہ اُن سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے جو اُس قوم کے اثر ار شعیب علیہ السلام کے ساتھیوں  
کو ڈرانے دھمکانے اور ایمان کی راہ سے روکنے کے لیے اختیار کیے ہوئے تھے۔

۲۳۵ یعنی خدا کی نعمتوں پر اُس کا شکر ادا کرو اور پیغمبر کی دعوت کے جواب میں وہ رویہ اختیار  
نہ کرو جو تم سے پہلی قوموں نے اختیار کیا تھا۔ اُن کا انجام پیش نظر رکھو کہ جب وہ خدا اور اُس کے  
رسولوں کے مقابلے میں سرکشی پر اتر آئے تو کس طرح تباہ و برباد کر دیے گئے۔



أَرْسَلْتُ بِهِ وَطَافِئَةً لَّمْ يُؤْمِنُوا فَاصْبِرُوا حَتَّى يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿٨٤﴾ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَشْعِبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودَنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ط قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَرِهِيْنَ ﴿٨٥﴾ قَدْ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجَّيْنَا اللَّهُ مِنْهَا ط وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيْهَا إِلَّا

میں سے ایک گروہ اُس چیز پر ایمان لے آیا ہے جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اُس کی قوم کے بڑوں نے، جو متکبر ہو چکے تھے، اُس سے کہا کہ اے شعیب، ہم تمہیں اور (تمہارے) اُن لوگوں کو جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی اس بستی سے نکال باہر کریں گے یا تم کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔ اُس نے جواب دیا: کیا اُس صورت میں بھی کہ ہم اُس سے بے زار ہوں؟ اگر ہم تمہاری ملت میں لوٹ آئیں، اس کے بعد کہ اللہ ہمیں اُس سے نجات دے چکا ہے تو (اس کے معنی یہ ہیں کہ) ہم نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے۔ (نہیں)، یہ ہمارے لیے

﴿٨٤﴾ مطلب یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ ایمان لے آئے ہیں اور کچھ نہیں لائے تو کیا بعید ہے کہ جو ایمان نہیں لائے، اُن کو بھی اللہ تعالیٰ توفیق دے اور وہ ایمان کی نعمت سے بہرہ یاب ہو جائیں۔ لہذا عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ تمہیں یہ مہلت اسی توقع کے پیش نظر ملی ہوئی ہے۔ پیغمبر کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تو ہر حال میں صادر ہونا ہے۔ ذرا صبر کرو، ابھی کچھ بلونے اور پھٹکنے کا کام باقی ہے۔ یہ ہو جائے گا تو خدا کا فیصلہ بھی اپنے وقت پر اور ٹھیک انصاف کے ساتھ صادر ہو جائے گا۔





الاعراف

اِنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ط عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا  
رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ﴿٨٩﴾  
وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِيْنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذَا  
لَخَسِرُوْنَ ﴿٩٠﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ

ممکن نہیں ہے کہ ہم اُس میں لوٹ آئیں، الا یہ کہ اللہ، ہمارا پروردگار ہی چاہے۔ ہمارے  
پروردگار کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا ہے۔ پروردگار،  
ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے، تو بہترین فیصلہ کرنے والا  
ہے۔ اُس کی قوم کے بڑوں نے، جو انکار کا فیصلہ کر چکے تھے، لوگوں کو تنبیہ کی کہ شعیب  
کی پیروی کرو گے تو سمجھ لو کہ پھر تم بڑے خسارے میں جا پڑے۔ آخر ایک سخت تھر تھراہٹ

۲۳۷ یعنی اس وقت جو کچھ کہہ رہے اور جن حقائق پر اپنے ایمان کا اظہار کر رہے ہیں، وہ  
محض جھوٹ اور افترا ہے۔ ہم تمہاری ملت کی طرف لوٹتے ہیں تو اس کے معنی یہی ہوں گے۔  
حالاں کہ جھوٹ اور افترا کا مجموعہ تمہاری یہ ملت ہے۔ حق و صداقت کو چھوڑ کر ہم اس کی طرف کیسے  
لوٹ سکتے ہیں؟ ہم تو آخری درجے میں اس سے بے زار ہیں۔ شعیب علیہ السلام نے یہ جواب  
اپنے ساتھیوں کی طرف سے بھی دیا ہے، اس لیے فرمایا ہے کہ بُعْدَ اِذْ نَجَّیْنَا اللّٰهَ مِنْهَا، ورنہ  
انبیاء علیہم السلام تو بعثت سے پہلے بھی ہدایت فطرت پر ہوتے ہیں۔

۲۳۸ یہ تفویض الی اللہ کے جملے ہیں۔ بندہ مومن عزم و جزم کے ساتھ کسی فیصلے کا اظہار تو کر  
سکتا ہے، مگر اس حقیقت سے کبھی غافل نہیں ہو سکتا کہ خدا کی مشیت ہر چیز پر غالب ہے۔ اُس کا علم  
ماضی، حال اور مستقبل کے تمام معاملات پر حاوی ہے۔ صرف وہی جانتا ہے کہ کس کے لیے کیا  
مقدر ہے اور کس کا انجام کیا ہونا ہے۔ لہذا اُس کے نیک ارادوں کا پورا ہونا بھی خدا کی مشیت پر  
موقوف ہے۔ وہ توفیق بخشے گا تو کامیابی حاصل ہوگی، ورنہ ہر شخص ناکام رہ جائے گا۔



دَارِهِمْ جُثَمِينَ ﴿٩١﴾ الَّذِينَ كَذَبُوا شُعَيْبًا كَانُوا لَمْ يَغْنَوْا  
فِيهَا الَّذِينَ كَذَبُوا شُعَيْبًا كَانُوا هُمُ الْخَاسِرِينَ ﴿٩٢﴾ فَتَوَلَّى عَنْهُمْ  
وَقَالَ يُقَوْمُ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَتِ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَيْفَ  
أَسَىٰ عَلَىٰ قَوْمٍ كَافِرِينَ ﴿٩٣﴾

نے اُنھیں آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ جنھوں نے  
شعیب کو جھٹلایا، وہ ایسے تھے کہ گویا اُس بستی میں کبھی بسے ہی نہیں تھے۔ جنھوں نے شعیب  
کو جھٹلایا، بالآخر وہی نامراد ہوئے۔ اُس وقت شعیب یہ کہتا ہوا اُنھیں چھوڑ کر چل دیا کہ  
میری قوم کے لوگو، میں نے اپنے پروردگار کے پیغامات تمھیں پہنچا دیے اور تمھاری خیر خواہی  
کا حق ادا کر دیا۔ اب میں اُن لوگوں پر افسوس کیا کروں جو منکر ہو چکے ہیں! ۸۵-۹۳

۲۳۹ اس میں تنبیہ و تہدید بھی ہے اور ہم دردی کی نمائش بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے نیک و  
بد تمھیں سمجھا دیا ہے۔ اس کے بعد بھی نہیں مانتے ہو تو قوم کے زما اور لیڈروں کو چھوڑ کر اس شخص  
کی پیروی کے نتائج عنقریب بھگت لو گے۔  
۲۴۰ یہ مجرد عذاب کی تعبیر ہے۔ اس کی تفصیل ہم پیچھے قوم صالح کی سرگذشت میں بیان کر  
چکے ہیں۔

۲۴۱ یہ عذاب کا نتیجہ بیان ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس کے دونوں فقروں میں اُن دونوں دھمکیوں کی طرف تلمیح ہے جو قوم شعیب علیہ السلام  
کے کفار نے حضرت شعیب علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں کو دی تھیں۔ اُنھوں نے دھمکی دی  
تھی کہ ہم تم کو اپنی بستی سے نکال کر چھوڑیں گے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ  
خود اس دیار سے اس طرح مٹے: گویا کہ ان تلوں میں کبھی تیل ہی نہ تھا۔ اُنھوں نے حضرت  
شعیب علیہ السلام کے ساتھیوں کو دھمکی دی تھی کہ اگر تم اس شخص کی پیروی سے دست کش نہ







الاعراف

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا بِالْبَأْسَاءِ  
وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُونَ ﴿٩٣﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ  
حَتَّىٰ عَفَّوْا وَقَالُوا قَدْ مَسَّ آبَاءَنَا الضَّرَّاءُ وَالسَّرَّاءُ فَأَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً

ہم نے جس بستی میں بھی کسی نبی کو رسول بنا کر بھیجا ہے، اُس کے لوگوں کو مالی اور  
جسمانی مصیبتوں میں مبتلا کیا ہے تاکہ وہ عاجزی اختیار کریں۔ پھر اُن کے دکھ کو ہم  
نے سکھ میں بدل دیا، یہاں تک کہ وہ خوب پھولے پھلے اور کہنے لگے کہ اچھے اور برے

ہوئے تو بڑے خسارے میں پڑو گے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جنھوں نے

شعیب کو جھٹلایا، وہی خسارے میں پڑے۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۱۴)

۴۴۲ یہی مضمون اوپر قوم صالح کی سرگذشت میں بھی گزر چکا ہے۔ ہم نے وہاں اس کی  
وضاحت کر دی ہے۔

۴۴۳ اصل میں ’بَأْسَاء‘ اور ’ضَرَّاء‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ جب ایک دوسرے کے ساتھ  
آتے ہیں تو پہلے سے مالی اور دوسرے سے جسمانی آفتیں مراد ہوتی ہیں۔

۴۴۴ یہ اُس سنت الہی کا بیان ہے جو رسولوں کی بعثت کے ساتھ لازماً ظاہر ہوتی ہے۔ استاذ  
امام لکھتے ہیں:

”...وہ سنت یہ ہے کہ جب نبی توبہ و استغفار اور جزا و سزا کی منادی شروع کرتا ہے تو اُس کے  
محرمات و مویذات اس کائنات میں بھی ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں۔ ایک طرف پیغمبر لوگوں کو  
غفلت و خدا فراموشی کے انجام، فساد فی الارض کے نتائج اور دنیا اور آخرت میں خدا کی پکڑ سے  
ڈراتا ہے، دوسری طرف اللہ تعالیٰ لوگوں کو سیلاب، قحط، وبا، طوفان کی آزمائشوں میں بھی مبتلا  
کرتا ہے تاکہ لوگ آنکھوں سے بھی، اگر اُن کے پاس دیدہٴ عبرت نگاہ ہو، دیکھیں کہ اس طرح  
اللہ جب چاہے اور جہاں سے چاہے، اُن کو پکڑ سکتا ہے اور پھر خدا کے سوا کوئی اُن کو بچانے والا



وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم

دن تو ہمارے باپ دادوں پر بھی آتے رہے ہیں۔ بالآخر ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا اور انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ <sup>۴۴۵</sup> حقیقت یہ ہے کہ اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ان پر ہم زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے، مگر <sup>۴۴۶</sup>

نہیں بن سکتا۔ اس طرح گویا دعوت کے ساتھ واقعات کی تائید اور عقل و فطرت کی شہادت کے ساتھ مشاہدے کی اثر انگیزی بھی جمع ہو جاتی ہے۔ نبی جو کچھ کہتا ہے، آسمان و زمین، دونوں مل کر اپنے اسٹیج پر گویا اُس کے مناظر دکھا بھی دیتے ہیں تاکہ جن کے اندر اثر پذیری کی کچھ بھی رُمق ہو، وہ خدا کے آگے جھکیں اور توبہ و اصلاح کریں۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۱۷)

<sup>۴۴۵</sup> یہ اُسی سنت کا ایک دوسرا پہلو ہے۔ اوپر جن آزمائشوں کا ذکر ہوا ہے، جب لوگ اُن سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور خدا کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے دل و دماغ کو بند کر لیتے ہیں تو اللہ انہیں ڈھیل دیتا ہے تاکہ جو لوگ تنبیہات سے نہیں جاگے، وہ رفاہیت کی لوری سے اور گہری نیند سو جائیں اور خدا کا عذاب اُن کو ایسی حالت میں پکڑے کہ انہیں خبر تک نہ ہو کہ یہ آفت کب اور کہاں سے نازل ہوئی ہے۔ اس کی صورت کیا ہوتی ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... بد حالی کی جگہ خوش حالی آ جاتی ہے، دنیوی اسباب و وسائل کے ہر گوشے میں ترقی و فراخی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، آزمائشوں اور تکلیفوں کے دن ذہنوں سے نکل جاتے ہیں، پھر سرکش لوگ چمکنا اور نبی اور اُس کے ساتھیوں کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ عقل کے کوتاہ لوگ، پچھلے قحط یا گذشتہ سیلاب یا فلاں آفت کو ہمارے اعمال و عقائد کی خرابی پر خدا کی تنبیہ سمجھتے تھے اور اپنے وعظوں میں طرح طرح سے ہم کو ڈراتے اور پست ہمت کرتے رہے، حالاں کہ ان باتوں کو ایمان و اخلاق سے کیا تعلق؟ اس قسم کی گردشیں قوموں کی زندگی میں آیا ہی کرتی ہیں۔ ایسے دن، کچھ ہمارے ہی اوپر تو نہیں گزرے ہیں، ہمارے باپ دادوں





الاعراف

بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٩٦﴾

أَفَأَمِّنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا بَيَاتًا وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿٩٧﴾  
 أَوْ أَمِّنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا ضُحًى وَهُمْ يُلْعَبُونَ ﴿٩٨﴾  
 أَفَأَمِّنُوا مَكَرَ اللَّهِ ۚ فَلَا يَأْمَنُ مَكَرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٩٩﴾

انہوں نے جھٹلادیا تو ان کے کرتوتوں کی پاداش میں ہم نے بھی ان کو پکڑ لیا۔ ۹۶-۹۷  
 پھر (بتاؤ کہ) ان بستیوں کے لوگ کیا اس سے مامون رہے تھے کہ ان پر ہمارا عذاب  
 رات میں آجائے، جب وہ سوتے پڑے ہوں؟ یا ان بستیوں کے لوگ اس سے مامون  
 رہے تھے کہ ہمارا عذاب ان پر دن دھاڑے آجائے، جب وہ کھیل میں لگے ہوں؟ پھر  
 کیا وہ خدا کی تدبیر سے مامون رہے تھے؟ سو (یاد رکھو کہ) خدا کی تدبیر سے وہی لوگ

پر بھی گزرے ہیں جو بڑے اچھے اور نیک نہاد لوگ تھے۔ یہ تو زمانے کے اتفاقات ہیں۔ کبھی تنگی  
 ہے، کبھی فراخی؛ کبھی فصل اچھی ہوئی، کبھی ماری گئی؛ کبھی سیلاب آ گیا، کبھی قحط پڑ گیا۔ ان چیزوں  
 کو اعمال و اخلاق سے باندھ دینا محض خرد باختگی اور وہمی پن ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۱۸)

۳۴۶ مطلب یہ ہے کہ رسولوں کو جھٹلادیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ جس طرح عذاب کی  
 صورت میں نکلتا ہے، اُسی طرح ان کی دعوت قبول کر لی جائے تو اس کے نتیجے میں زمین و آسمان  
 کی برکتیں اور فیروز مندیاں بھی لازماً حاصل ہوتی ہیں۔ یہ خدا کی سنت ہے اور خدا کے آخری پیغمبر  
 محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک اسی طریقے سے جاری رہی ہے۔ یہ اس کا آخری ظہور تھا جس سے یہ  
 حقیقت پوری قطعیت کے ساتھ ثابت ہو گئی ہے کہ آخرت کا عذاب و ثواب بھی ایک دن اسی طرح  
 واقع ہو جائے گا۔

۳۴۷ یعنی رات اور دن میں جس وقت بھی آیا، وہ اپنے آپ کو بچا نہیں سکے تو یہی آفت تم پر  
 ٹوٹ پڑی تو تم کیا کرو گے؟



أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ  
أَصْبَنَهُم بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿١٠٠﴾

اپنے آپ کو مامون سمجھتے ہیں جو نامراد ہونے والے ہوں۔ کیا اس چیز نے اُن لوگوں کو کوئی سبق نہیں دیا جو زمین کے اگلے رہنے والوں کے بعد اُس کے وارث بنتے ہیں کہ اگر ہم چاہتے تو اُن کے گناہوں کی پاداش میں اُن کو بھی آپکڑتے؟ (نہیں، وہ کبھی سبق نہیں لیتے) اور (اس کے نتیجے میں) ہم اُن کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں، پھر وہ کچھ نہیں سنتے۔

۴۴۸ اصل میں لفظ ”مگر“ آیا ہے۔ اس کے معنی خفیہ تدبیر کے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں: ”...خفیہ تدبیر کا مطلب یہ ہے کہ خدا وہاں سے پکڑتا ہے، جہاں سے کسی کو پکڑے جانے کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ اوپر تنبیہ کے بعد ڈھیل کی جو سنت بیان ہوئی، وہ اس خفیہ تدبیر الہی کی ایک مثال ہے۔ قوم تو سمجھتی ہے کہ اب اُس نے پالا مار لیا، لیکن درحقیقت وہیں اُس کی ہلاکت کا کھڈ ہوتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۲۰)

۴۴۹ اشارہ اگرچہ قریش کی طرف ہے، لیکن عام اسلوب میں فرمایا ہے کہ بعد میں آنے والوں نے اگلوں کے انجام سے سبق کیوں نہیں لیا اور کیوں نہیں سوچا کہ خدا نے جس طرح اُن کو پکڑا تھا، وہ اُن کے وارثوں کو بھی جب چاہے، اُسی طرح پکڑ سکتا ہے؟

۴۵۰ اس لیے کہ اُن کے اس جرم کی پاداش میں اُن کے دل پر مہر لگ چکی ہوتی ہے کہ اگلوں کی تاریخ سے اُنھوں نے کوئی سبق نہیں لیا اور اُسی راہ پر گام زن رہے جو خدا سے پھرے ہوئے لوگوں نے ہمیشہ اختیار کی ہے۔ یہ مہر عذاب الہی کا مقدمہ ہوتی ہے۔ اس کے بعد انسان اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے الجھاؤ میں الجھتا ہی چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ آیات الہی کو پچشم سردیکھ لینے کے بعد بھی اُس کے دل کا دروازہ قبول حق کے لیے نہیں کھلتا اور وہ پیغمبر کی بات کو بھی سننے سے انکار کر دیتا ہے۔





الاعراف

تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِهَا ۖ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ  
بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ  
عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ۝ (۱۰) وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ ۚ وَإِنْ

یہ بستیاں ہیں جن کی سرگزشتوں کا کچھ حصہ ہم تمہیں سنارہے ہیں۔ ان کے رسول  
ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے، مگر ایسا نہیں ہوا کہ یہ ایمان لاتے، اس  
لیے کہ پہلے جھٹلاتے رہے تھے۔ اللہ منکروں کے دلوں پر اسی طرح مہر لگا دیتا ہے۔<sup>۲۵۱</sup>  
حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر میں ہم نے کسی عہد کا پاس نہیں دیکھا، بلکہ اکثر کو عہد

<sup>۲۵۱</sup> یہ مزید وضاحت فرمائی ہے کہ دلوں پر مہر کب لگتی ہے اور کس طرح کے لوگوں کے دلوں  
پر لگتی ہے؟ فرمایا کہ ان کے دلوں پر لگتی ہے جو پہلے سے خدا کی آیتوں اور نشانیوں کو جھٹلاتے رہے  
تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... آدمی کا قاعدہ ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی عام آیات سے روگردانی کا عادی ہو جاتا ہے تو  
آہستہ آہستہ اُس کا دل ایسا پتھر ہو جاتا ہے کہ رسولوں کے ذریعے سے خاص نشانیاں بھی ظاہر  
ہوتی ہیں تو وہ بھی اُس پر کارگر نہیں ہوتیں۔ فرمایا کہ یہ طریقہ ہے ہمارے ہاں دلوں پر مہر لگانے  
کا۔ دل کا کام عبرت پذیری، تفکر اور تعقل ہے۔ اگر کوئی گروہ اس طرح اپنی خواہشوں کا اندھا  
بہرا مرید بن جاتا ہے کہ تذکیر و تنبیہ کے بعد بھی وہ دل کی آنکھیں نہیں کھولتا تو ایسے لوگوں کے  
دل بالآخر بالکل جپاٹ ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ ’بِمَا كَذَّبُوا‘ یہاں ’يُؤْمِنُوا‘ کا  
مفعول نہیں ہے، بلکہ ’ب‘ بیان سبب کے لیے ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۲۱)

<sup>۲۵۲</sup> اس سے وہ عہد مراد ہیں جو ان بستیوں کے لوگوں نے، جن کا ذکر ہوا ہے، اپنے  
پیغمبروں سے باندھے کہ فلاں شرط پوری کر دی جائے تو مان لیں گے اور فلاں معجزہ دکھا دیا جائے تو  
ایمان لے آئیں گے۔ آگے آیات ۱۳۴-۱۳۵ میں یہی مضمون حضرت موسیٰ اور فرعون کی



وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفْسِقِينَ ﴿١٠٢﴾  
ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْهُمُ مُوسَىٰ بَايِتَنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَأِيهِ  
فَظَلَمُوا بِهَا ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿١٠٣﴾ وَقَالَ

توڑنے والا ہی پایا ہے۔ ۹۷-۱۰۲

ان قوموں کے بعد، (جن کا ذکر اوپر ہوا ہے)، ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے  
ساتھ فرعون اور اُس کے سرداروں کے پاس (رسول بنا کر) بھیجا، مگر اُنھوں نے اپنی

سرگذشت میں بھی بیان ہوا ہے۔ سورۃ النعام (۶) کی آیات ۱۰۹-۱۱۰ میں قرآن نے اس کی مزید  
وضاحت کر دی ہے کہ اس طرح کے عہد باندھ لینے کے بعد وہ بار بار توڑتے رہے اور کسی طرح  
ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

۲۵۳ اصل میں لفظ 'فَاسِق' آیا ہے۔ اس کے معنی نافرمان کے ہیں، لیکن موقع کلام سے  
واضح ہے کہ یہاں نافرمانی سے عہد شکنی مراد ہے۔

۲۵۴ اصل میں لفظ 'آیت' آیا ہے۔ اس سے مراد وہ عقلی اور فطری دلائل بھی ہیں جو حضرت  
موسیٰ اور ہارون نے فرعون اور اُس کے سرداروں کے سامنے پیش کیے اور وہ حسی معجزات بھی جو  
اُنھوں نے فرعون اور اُس کی قوم کو دکھائے۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں اُن کی تفصیل کی گئی  
ہے۔

۲۵۵ لفظ فرعون 'رُع' کی طرف منسوب ہے۔ قدیم اہل مصر سورج کو اپنا رب اعلیٰ یا مہادیو  
قرار دیتے اور اُسے 'رُع' کہتے تھے۔ چنانچہ لفظ 'فرعون' کے معنی ہیں: سورج دیوتا کی اولاد۔ مصر  
کے بادشاہ اُس زمانے میں اپنے آپ کو 'رُع' کے جسمانی مظہر اور اُس کے ارضی نمائندے کی  
حیثیت سے پیش کرتے اور لوگوں کو یقین دلاتے تھے کہ اُن کے رب اعلیٰ یا مہادیو وہی ہیں۔  
دور حاضر کے محققین کا عام میلان ہے کہ یہ فرعون منفیہ یا منفی تھا۔



مُوسَىٰ يَفِرْعَوْنَ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٣﴾ حَقِيقٌ عَلَىٰ  
أَنْ لَاَ أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقُّ ۚ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ

جانوں پر ظلم کیا اور ان نشانیوں کا انکار کر دیا۔<sup>۲۵۶</sup> پھر دیکھو کہ ان مفسدوں کا انجام کیا  
ہوا! موسیٰ نے کہا: اے فرعون، میں جہانوں کے پروردگار کی طرف سے بھیجا ہوا آیا  
ہوں۔ مجھے یہی چاہیے اور میں اسی کا حریص ہوں کہ خدا کی طرف سے حق کے سوا کوئی

۲۵۶ اصل الفاظ ہیں: 'فُظِّلْمُوا بِهَا'۔ 'ان میں بُ' کا صلہ دلیل ہے کہ 'ظَلْمُوا' یہاں  
'کفروا' یا 'جحدوا' کے مفہوم پر متضمن ہے۔

۲۵۷ سورہ کے مخاطبین کو یہ اس سرگذشت کے سنانے کی اصل غایت کی طرف توجہ دلائی  
ہے۔ خدا اور اُس کے رسولوں کے مقابلے میں سرکشی اختیار کی جائے تو قرآن اسے بھی فساد سے  
تعبیر کرتا ہے۔ فرعون اور اُس کے سرداروں کے لیے 'مُفْسِدِينَ' کا لفظ یہاں اسی مفہوم میں  
ہے۔

۲۵۸ اصل میں 'حَقِيقٌ عَلَىٰ أَنْ لَاَ أَقُولَ' کے الفاظ ہیں۔ اہل اور سزاوار کے معنی میں  
'حَقِيقٌ بِهِ' یا 'هو حَقِيقٌ أَنْ يَفْعَلَ كَذَا' کے الفاظ آتے ہیں۔ یہاں اس کے ساتھ 'عَلَىٰ'  
ہے۔ اس سے یہ حریص کے معنی پر متضمن ہو گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...ظاہر ہے کہ جو خدا کا رسول اور سفیر ہو، وہی سب سے زیادہ اہل اس بات کا ہو سکتا ہے کہ  
خدا کی صحیح صحیح ترجمانی کرے، اُس پر کوئی من گھڑت بات نہ لگائے، اس لیے کہ اُس کا علم ظن و  
قیاس پر نہیں، بلکہ براہ راست خدا کی وحی اور خطاب پر مبنی ہوتا ہے اور اپنے منصب کی ذمہ داریوں  
کے لحاظ سے وہ اس بات کا نہایت حریص بھی ہوتا ہے کہ اُس کی زبان سے کوئی کلمہ حق کے  
خلاف نہ نکلے، اس لیے کہ جس پرش کا خوف اُسے ہوتا یا ہو سکتا ہے، کسی دوسرے کو نہ ہوتا ہے،  
نہ ہو سکتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۴۰)



فَارْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَآءِيلَ ۖ ﴿١٥﴾ قَالَ إِنَّ كُنْتَ جِئْتَ بِآيَةٍ  
فَآتِ بِهَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۖ ﴿١٦﴾ فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ  
تُغْبٰغٌ مُّبِیْنٌ ۖ ﴿١٧﴾ وَنَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضٌ لِلنَّظْرِ ۖ ﴿١٨﴾

بات نہ کہوں۔ تمہارے پروردگار کی طرف سے میں تمہارے پاس (اپنے اس منصب کی) صریح نشانی لے کر آیا ہوں، سو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دو۔ اُس نے جواب دیا: اگر کوئی نشانی لے کر آئے ہو تو اُسے پیش کرو، اگر تم سچے ہو۔ اس پر موسیٰ نے اپنی لاٹھی (زمین پر) ڈال دی تو یکایک وہ ایک جیتا جاگتا اثر ڈھاتا تھا اور اُس نے اپنا

۲۵۹ اس سے مراد عصا اور ید بیضا کا وہ معجزہ ہے جس کا ذکر آگے ہوا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے باجروت بادشاہ کے پاس بھیجنے کے لیے ضروری تھا کہ انہیں ایسے غیر معمولی معجزات دیے جائیں اور وہ شروع ہی میں اُن کا مظاہرہ بھی کر دیں تاکہ فرعون اور اُس کے اعیان و اکابر اُن کی بات سننے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔

۲۶۰ دوسرے مقامات میں تصریح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے صرف یہ مطالبہ ہی نہیں کیا، اس کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کے عام طریقے کے مطابق فرعون اور اُس کے اعیان و اکابر کو توحید اور معاد پر ایمان اور خشیت و تذکر کی دعوت دی اور اپنے غیر معمولی معجزات سے اُن پر اتمام حجت بھی کر دیا جس کے نتیجے میں وہ عذاب الہی میں گرفتار ہوئے۔ بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جانے کا یہ مطالبہ بھی، معاذ اللہ کسی قوم پرست لیڈر کی طرف سے اپنی قوم کو غلامی سے چھڑانے کا مطالبہ نہیں تھا، بلکہ خدا کی اُس اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے کیا گیا تھا جس کے تحت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کو عالمی سطح پر ابلاغ دعوت اور اتمام حجت کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس اسکیم کے مطابق یہ ضروری تھا کہ انہیں ایک خاص علاقے میں آباد کر کے وہاں دعوت حق کا مرکز قائم کیا جائے۔ بائبل کی کتاب خروج کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ





الاعراف

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هَذَا السَّحَرُ عَلِيمٌ ۝٩ يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ ۖ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ۝١٠ قَالُوا أَرْجِهْ وَ أَخَاهُ

ہاتھ (آستین سے) کھینچا تو دیکھنے والوں کے لیے وہ دفعتاً چمکتا ہوا نکلا۔ فرعون کی قوم کے سرداروں نے (یہ دیکھا تو) کہا: یہ شخص تو بڑا ماہر جادوگر ہے، تمہیں تمہارے ملک سے نکال دینا چاہتا ہے، سو بتاؤ، کیا رائے دیتے ہو؟ پھر سب نے (فرعون کو) مشورہ دیا

پوری اسکیم فرعون اور اُس کے درباریوں کے سامنے واضح نہیں فرمائی، بلکہ صرف اتنا کہا کہ وہ قربانی کی عبادت کے لیے تین دن کی راہ بیابان میں جانا چاہتے ہیں، اس لیے کہ جس چیز کی قربانی کرنا پیش نظر ہے، اُس کی قربانی اگر مصر میں کی گئی تو وہاں کے لوگ انہیں سنگ سار کر دیں گے۔

۴۶۱ یعنی ایسا کھلا اثر دہا کہ جس میں ذرا کسی شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ آیت میں 'تُعْبَان' کے ساتھ 'مُبِين' کی صفت اسی مفہوم کے لیے لائی گئی ہے۔

۴۶۲ اصل الفاظ ہیں: 'يُضَاءُ لِلنَّظَرِ'۔ 'نَظَر' کا لفظ عربی زبان میں اصلاً غور و تامل کے ساتھ دیکھنے کے لیے آتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ہاتھ میں جو چمک ظاہر ہوئی، وہ محض فریب نظر کی نوعیت کی نہیں تھی، بلکہ غور و تامل سے دیکھا جائے تو صاف واضح ہو جاتا تھا کہ اُس کی تابانی بالکل اصلی اور حقیقی ہے۔

۴۶۳ یعنی کچھ ایسا ویسا جادوگر نہیں ہے، بلکہ بڑا ماہر جادوگر ہے اور بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جانے کا مطالبہ اس لیے کر رہا ہے کہ انہیں منظم کر کے اپنی فوج بنائے اور تم پر حملہ کر کے تمہیں اس ملک سے نکال دے اور یہاں اپنی حکومت قائم کر لے۔ موسیٰ علیہ السلام کی غیر معمولی شخصیت اور بنی اسرائیل کی کثیر تعداد کے پیش نظر یہ بات بالکل قرین قیاس تھی۔ چنانچہ ہو سکتا ہے کہ فرعون کے درباریوں نے فی الواقع یہی سمجھا ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ انہوں نے اپنے لوگوں کو آں جناب کی دعوت سے برگشتہ کرنے کے لیے یہ اشتغلا اُسی طریقے پر چھوڑا ہو، جس طرح کہ ہر دور



وَأَرْسَلَ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ ۝ يَأْتُونَكَ بِكُلِّ سِحْرِ عَلِيمٍ ۝  
وَجَاءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوا إِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ ۝  
قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ لِمِنَ الْمُقْرَبِينَ ۝

قَالُوا يَمُوسَى إِمَّا أَنْ تُلْقَى وَإِمَّا أَنْ نَكُونَ نَحْنُ الْمُلْقِينَ ۝  
قَالَ الْقَوَّاجُ فَلَمَّا الْقَوَّاسُ سَحَرُوا عَيْنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ وَجَاءُوا

کہ ابھی اس کو اور اس کے بھائی کو ٹال دیجیے اور تمام شہروں میں ہر کارے بھیجے جو سب  
ماہر جادو گروں کو اکٹھا کر کے آپ کے پاس لے آئیں۔ (چنانچہ ایسا ہی کیا گیا) اور  
جادوگر فرعون کے پاس آ گئے۔ انھوں نے کہا: اگر ہم ہی جیت گئے تو بڑا صلہ تو ہمیں  
یقیناً ملے گا؟ فرعون نے جواب دیا: ہاں، ضرور اور تم ہمارے مقربین میں بھی شامل  
ہو جاؤ گے۔ ۱۰۳-۱۱۴

اس پر جادو گروں نے کہا: اے موسیٰ، تم پھینکو گے یا (اگر تم چاہو تو) ہم پھینکتے  
ہیں؟ اُس نے کہا: تم ہی پھینکو۔ چنانچہ انھوں نے جب پھینکا تو لوگوں کی آنکھیں باندھ

کے ارباب اقتدار کا شیوہ رہا ہے۔

۲۶۴ اصل میں 'أَرْجَهُ وَأَخَاهُ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'أَرْجَهُ' درحقیقت 'أَرْجئه' ہے۔ لفظ  
کو ہلکا کرنے کے لیے اس طرح کے تصرفات عربی زبان میں عام ہو جاتے ہیں۔

۲۶۵ قرآن نے یہ جملہ ساحروں کی اخلاقی پستی اور دنائت کو ظاہر کرنے کے لیے نقل کیا  
ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیشہ وروں کے عام طریقے کے مطابق انھوں نے اس خوشامدانہ انداز میں  
انعام کی توقع کا اظہار کیا۔

۲۶۶ یہ بات انھوں نے پیشہ ورانہ اخلاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہی، لیکن جملے کا اسلوب ایسا





الاعراف

بِسِحْرِ عَظِيمٍ ۝۱۱۶ وَ اَوْحَيْنَا اِلٰی مُوسٰی اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ  
تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُوْنَ ۝۱۱۷ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۱۸  
فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ۝۱۱۹ وَاَلْقٰی السَّحَرَةُ سَجْدِيْنَ ۝۱۲۰

۴۶۸ دیں اور اُن پر دہشت طاری کر دی اور بڑا زبردست جادو بنالائے۔ ہم نے موسیٰ کو اشارہ کیا کہ اپنا عصا پھینکو۔ پھر اُس کا پھینکنا تھا کہ وہ اُن کے اُس طلسم کو نگلتا چلا گیا جو وہ بنالائے تھے۔ سو حق ظاہر ہوا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے، سب باطل ہو گیا۔ ۴۶۹ فرعون اور اُس کے ساتھی (اُس روز) وہاں مغلوب ہوئے اور ذلیل ہو کر رہ گئے اور جادو گر ہے کہ اُن کی یہ خواہش بھی اُس سے ظاہر ہو رہی ہے کہ حضرت موسیٰ چاہیں تو وہ پہل کرنے کے لیے تیار ہیں۔

۴۶۷ موسیٰ علیہ السلام کو پورا اعتماد تھا کہ اُن کا پروردگار اُن کے ساتھ ہے، اس لیے اُنھوں نے پہلے اُنھی کو موقع دیا کہ وہ اپنا ہنر دکھائیں۔ جادو گر جب اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں تو جوئے کے تیروں کی طرح کوئی چیز دیکھنے والوں کے سامنے پھینکتے اور اُس پر اپنا جادو دکھاتے ہیں۔ آیت میں 'الْقَاء' یعنی پھینکنے کا لفظ اسی مناسبت سے آیا ہے۔

۴۶۸ یہ قرآن نے جادو کی حقیقت واضح کر دی ہے کہ اُس سے کسی چیز کی حقیقت و ماہیت نہیں بدلتی۔ وہ محض نگاہ اور قوت متخیلہ کو متاثر کرتا ہے جس سے انسان وہی کچھ دیکھنے لگتا ہے جو جادو گر دکھانا چاہتا ہے۔

۴۶۹ یعنی عصا کا سانپ جدھر جدھر گیا، اُس نے سانپوں کی طرح لہراتی ہوئی ہر رسی اور لاٹھی کو اُسی طرح رسی اور لاٹھی بنا دیا، جس طرح وہ حقیقت میں تھی اور سارا طلسم نابود ہو گیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ بالکل ویسی ہی بات ہے کہ مہ نخشب کے مقابلے میں خورشید جہاں تاب نکل آئے۔



قَالُوا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٢١﴾ رَبِّ مُوسٰى وَهٰرُونَ ﴿١٢٢﴾  
 قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذِنَ لَكُمْ ؕ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ

(خدا کی اس نشانی کو دیکھ کر) سجدے میں گر پڑے۔ اُنھوں نے (بے اختیار) کہا:  
 ہم جہانوں کے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں جو موسیٰ اور ہارون کا پروردگار  
 ہے۔ ۱۱۵-۱۲۲

فرعون نے کہا: تم میری اجازت کے بغیر اُس پر ایمان لے آئے ہو؟ یہ ضرور ایک

ظاہر ہے کہ ہزاروں مصنوعی چاند، سورج ہوں، جب بھی حقیقی سورج کے نکلتے ہی اُن کی چمک  
 دمک ملمع کی طرح غائب ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت موسیٰ کے معجزے کے ظاہر  
 ہوتے ہی ساحروں کا سارا طلسم غائب ہو گیا۔“ (تذکر قرآن ۳/۳۴۷)

۳۷۰ اصل الفاظ ہیں: ”وَالْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ“۔ ”الْقِيَ“ مجہول کا صیغہ ہے۔ یہ  
 جادو گروں کے جذبہ تعظیم و اکرام کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ سحر و ساحری اور اس طرح کے  
 دوسرے علوم و فنون کو اُن کے ماہرین ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان میں اور معجزے میں فرق کے  
 لیے یہ نہایت واضح معیار ہے کہ ان علوم و فنون کے ماہرین بھی اُس کے سامنے اعتراف عجز پر  
 مجبور ہو جاتے ہیں۔

۳۷۱ یہ صاف فرعون کی خدائی سے انکار تھا۔ سورہ طہ (۲۰) کی آیت ۷۳ سے معلوم ہوتا ہے  
 کہ مقابلے پر آنے سے پہلے ہی جادو گر کسی حد تک سمجھ چکے تھے کہ معاملہ اُن کے کسی ہم پیشہ  
 سے نہیں ہے۔ آیت میں ”مَا اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ“ کے الفاظ اسی طرف اشارہ کرتے  
 ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُن کے اندر دبی ہوئی روشنی اسی کی منتظر تھی کہ کوئی آگ دکھائے اور  
 وہ بھڑک اٹھے۔ استاذ امام کے الفاظ میں سعادت کا کوئی شمع بھی انسان کے اندر موجود ہو تو  
 بتوفیق الہی وہ اپنا اثر دکھا ہی جاتا ہے۔







الاعراف

مَكَرْتُمُوهُ فِي الْمَدِينَةِ لِتُخْرِجُوا مِنْهَا أَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿١٢٣﴾  
لَا قُطْعَنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلُكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَا تُصَلِّبُكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٢٤﴾  
قَالُوا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا مُنْقَلِبُونَ ﴿١٢٥﴾ وَمَا نَقِمُ مِنْكَ إِلَّا أَنَّ آمَنَّا بِآيَاتِ رَبِّنَا  
لَمَّا جَاءَ تَنَاطُرُ رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ ﴿١٢٦﴾

سازش ہے جو تم لوگوں نے اس شہر میں اس لیے کی ہے کہ اس کے باشندوں کو وہاں سے نکال دو۔ سو (اس کا نتیجہ) تمہیں ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔ میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹوں گا، پھر تم سب کو لازماً سولی پر چڑھا دوں گا۔ انہوں نے جواب دیا: (پھر کیا ہے)، ہم اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹیں گے! تم صرف اس غصے میں ہمارے درپے آزار ہو رہے ہو کہ ہمارے پروردگار کی نشانیاں جب ہمارے پاس آگئیں تو ہم اُن پر ایمان لے آئے۔ پروردگار، (اب) تو ہم پر صبر کا فیضان فرما اور ہمیں اس حال میں دنیا سے اٹھا کہ ہم مسلمان ہوں۔ ۱۲۳-۱۲۶

۱۲۲ جادو گروں کے اعتراف حق سے مجمع پر جو اثر پڑا اور فرعون اور اُس کے درباری جس طرح رسوا ہو کر رہ گئے، اُس کی خفت مٹانے اور بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھالنے کے لیے اُس نے کائیاں سیاسیوں کی طرح فوراً اُن پر سازش کا الزام رکھ کر سزا سنادی کہ یہ سب تمہاری اور موسیٰ کی ملی بھگت ہے۔ تم سب مل کر ہمارے خلاف بغاوت کرنا چاہتے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تم نے میری اجازت کا انتظار بھی نہیں کیا اور موسیٰ پر ایمان کا اعلان کر دیا ہے۔ اب میں تمہیں وہی سزا دوں گا جو سلطنت کے باغیوں کو دی جاتی ہے۔

۱۲۳ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سچا ایمان آن کی آن میں انسان کو کس بلندی پر پہنچا دیتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:



وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اتَذَرُ مُوسَى وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا  
فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَالْهَتَكَ ط قَالَ سَنُقْتِلُ أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِ  
نِسَاءَهُمْ جَ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ﴿١٢٤﴾ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا

فرعون سے اُس کی قوم کے سرداروں نے کہا: کیا تم موسیٰ اور اُس کی قوم کو اسی طرح چھوڑے رکھو گے کہ ملک میں فساد پھیل جائے اور تمہیں اور تمہارے (ٹھہرائے ہوئے) معبودوں کو ٹھکرائیں؟ فرعون نے جواب دیا: ہم اُن کے بیٹوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ماریں گے اور اُن کی عورتوں کو جیتا رہنے دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اُن پر

”... یہ وہی جادوگر ہیں جن کی دناءت اور پست ہمتی کا ابھی چند منٹ پہلے یہ حال تھا کہ اپنے کرتب دکھانے کے لیے فرعون کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو بھانڈوں، نقالوں اور مسخروں کی طرح اپنے فن کے مظاہرے پر بھرپور انعام کی التجا پیش کرتے ہیں یا اب یہ حال ہے کہ ایمان کی روشنی دل میں داخل ہوتے ہی اُن کے باطن کا ہر گوشہ اس طرح جگمگا اٹھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے تاریکی کی کوئی پرچھائیں اُن کے دلوں پر کبھی پڑی ہی نہیں تھی اور یہ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان نہیں بلکہ یہ عزیمت و استقامت کے پہاڑ اور پاکیزگی و قدوسیت کے ملائک صفت پیکر ہیں۔ غور کیجیے، فرعون نے کتنی بڑی دھمکی اُن کو دی، لیکن اُنھوں نے اس کے جواب میں فرمایا تو یہ فرمایا کہ کچھ غم نہیں، اگر تم نے ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر سولی دے دی تو ہم کہیں اور نہیں جائیں گے، اپنے رب ہی کے پاس جائیں گے اور جب تیرا سارا غضب ہمارے اوپر اس جرم میں ہے کہ ہم اپنے رب کی آیات پر، جب کہ وہ ہمارے پاس آئیں، ایمان لائے تو جو کچھ تو کر سکتا ہے، وہ کر گزرے، اگر اس جرم کی یہ سزا ہے تو ہم اس سزا کا خیر مقدم کرتے ہیں۔“ (تذکر قرآن ۳/۳۲۸)

۳۷۴ اس سے مراد خود فرعون کے بت ہیں جو سورج دیوتا کے اوتار کی حیثیت سے خود اُس کے حکم سے پورے ملک میں پوجے جا رہے تھے۔ عربی زبان میں اضافت اس طرح کے مفہوم





بِاللّٰهِ وَاصْبِرْوَاِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ قَفْلًا يُّوْرَثُهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ط  
وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿١٢٨﴾ قَالُوْا اَوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْ

پوری طرح حاوی ہیں۔ اس پر موسیٰ نے اپنی قوم کو نصیحت کی: تم اللہ سے مدد چاہو اور  
ثابت قدم رہو۔ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے، اُس کا  
وارث بنا دیتا ہے اور (یاد رکھو کہ) آخر میں کامیابی اُنھی کی ہے جو اُس سے ڈرنے  
کے لیے بھی آ جاتی ہے۔

۴۷۵ بنی اسرائیل کی نسل کشی کے لیے یہی اسکیم حضرت موسیٰ کی پیدائش سے پہلے رعمیس  
دوم کے زمانے میں بھی جاری رہی تھی۔ اپنے ہی منتخب کیے ہوئے میدان میں شکست کھا کر  
جب درباریوں نے موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم کے خلاف سخت اقدام کا مطالبہ کیا تو  
فرعون نے ظلم و ستم کی وہی اسکیم دوبارہ جاری کرنے کا اعلان کر دیا۔ نیز یہ اطمینان بھی دلا دیا  
کہ اس کے نتیجے میں کسی بغاوت کا اندیشہ نہیں ہے، ہمارا اقتدار اُن کے اوپر پوری طرح مستحکم  
ہے۔

۴۷۶ یعنی نماز میں اُس کے سامنے سربہ سجود ہو کر اُس سے مدد کی درخواست کرو۔ اللہ سے مدد  
چاہنے کا یہی طریقہ قرآن میں بیان ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... فتنوں اور آزمائشوں میں استقامت بڑا کٹھن کام ہے۔ یہ کام اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں  
ہے۔ اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے کہ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ\* (اور تمہیں صبر نہیں حاصل  
ہو سکتا، مگر اللہ ہی کی مدد سے)۔ اللہ کی یہ مدد حاصل کرنے کا واسطہ نماز ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ  
اس نماز سے مراد صرف عام نماز نہیں ہے، بلکہ وہ خاص نماز بھی ہے جس کی تاکید آں حضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو مکی زندگی کے ابتدائی پر محن دور میں کی گئی تھی۔ اسی چیز کی  
تاکید حضرت موسیٰ اور ہارون کو بھی کی گئی۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۵۱)

\* النحل ۱۶: ۱۲۷۔



بَعْدَ مَا جِئْنَا ط قَالَ عَسَى رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ  
فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿١٢٩﴾

وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصٍ مِنَ الثَّمَرَاتِ  
لَعَلَّهُمْ يَذْكُرُونَ ﴿١٣٠﴾ فَإِذَا جَاءَ تَهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَذِهِ

والے ہوں۔ اُنہوں نے کہا: ہم تمہارے آنے سے پہلے بھی ستائے گئے اور تمہارے  
آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں۔ موسیٰ نے جواب دیا: امید ہے کہ تمہارا  
پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کرے اور تمہیں زمین میں اقتدار عطا فرمائے، پھر  
دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ ۱۲۷-۱۲۹

ہم نے فرعون کے لوگوں کو قحط میں اور پیداوار کی کمی (کے عذاب) میں مبتلا رکھا  
تاکہ وہ متنبہ ہوں، لیکن (ہوایہ کہ) جب اُن کے اچھے دن آتے تو کہتے: یہ ہمارا حق

۱۲۷ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول تھے، لہذا یہ اُس سنت الہی کی طرف اشارہ ہے جس کے  
تحت اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اُس کے ساتھیوں کو اُن کے دشمنوں پر لازماً غلبہ عطا فرماتے ہیں۔

۱۲۸ بنی اسرائیل کا یہ جواب اُن کی روایتی بے یقینی اور ضعیف الاعتقادی کا اظہار ہے۔

۱۲۹ یہ برسر موقع تنبیہ ہے کہ خدا کے پیغمبر کا ساتھ دو گے تو بادشاہی ضرور مل جائے گی، مگر  
برقرار اُسی صورت میں رہے گی، جب اُس کا حق ادا کیا جائے گا۔ پچھلے رسولوں کی امتوں کی طرح  
بدست ہو کر زمین میں فساد برپا کرو گے تو اُنھی کی طرح یہ تم سے بھی چھین لی جائے گی۔

۱۳۰ رسولوں کے باب میں یہ سنت الہی پیچھے بیان ہوئی ہے کہ اُن کی دعوت جب انداز عام  
کے مرحلے میں داخل ہوتی ہے تو اس طرح کی آزمائشیں لوگوں کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کے  
لیے آسمان سے نازل کی جاتی ہیں۔





الاعراف

وَإِنْ تُصِبَّهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَنْ مَّعَهُ إِلَّا إِنَّمَا  
طَّيَّرُهمْ عِنْدَ اللَّهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٣١﴾ وَقَالُوا  
مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِنْ آيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿١٣٢﴾  
فَارْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالْدَّمَ  
آيَةً مُّفَصَّلَةً ۖ فَاسْتَكَبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ﴿١٣٣﴾ وَلَمَّا

ہے اور اگر کبھی برے دن آتے تو اُس کو موسیٰ اور اُس کے ساتھیوں کی نحوست بتاتے  
تھے۔ سنو، ان لوگوں کی نحوست تو اللہ ہی کے پاس ہے، مگر ان میں سے اکثر نہیں  
جانتے۔ اُنھوں نے یہی کہا کہ تم خواہ کوئی نشانی ہمارے پاس لے آؤ کہ اُس سے ہمیں  
مسحور کر دو، ہم تمھاری بات ماننے والے نہیں ہیں۔ سو ہم نے اُن پر طوفان بھیجا، ٹڈیاں،  
جونیں اور مینڈک چھوڑ دیے اور خون برسایا۔ یہ سب نشانیاں تھیں، بنی اسرائیل کے  
صحیفوں میں جن کی تفصیل کر دی گئی ہے۔ اس پر بھی وہ تکبر ہی کرتے رہے اور حقیقت

۲۸۱ مطلب یہ ہے کہ اپنی نحوست دوسروں کے طالع میں ڈھونڈتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ  
خدا کا فیصلہ ہے جو اُن کی بد اعمالیوں کے نتیجے میں اُن کے خلاف صادر ہو گیا ہے۔

۲۸۲ اصل الفاظ ہیں: 'آيَةُ مُّفَصَّلَةٍ'۔ یہ حال واقع ہوئے ہیں اور قرینہ دلیل ہے کہ  
'مُفَصَّلَت' کا ظرف یہاں محذوف ہے، یعنی اُن کی تفصیل بنی اسرائیل کے صحیفوں میں کر دی  
گئی ہے۔ چنانچہ بائبل کی کتاب خروج میں طوفان کی تفصیل اس طرح آئی ہے:

”اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھاتا کہ سب ملک مصر میں انسان  
اور حیوان اور کھیت کی سبزی پر جو ملک مصر میں ہے، اگلے گریں۔ اور موسیٰ نے اپنی لاٹھی آسمان  
کی طرف اٹھائی اور خداوند نے رعد اور اگلے بھیجے اور (بجلیوں کی) آگ زمین تک آنے لگی  
اور خداوند نے ملک مصر پر اگلے برسائے۔ پس اگلے گرے اور اولوں کے ساتھ آگ ملی ہوئی



تھی اور وہ اولے ایسے بھاری تھے کہ جب سے مصری قوم آباد ہوئی، ایسے اولے ملک میں کبھی نہیں پڑے تھے اور اولوں نے سارے ملک مصر میں اُن کو جو میدان میں تھے، کیا انسان کیا حیوان، سب کو مارا اور کھیتوں کی ساری سبزی کو بھی اولے مار گئے اور میدان کے سب درختوں کو توڑ ڈالا۔“ (۲۵-۲۲:۹)

ٹڈی دل کے حملے کی تفصیل اس طرح بیان ہوئی ہے:

”تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ملک مصر پر اپنا ہاتھ بڑھاتا کہ ٹڈیاں ملک مصر پر آئیں اور ہر قسم کی سبزی کو جو اس ملک میں اولوں سے بچ رہی ہے، چٹ کر جائیں۔ پس موسیٰ نے ملک مصر پر اپنی لاٹھی بڑھائی اور خداوند نے اُس سارے دن اور ساری رات پروا آندھی چلائی اور صبح ہوتے ہوتے پروا آندھی ٹڈیاں لے آئی اور ٹڈیاں سارے ملک مصر پر چھا گئیں اور وہیں مصر کی حدود میں بسیرا کیا اور اُن کا دل ایسا بھاری تھا کہ نہ تو اُن سے پہلے ایسی ٹڈیاں کبھی آئیں اور نہ اُن کے بعد پھر آئیں گی۔ کیونکہ اُنھوں نے تمام روئے زمین کو ڈھانک لیا، ایسا کہ ملک میں اندھیرا ہو گیا اور اُنھوں نے اُس ملک کی ایک ایک سبزی کو اور درختوں کے میووں کو جو اولوں سے بچ گئے تھے، چٹ کر لیا اور ملک مصر میں نہ تو کسی درخت کی، نہ کھیت کی کسی سبزی کی ہریالی باقی رہی۔“ (۱۵-۱۲:۱۰)

جوؤں کا حملہ جس طرح ہوا، اُس کی تفصیل یہ ہے:

”تب خداوند نے موسیٰ سے کہا: ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی بڑھا کر زمین کی گرد کو مارتا کہ وہ تمام ملک مصر میں جوئیں بن جائے۔ اُنھوں نے ایسا ہی کیا اور ہارون نے اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور زمین کی گرد کو مارا اور انسان اور حیوان پر جوئیں ہو گئیں اور تمام ملک مصر میں زمین کی ساری گرد جوئیں بن گئی۔“ (۱۷-۱۶:۸)

مینڈکوں کے عذاب کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے:

”پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ فرعون کے پاس جا اور اُس سے کہہ، خداوند یوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے تا کہ وہ میری عبادت کریں۔ اور اگر تو اُن کو جانے نہ دے گا تو دیکھ میں تیرے ملک کو مینڈکوں سے ماروں گا اور دریا بے شمار مینڈکوں سے بھر جائے گا اور وہ آ







الاعراف

وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يَمُوسَىٰ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ  
لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيَّ

یہ ہے کہ وہ مجرم لوگ تھے۔ جب اُن پر آفت ٹوٹ پڑی تو کہتے: اے موسیٰ، اپنے پروردگار سے تم اُس عہد کی بنا پر جو اُس نے تم سے کر رکھا ہے، ہمارے لیے دعا کرو۔

کرتیرے گھر میں اور تیری آرام گاہ میں اور تیرے پلنگ پر اور تیرے ملازموں کے گھروں میں اور تیری رعیت پر اور تیرے تنوروں اور آٹا گوندھنے کے لگنوں میں گھستے پھریں گے اور تجھ پر اور تیری رعیت اور تیرے نوکروں پر چڑھ جائیں گے۔ اور خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ دریاؤں اور نہروں اور جھیلوں پر بڑھا اور مینڈکوں کو ملک مصر پر چڑھالا۔ چنانچہ جتنا پانی مصر میں تھا، اُس پر ہارون نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مینڈک چڑھ آئے اور ملک مصر کو ڈھانک لیا۔“ (۸:۱-۶)

خون کا عذاب جس صورت میں ظاہر ہوا، اُس کی تفصیل یہ ہے:

”اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے اور مصر میں جتنا پانی ہے، یعنی دریاؤں اور نہروں اور جھیلوں اور تالابوں پر اپنا ہاتھ بڑھاتا کہ وہ خون بن جائیں اور سارے ملک مصر میں پتھر اور لکڑی کے برتنوں میں بھی خون ہی خون ہوگا۔ اور موسیٰ اور ہارون نے خداوند کے حکم کے مطابق کیا۔ اُس نے لاٹھی اٹھا کر اُسے فرعون اور اُس کے خادموں کے سامنے دریا کے پانی پر مارا اور دریا کا پانی سب خون ہو گیا اور دریا کی مچھلیاں مر گئیں اور دریا سے تعفن اٹھنے لگا اور مصری دریا کا پانی پی نہ سکے اور تمام ملک مصر میں خون ہی خون ہو گیا۔“ (۷:۱۹-۲۱)

۲۸۳ اصل الفاظ ہیں: 'لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ'۔ 'اِنْ' میں 'لَمَّا' 'كُلَّمَا' کے معنی میں ہے۔ تصویر حال مقصود ہو تو یہ اس معنی میں بھی آتا ہے۔ آگے آیت ۱۸۹ میں اس کی نظیر موجود ہے۔

۲۸۴ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کی حیثیت سے تمہاری بات سننے اور اُس کی حرمت قائم رکھنے کا



إِسْرَائِيلَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمْ الرِّجْزَ إِلَىٰ أَجَلٍ هُمَّ  
بِلُغْوِهِ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ۝ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ  
بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ۝ وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ  
الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضَعُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي

اگر یہ آفت تو نے (اس وقت) ہم سے ہٹا دی تو ہم تمہاری بات ضرور مان لیں گے اور  
بنی اسرائیل کو بھی ضرور تمہارے ساتھ جانے دیں گے۔ پھر جب کچھ مدت کے لیے،  
جس تک انھیں بالآخر پہنچنا ہی تھا، وہ آفت ہم اُن سے ہٹا دیتے تو اُسی وقت عہد کو توڑ  
دیتے تھے۔ سو ہم نے اُن سے انتقام لیا اور انھیں سمندر میں غرق کر دیا، اس لیے کہ  
انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور اُن سے بے پروا بنے رہے۔ اس کے برخلاف  
اُن کو جو دبا کر رکھے گئے تھے، ہم نے اُس سرزمین کے مشرق و مغرب کی وسعتوں کا وارث  
جو عہد کر رکھا ہے۔

۲۸۵ یعنی جو بہر حال ختم ہو جانا تھی اور اُن کے جھوٹ اور فریب کا پردہ جس کے بعد لازماً  
چاک ہو جانا تھا۔

۲۸۶ اس کا ذکر بائبل میں بھی ہوا ہے۔ کتاب خروج میں ہے:

”تب فرعون نے موسیٰ اور ہارون کو بلوا کر کہا کہ خداوند سے شفاعت کرو کہ مینڈکوں کو مجھ سے  
اور میری رعیت سے دفع کرے اور میں ان لوگوں کو جانے دوں گا تا کہ وہ خداوند کے لیے قربانی  
کریں۔“ (۸:۸)

”فرعون نے کہا: میں تم کو جانے دوں گا تا کہ تم خداوند اپنے خدا کے لیے بیابان میں قربانی  
کرو، لیکن تم دور مت جانا اور میرے لیے شفاعت کرنا... پر فرعون نے اس بار بھی اپنا دل سخت  
کر لیا اور اُن لوگوں کو جانے نہ دیا۔“ (۲۸:۸-۳۲)





الاعراف

بَرَكَتِنَا فِيهَا طَوَّمَتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَءِيلَ ۖ  
بِمَا صَبَرُوا طَوَّامُنَا مَا كَانَتْ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ  
وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ ﴿١٣٢﴾

وَجُوزْنَا بِبَنِي إِسْرَءِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَىٰ قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَىٰ

بنادیا جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں۔<sup>۴۸۸</sup> بنی اسرائیل پر تیرے پروردگار کا وعدہ خیر  
اس طرح پورا ہوا،<sup>۴۸۹</sup> کیونکہ وہ ثابت قدم رہے اور ہم نے فرعون اور اُس کی قوم کا سب کچھ  
برباد کر دیا جو وہ (اپنے شہروں میں) بناتے اور جو کچھ (دیہات کے باغوں اور کھیتوں  
میں ٹٹیوں پر) چڑھاتے تھے۔<sup>۴۹۰</sup> ۱۳۰-۱۳۷

دوسری طرف بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر کے پار اتار دیا۔<sup>۴۹۱</sup> پھر اُن کا گزر ایک

۴۸۷ یعنی اُن جرائم کا انتقام لیا جن پر وہ اتمام حجت کے باوجود جرمے رہے۔  
۴۸۸ اس سے فلسطین کی سرزمین مراد ہے جسے بنی اسرائیل کے لیے توحید کے مرکز کی  
حیثیت سے منتخب کیا گیا اور جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص عنایت سے مادی اور روحانی، دونوں  
قسم کی برکتیں اُن کے لیے رکھ دی تھیں۔ آیت میں 'مَشَارِقُ' اور 'مَغَارِبُ' کے الفاظ اس سرزمین  
کی وسعت اطراف کو بیان کرنے کے لیے آئے ہیں۔ یہ اس بات کی واضح نظیر ہے کہ عربی زبان  
میں جمع اس مفہوم کے لیے بھی آتی ہے۔

۴۸۹ اُس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو پیچھے آیات ۱۲۸-۱۲۹ میں مذکور ہے۔

۴۹۰ یعنی انگور جس کی پیداوار میں مصر کو اُس زمانے میں امتیاز حاصل تھا۔ یہ جزو غالب کے  
ذکر سے کسی چیز کی تعبیر کا اسلوب ہے، ورنہ مدعا یہی ہے کہ اُن کے تمام شہر اور باغ ملیا میٹ کر دیے  
گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اتمام حجت کے بعد صرف فرعون اور  
اُس کے لشکر ہی غرقاب نہیں ہوئے، بلکہ پورے ملک پر تباہی آئی جس سے محل اور ایوان بھی منہدم



اَصْنَامٌ لَهُمْ ؕ قَالُوا يَمُوسَى اجْعَلْ لَنَا اِلَٰهًا كَمَا لَهُمُ اِلَٰهَةٌ ۖ قَالَ  
اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ﴿١٢٨﴾ اِنَّ هَٰؤُلَاءِ مُتَّبِعُونَ مَا هُم فِيْهِ وَبِطِلٌ مَّا كَانُوْا

ایسی قوم پر ہوا جو (اس قدر احمق تھی کہ) اپنے کچھ بتوں کی پرستش میں لگی ہوئی تھی۔  
بنی اسرائیل نے (یہ دیکھا تو) کہا: اے موسیٰ، جس طرح ان کے معبود ہیں، اُسی طرح  
کا ایک معبود ہمارے لیے بھی بنا دو۔ موسیٰ نے کہا: تم بڑے ہی جاہل لوگ ہو۔ یہ جس  
ہوئے اور ہر قسم کے باغات بھی اجڑ گئے۔

۴۹۱ فرعون کا انجام بیان کرنے کے بعد یہاں سے اب بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ  
شروع ہوتا ہے جو خدائی دینونت کے عالمی ظہور کی سرگزشت ہے۔

۴۹۲ اصل الفاظ ہیں: 'يَعْكُفُونَ عَلَىٰ اَصْنَامٍ لَهُمْ'۔ یہ اسلوب بیان اپنے اندر تحقیر کا  
پہلو لیے ہوئے ہے۔ ہم نے ترجمے میں اسی کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ  
اس جملے میں 'عَكَفَ' 'عَلَىٰ' کے ساتھ آیا ہے۔ اس سے کسی چیز پر جمے ہونے اور اپنے آپ کو  
اُس سے وابستہ کر لینے کا مفہوم اس میں پیدا ہو گیا ہے۔ یہ غالباً موجودہ شہر طور اور ابو زینمہ کے  
قریب کسی مقام کا ذکر ہے جس سے بنی اسرائیل جزیرہ نماے سینا کے جنوبی علاقے کی طرف  
جاتے ہوئے گزرے۔ مصریوں کا ایک بہت بڑا بت خانہ اور قدیم زمانے سے سامی قوموں کی  
چاند دیوی کا معبد اسی علاقے میں تھا۔

۴۹۳ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل اُن سے بھی زیادہ احمق ثابت ہوئے اور خدا کے  
جلال و جمال کی اتنی شانیں دیکھ لینے کے بعد بھی اُس دہنی پستی سے نکلنے کے لیے تیار نہیں ہوئے  
جس میں مصر کی غلامی نے اُنھیں ڈال رکھا تھا۔ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام مصر کے دوران  
میں وہ اُن کے دیوتاؤں کی پرستش بھی کرنے لگے تھے۔ چنانچہ وہاں سے نکلنے کے فوراً بعد ہی جو  
بت کدہ سامنے آیا، اُس کو دیکھ کر اُن کی پیشانیاں اپنے پرانے معبودوں کے آستانے پر سجدے





الاعراف

يَعْمَلُونَ ﴿١٣٩﴾ قَالَ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِيكُمْ إِلَهًا وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى  
الْعَالَمِينَ ﴿١٤٠﴾ وَإِذْ أَنْجَيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ  
سُوءَ الْعَذَابِ ۖ يُقَتِّلُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۗ وَفِي  
ذَلِكَ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿١٤١﴾

وَوَعَدْنَا مُوسَى ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَتَمَّمْنَا بِعَشْرِ فِتْنَةٍ مِّقَاتُ

کام میں لگے ہوئے ہیں، وہ برباد ہونے والا ہے اور جو کچھ کر رہے ہیں، وہ سراسر  
باطل ہے۔ اُس نے کہا: کیا میں تمہارے لیے خدا کے سوا کوئی اور معبود تلاش کروں،  
دراں حالیکہ وہی ہے جس نے تم کو دنیا والوں پر فضیلت بخشی ہے؟ یاد کرو، جب ہم  
نے فرعون کے لوگوں سے تمہیں نجات عطا فرمائی جو تمہیں سخت عذاب میں ڈالے  
ہوئے تھے۔ وہ تمہارے بیٹوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مارتے اور تمہاری عورتیں جیتی  
رکھتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے (تمہارے لیے) بڑی عنایت  
تھی۔ ۱۳۸-۱۴۱

(بنی اسرائیل وہاں سے آگے بڑھے تو) ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ

کے لیے بے تاب ہو گئیں۔

۱۳۹ اس میں بلاغت کا یہ نکتہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ لڑکوں کو ذبح کرنے کا ذکر بیٹوں کے لفظ سے  
ہوا ہے اور لڑکیوں کو زندہ رکھنے کا ذکر کرتے ہوئے تمہاری عورتوں کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔  
پہلی تعبیر، اگر غور کیجیے تو شفقت پدری کا جذبہ ابھارتی ہے اور دوسری غیرت کو حرکت میں لانے کا  
باعث بنتی ہے۔ جملے کا اسلوب بھی قابل توجہ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی بات کے ساتھ ملا کر گویا  
اللہ تعالیٰ نے اپنی بات اُن کی زبان پر جاری کر دی ہے۔



رَبِّهِ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُونَ ۖ اٰخُلْفَنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٢٩٦﴾ وَلَمَّا جَاءَ مُوسٰى لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ ۚ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ط قَالَ لَنْ تَرٰنِيْ وَلٰكِنْ اَنْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنْ اَسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ

ٹھیرایا اور دس مزید راتوں سے اُس کو پورا کیا تو اُس کے نتیجے میں اُس کے پروردگار کی ٹھیرائی ہوئی مدت، چالیس راتیں پوری ہو گئی۔ (۲۹۵) اِس وعدے کے لیے جاتے ہوئے) موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا: میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرو گے اور لوگوں کی اصلاح کرتے رہو گے اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہیں چلو گے۔ جب موسیٰ ہمارے ٹھیرائے ہوئے وقت پر پہنچ گیا اور اُس کے پروردگار نے اُس سے کلام کیا تو اُس نے التجا کی کہ پروردگار، مجھے موقع دے کہ میں تجھے دیکھوں۔ فرمایا: تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے۔ البتہ، اِس پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ

۲۹۵ یہ اُس وعدے کا ذکر ہے جو دریا پار کر لینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنی شریعت دینے کے لیے فرمایا۔ چالیس راتوں کی یہ مدت اُس ذہنی اور قلبی تیاری کے لیے تھی جو کتاب الہی کا حامل بننے کے لیے ضروری تھی۔ پہلے یہ وعدہ تیس دنوں کا تھا، لیکن سورہ طہ (۲۰) کی آیت ۸۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام شوق ملاقات میں وقت مقررہ سے پہلے پہنچ گئے۔ چنانچہ اُن کی اِس جلد بازی کے باعث اللہ تعالیٰ نے اُن کی تربیت کے لیے یہ مدت تیس دنوں سے بڑھا کر چالیس دن کر دی۔

۲۹۶ موسیٰ علیہ السلام نے جانے سے پہلے اپنی قوم کی نگرانی کے لیے جواہتمام فرمایا، یہ اُس کا بیان ہے۔ اِسے خاص طور پر نمایاں کیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی کی





الاعراف

تَرٰنِیْ فَلَمَّا تَجَلٰی رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسٰی صَعِقًا  
فَلَمَّا اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبَّتْ اِلَیْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۴۳﴾  
قَالَ یٰمُوسٰی اِنِّیْ اصْطَفٰیْتُكَ عَلٰی النَّاسِ بِرِسٰلَتِیْ وَبِكَلَامِیْ ۚ

اپنی جگہ پر قائم رہ جائے تو آگے تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ پھر جب اُس کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلی کی تو اُس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش آیا تو بولے: تو پاک ہے، میں تیرے حضور تو بہ کرتا ہوں اور (گواہی دیتا ہوں کہ) سب سے پہلے ماننے والا میں ہوں۔<sup>۴۹۸</sup> فرمایا: اے موسیٰ، میں نے اپنے پیغام اور جولعت اختیار کی، وہ اس سارے اہتمام کے علی الرغم اختیار کی۔

۴۹۷ یہ شوق ایک فطری شوق ہے، اس وجہ سے آں جناب کو اللہ تعالیٰ نے اس پر کوئی ملامت نہیں فرمائی، بلکہ صرف سمجھا دیا ہے۔

۴۹۸ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو سمجھانے کے لیے یہ طریقہ کیوں اختیار فرمایا؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ مشاہدہ حضرت موسیٰ کی اطمینان دہانی کے لیے کرایا گیا کہ خدا کی تجلی ذات کی تاب تو کوہ و جبل بھی نہیں لا سکتے جو جامد اور ٹھوس ہونے کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر ہیں تو تم انسان ضعیف البیان ہو کر کس طرح لا سکو گے؟ انسان کی قوت برداشت محدود ہے۔ اُس کی نگاہیں روشنی کو دیکھتی ہیں، لیکن یہ روشنی ایک حد خاص سے متجاوز ہو جائے تو آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں، بلکہ بعض اوقات بینائی ہی سلب ہو جاتی ہے۔ اُس کے کان آواز کو سنتے ہیں، لیکن اُن کے سننے کی تاب بھی بس ایک مقررہ حد ہی تک ہے، بجلی کا کڑکا ہی ذرا حد سے متجاوز ہو جائے تو سرے سے کان کے پردے ہی بے کار ہو جائیں۔ آفتاب اُس کی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، مگر اُس کی روشنی اور حرارت اُسی وقت تک اُس کے لیے حیات بخش ہے، جب تک وہ نہایت ہی طویل فاصلے سے، نہ جانے کتنے فضائی پردوں کی اوٹ سے اور کتنی چھلنیوں



فَخُذْ مَا آتَيْتُكَ وَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿٣٩٩﴾ وَكَتَبْنَا لَهُ فِي  
الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِكُلِّ شَيْءٍ ۚ

کلام سے تمہیں لوگوں پر سرفرازی بخشی ہے، اس لیے جو کچھ میں نے تمہیں دیا ہے،  
اُسے لو اور شکر گزار بن کر رہو۔<sup>۳۹۹</sup> اور اُس کے لیے ہر قسم کی نصیحت اور (دین و شریعت  
سے متعلق) ہر چیز کی تفصیل ہم نے تختیوں پر لکھ دی۔ (فرمایا: یہ ہم نے لکھ دی

سے گزار کر اپنی روشنی اور حرارت اُس کو پہنچا رہا ہے۔ اگر کسی دن ذرا کرۂ ارض سے قریب آ کر  
اُس پر ایک نظر ڈال دے تو سارے جان دار جل بھن کر خاک اور راکھ ہو جائیں۔ تو جب اس  
کائنات کی مخلوق کے مقابل میں انسان کی قوت برداشت اتنی ناتواں ہے تو وہ خدا کی ذات بحت  
کی تاب کس طرح لاسکتی ہے جو نور مطلق اور تمام چون و چگلوں سے ماورا اور بالا تر ہے؟“

(تذبر قرآن ۳/۳۶۰)

۳۹۹ یہ انداز کلام بھی قابل توجہ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو اس میں نہایت لطیف طریقے سے  
توجہ دلائی گئی ہے کہ جو کچھ عطا کیا جا رہا ہے، وہی کم نہیں ہے، اُس پر قناعت کرو، مجھے دیکھنے کی  
خواہش نہ کرو۔

۵۰۰ اصل میں مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اور لِكُلِّ شَيْءٍ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس طرح کے  
سیاق و سباق میں یہ پیش نظر موضوع ہی سے متعلق ہو کر آتے ہیں۔ ہم نے ترجمے میں اسے واضح  
کر دیا ہے۔ تختیوں پر اللہ تعالیٰ نے خود لکھایا یا اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت موسیٰ علیہ السلام نے لکھا،  
بائبل کے بیان سے دونوں ہی باتیں نکلتی ہیں۔ ان میں سے جس کو بھی مانے، قرآن کے الفاظ  
اُس کے محتمل ہیں:

”اور موسیٰ نے لوگوں کے پاس جا کر خداوند کی سب باتیں اور احکام اُن کو بتا دیے اور سب  
لوگوں نے ہم آواز ہو کر جواب دیا کہ جتنی باتیں خداوند نے فرمائی ہیں، ہم اُن سب کو مانیں  
گے اور موسیٰ نے خدا کی سب باتیں لکھ لیں۔“ (خروج ۲۴: ۳-۴)



فُحِذْهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا ۖ سَأُورِيكُمْ  
دَارَ الْفُسِيقِينَ ﴿١٢٥﴾ سَأَصْرِفُ عَنْ آيَتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي  
الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۖ وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا ۖ وَإِنْ

ہیں)، سو انھیں مضبوطی سے پکڑو اور اپنی قوم کو حکم دو کہ ان کے (اندر لکھے ہوئے) احسن طریقے کی پیروی کریں۔ (اپنی قوم کو لے کر ذرا آگے بڑھو)، میں عنقریب تمہیں نافرمانوں کے گھر دکھاؤں گا۔ (تم دیکھو گے کہ) میں عنقریب ان لوگوں کو اپنی نشانیوں سے پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں اور (ایسے ہیں کہ) اگر

”اور موسیٰ شہادت کی دونوں لوحیں ہاتھ میں لیے ہوئے الٹا پھرا اور پہاڑ سے نیچے اتر اور وہ

لوحیں ادھر سے اور ادھر سے، دونوں طرف سے لکھی ہوئی تھیں۔ اور وہ لوحیں خدا ہی کی بنائی

ہوئی تھیں اور جو لکھا ہوا تھا، وہ بھی خدا ہی کا لکھا اور ان پر کندہ کیا ہوا تھا۔“ (خروج ۳۲: ۱۵-۱۶)

یہ امر، البتہ ملحوظ رہے کہ قرآن کے الفاظ سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی کہ تختیوں پر صرف احکام عشرہ لکھے ہوئے تھے، بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ دین و شریعت کی جو باتیں اُس مرحلے میں بتانی پیش نظر تھیں، وہ سب ان میں درج کر دی گئی تھیں۔

۵۰۱ اصل میں ”يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا“ کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں تفضیل مطلق ہے اور لوگ جو طریقے اُس زمانے میں اختیار کیے ہوئے تھے، ان کے مقابل میں آئی ہے۔ عربی زبان میں تفضیل کے صیغے اس پہلو سے بھی آجاتے ہیں۔ استاذ امام کے الفاظ میں مدعا یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے کہو کہ بت پرست قوموں کی خرافات پر نہ رتجھیں، بلکہ اُس پاکیزہ اور اعلیٰ و احسن طریقے کو اپنائیں جو ان الواح میں ان کو بتایا گیا ہے۔

۵۰۲ ان قوموں کی طرف اشارہ ہے جن کے علاقوں سے بنی اسرائیل فلسطین کی طرف اپنے سفر کے دوران میں گزرنے والے تھے۔



الاعراف



يُرَوِّسَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ وَإِن يَتَّخِذُوا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ﴿١٣٦﴾ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ۖ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٧﴾ وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِنۢ بَعْدِهِ مِنۢ حُلِيِّهِمْ عِجَلًا جَسَدًا

ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں، پھر بھی اُن پر ایمان نہ لائیں۔ اگر ہدایت کی راہ دیکھیں تو اُسے اختیار نہ کریں اور اگر گم راہی کی راہ دیکھیں تو اُس پر چل پڑیں۔ یہ اس لیے کہ اُنھوں نے (اس سے پہلے) ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور اُن سے بے پروا بنے رہے۔ ہماری نشانیوں کو جن لوگوں نے بھی جھٹلایا اور آخرت کی ملاقات کا انکار کیا ہے، اُن کے اعمال ضائع ہو گئے۔ اب کیا بدلے میں اُس کے سوا کچھ پائیں گے جو کرتے رہے ہیں؟ ۱۳۲-۱۳۷

موسیٰ (خدا کے حضور میں تھا کہ اُس) کی قوم نے اُس کے پیچھے اپنے زیوروں سے ۵۰۵

۵۰۳ آگے جو کچھ پیش آنے والا تھا، اُس کی مثال سے ہدایت و ضلالت کا قانون سمجھا دیا ہے کہ تمھارے جلو میں یہ قومیں خدائی دینونت کے ظہور کی عظیم نشانیاں دیکھیں گی، لیکن اس کے باوجود انکار کر دیں گی، اس لیے کہ ان میں زیادہ متکبرین ہیں اور اس سے پہلے بھی ہماری نشانیوں کو جھٹلا چکے ہیں۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ جو لوگ تکبر کے ساتھ ہماری نشانیوں کو جھٹلا دیتے ہیں، اُنھیں ہم ہدایت سے محروم کر دیتے ہیں۔

۵۰۴ مطلب یہ ہے کہ وہی پائیں گے جو کچھ کرتے رہے ہیں۔

۵۰۵ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیورات لوگوں نے چندے میں دیے تاکہ جس طرح کا





الاعراف

لَّهُ خُورٌ طَّالِمٌ يَرَوْنَ أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا  
اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ ﴿٥٨﴾ وَلَمَّا سَقَطَ فِي أَيْدِيهِمْ وَرَأَوْا أَنَّهُمْ  
قَدْ ضَلُّوا قَالُوا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُونَنَّ

ایک پچھڑا بنا لیا، ایک دھڑ جس سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ وہ نہ اُن سے بولتا ہے، نہ اُن کو کوئی راستہ دکھا سکتا ہے؟ (اس کے باوجود) انھوں نے اُسے معبود ٹھہرایا اور وہ سخت ظالم تھے۔ پھر جب اُن کا کیا اُن کے آگے آ گیا (کہ پچھتا میں) اور انھوں نے دیکھا کہ گم راہ ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ اگر ہمارے پروردگار نے ہم پر رحم

معبود وہ چاہتے ہیں، اُن سے بنا دیا جائے۔

۵۰۶ اُس زمانے کے مصر میں بت گری کا فن جس درجے کو پہنچا ہوا تھا، اُس سے واقف کسی شخص کے لیے ایک ایسا پچھڑا ڈھال لینا کچھ مشکل نہ تھا جس میں سے اُس کے ڈکرانے کی آواز نکلتی ہو۔ چنانچہ اس پچھڑے کی مورت بناتے وقت یہ صنعت گری بھی کی گئی تھی کہ اُس میں سے جب ہوا گزرتی تو جس طرح پچھڑے ڈکرتے ہیں، اُسی طرح کی آواز اُس سے نکلتی تھی۔

۵۰۷ یہ بنی اسرائیل کی بلادت پر تبصرہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”قرآن نے یہ ساری تصریح بنی اسرائیل کی بلادت، عقلی بے مایگی اور ساتھ ہی اُن کی ناقدری و ناسپاسی ظاہر کرنے کے لیے کی ہے کہ جس خداے بے ہمتا و بے مثال نے اُن کو اپنے جلال و جمال کی وہ شانیں دکھائیں جو اوپر مذکور ہوئیں، اُس کی قدر انھوں نے یہ کی کہ اپنے ہی زیوروں سے ایک پچھڑا بنایا، پچھڑا بھی کوئی سچ مچ کا نہیں، بلکہ صرف ایک جسد، ایک قالب، ایک دھڑ جس میں سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی اور اُس کے متعلق یہ باور کر لیا کہ یہی وہ خداوند خدا ہے جو بنی اسرائیل کو مصریوں کی غلامی سے چھڑا کر لایا اور یہی اپنی رہنمائی میں بنی اسرائیل کو ارض موعود کی بادشاہی دلانے گا! اس طرح انھوں نے اپنا وہ شوق پورا کر لیا جس کا اظہار



مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ وَلَمَّا رَجَعَ مُوسٰى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسْفًاۙ قَالَ بَلَّسَمَا خَلَفْتُمُوْنِىْ مِنْۢ بَعْدِىْ ؕ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ؕ وَاَلْقٰى الْاَلْوَاْحَ وَاَخَذَ بِرَاسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗ اِلَيْهِ ط قَالَ

نہ فرمایا اور ہماری غلطی معاف نہ کی تو ہم نامراد ہو کر رہ جائیں گے۔ (اس کے بعد) جب موسیٰ غصے اور رنج سے بھرا ہوا اپنی قوم کی طرف پلٹا تو (آتے ہی) کہا: تم نے میرے پیچھے میری بہت بری جانشینی کی ہے۔ کیا تم اپنے پروردگار کے حکم سے پہلے ہی جلدی کر بیٹھے؟ اُس نے تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی (ہارون) کا سر پکڑ کر اُسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔

اُنھوں نے حضرت موسیٰ کے سامنے اُن کے طور پر جانے سے پہلے کیا تھا اور جس پر حضرت موسیٰ نے اُن کو ڈانٹ بتائی تھی۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۶۵)

۵۰۸ یعنی بنانے کو تو بنا بیٹھے، مگر جب بھاں بھاں کرتا ہوا کچھڑا بن کر سامنے آیا اور یہ معلوم ہوا کہ اب یہ بنی اسرائیل کا خدا ہے تو حضرت ہارون اور دوسرے مصلحین کے توجہ دلانے پر بہت سے لوگ جن کے اندر کچھ سوجھ بوجھ تھی، سخت نادم ہوئے اور اپنے پروردگار سے معافی کی درخواست کرنے لگے۔

۵۰۹ اس حادثے کی خبر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ پر ہی دے دی تھی۔ چنانچہ جب وہ پلٹے ہیں تو مفسدین کی اس کامیاب شرارت پر نہایت غصے میں اور اپنی قوم کی نادانی اور جہالت پر نہایت غم و افسوس کی حالت میں پلٹے ہیں۔

۵۱۰ استفہام یہاں سرزنش اور ملامت کے لیے ہے۔ یعنی اس سے پہلے کہ خدا تمہیں اپنی شریعت دے اور بتائے کہ تم اُس کا معبد کس طرح بناؤ گے اور کس طریقے سے اُس کی عبادت کرو گے، تم اپنا خدا خود تراش کر بیٹھ گئے؟

۵۱۱ یہ موسیٰ علیہ السلام کے غلبہ حال اور جوش حمیت کی تصویر ہے کہ اُنھوں نے تختیاں ایک





ابْنَ اُمِّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضَعُّوْنِي وَكَادُوا يَقْتُلُوْنِي ۖ فَلَا تُشْمِتْ  
بِيَ الْاَعْدَاءَ وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ ﴿١٥٠﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي

ہارون نے کہا: میری ماں کے بیٹے، ان لوگوں نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالیں۔<sup>۵۱۲</sup> اس لیے دشمنوں کو میرے اوپر ہنسنے کا موقع نہ دے اور مجھے ان ظالم لوگوں کے ساتھ نہ ملا۔<sup>۵۱۳</sup> (تب) موسیٰ نے دعا کی: میرے رب، تو مجھے اور میرے بھائی کو معاف

طرف پھینکیں اور حضرت ہارون کے بال پکڑ کر انھیں جھنجھوڑنے لگے کہ اصل ذمہ داری تمھاری تھی، تم نے اس فتنے کو کیوں سراٹھانے دیا؟

۵۱۲ یہ حضرت ہارون نے اپنی صفائی پیش کی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...انداز خطاب بہت پیارا ہے۔ ’یا اُحییٰ‘ نہیں کہا، بلکہ ’ابن اُمّ‘ ”اے میرے ماں جائے“ کہا جس سے شفقت اور استمالت، دونوں چیزیں نمایاں ہو رہی ہیں۔ حضرت ہارون نے صفائی میں فرمایا کہ ”قوم نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ لوگ مجھے قتل کر دیں“۔ اس سے واضح ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اُس فتنے سے لوگوں کو روکا، بلکہ اُس کے لیے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی، لیکن قوم کی بھاری اکثریت سامری کے چکمے میں آگئی اور خود اُن کے ساتھ اتنی قلیل تعداد رہ گئی کہ طاقت کے زور سے اُن کے لیے اُس کو روکنا ممکن نہیں رہا۔ اس وجہ سے انھوں نے... مصلحت اسی میں دیکھی کہ حضرت موسیٰ کی واپسی کا انتظار کریں کہ مبادا اُن کا کوئی اقدام کسی مزید مضرت کا باعث ہو جائے۔“ (تذبرقرآن ۳/۳۶۸)

۵۱۳ مطلب یہ ہے کہ میں اس فتنے سے بالکل بری ہوں۔ یہ تمام شرارت ہمارے دشمنوں کی ہے۔ مجھ پر عتاب ہوا تو یہ اُن کے لیے خوشی کا باعث ہوگا کہ فتنہ تو انھوں نے اٹھایا اور ذمہ دار مجھے ٹھیرا دیا گیا۔ اس سے ضمناً اُس الزام کی بھی تردید ہوگئی ہے جو بائبل کی کتاب خروج میں اُن پر لگایا گیا ہے کہ گوسالہ سازی کا یہ سارا کام اُنھی کے اہتمام میں ہوا تھا۔ قرآن نے دوسرے

\* ۱:۳۲-۶



وَلَاخِيَّ وَأَدْخَلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّحِيمِينَ ﴿١٥١﴾  
 إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ  
 وَذَلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿١٥٢﴾  
 وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا أَنَّ  
 رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٥٣﴾

الاعراف

کر دئے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما، تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ ۱۴۸-۱۵۱

(ارشاد ہوا): جن لوگوں نے پچھڑے کو معبود بنایا ہے، اُن کے پروردگار کا غضب البتہ، اُنھیں پہنچ کر رہے گا اور وہ اسی دنیا کی زندگی میں ذلت سے دوچار ہوں گے۔ (یہ اس لیے کہ) ہم جھوٹ باندھنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ ۱۵۱۔ ہاں، جن لوگوں نے برے کام کیے، پھر اُن کے بعد توبہ کر لی اور ایمان لائے تو اس کے بعد تیرا پروردگار

مقامات میں صراحت فرمائی ہے کہ اس جرم عظیم کا مرتکب خدا کا پیغمبر ہارون نہیں، بلکہ بد بخت سامری تھا جس نے اپنی کیادی اور منافقت سے یہ فتنہ پیدا کیا۔

۱۵۲ یعنی اگر بھائی سے فیصلہ کرنے میں کوئی غلطی ہوئی ہے یا میں نے آ کر مواخذہ کرنے میں کوئی زیادتی کر دی ہے تو ہمیں معاف فرمادے۔

۱۵۵ بنی اسرائیل نے پچھڑے کو معبود بنا کر پوجنے کا جرم پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اور اُس کی موجودگی میں کیا تھا۔ پھر وہ جس منصب کے لیے منتخب کیے گئے تھے، اُس کے حاملین کو اُن کے جرائم کی سزا اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی لازماً دیتا ہے۔ اس لیے فرمایا ہے کہ اس افترا کا بدلہ اُنھیں ہر حال میں دیا جائے گا تا کہ اُس جماعت کی تطہیر ہو جائے جو خدا کے دین کی شہادت کے لیے منتخب





الاعراف

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَابَ ۖ وَفِي  
نُسخَتِهَا هُدًى وَرَحْمَةٌ لِلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ﴿١٥٣﴾  
وَاخْتَارَ مُوسَى قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا لِّمِيقَاتِنَا ۖ فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ  
الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُم مِّن قَبْلُ وَإِيَّايَ أَتُهْلِكُنَا

یقیناً بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۱۵۲-۱۵۳

پھر جب موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اُس نے وہ تختیاں اٹھالیں۔ اُن سے جو کچھ  
منقول ہے، اُس میں اُن لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت تھی جو اپنے پروردگار سے  
ڈرنے والے ہوں۔ اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمی منتخب کیے تاکہ وہ ہمارے مقرر  
کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوں۔ پھر جب (وہ حاضر ہوئے اور) اُن کو زلزلے نے آ  
کی گئی ہے۔

۱۵۶ یعنی تجدید ایمان کی، اس لیے کہ بنی اسرائیل کا یہ گناہ اُن گناہوں میں سے تھا جن سے  
آدمی کا ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ اگر گناہ کی نوعیت یہ نہ ہوتی تو صرف رویے کی اصلاح کافی تھی۔  
۱۵۷ اصل الفاظ ہیں: 'سَكَتَ عَنْ مُوسَى الْغَضَبُ'۔ 'سَكَتَ' کے بعد 'عَنْ' ہے۔  
یہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہاں یہ فعل 'زال' یا 'اس' کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہو گیا ہے۔  
مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ خاموش ہوئے اور اُن کا غصہ دور ہو گیا۔  
۱۵۸ اس سے ضمناً بائبل کی اُس روایت کی تردید ہو جاتی ہے کہ تختیاں پھینکنے سے ٹوٹ  
پھوٹ گئی تھیں۔

۱۵۹ یعنی تورات میں منقول ہے۔ اصل میں لفظ 'نُسْخَة' آیا ہے۔ یہ کسی تحریر کی حرف حرف  
نقل کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں یہ اسی معنی میں ہے۔

۱۶۰ یہ دونوں لفظ ساتھ ساتھ آئیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں اس سے ہدایت



بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا ۖ إِنَّ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَن تَشَاءُ  
وَتَهْدِي مَن تَشَاءُ ۖ أَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ  
الْغَافِرِينَ ۝ وَكُتِبَ لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَفِي الْآخِرَةِ  
إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ ۖ قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَن يَشَاءُ ۖ وَرَحْمَتِي

پکڑا تو موسیٰ نے کہا: پروردگار، اگر تو چاہتا تو پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک کر دیتا۔ کیا تو ایک ایسے کام پر ہمیں ہلاک کرے گا جو ہمارے اندر کے احمقوں نے کیا ہے؟ یہ سب تیری آزمائش ہی تھی۔ تو اس سے جس کو چاہے، (اپنے قانون کے مطابق)، گم راہی میں ڈال دے اور جس کو چاہے، ہدایت بخش دے۔<sup>۵۲۳</sup> تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ سو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے۔ (پروردگار)، تو ہمارے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی۔ ہم نے تیری طرف رجوع کر لیا ہے۔ فرمایا:

حاصل ہوگی اور قیامت میں خدا کی رحمت و عنایت جو اُس ہدایت پر عمل کا نتیجہ ہے۔

۵۲۱۔ بنی اسرائیل کا جرم چونکہ اجتماعی نوعیت کا تھا، اس لیے اُن کے ستر آدمی منتخب کیے گئے جو اجتماعی توبہ کے لیے اُن کی نمائندگی بھی کریں اور اس موقع پر اپنے پروردگار سے از سر نو اطاعت کا عہد بھی استوار کر لیں۔

۵۲۲۔ یہ زلزلہ خدا کے جلال کا ظہور تھا تا کہ بنی اسرائیل اس بات کو یاد رکھیں کہ جس خدا کے ساتھ وہ معاملہ کر رہے ہیں، اُس کی قدرت کتنی بے پناہ ہے اور اُنھوں نے اگر دوبارہ اسی طرح کے کسی جرم کا ارتکاب کیا تو اُن کے ساتھ وہ کیا معاملہ کر سکتا ہے۔

۵۲۳۔ یہ ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت الہی کا حوالہ بھی ہے اور نہایت لطیف طریقے سے اس بات کی طرف اشارہ بھی کہ پروردگار، تیری آزمائشوں میں پورا اترنا کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ بندہ صرف ارادہ اور اُس ارادے کو بروئے کار لانے کی سعی کر سکتا ہے۔ اُس کی کامیابی







الاعراف  
۷

وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۖ فَسَاكُنْهَا الَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ  
الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥٢٤﴾ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ  
النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ

میں اپنے عذاب میں تو اُسی کو مبتلا کرتا ہوں، جسے میں (اپنے قانون کے مطابق) مبتلا کرنا  
چاہتا ہوں، مگر میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔ سو (قیامت کے لیے) میں اُس کو اُن  
لوگوں کے حق میں لکھ رکھوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور اُن  
کے حق میں جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے۔ (اُن لوگوں کے حق میں) جو

کا انحصار تمام تر تیری عنایت اور توفیق بخشی پر ہے اور ہم اُسی کی درخواست کر رہے ہیں۔

۵۲۴ یعنی ہر ایک کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا، صرف اُنھی کو کرتا ہوں جنہیں اپنے قانون عدل  
کے مطابق چاہتا ہوں کہ اُن کو مکافات عمل سے دو چار کر دیا جائے۔ مگر جہاں تک رحمت کا تعلق  
ہے، وہ ہر کافر و مومن کے لیے عام ہے اور اس دنیا میں ہر ایک کو پہنچ رہی ہے۔

۵۲۵ موسیٰ علیہ السلام کی دعا پوری قوم کے لیے تھی اور تعیم کے ساتھ مانگی گئی تھی، مگر اللہ تعالیٰ  
نے اُس کے جواب میں اصل ضابطہ بیان فرما دیا ہے کہ اُس کا عذاب کن لوگوں پر آتا ہے اور دنیا  
اور آخرت میں اُس کی رحمت سے کون بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ اس جواب کا آخری فقرہ خاص طور  
پر قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یوں نہیں فرمایا کہ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا، بلکہ اسلوب بدل  
کر فرمایا: وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ۔ اسلوب کی اس تبدیلی سے مبتدا پر خاص طور پر زور  
دینا مقصود ہے کہ خاص کر وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ جو لوگ قرآن کے نظائر  
پر نگاہ رکھتے ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اُس عہد و میثاق کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل سے  
آئندہ آنے والے انبیاء پر ایمان لانے کے لیے لیا گیا تھا۔“ (تذبر قرآن ۳/۳۷۱)



يَا مُرْهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ

(آج) اس نبی امی رسولؐ کی پیروی کریں گے جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ انھیں بھلائی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے، اُن کے لیے پاک

اس کی وضاحت کے لیے ملاحظہ ہوں: سورہ مائدہ (۵) کی آیت ۱۱۲ اور سورہ آل عمران (۳) کی آیات ۸۱-۸۲ جن میں یہ عہد و میثاق تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

۵۲۶ حضرت موسیٰ کی دعا کا جواب پچھلے فقرے پر ختم ہو گیا ہے۔ یہاں سے آگے اب تضمین کے طریقے پر کلام کو مطابق حال کر دیا ہے کہ اس وقت وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ کے مصداق کون لوگ ہوں گے۔

۵۲۷ یہ تینوں لفظ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعارف کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ آپ بنی اسمعیل میں پیدا ہوئے جنھیں اُن کے بھائی بنی اسرائیل امی کہتے تھے اور اُن کے بالمقابل بنی اسمعیل کے لیے یہ گویا ایک امتیازی لقب بن چکا تھا، اس لیے کہ وہ اُس طریقے سے حاملین کتاب و شریعت نہیں تھے، جس طرح بنی اسرائیل تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی اور صرف نبوت ہی نہیں، اُس کے ساتھ رسالت کے منصب پر بھی سرفراز فرمایا تھا۔ چنانچہ خدا کی زمین پر آخری دینونت آپ ہی کے ذریعے سے برپا کی گئی جو اب پوری انسانیت کے لیے خدا کی سب سے بڑی حجت ہے۔

۵۲۸ تورات میں یہ ذکر اس طرح آیا ہے:

”خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے، یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اُس کی سننا... اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا، وہی وہ اُن سے کہے گا اور جو کوئی میری اُن باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے تو میں اُن کا حساب اُس سے لوں



گا۔“ (استثنا ۱۸: ۱۵-۱۹)

استاذ امام لکھتے ہیں:

”اس سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پر خود حضرت موسیٰ ہی نے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ آنے والا نبی بنی اسمعیل، یعنی امیوں میں پیدا ہوگا، اس لیے کہ اس سیاق میں تیرے بھائیوں میں سے یا انہی کے بھائیوں میں سے کا مطلب اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بنی اسمعیل میں سے ہوگا۔ یہ حضرت موسیٰ کی زبان مبارک سے گویا اُسی بشارت کا اعادہ تھا جو سیدنا ابراہیمؑ نے حضرت اسمعیلؑ کی نسل سے ایک رسول کی بعثت کی دی تھی۔“

(تدبر قرآن ۳/ ۳۷۴)

اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے:

”اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ وہ صرف نبی نہیں ہوگا، بلکہ رسول بھی ہوگا، اس لیے کہ میری مانند اور تیری مانند سے مراد حضرت موسیٰ کے مانند ہے اور حضرت موسیٰ فرعون اور اُس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے، جن کے ذریعے سے بنی اسرائیل کو نجات حاصل ہوئی اور فرعون اور اُس کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے تباہ کر دیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح اپنی قوم قریش اور اہل عرب کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۳۷۴)

تورات میں دوسری جگہ فرمایا ہے:

”خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اُس کے داہنے ہاتھ ایک آتش شریعت اُن کے لیے تھی۔“

(استثنا ۳: ۳۳)

استاذ امام لکھتے ہیں:

”آتش شریعت سے میرے نزدیک اُسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو سیدنا مسیحؑ نے ظاہر فرمائی ہے کہ اُس کے ہاتھ میں اُس کا چھاج ہوگا، وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا، دانے کو بھس سے الگ کرے گا، پھر دانے کو محفوظ کرے گا اور بھس کو جلا دے گا۔ یہ ٹھیک ٹھیک رسول کی وہ خصوصیت بیان ہوئی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ وہ اپنی قوم



الاعراف



کے لیے عدالت بن کر آتا ہے اور حق و باطل کے درمیان اُس کے ذریعے سے فیصلہ ہو جاتا ہے۔“ (تذبر قرآن ۳/۳۷۴)

انجیل میں یہ بشارت آپ کے اسم گرامی کی صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ سیدنا مسیح فرماتے ہیں:

”اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے، یعنی سچائی کا روح۔“ (یوحنا ۱۴:۱۶-۱۷)

”لیکن مددگار، یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے، وہ سب تمہیں یاد دلانے گا۔“ (یوحنا ۱۴:۲۶)

”اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا، کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اُس کا کچھ نہیں۔“ (یوحنا ۱۴:۳۰)

”لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کا روح جو باپ سے صادر ہوتا ہے، تو وہ میری گواہی دے گا۔“ (یوحنا ۱۵:۲۶)

”لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔“ (یوحنا ۱۶:۷)

”مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں، مگر اب تم اُن کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ، یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا، اِس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا، لیکن جو کچھ سنے گا، وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔“ (یوحنا ۱۶:۱۲-۱۳)

”...کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا؟ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اِس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اُس قوم کو جو اُس کے پھل لائے، دے دی جائے گی۔ اور جو اُس پتھر پر گرے گا، ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، لیکن جس پر وہ گرے گا، اُسے پس ڈالے گا۔“ (متی ۲۱:۴۲-۴۴)

ان ارشادات میں لفظ مددگار، ظاہر ہے کہ آرامی یا سریانی کے کسی لفظ کا ترجمہ ہے۔ قرآن





وَيَحْرِمُ عَلَيْهِمُ الْخَبِيثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي  
كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۖ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا

چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام ٹھہراتا ہے اور اُن کے اوپر سے اُن کے وہ بوجھ اتارتا  
اور بندشیں دور کرتا ہے جو اب تک اُن پر رہی ہیں۔ لہذا جو اُس پر ایمان لائے،

نے بتایا ہے کہ یہ اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام احمد کے ہم معنی کوئی لفظ تھا جسے انجیل  
کے مترجمین نے کچھ سے کچھ بنا دیا ہے اور پیش و عقب میں ایسے بے جوڑ فقرے اور الفاظ داخل کر  
دیے ہیں کہ اس کا مطلب خبط ہو کر رہ جائے۔

استاذ امام لکھتے ہیں:

”ان پیشین گوئیوں پر غور کیجیے۔ حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل میں آخری نبی ہیں۔ اُن کے بعد  
کوئی نبی بنی اسرائیل میں نہیں آیا۔ پھر ان پیشین گوئیوں کا مصداق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ آخر وہ پتھر کون ہو سکتا ہے جس کو معماروں نے تو رد کر دیا تھا، لیکن  
بالآخر وہی کونے کے سرے کا پتھر بن گیا؟ یہ کس کی شان ہے کہ جو اُس پر گرے گا، اُس کے  
ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور جس پر وہ گرے گا، اُس کو پیس ڈالے گا؟ یہ کس کا مرتبہ بیان ہوا  
ہے کہ وہ دنیا کا سردار ہے جو ابد تک لوگوں کے ساتھ رہے گا اور وہ باتیں بتائے گا جو حضرت مسیح  
بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ضد اور مکابرت کی بات اور ہے، لیکن جو شخص بھی ان پیشین گوئیوں  
پر انصاف اور غیر جانب داری کے ساتھ غور کرے گا، وہ پکاراٹھے گا کہ یہ اگر کسی پر راست آسکتی  
ہیں تو صرف نبی امی اور رسول خاتم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی راست آسکتی ہیں۔ نبی امی کے سوا اور  
کون ان کا مصداق ہو سکتا ہے؟“ (تدبر قرآن ۳/۵۷۳)

۵۲۹ یعنی جو پاک چیزیں انھوں نے حرام کر رکھی ہیں، انھیں حلال قرار دیتا ہے اور جو  
ناپاک چیزیں یہ حلال کیے بیٹھے ہیں، انھیں حرام قرار دیتا ہے۔

۵۳۰ اشارہ ہے اُن خود ساختہ پابندیوں کی طرف جو یہود کے فقیہوں نے اپنی فقہی موشگافیوں





النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ ۖ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٥٤﴾  
 قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ  
 مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۖ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ  
 وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ

جنھوں نے اُس کی عزت کی اور اُس کی نصرت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُس  
 روشنی کی پیروی اختیار کر لی جو اُس کے ساتھ اتاری گئی ہے، وہی فلاح پانے والے

ہیں۔ ۱۵۴-۱۵۷

کہہ دو،<sup>۵۳۱</sup> (اے پیغمبر کہ) لوگو، میں تم سب کی طرف اُس خدا کا رسول ہو کر آیا ہوں  
 جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۔ اُس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔ وہی زندگی  
 دیتا اور وہی مارتا ہے۔<sup>۵۳۳</sup> سو اللہ اور اُس کے نبی امی رسول پر ایمان لاؤ جو خود بھی اللہ اور

سے اور اُن کے صوفیا اور رہبان نے اپنے تورع کے مبالغوں سے اپنے اوپر لا در کھی تھیں، نیز اُن  
 پابندیوں کی طرف جو اُن کی سرکشی کے باعث اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اُن پر عائد کر دی گئی تھیں۔  
 ۵۳۱ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر تک بات پہنچ گئی تو یہاں سے آگے آپ کی دعوت بھی آپ  
 ہی کی زبان مبارک سے لوگوں، بالخصوص بنی اسرائیل کے سامنے پیش کر دی گئی ہے۔

۵۳۲ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل اس بہانے سے گریز و فرار کے راستے تلاش نہ  
 کریں کہ آپ اُن کے لیے نہیں، بلکہ صرف بنی اسمعیل کے لیے خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے  
 مبعوث ہوئے ہیں اور وہی آپ کو ماننے کے مکلف ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ آپ کی بعثت  
 سب کی طرف ہے، خواہ وہ بنی اسمعیل ہوں یا بنی اسرائیل اور خواہ عربی ہوں یا عجمی، سب اس کے  
 پابند ہیں کہ آپ پر ایمان لائیں، اگر آپ کی دعوت اُن تک پہنچ جائے۔



تَهْتَدُونَ ﴿١٥٨﴾

وَمِنْ قَوْمِ مُوسَى أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ﴿١٥٩﴾  
وَقَطَّعْنَهُمْ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ أَسْبَاطًا أُمَمًا ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ



الاعراف

اُس کے ارشادت پر ایمان رکھتا ہے اور اُس کی پیروی کرو تا کہ تم راہ یاب ہو جاؤ۔ ۱۵۸  
(بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ اسے ضرور مانیں گے)۔

موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہمیشہ رہا ہے جو حق کے مطابق رہنمائی کرتے اور اُسی کے مطابق انصاف کرتے ہیں۔ ۱۵۹ (تاہم زیادہ وہی ہیں جو نافرمان رہے)۔ ۱۶۰ ہم نے انھیں بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے الگ الگ گروہ بنا دیا تھا۔ ۱۶۱ جب

۱۶۲ مطلب یہ ہے کہ متنبہ ہو جاؤ، تمہارا معاملہ کسی عام انسان سے نہیں ہے، اُس خدا کے رسول سے ہے جو پوری کائنات کا بادشاہ، تنہا معبود اور تمہاری زندگی اور موت کا مالک ہے۔ اُس کی دعوت سے اعراض کرو گے تو اس کے نتائج معمولی نہیں ہوں گے۔

۱۶۳ یعنی جس بات کی دعوت دے رہا ہے، سب سے پہلے خود اُس پر ایمان لایا ہے، لہذا سنجیدگی سے سنو۔ نہ اُس کے لیے ممکن ہے کہ اُس کی تبلیغ میں کوئی مددہنت کرے اور نہ تم اُس کی مخالفت کر کے خدا کے مواخذے سے بچ سکتے ہو۔ یہ وہی چیز ہے جس کا تعارف موسیٰ علیہ السلام نے تمہیں پہلے ہی کر دیا تھا کہ جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا، وہی وہ لوگوں سے کہے گا۔

۱۶۴ اصل الفاظ ہیں: 'أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ'۔ لفظ 'أُمَّةٌ' کی تفسیر قلت کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور 'يَهْدُونَ' اور 'يَعْدِلُونَ' میں ایک فعل ناقص محذوف ہے، اس لیے کہ قرینہ اُس پر دلالت کر رہا ہے۔ یہ اُن کے علما اور قضاة کی طرف اشارہ ہے جن میں صالحین کا ایک قلیل گروہ ہمیشہ رہا ہے۔ ان آیات کے زمانہ نزول میں بھی اس طرح کے لوگ موجود تھے جنہوں نے کھلے ذہن کے ساتھ اسلام کو دیکھا اور اُس کی صداقت کا اعلان کر دیا۔



إِذِ اسْتَسْقَاهُ قَوْمُهُ أَنْ يَضْرِبَ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَشْرَبَهُمْ<sup>ط</sup> وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَى<sup>ط</sup> كُلُّوْا مِنْ طَيِّبَاتِ

اُس کی قوم نے اُس سے پانی مانگا تو ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنی لاٹھی اس پتھر پر مارو۔ اُس نے ماری تو اُس سے بارہ چشمے بہ نکلے، اس طرح کہ ہر گروہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ متعین کر لی۔ (صرف یہی نہیں)، ہم نے اُن پر بدلیوں کا سایہ کیا اور اُن پر من و سلوی اتارے۔<sup>۵۳۸</sup> کھاؤ یہ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمہیں دی ہیں۔<sup>۵۳۹</sup>

۵۳۶ اَلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ کے الفاظ سے جو تضمین شروع ہوئی تھی، وہ پچھلی آیت پر ختم ہو گئی۔ یہاں سے آگے سلسلہ کلام پھر اُسی سرگذشت سے جڑ گیا ہے جو بیان ہو رہی تھی۔  
۵۳۷ اصل میں لَفْظُ قَطَّعْنَهُمْ آیا ہے۔ یہ یہاں اچھے معنی میں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں: ”... یعنی ایک ہی باپ کی اولاد بارہ خاندانوں کی شکل میں پھلی پھولی، اور ہم نے ہر خاندان کو امتوں اور قوموں کی شکل میں بڑھایا اور پھیلایا اور اسی اعتبار سے اُن کو اپنی نعمتوں اور رحمتوں سے بھی نوازا، لیکن اُنھوں نے ہر نعمت کی نافرمانی کی۔“  
(تذبرقرآن ۳/۳۷۷)

۵۳۸ من و سلوی کیا تھے؟ اس کی وضاحت ہم سورہ بقرہ (۲) کی آیت ۵۷ کے تحت کر چکے ہیں۔ پینے کے لیے پانی، کھانے کے لیے من و سلوی اور دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے بدلیوں کے سایے کا یہ اہتمام کتنا بڑا معجزہ اور کتنا عظیم احسان تھا، اس کا اندازہ کوئی شخص اگر کرنا چاہے تو اُسے جزیرہ نماے سینا کے اُس بیابان کو جا کر دیکھنا چاہیے، جہاں لاکھوں کی تعداد میں بنی اسرائیل آ کر ٹھہرے تھے، خاص کر جب کہ مصر کی طرف سے اُن کی رسد کا سلسلہ بھی منقطع تھا اور جزیرہ نما کے شمال اور مشرق میں عمالقہ کے قبیلے بھی آمادہ مزاحمت تھے۔





الاعراف  
۷

مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١٦٠﴾  
وَإِذْ قِيلَ لَهُمْ اسْكُنُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ  
شِئْتُمْ وَقُولُوا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ

(افسوس کہ جن پر یہ عنایت ہوئی، اُنھوں نے اس کی ناقدری کی) اور (اس طرح)  
ہمارا کچھ نہیں بگاڑا، بلکہ اپنے اوپر ہی ظلم کرتے رہے۔ ۱۵۹-۱۶۰

اور اُنھیں وہ واقعہ یاد دلاؤ، جب اُن سے کہا گیا کہ اس بستی<sup>۵۳۰</sup> میں جا کر بس جاؤ  
اور اس میں جہاں سے چاہو، کھاؤ اور دعا کرو کہ پروردگار، ہمارے گناہ بخش دے<sup>۵۳۱</sup> اور  
بستی کے دروازے<sup>۵۳۲</sup> میں (عجز کے ساتھ) سر جھکائے ہوئے داخل ہو، ہم تمھاری

۵۳۹ مطلب یہ ہے کہ یہ نعمتیں گویا زبان حال سے دعوت دیتی تھیں کہ اپنے پروردگار کی اس  
عنایت سے فائدہ اٹھاؤ اور اُس کے شکر گزار بن کر رہو۔

۵۴۰ اصل میں لفظ 'الْقَرْيَةَ' آیا ہے۔ اس کے استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جس طرح  
چھوٹے دیہات کے لیے مستعمل ہے، اُسی طرح بڑے بڑے شہروں کے لیے بھی استعمال ہوتا  
ہے۔ یہاں اس سے مراد فلسطین ہی کا کوئی شہر ہے، اس لیے کہ سورہ بقرہ (۲) کی آیت ۵۸ میں  
'فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا' کے جو الفاظ اس کے لیے آئے ہیں، وہ اسی سرزمین کے  
لیے موزوں ہو سکتے ہیں۔

۵۴۱ اصل الفاظ ہیں: 'قُولُوا حِطَّةٌ'۔ ان میں 'حِطَّةٌ' ایک جملے کا قائم مقام ہے، یعنی  
'مَسْئَلَتْنَا حِطَّةٌ'۔ 'حِطَّةٌ' 'حَطَّ يَحِطُّ' سے ہے جس کے معنی جھاڑ دینے کے ہیں۔ یہاں  
اس سے مراد گناہوں کا جھاڑ دینا ہے۔ عربی اور عبرانی چونکہ قریب الماخذ زبانیں ہیں، اس وجہ  
سے گمان ہوتا ہے کہ عبرانی میں بھی یہ جھاڑ دینے اور بخش دینے کے مفہوم میں مستعمل رہا ہے۔

۵۴۲ اصل الفاظ ہیں: 'وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا'۔ 'الْقَرْيَةَ' کے بعد 'الْبَاب' کا لفظ



سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٦١﴾ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ  
الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ  
بِمَا كَانُوا يَظْلِمُونَ ﴿١٦٢﴾

خطائیں معاف کر دیں گے اور (تم میں سے) جو لوگ اچھا رویہ اختیار کریں گے، اُن پر آگے ہم اور بھی عنایت فرمائیں گے۔ پھر جو بات اُن سے کہی گئی تھی، اُن کے ظالموں نے اُسے ایک دوسری بات سے بدل دیا۔<sup>۵۴۳</sup> چنانچہ ہم نے اُن پر آسمان سے عذاب اتارا، اس لیے کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرتے رہے تھے۔<sup>۵۴۵</sup> ۱۶۱-۱۶۲

جس طرح یہاں آیا ہے، اس سے عربیت کی رو سے بستی کا دروازہ ہی مراد ہو سکتا ہے، اسے خیمہ عبادت کا دروازہ کے معنی میں لینے کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔

۵۴۳ اس مفہوم کے لیے اصل میں 'سُجِّدًا' کا لفظ آیا ہے۔ صاف واضح ہے کہ اس سے مراد یہاں سر جھکانا ہے۔ قرآن کی یہ آیت دلیل ہے کہ 'سجد' عربی زبان میں جس طرح زمین پر پیشانی رکھ دینے کے معنی میں آتا ہے، اُسی طرح محض سر جھکا دینے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

۵۴۴ یعنی بنی اسرائیل کے کچھ بد بختوں نے 'حِطَّةٌ' کے لفظ کو جو استغفار اور توبہ کا کلمہ تھا، اس سے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے کسی لفظ سے بدل دیا۔ 'بَدَّلَ' کا جو لفظ اصل میں استعمال ہوا ہے، یہ جب اپنے دو مفعولوں کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کو رکھ دینے کے ہوتے ہیں۔ لفظ کی یہ نوعیت پیش نظر رہے تو اسے محض رویے کی تبدیلی کے معنوں میں نہیں لیا جاسکتا۔ اس کے صاف معنی یہی ہیں کہ اُنھوں نے اس لفظ کو کسی دوسرے لفظ سے تبدیل کر دیا۔

۵۴۵ اس عذاب کے لیے آسمان سے عذاب کی یہ تعبیر اُسی طرح اختیار کی گئی ہے، جس طرح کسی ہول ناک آفت کو قہر آسمانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل پر یہ عذاب غالباً ارض فلسطین کے قریب ایک شہر شطیم میں آیا۔ بائبل کا بیان ہے کہ اس شہر میں اُنھوں نے موآبی





وَسَأَلَهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ  
فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا

اور اُن سے اُس بستی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے تھی، جب وہ سبت کے  
معاملے میں (خدا کے حدود سے) تجاوز کرتے تھے۔ جب اُن کی مچھلیاں اُن کے سبت

عورتوں سے بدکاریاں کیں، اُن کی دعوت پر مشرکانہ قربانیوں میں شریک ہوئے اور اس طرح گویا  
بالواسطہ اُن کے دیوتا بعل فغور کی پرستش میں اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان جرائم کی پاداش میں  
اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایک سخت وبا بھیجی جس میں اُن کے چوبیس ہزار مردوزن ہلاک ہوئے۔

۵۴۶ یہ اسلوب یہاں زجروتوئیخ کو ظاہر کر رہا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی ان تمام کرتوتوں کے باوجود جو بیان ہوئیں، اپنی پاکی و برتری  
کے زعم سے باز نہیں آتے اور اپنے آپ کو خدا کا چہیتا اور لاڈلا بنائے بیٹھے ہیں تو ذرا ان سے  
اُس قریے کا ماجرا پوچھو جس نے سبت کی بے حرمتی کی اور اُس کی سزا میں خدا نے اُس کو نمونہ عبرت  
بنادیا۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۷۸)

۵۴۷ یہ مقام غالباً ایلہ یا ایلات یا ایلوت تھا۔ اسرائیل کی یہودی ریاست نے یہاں اسی نام  
کی ایک بندرگاہ بنائی ہے۔ اردن کی مشہور بندرگاہ عقبہ اُس کے قریب ہی واقع ہے۔ حضرت  
سلیمان کے عہد میں بحر قلزم کے لیے اُن کے جنگی اور تجارتی بیڑے کا صدر مقام یہی بستی تھی۔ اس  
کا محل وقوع بحر قلزم کی اُس شاخ کے انتہائی سرے پر ہے، جو جزیرہ نماے سینا کے مشرقی اور عرب  
کے مغربی ساحل کے درمیان ایک لمبی خلیج کی صورت میں نظر آتی ہے۔

۵۴۸ سبت چھٹی کے دن کو کہتے ہیں۔ یہ اصلاً جمعہ کا دن تھا جسے بنی اسرائیل نے اُس کے  
اگلے دن سے بدل ڈالا۔ اُن کے ہاں یہ دن پشت در پشت تک دائمی عہد کے نشان کے طور پر خدا  
کی عبادت کے لیے خاص تھا اور اس میں اُن کے لیے کام کاج، سیر و شکار، حتیٰ کہ گھروں میں  
آگ جلانا اور لونڈی غلاموں سے کوئی خدمت لینا بھی ممنوع قرار دیا گیا تھا۔



الاعراف



يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَلِكَ نَبْلُوهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿١٦٣﴾  
وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا لَا اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ

کے دن منہ اٹھائے ہوئے اُن کے سامنے پانی کے اوپر آ جاتی تھیں اور جب سبت کا دن نہ ہوتا تو نہیں آتی تھیں۔ ہم اس طرح انہیں آزماتے تھے، اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ اور انہیں یاد دلاؤ، جب اُن میں سے ایک گروہ نے (نصیحت کرنے

۵۴۹ آیت میں مچھلیوں کے منہ اٹھائے ہوئے پانی کے اوپر آ جانے کا ذکر جن الفاظ میں ہوا

ہے، وہ یہ ہیں: اِذْ تَأْتِيهِمْ حَيَاتَانَهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَعًا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...شُرْع‘، شَارِعَة‘ کی جمع ہے۔ جب یہ لفظ نیزوں کے لیے بولا جاتا ہے تو اس سے

مراد سیدھے اٹھائے ہوئے نیزے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ لفظ مچھلیوں کے لیے آیا ہے تو اس

سے منہ اٹھائے ہوئے مچھلیاں مراد ہیں۔ پلی ہوئی مچھلیوں کے تالاب کے کنارے اُن کے

ابھرنے کے اوقات میں کھڑے ہو جائیے تو یہ دل کش منظر نظر آئے گا کہ مچھلیاں اپنے سر سطح پر

اس طرح ابھارے ہوئے نظر آئیں گی گویا وہ اپنے نیزے سیدھے کیے ہوئے ہیں۔ سمندروں

کے کنارے جو شکار گاہیں ہوتی ہیں، اُن میں یہ منظر اور بھی دل فریب اور طمع انگیز ہوتا ہوگا۔ یہود

کی شریعت میں سبت، یعنی ہفتے کے دن کام کاج اور سیر و شکار وغیرہ کی ممانعت تھی، لیکن وہ صبر نہ

کر سکے۔ انہوں نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار کے لیے مختلف قسم کے حیلے ایجاد کر لیے۔

سنت الہی یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی نافرمانی میں اصرار کے حد تک بڑھ جاتی ہے اور اچھوں

کے سمجھانے سے بھی باز نہیں آتی تو اُس معاملے میں اُس کی آزمائش سخت سے سخت تر ہو جاتی

ہے تاکہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہی صورت حال بنی اسرائیل کے

لیے پیدا کر دی۔ عام دنوں میں تو یہ مچھلیاں نظر نہ آتیں یا بہت ہی کم نظر آتیں، لیکن سبت کے

دن معلوم ہوتا کہ اُن کے ہاں بارات اتری ہوئی ہے۔ یہ چیز اُن کی حرص کو اور بھڑکا دیتی۔ مشہور

ہے کہ آدمی جس چیز سے روک دیا جائے، اُس کی خواہش اور زیادہ بڑھ جاتی ہے... بنی اسرائیل







الاعراف

مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا مَعذِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٦٣﴾  
فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا  
الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَیِّنٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿١٦٤﴾ فَلَمَّا عَتَوْا

والوں سے) کہا: تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا سخت سزا دینے والا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: تمہارے پروردگار کے حضور اپنا عذر پیش کرنے کے لیے اور اس لیے کہ یہ (خدا کے غضب سے) بچ جائیں۔ پھر جب انہوں نے وہ سب کچھ بھلا دیا جس سے انہیں یاد دہانی کی گئی تھی تو ہم نے انہیں نجات دی جو برائی سے روک رہے تھے اور جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا، انہیں ایک سخت عذاب میں پکڑ لیا، اس لیے کہ وہ نافرمان ہو چکے تھے۔ چنانچہ جس

اپنی شامت اعمال سے اس دہرے فتنے میں مبتلا ہو گئے اور پھر اس حد تک خراب ہوئے کہ نیکوں کی تلقین و موعظت تو درکنار، خدا کے عذاب سے بھی اُن کو تنبیہ نہیں ہوئی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے اُن پر لعنت کر دی۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۷۸)

۵۵۰۔ اس سے مزید وضاحت ہو گئی کہ اُس بستی کے لوگوں نے خدا کے حکم سے سرکشی کی یہ راہ نصیحت کرنے والوں کی تلقین و نصیحت کے علی الرغم اختیار کیے رکھی۔

۵۵۱۔ دعوت و تبلیغ کا اصلی مقصد یہی ہے اور اس کام کے لیے اٹھنے والوں کے لیے ذمہ داری کی آخری حد بھی یہی ہے کہ وہ زندگی کے آخری لمحے تک برابر اس کام میں لگے رہیں اور اپنی دعوت کبھی منقطع نہ کریں۔ ختم نبوت کے بعد اب اُن کی دعوت میں کوئی ایسا مرحلہ کبھی نہیں آ سکتا، جب وہ فرض کر لیں کہ اُن کا کام پورا ہو گیا، اس لیے نہ ماننے والوں کو عذاب الہی کے لیے چھوڑ کر اب وہ اُن سے الگ ہو سکتے ہیں۔

۵۵۲۔ یہ سزا اُس قانون کے مطابق دی گئی جو بنی اسرائیل کے منصب شہادت کے لیے



عَنْ مَا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿١٦٦﴾  
وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لِيُبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ مَنْ يَسُومُهُمْ  
سُوءَ الْعَذَابِ ۖ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٦٧﴾

چیز سے روکے گئے تھے، جب سرکشی کے ساتھ وہی کیے چلے گئے تو ہم نے اُن سے کہہ  
دیا کہ جاؤ ذلیل بندر بن جاؤ۔ ۵۵۳-۱۶۳-۱۶۶

اور وہ بات بھی یاد دلاؤ، جب تمہارے پروردگار نے (اپنے اس) فیصلے سے  
اُنہیں آگاہ کیا کہ روز قیامت تک وہ ضرور ایسے لوگوں کو اُن پر مسلط کرتا رہے گا جو  
اُنہیں نہایت برے عذاب دیں گے۔ ۵۵۴ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا پروردگار بہت جلد سزا

انتخاب کے بعد خاص اُن کے لیے مقرر کر دیا گیا تھا۔ دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ اس کا کوئی  
تعلق نہیں ہے۔

۵۵۳ یہ لعنت کا جملہ ہے۔ سورہ بقرہ (۲) کی آیت ۶۶ میں اس کا جو نتیجہ بیان ہوا ہے، اُس  
سے واضح ہے کہ وہ بندروں سے جس طرح مشابہ ہوئے، اُس کی نوعیت ایسی محسوس تھی کہ گرد و پیش  
کی بستیوں کے لوگ اُسے دیکھ کر عبرت حاصل کر سکتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خواہش نفس کی پیروی  
میں جب وہ بندروں کی طرح کسی حد کے پابند نہیں رہے تو پہلے اُن کی سیرت مسخ ہوئی اور اس کے  
بعد ایک ظاہری فرق جو تھوڑا سا رہ گیا تھا، وہ بھی بالآخر مٹ گیا۔ یہاں تک کہ اس لعنت نے اُن  
کے ظاہر و باطن، ہر چیز کا احاطہ کر لیا۔

۵۵۴ بنی اسرائیل کو اس فیصلے سے ابتداء ہی میں آگاہ کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ بائبل کے صحیفوں  
— احبار اور استثنا — میں کئی جگہ اس کا ذکر ہوا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اس کے بعد بھی اُنہیں  
اس کی یاد دہانی کرتے رہے۔ یسعیاہ، یرمیا اور دوسرے تمام نبیوں کے صحائف اسی تنبیہ پر مشتمل  
ہیں۔ آخر میں سیدنا مسیح علیہ السلام نے یروشلم کی گلیوں میں اس کی منادی کی۔ یہ فیصلہ کس طریقے







الاعراف

وَقَطَّعْنَاهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَمًا مِّنْهُمْ الصَّالِحُونَ وَمِنْهُمْ دُونَ ذَلِكَ  
وَبَلَّوْنَهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿١٦٨﴾ فَخَلَفَ  
مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَذَا الْأَدْنَى  
وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَإِنْ يَأْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلَهُ يَأْخُذُوهُ أَلَمْ  
يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِيثَاقُ الْكِتَابِ أَنْ لَا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ

دینے والا بھی ہے اور یقیناً بخشے والا اور نہایت مہربان بھی ہے۔ <sup>۵۵۵</sup>ہم نے زمین میں اُن کی جمعیت مختلف گروہوں کی صورت میں پراگندہ کر دی۔ اُن میں کچھ نیک بھی ہیں اور کچھ اِس سے مختلف بھی۔ <sup>۵۵۶</sup>ہم نے اُنھیں اچھے اور برے حالات سے آزمایا تا کہ وہ پلٹیں۔ پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف لوگ کتاب الہی کے وارث ہوئے جو (اُس کی آیتوں کے عوض) اِس دنیاے دوں کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں سب معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہی متاع حقیر پھر مل جائے تو اُسے بھی لے لیں گے۔ کیا اُن سے اسی کتاب کے بارے میں عہد نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ پر حق کے سوا کوئی بات

سے نافذ ہوا؟ دنیا کی تاریخ اِس کی گواہی دیتی ہے۔ اِس وقت بھی ارض مقدس میں یہ اسی مقصد سے جمع کیے جا رہے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ آشیاں بندی بھی ایک نئے طوفان کی دعوت ہے جس کے بعد ان کی پوری مجتمہ قوت

ان شاء اللہ یک قلم ختم ہو جائے گی۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۸۱)

<sup>۵۵۵</sup> یعنی اتمام حجت ہو جائے تو سزا دینے میں دیر نہیں کرتا اور لوگ رجوع کر لیں تو فوراً

معاف بھی کر دیتا ہے، اِس لیے کہ صرف سریع العقاب ہی نہیں، اِس کے ساتھ غفور و رحیم بھی ہے۔

<sup>۵۵۶</sup> مطلب یہ ہے کہ انفرادی حیثیت سے تو نیک و بد، ہر طرح کے لوگ ان کے اندر موجود



وَدَرَسُوا مَا فِيهِ ط وَالَّذِينَ خَرُّوا خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ ط  
 أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝۱۶۹ وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ط  
 إِنَّا لَا نَضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ ۝۱۷۰ وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ  
 كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ ج خُذُوا مَا آتَيْنَكُم بِقُوَّةٍ

نہ لگائیں؟ اور جو کچھ اس کتاب میں (لکھا) ہے، اُنھوں نے اُسے اچھی طرح پڑھا بھی  
 ۵۵۷ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا سے ڈرنے والوں کے لیے آخرت کا گھر ہی بہتر ہے، پھر کیا  
 تم سمجھتے نہیں ہو؟ ہاں، جو کتاب الہی کو مضبوطی سے تھامتے اور نماز کا اہتمام رکھتے ہیں،  
 وہی اصلاح کرنے والے ہیں ۵۵۸ اور اصلاح کرنے والوں کا اجر ہم ضائع نہیں کریں گے۔  
 (اُنھیں یاد بھی ہے)، جب ہم نے پہاڑ کو اٹھا کر اُن کے اوپر معلق کر دیا تھا گویا وہ  
 سائبان ہے اور وہ گمان کر رہے تھے کہ وہ اُن پر گرا ہی چاہتا ہے۔ ۵۵۹ (فرمایا): یہ جو کچھ ہم

ہیں، مگر اجتماعی حیثیت سے یہ اُن تمام اوصاف سے محروم ہو چکے ہیں جو انھیں دنیا کی قوموں میں  
 سر بلند رکھ سکتے تھے۔

۵۵۷ اصل میں لفظ دَرَسُوا آیا ہے۔ یہ اصلاً گھسنے کے معنی میں آتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:  
 ”... یہاں یہ لفظ یہود کے لیے بطور تعریض استعمال ہوا ہے کہ کتاب کو تو پڑھتے پڑھتے اُنھوں  
 نے گھس ڈالا، لیکن حال وہی رہا کہ ساری زلیخا پڑھ جانے کے بعد بھی یہ پتا نہ چل سکا کہ  
 زلیخا زن بود کہ مرد!“ (تدبر قرآن ۳/۳۸۲)

۵۵۸ آیت میں یہ فقرہ ایجاز کے قاعدے سے محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اسے کھول  
 دیا ہے۔

۵۵۹ یہ خدا کی قدرت اور اُس کے جلال کا ایک مظاہرہ تھا جو اس لیے کیا گیا کہ بنی اسرائیل  
 ہمیشہ اس بات کو یاد رکھیں کہ جس خدا کے ساتھ وہ یہ عہد باندھ رہے ہیں، اُس کی قدرت کتنی بے پناہ





وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٤١﴾  
وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ

نے تمہیں دیا ہے، اسے مضبوطی سے پکڑو اور جو کچھ اس میں (لکھا) ہے، اُسے یاد رکھو تاکہ (خدا کے غضب سے) بچے رہو۔ ۵۶۲-۱۶۷-۱۷۱

(اے پیغمبر)، انہیں وہ وقت بھی یاد دلاؤ، جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم کی

ہے اور انہوں نے اگر اس کی خلاف ورزی کی تو وہ اُن کے ساتھ کیا معاملہ کر سکتا ہے۔ بائبل میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے:

”اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملائے اور وہ پہاڑ سے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اُس پر اترا اور دھواں تنور کے دھوئیں کی طرح اوپر کو اٹھ رہا تھا اور وہ سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا۔“

(خروج ۱۹: ۱۷-۱۸)

۵۶۰ یعنی اسے پوری مضبوطی کے ساتھ لو اور زندگی کے تمام مراحل میں پورے استقلال اور عزیمت کے ساتھ اس کی ہدایات کی پیروی کرو۔

۵۶۱ مطلب یہ ہے کہ اس کا حرف حرف ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھو، خواہ وہ اس کے احکام و ہدایات سے متعلق ہو یا اس کی تنبیہات سے متعلق جو ان احکام و ہدایات سے انحراف کے نتائج کے بارے میں تمہیں سنائی گئی ہیں۔

۵۶۲ اصل الفاظ ہیں: ”لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ“۔ موقع کلام کا تقاضا ہے کہ یہاں انہیں خدا کے غضب سے بچنے کے مفہوم میں لیا جائے۔

۵۶۳ زمین پر خدا کی دینونت کے واقعات سے استدلال کے بعد اب یہ قریش کو اُس عہد فطرت کی یاد دہانی کرائی ہے جس کی بنیاد پر تمام بنی آدم قیامت کے دن مسئول ٹھہرائے جائیں



عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ ۖ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۖ شَهِدْنَا أَنَّا نَقُولُوا  
يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غٰفِلِينَ ﴿٥٦٢﴾ أَوْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ

پشتوں سے اُن کی نسل کو نکالا اور اُنھیں خود اُن کے اوپر گواہ ٹھیرایا تھا۔ (اُس نے پوچھا تھا): کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ اُنھوں نے جواب دیا: ہاں، (آپ ہی ہمارے رب ہیں)، ہم اِس کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ ہم نے اِس لیے کیا کہ قیامت کے دن تم

گے اور خدا کی بارگاہ میں کوئی شخص یہ عذر پیش نہیں کر سکے گا کہ اُسے کسی پیغمبر کی دعوت نہیں پہنچی یا اُس نے شرک اور الحاد کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور خدا کے اقرار اور اُس کی توحید کے تصور تک پہنچنا اُس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ قرآن نے اِس عہد کو جس طریقے سے پیش کیا ہے، اُس سے واضح ہے کہ یہ محض تمثیلی انداز بیان نہیں ہے، بلکہ اُسی طرح کے ایک واقعے کا بیان ہے جس طرح عالم خارجی میں واقعات پیش آیا کرتے ہیں۔ اِس سے یہ حقیقت بالکل مبرہن ہو جاتی ہے کہ خالق کا اقرار مخلوقات کی فطرت ہے۔ وہ اپنے وجود ہی سے تقاضا کرتی ہیں کہ خالق کی محتاج ہیں۔ اُن کے لیے خالق کا اثبات پیش نظر ہو تو کسی منطقی استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی، صرف متنبہ کرنے اور توجہ دلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ انسان بعض اوقات انکار کر دیتا ہے۔ لیکن یہ محض مکابریت ہے، لہذا جس وقت انکار کرتا ہے، عین اُسی وقت اپنے دائرہ علم میں ہر انفعال کے لیے فاعل، ہر ارادے کے لیے مرید، ہر صفت کے لیے موصوف، ہر اثر کے لیے موثر اور ہر نظم کے لیے ایک علیم و حکیم ناظم کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے۔ اُس کا تمام علم اِسی سرگردانی کی سرگذشت ہے۔ یہ عمل کی تکذیب ہے جو اُس کے انکار کی حقیقت بالکل آخری درجے میں واضح کر دیتی ہے۔

۵۶۴ اصل الفاظ ہیں: مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ۔ مِنْ ظُهُورِهِمْ "مِنْ بَنِي آدَمَ" سے بدل واقع ہوا ہے۔ اِس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ یہ واقعہ کسی خاص دور ہی کے بنی آدم سے متعلق نہیں ہے، بلکہ قیامت کے دن تک جتنے بنی آدم بھی پیدا ہونے والے ہیں، اُن سب سے متعلق ہے اور ارواح کے اجسام کے ساتھ اتصال کی ابتدا سے پہلے ہوا ہے۔





الاعراف

أَبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِنْ بَعْدِهِمْ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ  
الْمُبْطِلُونَ ﴿١٤٣﴾ وَكَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿١٤٤﴾

کہیں یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر ہی رہے یا اپنا یہ عذر پیش کرو کہ شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے پہلے سے کر رکھی تھی اور ہم بعد کو اُن کی اولاد ہوئے ہیں، پھر کیا آپ ان غلط کاروں کے عمل کی پاداش میں ہمیں ہلاک کریں گے؟<sup>۵۶۶</sup> ہم اسی طرح اپنی آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں، اس لیے کہ لوگوں پر حجت قائم ہو<sup>۵۶۷</sup> اور اس لیے کہ وہ رجوع کریں۔ ۱۷۲-۱۷۴

۵۶۵ انسان کو اس دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے، اس لیے یہ واقعہ تو اُس کی یادداشت سے محو کر دیا گیا ہے، لیکن اس کی حقیقت اُس کے صفحہ قلب پر نقش اور اُس کے نہاں خانہ دماغ میں پیوست ہے۔ اسے کوئی چیز بھی محو نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ماحول میں کوئی چیز مانع نہ ہو اور انسان کو اُسے یاد دلایا جائے تو وہ اس کی طرف اس طرح لپکتا ہے، جس طرح بچہ ماں کی طرف لپکتا ہے، دراں حالیکہ اُس نے کبھی اپنے آپ کو ماں کے پیٹ سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا، اور اس یقین کے ساتھ لپکتا ہے، جیسے کہ وہ پہلے ہی سے اُس کو جانتا تھا۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کا یہ اقرار اُس کی ایک فطری احتیاج کے تقاضے کا جواب تھا جو اُس کے اندر ہی موجود تھا۔ اُس نے اسے پالیا ہے تو اُس کی نفسیات کے تمام تقاضوں نے بھی اس کے ساتھ ہی اپنی جگہ پالی ہے۔

۵۶۶ یعنی جہاں تک توحید اور بدیہیات فطرت کا تعلق ہے، اُن کے بارے میں مجرد اس اقرار کی بنا پر بنی آدم کا مواخذہ کیا جائے گا۔ اُن سے انحراف کے لیے کسی کا یہ عذر خدا کے ہاں مسموع نہیں ہوگا کہ اُسے کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی یا اُس نے یہ انحراف خارجی اثرات کے نتیجے میں اختیار کیا تھا اور اس کے ذمہ دار اُس کے باپ دادا اور اُس کا ماحول ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ انسان کے باطن کی یہ شہادت ایسی قطعی ہے کہ ہر شخص مجرد اس شہادت کی بنا پر اللہ کے حضور



وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَا الَّذِي أْتَيْنَاهُ أَتَيْنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاتَّبَعَهُ  
الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ ﴿٥٦٨﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ

اور اُس کی سرگذشت بھی انھیں سناؤ<sup>۵۶۸</sup> جسے ہم نے اپنی آیتیں عطا فرمائی تھیں، مگر وہ  
اُن سے نکل بھاگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیطان اُس کے پیچھے لگ گیا، یہاں تک کہ وہ

میں جواب دہ ہے۔

۵۶۷ یعنی مزید حجت جس کے نتیجے میں دنیا میں بھی اُن کا مواخذہ ہوگا اور آخرت کے لحاظ  
سے بھی اُن کی مسئولیت دوچند ہو جائے گی، ورنہ اصلاً تو یہ حجت، جیسا کہ بیان ہوا، اُس علم سے  
قائم ہو جاتی ہے جو انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ آیات الہی کی تفصیل سے اسی علم کی  
یاد دہانی ہوتی ہے۔ قرآن مجید اسی بنا پر اپنے لیے ذِکْر اور ذِکْرٰی اور رسولوں کے لیے مُذْکِر  
کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔

۵۶۸ یہ من حیث القوم یہود کی تمثیل ہے۔ آگے یہ بات قرآن نے خود واضح کر دی ہے۔  
لیکن آیت میں چونکہ لفظ 'الَّذِي' آیا ہے، اس لیے مختلف اشخاص کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ استاذ  
امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”الَّذِي“ اگرچہ اصلاً معرفہ کے لیے آتا ہے، لیکن تمثیلات میں یہ لازم نہیں ہے کہ اس سے  
کوئی معین شخص ہی مراد ہو جو خارج میں بھی موجود ہو، بلکہ متکلم جس کی تمثیل پیش کرنا چاہتا ہے،  
اُس کو نگاہ میں رکھ کر اُس کا ایک ایسا سراپا آراستہ کر دیتا ہے جو اُس پر پوری طرح منطبق ہو جاتا  
ہے۔ چونکہ پیش نظر صرف واقعے کی تصویر کشی ہوتی ہے، اس وجہ سے تقاضاے بلاغت یہ ہوتا  
ہے کہ اُس کو نکرہ کے بجائے معرفہ کے لفظوں میں ذکر کیا جائے تاکہ تمثیل ایک خاص شخص کی  
صورت میں متمثل ہو کر اس طرح سامع کے سامنے آجائے کہ گویا اُس نے اُس کی سرگذشت  
صرف سنی ہی نہیں، بلکہ خود اُس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۹۵)

۵۶۹ یعنی کتاب الہی کی جو تشریف و خلعت انھیں عطا فرمائی گئی تھی، وہ انھوں نے اتار پھینکی





الاعراف

أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ ۖ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۖ إِنْ  
تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثُ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثُ ۚ ذَٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ  
الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿١٤٩﴾  
سَاءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَأَنْفُسُهُمْ كَانُوا

گم راہوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کے ذریعے سے اُسے بلندی  
عطا کرتے، لیکن وہ زمین کا ہو رہا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا۔ چنانچہ اُس کی  
مثال کتے کی سی ہو گئی کہ تم اُس پر پتھراٹھاؤ، جب بھی زبان نکالے رہتا ہے اور  
چھوڑ دو، جب بھی زبان نکالے رہتا ہے۔ یہ اُس قوم کی تمثیل ہے جس نے ہماری  
آیتوں کو جھٹلا دیا۔ سو یہ سرگذشت انھیں سناؤ تاکہ یہ سوچیں۔ کیا ہی بری تمثیل ہے

اور استاذ امام کے الفاظ میں بالکل ننگے الف بن کر رہ گئے۔

۵۷۰۔ یہ اُس سنت الہی کے مطابق ہوا جو سورہ زخرف (۴۳) کی آیت ۳۶ میں بیان ہوئی  
ہے کہ جو خداے رحمن کی یاد دہانی سے منہ پھیرتے ہیں، اُن پر ایک شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے، پھر  
وہ اُسی کے ساتھی بن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔

۵۷۱۔ یعنی اُس قانون کے مطابق چاہتے جو ہم نے اُن لوگوں کے لیے مقرر کر رکھا ہے جنہیں  
ہم اپنی آیتوں سے نوازتے ہیں۔ وہ قانون یہ ہے کہ اگر ان آیتوں کی قدر کریں گے تو ان کے  
ذریعے سے اُنھیں دین و دنیا کی سرفرازی حاصل ہوگی اور ان سے گریز کر کے اپنی خواہشوں کے  
غلام ہو کر رہ جائیں گے تو اُنھی کے حوالے کر دیے جائیں گے۔

۵۷۲۔ یعنی زبان نکالے ہوئے حرص و دنائت کی تصویر بنا رہتا ہے۔ اُسے پیار کیجیے یا  
دھتکارے، اُس کی یہ حالت کسی حال میں اُس سے جدا نہیں ہوتی۔ ہم اپنی زبان میں بھی اُس شخص  
کو جو دنیا کی حرص میں اندھا ہو رہا ہو، اسی رعایت سے دنیا کا کتا کہتے ہیں۔



يُظْلِمُونَ ﴿١٤٤﴾ مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدَىٰ وَمَنْ يُضِلِّ  
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿١٤٥﴾

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ  
لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ

اُس قوم کی جس نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرتی رہی۔

(حقیقت یہ ہے کہ) جن کو اللہ ہدایت بخشے، وہی ہدایت پانے والے ہیں اور جن کو وہ

(اپنے قانون کے مطابق) گم راہ کر دے، وہی نامراد ہوتے ہیں۔ ۱۴۵-۱۴۸

(یہ متنبہ ہو جائیں)، جنوں اور انسانوں میں سے بہتوں کو ہم نے جہنم ہی کے لیے

پیدا کیا ہے۔ اُن کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں ہیں۔ اُن کی آنکھیں ہیں جن سے

۱۴۳ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ تمثیل کسی خاص شخص کی تمثیل نہیں ہے، بلکہ اُس قوم کی

تمثیل ہے جس نے اللہ کی آیتوں سے بہرہ یاب ہونے کے بعد انھیں جھٹلادیا۔ قرآن کے طالب علم

جانتے ہیں کہ اس سے مراد یہود ہی ہو سکتے ہیں۔

۱۴۴ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور قریش کے لیے تہدید و وعید ہے۔ مطلب یہ ہے

کہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں خدا کا ایک قانون ہے۔ اس کے تحت ہدایت اُنھی کو ملتی ہے

جو اُس کے سچے طالب ہوتے ہیں اور جو خواہشوں کی غلامی اختیار کر لیتے ہیں، وہ گم راہی کے لیے

چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ انھیں کبھی راہ ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ اس لیے ہر شخص پر واضح ہونا چاہیے

کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اسی قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔

۱۴۵ یہ سخت غصے اور تہدید کا جملہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جنوں اور انسانوں کی بڑی

تعداد نے سرکشی کا جو رویہ اختیار کیا ہے، اُس کے بعد تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ ہم نے انھیں پیدا ہی

جہنم کے لیے کیا تھا۔ چنانچہ آگے وضاحت کر دی ہے کہ وہ کیوں جہنم کا ایندھن بننے والے







لَا يَسْمَعُونَ بِهَا<sup>ط</sup> أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ<sup>ط</sup> أُولَئِكَ هُمُ  
الْغَافِلُونَ ﴿١٤٩﴾ وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا<sup>ص</sup> وَذَرُوا

وہ دیکھتے نہیں ہیں۔ اُن کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں ہیں۔<sup>۵۷۶</sup> وہ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ اُن سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ وہی ہیں جو بالکل غافل ہیں۔<sup>۵۷۷</sup> (ایمان والو، تم یاد رکھو کہ) اللہ کے لیے صرف اچھے نام ہیں، سو اُس کو اُنھی سے پکارو اور اُن<sup>۵۷۸</sup>

ہیں۔ فرمایا ہے کہ حقائق کو سمجھنے اور اُن کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے جو صلاحیتیں ہم نے اُنھیں دی تھیں، اُن سے اُنھوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کی پیدائش کا مقصد ہی یہ ہو کر رہ گیا ہے کہ پیدا ہوں، زندگی گزاریں اور جہنم رسید ہو جائیں۔

۵۷۶ یہ سمجھنا، دیکھنا اور سننا اپنے حقیقی مفہوم کے لحاظ سے ہے، ورنہ مطلوبات بطن و فرج کے لیے تو وہ ہر چیز کو خوب سمجھتے، دیکھتے اور سنتے ہیں۔

۵۷۷۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...چوپایوں کے مانند اس وجہ سے ہیں کہ جس طرح چوپایوں کی طلب و جستجو بس اپنے پیٹ اور تن کی مطلوبات ہی تک محدود ہوتی ہے، اُسی طرح اُن کی تگ و دو بھی اپنی مادی ضروریات و خواہشات ہی تک محدود ہے۔ اور چوپایوں سے زیادہ بے عقل اس وجہ سے ہیں کہ چوپایے بہر حال اپنی جبلت کی تمام صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس میں وہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے، لیکن انسان کی فطرت کے اندر قدرت نے جو اعلیٰ صلاحیتیں رکھی ہیں، اُن سے نہ صرف یہ کہ وہ حقیقی فائدہ نہیں اٹھاتا، بلکہ بسا اوقات اُس سے ایسی حرکتیں صادر ہوتی ہیں جو ایک بیل یا گدھے سے کبھی صادر نہیں ہوتیں۔ مثلاً انسان انسان ہو کر اتنا بے عقل اور کج فہم بن جاتا ہے کہ درختوں، پتھروں اور جانوروں کی پرستش شروع کر دیتا ہے، لیکن ایک گدھ یا بیل ایسی بے عقلی کبھی نہیں کر سکتا۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو اصلی اور حقیقی بے خبر ہیں، اس لیے کہ یہ بے خبری چوپایوں میں بھی نہیں ہے۔“ (تذکر قرآن ۳/۳۹۸)



الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ<sup>ط</sup> سَيَجْزُونَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٨٠﴾  
 وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةً يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ﴿١٨١﴾  
 وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا  
 يَعْلَمُونَ ﴿١٨٢﴾ وَأُمْلِي لَهُمْ<sup>قف</sup> إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴿١٨٣﴾

لوگوں کو چھوڑ دو جو اُس کے ناموں میں کج روی اختیار کر رہے ہیں۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اُس کا بدلہ عنقریب پالیں گے۔ (یاد رکھو کہ سب یکساں نہیں ہیں)، ہمارے پیدا کیے ہوئے لوگوں میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور اُسی کے مطابق فیصلے کرتا رہا ہے۔ اس کے برخلاف جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلادیا ہے، اُن کو ہم وہاں سے داؤں پر لے جا رہے ہیں، جہاں سے اُن کو خبر بھی نہ ہوگی۔ (اس وقت) میں اُن کو ڈھیل دے رہا ہوں، اس لیے کہ میری تدبیر بڑی محکم ہے۔ ۱۸۳-۱۷۹-۵۸۰

۵۷۸ یعنی ایسے ناموں سے پکارو جو اُس کی شان یکتائی، اُس کی قدرت، اُس کی بے نیازی اور اُس کے علم و حکمت کے مطابق ہیں۔ یہ اُسی توحید کی وضاحت مزید ہے جس کا ذکر اوپر عہد فطرت کے حوالے سے ہوا ہے۔

۵۷۹ اصل میں لفظ ”يُلْحِدُونَ“ آیا ہے۔ یہ یہاں صفات الہی کی بے حرمتی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے نام اور ایسی صفات اللہ تعالیٰ سے منسوب کرتے ہیں جو کسی طرح اُس کے شایان شان نہیں ہے، جن سے اُس کی ذات و صفات کی اہانت ہوتی ہے اور جن سے وہ پاک، برتر اور منزہ ہے۔

۵۸۰ یہ معاملہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو خدا کے مقابلے میں سرکشی اور بغاوت پر اتر



أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا<sup>۱۸۳</sup> مَا بِصَاحِبِهِمْ<sup>۱۸۴</sup> مِنْ جَنَّةٍ<sup>۱۸۵</sup> إِنْ هُوَ إِلَّا  
نَذِيرٌ مُبِينٌ<sup>۱۸۶</sup> ۝ أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ  
وَمَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ<sup>۱۸۷</sup> وَلَا أَنْ عَسَى أَنْ يَكُونَ قَدِ اقْتَرَبَ

کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے؟ وہ تو ایک کھلا  
خبردار کرنے والا ہے۔ کیا انھوں نے زمین اور آسمانوں کی سلطنت پر اور ان سب چیزوں  
آتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...جب شکاری کو اپنی ڈور پر پورا اعتماد ہوتا ہے تو وہ مچھلی کو آخری حد تک ڈھیل دیتا ہے۔  
مچھلی سمجھتی ہے کہ اب اُس نے بازی مار لی، حالاں کہ شکاری اس لیے اُس کو ڈھیل پر ڈھیل دیتا  
ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ کتنا ہی زور لگائے، لیکن وہ اُس کے قابو سے باہر نہیں جاسکتی۔ اُس کی  
بھاگ دوڑ اُس کے لیے نجات کی راہ نہیں کھولے گی، بلکہ اُس کو تھکا کر اتنا چور کر دے گی کہ  
بالآخر وہ بے جان ہو کر خود بخود گھسٹتی ہوئی کنارے پر آ لگے گی۔ یہی حال خدا کی تدبیر کا ہے۔  
اُس کی تدبیر نہایت محکم اور اُس کی گرفت نہایت شدید ہوتی ہے۔ کوئی اُس کے احاطے سے باہر  
نہیں نکل سکتا۔ اس وجہ سے وہ لوگوں کو اُن کی سرکشی کے باوجود ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے۔ اس  
ڈھیل کو سرکش اپنی کامیابی سمجھتے ہیں، حالاں کہ وہ جتنی ہی زور آزمائی کرتے ہیں، اتنے ہی اپنی  
ہلاکت کے گڑھے سے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ جلد بازی وہ کرتا ہے جس کو اپنی تدبیر کے ناکام  
ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ جس کا تیر بے خطا اور جس کا وار بے پناہ ہو، اُس کو جلد بازی کی کیا ضرورت  
ہے؟“ (تذبرقرآن ۳/۴۰۰)

۵۸۱ ساتھی سے مراد یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کو جو دن رات اس بات کی لگن تھی  
کہ آپ اپنی قوم کو اُس عذاب سے خبردار کر دیں جو سنت الہی کے مطابق رسولوں کی تکذیب کرنے  
والوں پر لازماً آتا ہے، اُسے دیکھ کر قریش کے لیڈر اپنے لوگوں کو آپ کے اثر سے بچانے اور اپنی  
سیادت کی دھاک قائم رکھنے کے لیے اُن سے کہتے تھے کہ اگرچہ یہ شخص بھلا چنگا ہے، لیکن معلوم



اَجَلُهُمْ فَبِآيٍ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ﴿١٨٥﴾ مَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَكَلا

پر جو خدا نے پیدا کی ہیں، کبھی نگاہ نہیں کی (کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ خدا نے یہ کارخانہ عبث نہیں بنایا) اور نہیں سوچا کہ کیا عجب ان کی مدت قریب آگئی ہو؟ سو (یہ مدت پوری ہوگئی تو) اس کے بعد یہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟ (حقیقت یہ ہے کہ)

ہوتا ہے کہ اسے عذاب اور قیامت کا سودا لاحق ہو گیا ہے۔ یہ قریش کی اسی طفل تسلی کی تردید فرمائی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ساتھی کا لفظ بھی اسی بنا پر استعمال کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس لفظ کے استعمال سے قریش کو اس امر واقعہ کی طرف توجہ دلانا ہے کہ یہ پیغمبر اُن کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں، بلکہ اُن کے دن رات کے ساتھی ہیں۔ ان کا بچپن، ان کی جوانی، سب اُنھی کے اندر اور اُنھی کے ساتھ گزری ہے۔ ہر دور اور ہر مرحلہ میں اُنھوں نے ان کو دیکھا اور آزمایا اور ہر طرح کے حالات میں ان کو جانچا اور پرکھا ہے۔ پھر آخر یہ اس امر پر کیوں نہیں غور کرتے کہ جو شخص ہمیشہ اپنی سلامت روی، اپنی صداقت شعاری، اپنی بے غرضی، اپنی پاک بازی، اپنی فکر و رائے کی اصابت اور اپنی دانش و بینش کی پختگی کے اعتبار سے ساری قوم میں گل سرسبد رہا، دفعتاً وہ اب خطی اور دیوانہ کیسے بن گیا؟“ (تدبر قرآن ۳/۴۰۰)

۵۸۲ مطلب یہ ہے کہ خدا کی کائنات پر غور کرتے تو لازماً اس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ نہ یہ کارخانہ عبث بنا ہے کہ جزا و سزا کے بغیریوں ہی چلتا رہے اور کسی ظالم، معاند، حق و انصاف کے دشمن اور سرکش کے لیے کوئی یوم حساب نہ آئے اور نہ اس کا علیم و حکیم خداوند جس نے انسان کو خیر و شر میں امتیاز کا شعور دیا ہے، خود اس شعور سے بے نیاز ہو کر دنیا کو یوں ہی چھوڑے رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ حسرت و افسوس کے ساتھ فرمایا ہے کہ وہ اس بات پر غور کرتے تو یہ بات بھی اُن پر کھل جاتی کہ کیا عجب کہ اُن کی وہ اجل بھی قریب آگئی ہو جس سے پیغمبر اُن کو خبردار کر رہے ہیں اور خدا کا وہ فیصلہ اُن کے لیے بھی صادر ہونے والا ہے جو اُن سے پہلے پیغمبروں کی تکذیب کرنے والوں کے





الاعراف  
۷

هَادِيَ لَهُ<sup>ط</sup> وَيَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١٨٦﴾ يَسْأَلُونَكَ  
عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا<sup>ط</sup> قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي لَا  
يُجِدُهَا لَوْ قَتَّهَا إِلَّا هُوَ<sup>ط</sup> ثَقُلَتْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا تَأْتِيكُمُ

جنہیں خدا (اپنے قانون کے مطابق) گم راہی میں ڈال دے، اُن کے لیے پھر کوئی  
ہدایت دینے والا نہیں ہو سکتا۔ اُن کو وہ اُن کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔  
وہ تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں، (تمہارا ٹھٹھا اڑانے کے لیے) کہ آخروہ  
گھڑی کب نازل ہوگی؟<sup>۵۸۳</sup> کہہ دو کہ اُس کا علم تو میرے پروردگار ہی کے پاس ہے۔ وہی  
اپنے وقت پر اُس کو ظاہر کرے گا۔<sup>۵۸۴</sup> زمین و آسمان اُس سے بوجھل ہو رہے ہیں۔<sup>۵۸۵</sup> وہ تم پر

لیے صادر ہو چکا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ گویا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں آفاقی شہادت کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر جو کچھ

کہہ رہے ہیں، اُس کو خبط پر محمول نہ کرو، بلکہ اپنی بلادت اور سرگشتگی پر ماتم کرو۔“

(تذبرقرآن ۳/۴۰۳)

۵۸۳ اصل میں ’أَيَّانَ مُرْسَاهَا‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ ’أَيَّانَ‘ بھی ’متی‘ کے معنی میں ہے،  
لیکن یہ اُس موقع پر استعمال ہوتا ہے، جب استغراب و استنکار کے لہجے میں کسی چیز کے متعلق  
پوچھنا مقصود ہو۔ اسی طرح ’مُرْسَى‘ جہاز وغیرہ کے لنگر انداز ہونے کو کہتے ہیں۔ اس سے سوال  
کے اندر چھپے ہوئے طنز و استہزا کو سمجھا جاسکتا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں گویا مدعا یہ ہے کہ جس  
گھڑی کے ڈراوے سنار ہے ہو، وہ کب نمودار ہوگی؟ آخر یہ جہاز چلا تو کہاں اٹک کر رہ گیا، یہ  
ساحل پر کب لنگر انداز ہوگا؟

۵۸۴ مطلب یہ ہے کہ اُس کا علم بھی خدا ہی کے پاس ہے اور اُس کو برپا کر دینے کی قدرت  
بھی وہی رکھتا ہے۔ مجھے نہ اُس کے وقت کا پتا ہے اور نہ میں یہ طاقت رکھتا ہوں کہ جب چاہوں،



الْبَغْتَةُ ط يَسْأَلُونَكَ كَانَتْكَ حَفِي عَنْهَا ط قُلْ إِنَّمَا عَلَّمَهَا عِنْدَ اللَّهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٨٥﴾ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا

آئے گی تو اچانک آپڑے گی۔ وہ (اُس کے بارے میں) تم سے اس طرح پوچھتے ہیں گویا تم اُس کی تحقیق میں لگے ہوئے ہو۔<sup>۵۸۶</sup> کہہ دو: اُس کا علم تو صرف اللہ کو ہے، مگر لوگوں کی اکثریت اس بات کو نہیں جانتی۔ کہہ دو: (تم مجھ سے اُن چیزوں کا مطالبہ نہ کرو جو اُسے برپا کردوں۔

۵۸۵ اس سے کیا مراد ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”... جس طرح ایک حاملہ عورت ولادت کے قریب بار حمل سے گراں بار ہوتی ہے، اگرچہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ ولادت کا صحیح وقت کیا ہے، لیکن ہر آنکھیں رکھنے والا دیکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ یہ عورت جنے گی اور بہت جلد جنے گی، وہی حال قیامت اور عذاب کے معاملے میں آسمان وزمین میں غور کرنے والے ارباب بصیرت کا ہے۔ وہ آسمانوں اور زمین کو اس بوجھ سے گراں بار دیکھتے ہیں، اور اگرچہ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس بوجھ سے کب سبک دوش ہوں گے، لیکن جس طرح ایک حاملہ اپنے آخری مرحلہ میں اپنے بوجھ سے سبک دوش ہونے کے لیے منتظر اور بے قرار ہوتی ہے، وہی بے قراری آسمان وزمین کے اندر نمایاں ہے۔ اس میں اس بات کی طرف ایک لطیف اشارہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو آسمان وزمین کے اندر قیامت اور عذاب کی نشانیاں نظر نہیں آ رہی ہیں، اُن کو گویا آخری مرحلے میں پہنچی ہوئی حاملہ کا حمل نظر نہیں آ رہا ہے۔“ (تذکر قرآن ۳/۴۰۴)

۵۸۶ حالاں کہ کوئی شخص بھی جسے خدا نے علم و عقل سے بہرہ یاب کیا ہو، کسی ایسی چیز کے درپے نہیں ہو سکتا جو اُس کے حدود علم و تحقیق سے ماورا ہو۔ اور اُسے ہونا بھی نہیں چاہیے، اس لیے کہ اس سے بڑھ کر بے عقلی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی جاننے کی چیزوں پر توجہ کرنے کے بجائے اُن چیزوں کی کھوج کرید میں لگا رہے جن کو نہ وہ جان سکتا ہے اور نہ وہ اُس کے جاننے کی





الاعراف

وَلَا ضَرَّ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ط وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَا سَتَكُنْتُ  
مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ ۖ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ  
لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝۱۸۸

اللہ کے علم و اختیار میں ہیں، میں اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے۔ مجھے سارے غیب کا علم ہوتا تو میں خیر کثیر جمع کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں صرف ایک خبردار کرنے والا اور خوش خبری سنانے والا ہوں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لانا چاہیں۔ ۱۸۸-۱۸۴

ہیں۔

۵۸۷ یعنی علم و عمل کا سارا خزانہ سمیٹ لیتا، لیکن تم جانتے ہو کہ مجھے نقصان بھی پہنچ جاتا ہے اور اپنے لیے خیر و صلاح کے راستوں پر بھی میں اُسی حد تک آگے بڑھ سکتا ہوں جس حد کا مجھے علم دیا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... لَا سَتَكُنْتُ مِنَ الْخَيْرِ“ کے ٹکڑے میں جس خیر کی زیادہ سے زیادہ مقدار جمع کر لینے کی تمنا کا اظہار ہے، وہ پیغمبر کے ظرف اور اُس کی طلب کے اعتبار سے ہے۔ پیغمبر اپنے حوصلہ اور اپنے ارمان کے اعتبار سے اس مقام بلند پر ہوتا ہے کہ وہ خیر کی کسی وادی کو نا طے کردہ نہیں چھوڑنا چاہتا، لیکن وہ خیر سے واقف اُسی حد تک ہوتا ہے، جس حد تک اُس کو وحی الہی کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اگر اُس کو پورا غیب معلوم ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اُس کے اپنے امکان کے حد تک تو اُس کی کوشش یہی ہوگی کہ خیر کی راہ کے کسی پتھر کو بھی الٹے بغیر نہ چھوڑے۔ لیکن دائرہ وحی سے باہر اُسے بھی دوسروں کی طرح اپنی صواب دید ہی پر کام کرنا اور اپنی عقل ہی پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جس میں کامیابی اور ناکامی، دونوں کے امکانات مضمحل ہوتے ہیں۔“

(تدبر قرآن ۳/۴۰۵)



هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا  
لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيًّا فَمَرَّتْ بِهِ ۖ  
فَلَمَّا أَثْقَلَتْ دَعَا اللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَنُكَوِّنَنَّ  
مِنَ الشُّكْرَيْنِ ۝ (۱۸۹) فَلَمَّا أَتَاهَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا  
آتَاهُمَا ۖ فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ (۱۹۰) اَيُّشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ

وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی کی جنس سے اُس کا جوڑا بنایا تا کہ اُس سے تسکین پائے۔ پھر (بارہا ایسا ہوا کہ) جب مرد نے عورت کو چھا لیا تو اُسے ایک ہلکا سا حمل رہ گیا۔ سو اُس کو لیے پھرتی رہی۔ پھر جب زیادہ بوجھل ہو گئی تو مرد و عورت، دونوں نے مل کر اللہ، اپنے پروردگار سے دعا کی کہ (پروردگار)، اگر تو نے ہمیں تندرست اولاد عطا فرمائی تو ہم ضرور تیرے شکر گزاروں میں رہیں گے۔ مگر جب اللہ نے اُن کو صحیح و سالم اولاد عطا فرمادی تو اُس کی بخشی ہوئی چیز میں وہ دوسروں کو اُس کے شریک ٹھہرانے لگے۔ سو (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ برتر ہے اُن چیزوں سے

۵۸۸ مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا یہ نہیں کر سکتا تھا کہ دو الگ الگ اور مستقل وجود پیدا کرے اور دونوں میں ایسی مطابقت، ہم آہنگی اور سازگاری پیدا کر دے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے راحت دل و جان اور سرمایہ تسکین و نشاط بن جائیں۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ایک ہی علیم و حکیم ہستی کا ارادہ ہے جس نے اپنے پیشگی منصوبے کے تحت، دونوں کو خاص ڈھنگ سے وجود بخشا اور اس طرح پروان چڑھایا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بمنزلہ جان و تن ہو گئے ہیں۔ آیت میں ایک جان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ سورہ نساء (۴) کی آیت میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے۔





الاعراف

شَيْئًا وَهُمْ يُخْلِقُونَ ۝ (۱۹۱) وَلَا يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَا أَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُونَ ۝ (۱۹۲) وَإِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَى لَا يَتَّبِعُوكُمْ سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ أَدَعَوْتُمُوهُمْ أَمْ أَنْتُمْ صَامِتُونَ ۝ (۱۹۳) إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِنْ

جنہیں یہ شریک ٹھیراتے ہیں۔ کیا وہ اُن کو شریک ٹھیراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے، بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں! وہ نہ اُن کی کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ اور اگر تم اُن کو رہنمائی کے لیے پکارو تو وہ تمہارے پیچھے نہ آئیں گے۔<sup>۵۸۹</sup> تم انہیں پکارو یا خاموش رہو، تمہارے لیے برابر ہے۔ تم اللہ کے سوا جنہیں پکارتے ہو، وہ بندے ہیں، جس طرح تم بندے ہو۔<sup>۵۹۰</sup> سوا انہیں پکار دیکھو، انہیں چاہیے کہ تمہیں جواب

۵۸۹ یہ مشرکین کا عام رویہ ہے۔ اپنی اصل ضرورت اور اصل احتیاج کے وقت تو وہ اللہ، پروردگار عالم ہی کی طرف متوجہ ہوتے اور اُسی کو پکارتے ہیں، لیکن جب وہ احتیاج پوری ہو جاتی ہے تو اُسے دوسروں کی کرامت اور اُن کے علم و عمل کا کرشمہ قرار دینے لگتے ہیں۔

۵۹۰ شرک جس نوعیت کا بھی ہو، اُس سے اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کمال کی نفی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ وہ ایسی تمام نسبتوں اور شراکتوں سے منزہ اور ارفع ہے، اس نوعیت کی کوئی چیز بھی اُس سے منسوب نہیں کی جاسکتی۔

۵۹۱ اصل میں لفظ 'لَا يَتَّبِعُوكُمْ' آیا ہے۔ لفظ 'اتَّبَاع' یہاں اپنے ابتدائی لغوی مفہوم میں ہے، یعنی 'مشی خلفہ'۔ ہم نے ترجمہ اُسی کے لحاظ سے کیا ہے۔ ہم بھی اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ اُس نے مصیبت میں بلایا، لیکن کوئی اُس کے پیچھے نہیں آیا۔

۵۹۲ یہ اُن ذوات پر تبصرہ ہے جنہیں مشرکین اپنے زعم کے مطابق خدائی میں شریک مانتے



كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۹۴ اَلْهَمَّ اَرَجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَا اَمَّ لَھُمَّ  
اَيَّدِ يَبْطِشُوْنَ بِهَا اَمَّ لَھُمَّ اَعِيْنَ يُّبْصِرُوْنَ بِهَا اَمَّ لَھُمَّ اِذَا ب  
يَسْمَعُوْنَ بِهَا ط قُلْ اَدْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ كِيدُوْنَ فَلَا تَنْظُرُوْنَ ۝۱۹۵

دیں، اگر تم سچے ہو۔<sup>۵۹۳</sup> (تم نے کبھی غور نہیں کیا)، کیا اُن کے پاؤں ہیں کہ جن سے وہ چلتے ہیں؟ کیا اُن کے ہاتھ ہیں کہ جن سے وہ پکڑتے ہیں؟ کیا اُن کی آنکھیں ہیں کہ جن سے وہ دیکھتے ہیں؟ کیا اُن کے کان ہیں کہ جن سے وہ سنتے ہیں؟<sup>۵۹۴</sup> کہہ دو، (اے پیغمبر)، تم

اور معبودِ قرا دے کر پوجتے تھے، یعنی فرشتے اور جنات وغیرہ۔

۵۹۳ یہ اُسی طرح کا چیلنج ہے، جس طرح کا چیلنج سورہ بقرہ (۲) کی آیت ۲۳ میں دیا گیا

ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مطلب یہ ہوا کہ اب تک تو تم نے اپنے ان خیالی معبودوں کو جو چاہا مانا اور جو چاہا منوایا،

لیکن اب پیغمبر اور قرآن نے ان سب کی خدائی کو چیلنج کر دیا ہے۔ اب وقت ہے کہ وہ تمہاری

مدد اور رہنمائی کے لیے پہنچیں اور تم کو بھی اور خود اپنے آپ کو بھی سنبھالیں۔ اگر انہوں نے اپنی

خدائی بچالی تو بے شک، معلوم ہوگا کہ تم سچے ہو۔“ (تذبر قرآن ۴۰۹/۳)

۵۹۴ اوپر ذوات پر تبصرہ کیا تھا۔ اب یہ اُن مظاہر پر تنقید ہے جنہیں مشرکین ان ذوات کے

پیکر اور قالب کی حیثیت سے سونے، چاندی یا لوہے اور پتھر کی صورتوں کی صورت میں ڈھالتے اور

یہ گمان رکھتے تھے کہ اُن کے یہ معبود ان صورتوں کے اندر حلول کر آئے ہیں۔ زبور میں یہی حقیقت

بدیں الفاظ بیان ہوئی ہے:

اُن کے بت چاندی اور سونا ہیں

یعنی آدمی کی دست کاری۔

اُن کے منہ ہیں، پر وہ بولتے نہیں۔

آنکھیں ہیں، پر وہ دیکھتے نہیں۔







الاعراف

إِنَّ وَلِيََّ اللَّهِ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ ۝  
وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتِطِيعُونَ نَصْرَكُمْ وَلَا أَنْفُسَهُمْ  
يُنْصِرُونَ ۝<sup>١٩٤</sup> وَإِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَى لَا يَسْمَعُوا ۖ وَتَرْكُهُمْ

اپنے سب شریکوں کو بلا لو، پھر میرے خلاف تدبیریں کر دیکھو اور مجھے ہرگز مہلت نہ  
دو۔<sup>۵۹۵</sup> میرا کارساز اللہ ہے جس نے نہایت اہتمام کے ساتھ یہ کتاب اتاری ہے اور وہ  
اپنے نیک بندوں کی کارسازی فرماتا ہے۔<sup>۵۹۶</sup> اس کے برخلاف جنہیں تم اللہ کے سوا  
پکارتے ہو، وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ تم انہیں

اُن کے کان ہیں، پروہ سنتے نہیں۔

ناک ہیں، پروہ سونگھتے نہیں۔

اُن کے ہاتھ ہیں، پروہ چھوتے نہیں۔

پاؤں ہیں، پروہ چلتے نہیں۔

اور اُن کے گلے سے آواز نہیں نکلتی۔

اُن کے بنانے والے اُنھی کے مانند ہو جائیں گے۔

بلکہ وہ سب جو اُن پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

(۸-۴:۱۱۵)

۵۹۵ یہ اُن دھمکیوں کا جواب ہے جو مشرکین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے کہ ہمارے  
معبودوں کو برا کہتے ہو اور اُن کی طرف سے لوگوں کے عقیدے خراب کر رہے ہو تو یاد رکھو، ایک دن  
اُن کا قہر تم پر ٹوٹ پڑے گا اور تم کہیں پناہ حاصل نہ کر سکو گے۔

۵۹۶ مطلب یہ ہے کہ تمہارے معبود تو اپنے چہرے سے مکھی بھی نہیں ہٹا سکتے، لیکن میرا حامی و  
ناصر وہ پروردگار ہے جس نے انسان کی حیثیت سے میری سب سے بڑی احتیاج پوری کی اور مجھے  
کتاب ہدایت سے نوازا ہے۔ اُس کی شان یہی ہے کہ وہ اپنے صالح بندوں کی کارسازی فرماتا



يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٩٨﴾ خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ  
عَنِ الْجَاهِلِينَ ﴿١٩٩﴾ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ  
إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٠٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طِيفٌ مِّنَ  
الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ ﴿٢٠١﴾ وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوهُمْ

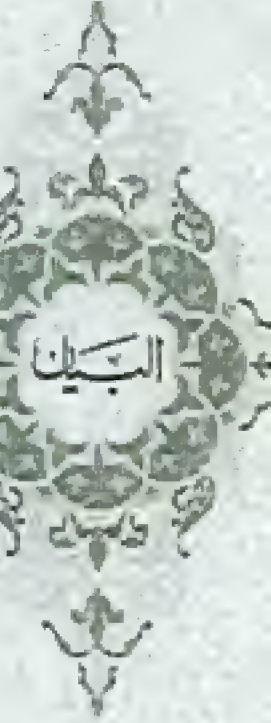
رہنمائی کے لیے پکارو تو تمہاری بات نہ سنیں گے۔ تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمہاری  
طرف دیکھ رہے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ کچھ نہیں دیکھتے۔<sup>۵۹۷</sup> (ان کے ماننے والوں  
کو اب اور کیا سمجھایا جائے؟ اس لیے) درگزر کرو، (اے پیغمبر)، نیکی کی تلقین کرتے  
رہو<sup>۵۹۸</sup> اور ان جاہلوں سے اعراض کرو۔ اس کے باوجود اگر تمہیں کوئی اکساہٹ شیطان  
کی طرف سے آجائے تو اللہ کی پناہ چاہو، اس لیے کہ وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے  
والا ہے۔ (یاد رکھو)، جو خدا ترس ہیں، انہیں جب شیطان کی کوئی چھوت لاحق ہوتی  
ہے۔

۵۹۷ اصل الفاظ ہیں: 'وَتَرَاهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ، وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ'۔ ان میں 'تَرَاهُمْ'  
اگرچہ واحد ہے، لیکن یہ 'خطاب لغیر معین' کے اسلوب پر آیا ہے، لہذا جمع کے مفہوم میں ہے  
اور اس کے مخاطب مشرکین ہیں۔ استاذ امام کے الفاظ میں 'رویت'، 'نظر' اور 'بصار' کے الفاظ  
اس ٹکڑے میں اس خوبی سے استعمال ہوئے ہیں کہ بس قرآن کا اعجاز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ  
بے بصرو، تم تو یہ خیال کر رہے ہو کہ یہ تمہیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں، لیکن انہیں سو جھٹا بھٹاتا  
کچھ بھی نہیں۔

۵۹۸ اصل میں لفظ 'عُرْف' آیا ہے۔ اس سے مراد وہ باتیں ہیں جو تمام سلیم الطبع لوگوں کے  
نزدیک نیکی اور خیر کی باتیں سمجھی جاتی ہیں اور اس لحاظ سے گویا جانی پہچانی ہوتی ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ  
جو دعوت دے رہے ہو، اُس پر جمے رہو۔ خدا کا فیصلہ جب تک صادر نہیں ہو جاتا، تمہارے لیے







الاعراف

فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُونَ ﴿٤٢﴾

وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بَايَةٌ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ  
مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِنْ رَبِّي ۚ هَذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ

ہے تو فوراً اپنے پروردگار کا دھیان کرتے ہیں اور دفعتاً اُن کے دل روشن ہو جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف ان (جاہلوں) کے بھائی، (شیاطین) انھیں گم راہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں، پھر اُس میں کوئی کسراٹھا نہیں رکھتے۔ ۱۸۹-۲۰۲

(ان کے مطالبے پر) تم ان لوگوں کے سامنے جب کوئی نشانی پیش نہیں کرتے تو کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لیے کوئی نشانی کیوں نہیں گھڑ لی؟ کہہ دو، میں تو صرف اُس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پروردگار کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ یہ

یہی حکم ہے۔ ان کی بوالفضولیوں کے پیش نظر تم خیر و صلاح کی یہ دعوت منقطع نہیں کر سکتے۔

۵۹۹ یہ صریح طعن کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن گھڑ کر لا سکتے ہو تو اپنے دعویٰ نبوت کی تائید کے لیے کوئی معجزہ بھی گھڑ کر لے آؤ۔ اس مفہوم کے لیے اصل میں لفظ 'اجْتَبَاء' آیا ہے۔ اس کے لغوی معنی تو کسی چیز کا انتخاب کر لینے کے ہیں، مگر طنزیہ اسلوب نے یہاں اس میں گھڑنے اور بنا لینے کے معنی پیدا کر دیے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس قول سے ظالموں کا مطلب یہ ہوتا کہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، اُس کا معاملہ تو

بہت آسان ہے۔ ادھر ادھر سے جو باتیں اگلوں کے واقعات اور کاہنوں اور اہل کتاب کی

روایات پر مشتمل کانوں میں پڑیں، اُن میں سے جو باتیں دل کو بھاگئیں، اُن کو جوڑ جاڑ کر کچھ

کلام بنایا اور اُس کو لا کر ہمیں اس دعوے کے ساتھ سنا دیا کہ یہ اللہ نے اپنے خاص فرشتے کے

ذریعے سے وحی بھیجی ہے۔ لیکن اب ہم نے مطالبہ جو معجزے کا رکھ دیا ہے تو تمھاری کچھ پیش نہیں

جاتی، اس لیے کہ ادھر ادھر سے باتیں چھانٹ لینا اور چیز ہے، معجزہ دکھانا اور چیز ہے۔ یہ



لَقَوْمٌ يُؤْمِنُونَ ﴿٤٣﴾ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهُ  
وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٤٤﴾

وَإِذْ كُنَّا فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ  
مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَفْلِينَ ﴿٤٥﴾ إِنَّ

اُن لوگوں کے لیے تمہارے پروردگار کی طرف سے آنکھیں کھول دینے والی آیتیں  
ہیں اور ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لانا چاہیں۔ (اس لیے) جب یہ قرآن سنایا  
جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۲۰۳-۲۰۴

اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو، (اے پیغمبر)، دل ہی دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ  
اور بولنے میں ہلکی آواز سے اور اُن لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے

چھانٹ لینے کی چیز نہیں تھی کہ کہیں سے چھانٹ کر لاتے اور ہمیں دکھا دیتے کہ یہ لو، تمہارا  
مطالبہ پورا کر دیا۔ گویا اس طعنے میں صرف معجزہ نہ دکھا سکنے ہی کا طعنہ نہیں، بلکہ اس سے زیادہ  
زہر آلود طعنہ اس کے اندر یہ مضمحل ہے کہ نعوذ باللہ قرآن ایک من گھڑت چیز ہے جو ادھر ادھر سے  
اپنے ذوق کے مطابق چھانٹی ہوئی چیزوں کا مجموعہ ہے۔“ (تذکر قرآن ۳/۴۱۲)

۶۰۰ یعنی آغاز کے لحاظ سے ہدایت اور انجام کے لحاظ سے رحمت۔ یہ اُس طنز کا جواب ہے  
جو اوپر نقل ہوئی ہے اور دیکھیے کہ کس قدر با عظمت اسلوب میں اور کیسا باوقار جواب ہے۔ فرمایا تھا  
کہ نیکی کی تلقین کرتے رہو اور ان جاہلوں سے اعراض کرو۔ یہ بہترین مثال ہے کہ اس ہدایت کی  
تعمیل کس طرح ہونی چاہیے۔ اُن کی بات چونکہ آخری درجے میں جاہلانہ تھی، اس لیے اُس کا  
نوٹس ہی نہیں لیا اور اصل حقیقت نہایت سادہ لفظوں میں سامنے رکھ دی ہے کہ میں معجزے اور  
کرامتیں نہیں، بلکہ یہ بصائر اور ہدایت و رحمت لے کر آیا ہوں، اس لیے قبول کرنا ہے تو اسے قبول  
کرو۔ دنیا اور آخرت کی تمام سعادتیں اسی میں مضمحل ہیں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ دلوں





الَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَغْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَحْسِنُونَ  
وَلَهُ يَسْجُدُونَ ﴿٢٠٦﴾ السَّجْدَةُ



ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو (فرشتے) تیرے پروردگار کے حضور میں ہیں، وہ اُس کی عبادت سے کبھی تکبر نہیں کرتے۔ وہ اُس کی تسبیح کرتے ہیں اور اُسی کے آگے سجدہ ریز رہتے ہیں۔ ۲۰۵-۲۰۶

کی خرابی دور کی جائے اور جانتے ہو، وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ تم حقیقت کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔ ۲۰۱ یہ آخر میں خدا کو دائماً یاد رکھنے کی تلقین فرمائی اور اُس کا طریقہ بھی بتا دیا ہے کہ خدا کا یہ ذکر ناز و تدلل کے ساتھ نہیں، بلکہ لجاجت، خوف، فروتنی اور مسکنت کے ساتھ اور پست آواز سے ہونا چاہیے تاکہ دل کی توجہ اس میں شامل رہے۔ روح کی زندگی کے لیے یہ اُسی طرح ضروری ہے، جس طرح جسم کی زندگی کے لیے سانس کی آمد و شد ضروری ہے۔ شیطان کے حملوں سے یہی ذکر آدمی کو بچاتا اور دعوت حق کے راستے پر پا بر جا رکھتا ہے۔ قرآن کی اکثر سورتیں اسی تلقین پر ختم ہوتی ہیں، اس لیے کہ دعوت کی راہ میں یہی بدرقہ ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو بیدار کرنے والے کہیں خود غفلت کی نیند نہ سو جائیں اور جس بھول سے وہ دوسروں کو نکالنا چاہتے ہیں، وہی بھول کہیں اُنھیں بھی لاحق نہ ہو جائے۔

۲۰۲ مطلب یہ ہے کہ خدا کو یاد کرنے والوں کا زمرہ یہ ہے۔ وہ زمین پر رہتے بستے ہیں، مگر اُن کا تعلق فرشتوں کی بزم قدس سے ہوتا ہے جو اپنے پروردگار کی بندگی سے کبھی سرتابی نہیں کرتے۔ اپنے دل کی گہرائیوں سے مانتے ہیں کہ اُن کا خالق بے عیب، بے نقص اور بے خطا ہے، ہر قسم کی کمزوریوں سے منزہ ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں، وہ بے ہمتا اور بے مثل ہے۔ وہ زبان سے بھی دائماً اسی حقیقت کا اعتراف و اعلان کرتے اور اُسی کے سامنے سجدہ ریز رہتے ہیں۔ اس میں مشرکین پر بھی تعریض ہے کہ جن کو خدا کے شریک ٹھہراتے ہو، اُن کا اپنا حال یہ ہے کہ ہر وقت



خدا کے آگے سرگرم سجود اور زمزمہ سنخ تسبیح و تہلیل ہیں۔

کوالا لپور

۲۸ مارچ ۲۰۱۱ء



الاعراف  
۷







# الانتقال - التوبه

٨ — ٩





## الانفال - التوبة

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں جس آخری دینونت کے لیے تیاری اور مسلمانوں کے تزکیہ و تطہیر کی ہدایات دی گئی ہیں، دوسری اُسی کے ظہور کا بیان ہے۔ دونوں کے مخاطب اہل ایمان ہیں اور ان کے مضمون سے واضح ہے کہ مدینہ طیبہ میں یہ دونوں سورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلہ جزا و سزا میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ — الانفال — کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین کے خلاف آخری اقدام کی تیاری اور اس کے لیے مسلمانوں کا تزکیہ و تطہیر ہے۔  
دوسری سورہ — التوبہ — کا موضوع انھی منکرین کے لیے، خواہ وہ کھلمنکر ہوں یا منافقین، خدا کی آخری دینونت کا ظہور ہے۔



## سورة الانفال

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ فَاتَّقُوا  
اللّٰهَ وَاصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ<sup>ص</sup> وَاطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ اِنْ كُنْتُمْ

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

وہ تم سے غنائم<sup>۱</sup> کے بارے میں پوچھتے ہیں<sup>۲</sup>۔ انھیں بتادو کہ یہ سب غنائم اللہ اور اُس کے رسول کے ہیں<sup>۳</sup>۔ اس لیے اللہ سے ڈرو، (اس معاملے میں کوئی نزاع پیدا نہ کرو) اور اپنے آپس کے معاملات کی اصلاح کر لو اور اللہ اور اُس کے رسول کا حکم مانو، اگر تم

۱۔ آیت میں لفظ 'الْاَنْفَال' آیا ہے۔ 'نفل' اُس چیز کو کہتے ہیں جو حق سے زیادہ حصہ مزید کے طور پر دی جائے۔ اس تعبیر میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کا اجر تو اُس کے ہاں بالکل الگ اور دائمی طور پر محفوظ ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ جو مال غنیمت دشمن سے حاصل ہوتا ہے، وہ ایک حصہ مزید ہے۔ قیامت سے پہلے وہ اللہ تعالیٰ اسی دنیا میں مجاہدین کو عطا کر دیتے ہیں۔

۲۔ یہ سوال اعتراض کی نوعیت کا ہے اور غزوہ بدر میں حاصل ہونے والے مال غنیمت سے متعلق پیدا ہوا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ جو جتنا مال جنگ میں لوٹے، وہ اُسی کا حق ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بدر کے بعد جب لوٹنے والوں سے دوسروں نے جنگی خدمات کی بنا پر اپنے حق کا مطالبہ کیا تو اُس سے ایک نزاع پیدا ہو گئی جس نے کسی حد تک تلخی کی صورت اختیار کر لی۔ یہ سوال اسی پس منظر میں اور مسلمانوں کے ایک گروہ کی طرف سے کیا گیا ہے۔

\* السيرة النبوية، ابن هشام ۲/۵۷۰۔



مُؤْمِنِينَ ① إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ

مومن ہو۔ (یاد رکھو)، اہل ایمان تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل دہل جاتے ہیں اور جب اُس کی آیتیں اُنھیں سنائی جاتی ہیں تو اُن کا ایمان بڑھادیتی

۳۔ یعنی اس وقت جو غنائم حاصل ہوئے ہیں، اُن کے متعلق خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ اُن پر کسی شخص کا بھی کوئی حق قائم نہیں ہوتا۔ یہ سب اللہ اور رسول کا ہے اور وہ اس کے ساتھ جو معاملہ چاہیں گے، اپنی صواب دید کے مطابق کریں گے۔ یہ فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ زمانہ رسالت کی جنگیں زیادہ تر اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت کے تحت لڑی گئی تھیں اور ان میں لڑنے والوں کی حیثیت اصلاً آلات و جوارح کی تھی۔ وہ اللہ کے حکم پر میدان میں اترے اور براہ راست اُس کے فرشتوں کی مدد سے فتح یاب ہوئے تھے۔ لہذا ان جنگوں کے مال غنیمت پر اُن کا کوئی حق اللہ تعالیٰ نے تسلیم نہیں کیا، تاہم آگے جا کر بتا دیا ہے کہ اس کے باوجود یہ سارا مال نہیں، بلکہ اس کا پانچواں حصہ ہی اجتماعی مقاصد کے لیے خاص رہے گا اور باقی ازراہ عنایت مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

۴۔ مطلب یہ ہے کہ بحث و اختلاف کی گرما گرمی میں اگر کوئی بدگمانی یا رنجش پیدا ہوگئی ہے یا اپنے بھائیوں کے بارے میں رشک و حسد کے جذبات کسی کے دل میں ابھرے ہیں کہ فلاں اور فلاں کو اس مال میں کیوں شریک بنایا گیا ہے، تو اپنی اصلاح کرلو۔ تم سب بھائی بھائی ہو۔ تمھارے تعلقات اخوت، رحم اور محبت کی بنیاد پر قائم ہونے چاہئیں۔ یہ ایمان و تقویٰ کے منافی ہے کہ تمھارا دامن دل حسد، رقابت اور خود غرضی کے غبار سے آلودہ ہو، اسے پاک صاف کرلو۔

۵۔ یہاں سے آگے سچے اہل ایمان کی تصویر ہے جو اُن لوگوں کے سامنے رکھی گئی ہے جنھیں 'اگر تم مومن ہو' کے الفاظ میں خطاب فرمایا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہو تو اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرو۔ ان کے بغیر یہ دعویٰ کسی کو زیب نہیں دیتا۔





الانفال  
۸

يَتَوَكَّلُونَ ۝۲۱ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝۲۲

ہیں اور وہ (ہر معاملے میں) اپنے پروردگار ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ جو نماز کا اہتمام

۱۔ یہ سچے اہل ایمان کی پہلی علامت بتائی ہے کہ وہ خدا کی عظمت و جلالت اور کبریائی کا شعور رکھتے ہیں، لہذا خدا کی کوئی بات بھی اُن کے سامنے پیش کی جائے، وہ اس گہرے احساس کے ساتھ اُس کو سنتے ہیں کہ یہ اُس ہستی کا ذکر ہو رہا ہے یا اُس کے نام پر کوئی بات کہی جا رہی ہے، جس کی ناراضی کا خوف ہر انسان کے نہاں خانہ وجود میں جاگزیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اُن کا دل اس گہرے احساس سے لرز جاتا ہے۔

۲۔ یہ دوسری علامت ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ آیات سے یہاں کتاب الہی کی وہ آیات مراد ہیں جن میں خدا کے احکام اور قوانین بیان ہوتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اہل ایمان جب ان احکام و قوانین کو سنتے ہیں تو انھیں ایمان ہی کا مظہر اور اُس کے مضمرات کی تفصیل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ایمان کے شجرہ طیبہ پر یہ برگ و بار دیکھ کر اُن کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ایمان کے ان مطالبات کو جب وہ پورا کرتے ہیں تو امتحان و آزمائش کے جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، اُن میں خدا کی تائید و نصرت کا ظہور اور کامیابی سے گزرنے کے بعد فتح مندی کا احساس بھی اُن کے ایمان کو قوی سے قوی تر بنا دیتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا“ کے اسلوب بیان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جن کے اندر ایمان موجود ہوتا ہے، جب اُن کے سامنے ایمان کے مقتضیات و مطالبات آتے ہیں تو وہ پوری بشاشت سے اُن کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ وہ ان مقتضیات و مطالبات کو اپنے ہی لگائے ہوئے درخت کا پھل اور اپنی ہی بوئی ہوئی کھیتی کا حاصل سمجھتے ہیں اور جس طرح ہر کسان اپنی کھیتی کے حاصل اور اپنے درخت کے پھلوں میں افزونی دیکھ کر باغ باغ ہوتا ہے، اُسی طرح یہ اہل ایمان بھی اپنے ایمان کی یہ افزائش دیکھ کر شادمان ہوتے ہیں۔ یہ گویا اُن مدعیان ایمان پر ایک لطیف تعریف ہوئی جو ایمان کا دعویٰ کرنے کو تو کر بیٹھے، لیکن جب اُس کے مطالبے سامنے آئے تو اُن



أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ ۚ حَقًّا لَّهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ  
وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٢٤﴾

کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے، اُس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں<sup>۹</sup>۔ یہی سچے مومن ہیں۔ ان کے پروردگار کے پاس ان کے لیے درجے ہیں، مغفرت ہے اور عزت کی روزی ہے<sup>۱۰</sup>۔ ۴-۱

سے خوش ہونے کے بجائے اُن کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے کہ یہ کیا بلا نازل ہوگئی!“

(تدبر قرآن ۳/۴۳۲)

۸ یہ تیسری علامت ہے۔ یعنی امتحان و آزمائش کے مراحل میں وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ انہیں یقین کامل ہوتا ہے کہ اُن کے پروردگار نے جو حکم بھی دیا ہے اور جس امتحان سے بھی گزارا ہے، اُس میں سرتاسر اُنھی کی فلاح ہے۔ چنانچہ تمام احکام اور تمام امتحانات کو وہ یہی سمجھتے ہیں کہ اُن میں یقیناً کوئی حکمت و مصلحت پوشیدہ ہوگی اور جلد یا بدیر وہ اُن کے لیے رحمت و برکت کی صورت میں ظاہر ہو جائے گی۔

۹ یہ چوتھی علامت ہے اور اس میں جو چیزیں بیان ہوئی ہیں، وہ سب کی جامع اور محافظ ہیں۔ ایمان جو اوصاف اہل ایمان کے اندر پیدا کرتا ہے، اُن کی شیرازہ بندی انھی دو چیزوں — نماز اور انفاق — سے ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ اسی حیثیت سے بیان ہوئی ہیں۔

۱۰ یعنی اُن کے ایمان و یقین کی کیفیات اور اُن کے ظہور کے لحاظ سے درجے ہیں، اُن کی غلطیوں اور کوتاہیوں کے لیے خدا کا دامن مغفرت ہے اور اس کے نتیجے میں ایسی روزی ہے جو اس عزت کے ساتھ دی جائے گی کہ یہ درحقیقت اُنھی کا حق ہے جو انہیں دیا جا رہا ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ ان آیتوں میں جس ایمان کا ذکر ہوا ہے، وہ قانونی اور فقہی ایمان نہیں ہے جس سے لوگوں کے حقوق و فرائض کا تعین کیا جاتا ہے، بلکہ حقیقی ایمان ہے اور یہ ہرگز کوئی جامد چیز





كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ  
الْمُؤْمِنِينَ لَكَاذِبُونَ ۝۵ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ

اسی طرح کی صورت اُس وقت پیش آئی تھی، جب تمہارا پروردگار تمہیں ایک مقصد حق کے ساتھ تمہارے گھر سے نکال لایا اور مسلمانوں کے ایک گروہ کو یہ سخت نہیں ہے۔ اللہ کے ذکر اور اُس کی آیتوں کی تلاوت اور نفس و آفاق میں اُن کے ظہور سے اس میں افزونی ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے دوسری جگہ اسے ایک ایسے درخت سے تشبیہ دی ہے جس کی جڑیں زمین کے اعماق میں اتری ہوئی اور شاخیں آسمان کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہوں۔ چنانچہ انسان اگر اپنے ایمان کو علم نافع اور عمل صالح سے برابر بڑھاتے رہنے کے بجائے اُس کے تقاضوں کے خلاف عمل کرنا شروع کر دے تو یہ کم بھی ہوتا ہے، بلکہ بعض حالات میں بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

۱۱ اصل میں لفظ 'کَمَا' ہے۔ یہ واقعہ سے واقعہ کی مماثلت کو ظاہر کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔ اس صورت میں اس کا مشبہ اور مشبہ بہ متعین الفاظ کے اندر نہیں ہوتا، بلکہ بحیثیت مجموعی واقعہ کے اندر ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ اوپر مال غنیمت سے متعلق نزاع کا ذکر ہوا ہے۔ اسی طرح کا ایک معاملہ جنگ کے لیے روانہ ہونے سے پہلے پیش آیا تھا۔ تزکیہ و تطہیر کی ضرورت سے قرآن نے اُسے بھی ساتھ ہی موضوع بنا لیا ہے۔

۱۲ اس کی وضاحت آگے فرمادی ہے کہ وہ مقصد حق یہ تھا کہ حق کا بول بالا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکروں کی جڑ کاٹ دی جائے۔ اس سے قرآن نے اُن روایتوں کی تردید کر دی ہے جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے اُس تجارتی قافلے کو لوٹنے کے لیے گھر سے روانہ ہوئے تھے جو ابوسفیان کی سربراہی میں شام سے واپس آ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ ابتدا ہی سے قریش کی ہزیمت پیش نظر تھی اور نکلنے کی ہدایت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی تھی تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے۔ یہ چیز، ظاہر



كَانَ مَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۖ ﴿٦﴾ وَإِذِ يَعِدُكُمُ اللَّهُ أَحَدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشُّوْكَه تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ

ناگوار تھا۔ وہ اس مقصد حق کے معاملے میں تم سے جھگڑ رہے تھے، اس کے باوجود کہ اُن پر وہ اچھی طرح واضح تھا۔ اُن کا حال یہ تھا کہ گویا آنکھوں دیکھے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں۔ اُس وقت کو یاد کرو، جب اللہ تم لوگوں سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا۔ تم چاہتے تھے کہ تمہیں وہ ملے جو ہے کہ کسی تجارتی قافلے کو لوٹ لینے سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

۱۳ آیت میں فَرِيقًا کا لفظ بتاتا ہے کہ اُن لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی جن پر یہ دیکھ کر دہشت طاری ہو رہی تھی کہ پیش نظر تجارتی قافلہ نہیں، بلکہ قریش کا لشکر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی لشکر کی سرکوبی کے لیے مدینہ سے نکل رہے ہیں۔ تاہم یہ گروہ اتنا قابل لحاظ ضرور تھا کہ مسلمانوں کی جماعت کے تزکیہ و تطہیر کے لیے اس کا رویہ زیر بحث آیا ہے۔

۱۴ اصل میں لفظ يُجَادِلُونَكَ آیا ہے۔ اس کے معنی یہاں بلطائف الحیل مخاطب سے اپنی بات منوانے کے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اس کے باوجود کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منشا اُن پر واضح تھا کہ آپ لشکر ہی کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، وہ موت کے خوف سے آخر وقت تک سخن سازی کرتے اور زور لگاتے رہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے آپ کو قائل کر لیں کہ لشکر کے مقابلے میں جانے کے بجائے قافلے کو لوٹنا زیادہ قرین مصلحت ہے، اس سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو سنبھالنے میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔

۱۵ اس وعدے میں ابہام کا اسلوب ہے۔ یعنی دو ٹوک انداز میں یہ نہیں کہا گیا کہ تجارتی قافلے کی حفاظت کا بہانہ بنا کر قریش نے حملے کے لیے فوج بھیج دی ہے، اُس کے مقابلے کے لیے



## الْكُفْرَيْنَ ④ لِيُحَقِّقَ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ⑧

مسلح نہیں ہے اور اللہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کا بول بالا کرے اور منکروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق کو حق اور باطل کو باطل کر دکھائے، خواہ ان مجرموں کو وہ کتنا ہی ناگوار ہو۔<sup>۱۸</sup> ۵-۸

نکلو، اللہ اُس کو تمہارے قابو میں کر دے گا، بلکہ ابہام کا انداز بیان اختیار کیا گیا ہے کہ قریش کی دو جماعتیں آرہی ہیں جن میں سے ایک تمہیں مل جائے گی، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے مخلصین اور منافقین کو الگ الگ کرنا مقصود تھا تاکہ ایک بڑی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے یہ اندازہ ہو جائے کہ کون کہاں کھڑا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر مہاجرین و انصار کے اکابر کی جو تقریریں روایتوں میں نقل ہوئی ہیں، اُن سے صاف واضح ہے کہ وہ حضور کا یہ منشا پوری طرح سمجھ گئے تھے۔\* استاذ امام کے الفاظ میں، اُنھوں نے آپ کے استفسار کے جواب میں ایسی تقریریں کیں جن کی گونج اسلام کی تاریخ میں ہمیشہ باقی رہے گی، جن کا ایک ایک لفظ میدان جہاد کا رجز ہے اور جن کی حرارت ایمانی چودہ سو سال گزرنے پر بھی ٹھنڈی نہیں پڑی ہے۔ یہ تقریریں، ظاہر ہے کہ کسی تجارتی قافلے پر حملے کے لیے نہیں کی گئی تھیں۔

<sup>۱۶</sup> یہ ضعیف الایمانوں کے اُسی گروہ قلیل کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اُن پر بھی، جیسا کہ فرمایا ہے، حقیقت بالکل واضح تھی، مگر اپنی بزدلی کے باعث وہ چاہتے تھے کہ قافلے کا قصد کیا جائے جو غیر مسلح ہے تاکہ کوئی خطرہ پیش نہ آئے اور مال غنیمت بھی حاصل ہو جائے۔  
<sup>۱۷</sup> اس سے وہ کلمات مراد ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ کے لیے گھر سے نکالنے اور بعد میں آپ کی تائید و نصرت کے لیے صادر ہوئے۔

<sup>۱۸</sup> ان آیتوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے، اُس کی روشنی میں غزوہ بدر کی جو تصویر سامنے آتی ہے، وہ اُس سے بالکل مختلف ہے جو سیرت و مغازی کی کتابوں میں پیش کی گئی ہے۔ استاذ امام

\* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/۲۳۳۔



امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا مسلمانوں کے ذہن میں قریش کے قافلہ تجارت سے تعرض کرنے کا کوئی خیال موجود نہیں تھا۔ مدینہ پر حملے کی ساری اسکیم قریش نے بنائی اور اُس کے لیے قافلہ تجارت کی حفاظت کا بہانہ تراشا۔ قریش مدینہ میں مسلمانوں کے جڑ پکڑنے سے بہت خائف تھے۔ مذہبی عناد کے علاوہ انھیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ اب مکہ اور شام کی تجارتی شاہ راہ اُن کے لیے محفوظ نہیں رہ گئی ہے۔ اس وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد ہی وہ اس فکر میں تھے کہ کوئی عذر تلاش کر کے مسلمانوں کو ایک قوت بننے سے پہلے ہی ختم کر دیں۔ اب یا تو قافلہ تجارت کے سالار ابوسفیان نے واپسی کے موقع پر کوئی وہمی خطرہ مسلمانوں کے حملے کا محسوس کیا ہو کہ آدمی بھیج کر قریش کو حملے کی خبر بھیج دی یا اس کے لیے بھی پہلے سے قریش کے لیڈروں میں کوئی سازش رہی ہو، بہر حال ابوسفیان کی اطلاع پر مکہ سے ایک بھاری بھر کم لشکر مدینہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ مرحلہ ہے جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رویا کے ذریعے سے یہ اطلاع ہوتی ہے کہ قریش کی دو جماعتیں آرہی ہیں جن میں سے ایک سے مسلمانوں کا مقابلہ ہونا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد مدینہ سے بدر کے لیے نکلنے کا ارادہ فرمایا اور مسلمانوں کے حوصلے کا اندازہ کرنے کے لیے صورت حال مبہم انداز میں اُن کے سامنے رکھی کہ کفار کی دو جماعتیں آرہی ہیں جن میں سے ایک سے ہمارا مقابلہ ہوگا اور وہ ہم سے شکست کھائے گی۔ مسئلہ کے سامنے آتے ہی مہاجرین و انصار سب سمجھ گئے کہ قریش کی فوج آرہی ہے اور اُس سے معاملہ درپیش ہے۔ چنانچہ اُن کے لیڈروں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وفاداری اور اسلام کے لیے اپنی جاں نثاری کا یقین دلایا۔ البتہ، ایک مختصر سی ٹولی اُن میں ایسی بھی تھی جس نے اپنا زور اس بات کے لیے لگایا کہ قریش کی فوج کے بجائے قافلہ تجارت کا رخ کیا جائے تاکہ بغیر ایک قطرہ خون بہائے بھاری غنیمت ہاتھ آئے۔ اسی گروہ کو بے نقاب کرنے کے لیے حضور نے اپنی بات مبہم انداز میں پیش کی تھی تاکہ جن لوگوں کے اندر کوئی کمزوری چھپی ہوئی ہے، وہ اپنی کمزوری ظاہر کر دیں اور مخلص و منافق میں







إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِالْفِ  
مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ⑨ وَمَا جَعَلَ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ  
بِهِ قُلُوبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ⑩  
إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ

یاد کرو، جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے تو اُس نے تمہاری فریاد سن لی  
اور فرمایا کہ میں ایک ہزار فرشتے تمہاری مدد کے لیے بھیج رہا ہوں جو لگاتار پہنچتے  
رہیں گے۔ یہ اللہ نے صرف اس لیے کیا کہ تمہارے لیے خوش خبری ہو اور اس لیے کہ  
تمہارے دل اس سے مطمئن ہوں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مدد تو اللہ ہی کے پاس  
سے آتی ہے۔ یقیناً اللہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔ یاد کرو، جب اللہ اپنی

مرحلہ جنگ پیش آنے سے پہلے ہی امتیاز ہو جائے۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۳۹)

۱۹ مسلمانوں کی تعداد چونکہ اس جنگ میں بہت تھوڑی تھی اور وہ بے سروسامان بھی تھے، اس  
لیے استاذ امام کے الفاظ میں، ہر شخص سراپا عجز و نیاز اور یک سر دعا و فریاد بنا ہوا تھا۔ ان دعاؤں میں  
لوگوں نے کس طرح اپنے دل نکال کر اپنے رب کے سامنے رکھ دیے تھے، اُس کا اندازہ کسی حد  
تک اُس دعا سے کیا جاسکتا ہے جو اُس موقع پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ آپ نے  
عرض کیا تھا: ”خدا یا، یہ ہیں قریش، اپنے سامان غرور کے ساتھ آئے ہیں تاکہ تیرے رسول کو جھوٹا  
ثابت کر دیں۔ خدا یا، اب تیری وہ مدد آ جائے جس کا تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ خدا یا، اگر آج یہ  
مٹھی بھر جماعت ہلاک ہو گئی تو روئے زمین پر پھر کوئی تیری عبادت نہ کرے گا۔“

۲۰ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ میدان جنگ میں حوصلے کو برقرار رکھنے کے لیے سب سے زیادہ  
دخل اسی چیز کو ہوتا ہے کہ لڑنے والوں کو اس بات کا اطمینان رہے کہ جب ذرا کمزور ہوں گے تو

\* السيرة النبوية، ابن هشام ۲/۲۳۹۔ تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۲/۳۸۳۔



مَا لِيُطَهِّرَكُمْ بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رَجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ

طرف سے تمہاری تسکین کے لیے تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا اور آسمان سے تم پر پانی برسا رہا تھا کہ اُس کے ذریعے سے تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی نجاست دور پیچھے سے مکہ لازماً پہنچ جائے گی۔

۲۱ مطلب یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جہاد کیا جائے تو جو کچھ بھی مدد حاصل ہوتی ہے، خدا ہی سے حاصل ہوتی ہے اور تمہیں بھی لازماً حاصل ہوتی، مگر پہلے اس لیے بتا دیا گیا کہ یہ چیز تمہارے لیے خوش خبری ہو اور تمہارے حوصلے کو برقرار رکھنے کا ذریعہ بن جائے۔

۲۲ آیت میں مضارع کا صیغہ ہے۔ اس کے ساتھ حرف 'اِذْ' ہو تو فعل ناقص کی ضرورت نہیں ہوتی، اُس کا مفہوم آپ سے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی صورت اس سے پیچھے 'يَعِزُّكُمْ' اور 'تَسْتَغِيثُونَ' میں بھی ہے۔ آیت میں نیند کے بجائے اونگھ کا ذکر ہوا ہے، اُس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کی صورت حال میں اونگھ آجائے تو آدمی کچھ سو ہی لیتا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ نہایت بر محل استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے یہ چیز مسلمانوں پر اڑھا دی، جیسا کہ 'يُغَشِّيْكُمْ' کے لفظ سے واضح ہے اور وہ جنگ سے پہلے رات میں سو لیے۔ اس سے اُن کے اعصاب اور دل و دماغ کو اتنا سکون حاصل ہو گیا کہ وہ تازہ دم ہو کر میدان میں اتر سکیں۔ یہ فی الواقع خدا کی تائید کا ظہور تھا، اس لیے کہ جہاں صبح ایک دل بادل فوج کا سامنا کرنا ہو، وہاں رات میں سو لینا آسان نہیں ہوتا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...میدان جنگ میں فوج کے لیے سولینے کا موقع مل جانا ہی اول تو بڑی نعمت ہے، لیکن اس سے بڑی نعمت اس موقع سے صحیح فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس لیے کہ نیند کے لیے موقع مل جانا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا اصلی انحصار دل و دماغ کی حالت پر ہے اور یہ چیز ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی، اُنھی کو حاصل ہوتی ہے جن پر خداے مقلب القلوب اپنے فضل خاص سے یہ سکینت طاری کر دے۔“ (تدبر قرآن ۳/۴۴۵)







عَلَى قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ۝ اِذْ يُوحَىٰ رَبُّكَ إِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَالِقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ

کرے اور (تمہیں کچھ دیر کے لیے سلا کر) تمہارے دلوں کو اس سے مضبوط کرے اور تمہارے قدم جمادے۔ یاد کرو، جب تمہارا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تو ایمان والوں کو ثابت قدم رکھو۔ میں ان منکروں کے دلوں سے ۲۳ یعنی زمین کا پانی اگر میسر نہیں تھا تو اپنی عنایت خاص سے اُس نے آسمان کو حکم دیا کہ وہ اپنا پانی برسا دے۔ رات کی نیند اور اس سے پہلے فرشتوں کے اترنے کی بشارت کے بعد یہ تیسری تائید الہی ہے جو بدر کے موقع پر ظاہر ہوئی۔

۲۴ یہ اُن وساوس کی طرف اشارہ ہے جو ناپاکی کی حالت میں ہجوم کر سکتے اور عین میدان جنگ میں لوگوں کو خدا کی یاد اور اُس کی تائید و نصرت پر اعتماد سے محروم کر سکتے تھے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ پانی کے حیوانی فوائد چونکہ ہر شخص کے علم میں ہیں، اس لیے اللہ نے اُن سے صرف نظر فرمایا اور اُن کے بجائے پانی کی روحانی برکات کا ذکر کیا ہے۔ بندہ مومن کے لیے زیادہ اہمیت انہی کی ہوتی ہے۔ اس موقع پر بھی صحابہ کرام کو زیادہ پریشانی یہی ہو سکتی تھی کہ نماز کے لیے وضو کیسے ہوگا، طہارت کے لیے کیا کریں گے اور غسل کی ضرورت پیش آگئی تو اُس کے لیے کیا صورت اختیار کی جائے گی؟

۲۵ اصل الفاظ ہیں: 'وَلَيَرْبِطَ عَلَى قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ'۔ یہ دونوں باتیں پانی سے نہیں، بلکہ نیند سے متعلق ہیں۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ نیند ہی سے متعلق ہو سکتی ہیں۔ قرآن نے یہاں ترتیب صعودی کا طریقہ اختیار کیا ہے، یعنی پہلے پانی اور اُس کے بعد نیند کے فوائد بیان کیے ہیں۔ یہی اسلوب سورہ بقرہ (۲) کی آیت ۱۸۵ میں بھی ہے۔ 'وَلَيَرْبِطَ' میں حرف 'ل' کا اعادہ اسی لیے کیا گیا ہے۔

۲۶ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتے بھی اپنے علوم مرتبت کے باوجود خدا تک براہ راست رسائی



كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿١٣﴾ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿١٤﴾ ذَلِكَ كُمْ فَذُوقُوا

میں رعب ڈالے دیتا ہوں، سو تم ان کی گردنوں پر مارو اور ان کے پور پور پر چوٹ لگاؤ۔  
یہ اس لیے کہ یہ اللہ اور اُس کے رسول کے مقابلے کو اٹھے ہیں اور جو اللہ اور اُس کے رسول کے مقابلے کو اٹھتے ہیں، اُن کو ایسی ہی سزا ملتی ہے، اس لیے کہ اللہ سخت سزا نہیں رکھتے۔ اُس کے احکام اُنھیں بھی وحی کے ذریعے سے ہی ملتے ہیں۔

۲۷ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ فرشتے بھی خدا کی معیت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسری یہ کہ بدر کی جنگ میں بھی اصلی چیز مسلمانوں کی اپنی شجاعت اور ثابت قدمی تھی۔ فرشتوں کا کام اُنھیں ایک طرف بٹھا کر خود لڑنا نہیں تھا، بلکہ منکروں کو ٹھیک اُن کے سامنے کر دینا اور اُنھیں ثابت قدم رکھنا تھا۔

۲۸ لڑنے والوں کی اصلی طاقت اُن کے حوصلے میں ہوتی ہے، اس لیے یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ منکرین جو کچھ کر سکتے ہیں، وہ بھی نہیں کر سکیں گے۔

۲۹ یعنی مسلمانوں کی تلواروں سے۔ یہ اُس بے بسی کی تصویر ہے جو مرعوبیت کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...حریف میں جب تک دم خم ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اس بات کا موقع وہ مشکل ہی سے دیتا ہے کہ آپ جہاں چاہیں، اُس کے مار دیں، لیکن جب اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تو پکڑ کر اُس کی چندیا پر جوتے لگا دیجیے، وہ چوں بھی نہ کر سکے گا۔ تعین محل کے ساتھ جب کسی کو مارنے کے لیے کہا جائے تو اس میں اُس کی تحقیر و تذلیل بھی مد نظر ہوتی ہے اور اس سے اُس کی بے بسی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۴۲۹)







وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ النَّارِ ⑫

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحَفًا فَلَا تُولُوهُمْ  
الْأَدْبَارَ ⑬ وَمَنْ يُؤَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبْرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا  
إِلَى فِتْنَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَا وَهُ جَهَنَّمُ ⑭ وَبِئْسَ  
الْمَصِيرُ ⑮ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ⑯ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ

دینے والا ہے — یہ ہے تمہاری سزا۔ سو اسے ابھی چکھو اور جان لو کہ (آگے)  
منکروں کے لیے آگ کا عذاب ہے۔ ۱۲-۹

ایمان والو، جب ان منکروں سے تمہارا مقابلہ باقاعدہ فوج کشی کی صورت میں ہو<sup>۳۱</sup>  
تو انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ اور (خوب سمجھ لو کہ) جو اُس وقت ان کو پیٹھ دکھائے گا، الا یہ کہ  
جنگ کے لیے پینتر ابدلنا چاہتا ہو یا اپنی فوج کے کسی دوسرے حصے سے ملنا چاہتا ہو تو وہ  
خدا کا غضب لے کر لوٹا۔ اُس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔<sup>۳۲</sup> (ایمان

۳۰ قرآن کے عام اسلوب کے مطابق اثنائے کلام میں خطاب کا رخ پھر گیا ہے اور یہ بات  
قریش کو مخاطب کر کے فرمادی ہے۔

۳۱ یعنی گوریلا وار فیر یا کروفر کی جنگ کی صورت میں نہیں، جس میں حملہ کرو، لوٹو اور بھاگ  
جاؤ کے اصول پر جنگ کی جاتی ہے، بلکہ جب منظم فوج کشی کے طریقے پر مقابلہ ہو۔

۳۲ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے حکم پر اور قتال فی سبیل اللہ کے لیے میدان میں اترنے کے  
بعد بزدلی اور فرار کی نوعیت کا پیٹھ دکھانا حرام ہے۔ کسی صاحب ایمان کو ہرگز اس کا ارتکاب نہیں  
کرنا چاہیے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نصرت پر بے اعتمادی، دنیا کی آخرت پر ترجیح اور موت و حیات کو اپنی  
تدبیر پر منحصر قرار دینے کا جرم ہے جس کی ایمان کے ساتھ کوئی گنجائش نہیں مانی جاسکتی۔



رَمِيتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَحِيٌّ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا  
إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ⑭ ذَلِكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ مُوهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِينَ ⑮

والو، تم کیوں جان چراؤ، جب کہ تمہاری طرف سے خدا لڑتا ہے؟ سو حقیقت یہ ہے کہ (اس جنگ میں) تم نے ان کو قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا ہے اور، (اے پیغمبر)، جب تو نے ان پر (خاک) پھینکی تو تو نے نہیں پھینکی، بلکہ اللہ نے پھینکی ہے، اس لیے کہ منکروں کو اپنی شانیں دکھائے اور اس لیے کہ مسلمانوں کو اللہ اپنی طرف سے اچھا انعام عنایت فرمائے۔ بے شک، اللہ سمیع و علیم ہے۔ یہ جو کچھ ہوا، تمہارے سامنے ہے ⑮

⑮ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ جب مسلمانوں اور کفار کے لشکر آمنے سامنے ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی بھر خاک زمین سے اٹھائی اور شاہت الوجوہ کہہ کر کفار کی طرف پھینک دی۔ یہ لعنت کا جملہ اور قدیم ترین زمانے سے لعنت کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ مسلمان اس کے ساتھ ہی یک بارگی حملہ آور ہو گئے۔ قرآن میں یہ اسی واقعے کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”یہاں زبان کا یہ اسلوب بھی نگاہ میں رہے کہ بعض مرتبہ فعل کی نفی سے مقصود نفس فعل کی نفی نہیں ہوتی، بلکہ اس فعل کے ساتھ اُن شان دار نتائج کی نسبت کی نفی ہوتی ہے جو اس فعل کے پردے میں ظاہر ہوئے۔ مٹھی بھر نہتے مسلمانوں کا قریش کی دل بادل غرق آہن فوج کو گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ کر ڈال دینا یا آں حضرت کے دست مبارک سے پھینکی ہوئی چٹکی بھر خاک کا ایک ایسا طوفان بن جانا کہ تمام کفار کو اپنی اپنی آنکھوں کی پڑ جائے، یہ مسلمانوں کی چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تلواروں یا پیغمبر کی رُمی کے کارنامے نہیں تھے، بلکہ اُس دست غیب کے کارنامے تھے جو مسلمانوں کی میانوں اور پیغمبر عالم کی آستینوں میں چھپا ہوا تھا۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۵۱)

⑮ اصل الفاظ ہیں: وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا۔ اس کا معطوف علیہ یہاں

\* السيرة النبوية، ابن ہشام ۲/۲۳۵۔



إِنْ تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَكُمْ الْفَتْحُ ۚ وَإِنْ تَنْتَهُوا فَمَا وَخَرُّكُمْ ۚ  
وَإِنْ تَعُودُوا نَعُدَّ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَلَوْ كَثُرَتْ ۚ

اور اس کے ساتھ یہ (بشارت) بھی کہ اللہ ان منکروں کی تمام تدبیریں بے کار کر کے رہے گا۔ اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو (قریش کے لوگو)، یہ فیصلہ آ گیا ہے۔ اگر (اب بھی) باز آ جاؤ تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر پھر یہی کرو گے تو ہم بھی یہی کریں گے اور تمہاری جمعیت، خواہ کتنی ہی زیادہ ہو، تمہارے کچھ کام نہ آئے گی۔

عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق حذف کر دیا ہے، اس لیے کہ اوپر کے الفاظ سے وہ خود بخود واضح ہو رہا ہے۔

۳۵ اصل میں 'ذَلِكُمْ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ جب اس طرح آتا ہے تو پورے جملے کا قائم مقام ہوتا ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔ آگے حرف ربط 'و' کا تعلق اسی جملے کے مفہوم سے ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ جملہ ٹھیک ٹھیک اوپر کے جملہ 'ذَلِكُمْ فَذُوقُوْهُ، وَاَنَّ لِلْكَافِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ' کا مد مقابل جملہ ہے، یعنی کفار کے لیے یہ چیت نقد ہے جو ان کو بدر میں لگی اور تمہارے لیے یہ فتح عظیم نقد ہے جو تمہیں حاصل ہوئی۔ اب آگے اُن کے لیے دوزخ ہے اور تمہارے لیے یہ بشارت کہ کفار کی سازشوں کے تمام تار و پود بکھر جائیں گے اور دین حق کا بول بالا ہوگا۔“

(تدبر قرآن ۳/۲۵۲)

۳۶ اصل میں لفظ 'كَيْدٌ' آیا ہے۔ اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ بدر کی جنگ مسلمانوں کے کسی اقدام کے نتیجے میں نہیں ہوئی، بلکہ قریش کے لیڈروں کی سازش کے نتیجے میں ہوئی۔ انہوں نے قافلہ تجارت کی حفاظت کا بہانہ تراشا اور ایک لشکر جرار لے کر مسلمانوں کو صفحہ رہستی سے مٹا دینے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی بنا پر اس کو اور اس کے بعد بھی جو کچھ وہ کریں گے، اُسے 'كَيْدٌ' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس کے معنی چال اور سازش کے ہیں۔





وَاتَّبَعُوا اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ①۹  
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنَّهُ وَاتَّبِعُوا

اور خوب سمجھ لو کہ اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔ ۱۵-۱۹

ایمان والو! اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو، (جس طرح کہ اطاعت کا حق

۳۷ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش کو اس جنگ میں اپنی فتح کا کامل یقین تھا۔ بدر کے لیے روانگی سے پہلے اُنھوں نے کعبے کے پردے پکڑ کر دعا مانگی تھی کہ خدایا، اُس کی مدد کر جو دونوں لشکروں میں سب سے اعلیٰ ہو، جو دونوں گروہوں میں سب سے اشرف ہو، جو دونوں قبیلوں میں سب سے بہتر ہو۔ اس طرح خود اُنھوں نے اس جنگ کو حق و باطل میں فیصلے کی میزان ٹھیرا لیا تھا، چنانچہ یہ فیصلہ آ گیا۔ آگے آیت ۴۱ میں غزوہ بدر کو قرآن نے ”يَوْمَ الْفُرْقَانِ“ کہا ہے۔ اُس کی وجہ یہی ہے۔

۳۸ یہ پوری آیت نصیحت بھی ہے اور فضیحت بھی۔ مطلب یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہی سوچ سکتے ہو کہ آئندہ مزید تیاری اور قوت و شوکت کے ساتھ حملہ آور ہو گے۔ سو جان لو کہ یہ چیز بھی تمہارے کچھ کام نہ آئے گی، اس لیے کہ اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ (آخری) ٹکڑا ساری آیت کی جان ہے اور اس کے دو لفظوں میں کفار کے لیے دھمکیوں کا اور اہل ایمان کے لیے بشارتوں کا ایک جہان ہے۔ فرمایا کہ اب آئے جس کو آنا ہو اور لڑے جس کو لڑنا ہو اور جمع کرے وہ جتنی جمعیت جمع کر سکتا ہو، اہل ایمان کے ساتھ ہم ہیں ہم! سبحان اللہ۔“ (تذکرہ قرآن ۳/۴۵۳)

۳۹ یہ خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روئے سخن اُنھی لوگوں کی طرف ہے جن کی کمزوری اور منافقت ابتدا سے زیر بحث ہے۔

\* تفسیر القرآن العظیم ۲/۳۹۲۔







الانفال  
۸

تَسْمَعُونَ ﴿٢٠﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿٢١﴾  
إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٢٢﴾  
وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَأَسْمَعَهُمْ ۖ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا

ہے اور رسول (کی دعوت) سے روگردانی نہ کرو، جب کہ تم (اُس کو) سن رہے ہو۔  
تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو دعویٰ کرتے تھے کہ ہم نے سنا، لیکن سنتے سناتے کچھ  
نہیں تھے۔ یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین جانور یہی بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل  
سے کام نہیں لیتے۔ اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی دیکھتا تو ضرور ان کو سننے کی توفیق دیتا

۲۰ آیت میں لفظ 'أَطِيعُوا' آیا ہے۔ یہ اپنے کامل معنی میں ہے۔ ہم نے ترجمہ اسی کے لحاظ  
سے کیا ہے۔

۲۱ پیچھے اللہ و رسول، دونوں کا ذکر ہے، لیکن یہاں ضمیر واحد آگئی ہے۔ اس سے یہ بات  
واضح ہوتی ہے کہ رسول کی دعوت سے روگردانی اللہ سے روگردانی کے ہم معنی ہے، اس لیے کہ خدا  
سے تعلق اور اُس کی اطاعت کا واحد ذریعہ اُس کا رسول ہی ہے۔

۲۲ یہ الفاظ اُن کے رویے کی شاعت کو ظاہر کرنے کے لیے آئے ہیں کہ جب رسول کی  
موجودگی میں اور اُس کی زبان سے براہ راست سن کر تمہارا یہ حال ہے تو آگے کیا کرو گے؟

۲۳ قرآن کے ذوق آشنا سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اشارہ یہود کی طرف ہے۔

۲۴ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ انسان کا اصلی امتیازی وصف اُس کا سننا سمجھنا اور عقل و بصیرت  
سے کام لینا ہی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس وصف سے محروم کر لے تو پھر وہ دو ٹانگوں پر چلنے والا  
جانور ہی ہے، بلکہ بدترین جانور۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... بدترین اس لیے کہ جانور خواہ کتنا ہی برا ہو، وہ اپنی جبلت پر قائم رہتا ہے اور اپنے محل

میں اُس کی ایک قیمت اور اُس کی ایک افادیت ہے، لیکن انسان اپنی خصوصیت نوعی سے محروم



وَهُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ

اور اگر اس کے بغیر سنو ادیتا تو یہ بے رخی کے ساتھ منہ پھیر جاتے۔ ۲۰-۲۳

ایمان والو، اللہ اور اُس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہو، جب کہ رسول تمہیں اُس چیز کی طرف بلا رہا ہے جو تم کو زندگی بخشنے والی ہے اور جان رکھو کہ (ایک عرصے تک

ہو جائے تو اُس کے آگے شیطان بھی اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے۔ یہ عقل و بصیرت سے کام لے تو جس طرح اِس کے عروج کی کوئی حد نہیں، اُسی طرح عقل و بصیرت سے محروم ہو جانے کی صورت میں اِس کی پستی کی بھی کوئی انتہا نہیں۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۵۷)

۲۵ ہدایت و ضلالت کے باب میں یہی خدا کی سنت ہے۔ انسان کے اندر خیر و شر میں امتیاز کی جو صلاحیت رکھی گئی ہے، اُسے زندہ رکھا جائے اور اُس سے کام لیا جائے تو خدا کی توفیق شامل حال ہو جاتی ہے اور انسان علم و عمل کے اعلیٰ درجات تک پہنچنے کے لیے ترقی کرتا رہتا ہے۔

۲۶ اِس لیے کہ وہ اُن کے اندر جڑ نہ پکڑ سکتی اور وہ اُس کو لازماً اگل دیتے۔ استاذ امام لکھتے

ہیں:

”...غذا کتنی ہی صالح ہو، لیکن معدہ فاسد ہو چکا ہو تو وہ اُس کو قبول نہیں کرتا۔ آدمی لقمہ حلق سے اتار تو لیتا ہے، لیکن بڑی جلدی قے کر دیتا ہے۔ ایک پودے کی صحیح نشوونما کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ذات سے تندرست ہو، بلکہ اِس کے لیے زمین کی زرخیزی بھی مطلوب ہوتی ہے۔ ایک مالی اگر ایک بنجر زمین میں عمدہ سے عمدہ پودا لگا دے تو لگانے کو تو وہ لگا دے گا اور چند روز وہ پودا اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل پر زندہ بھی رہے گا، لیکن جب زمین کے اندر سے اُس کے مزاج کے مطابق اُس کو مطلوب غذا نہیں ملے گی تو بالآخر وہ سوکھ جائے گا۔ ٹھیک یہی حال نیکی اور ہدایت کے بیج کا بھی ہے۔ یہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق نشوونما صالح



إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٣﴾ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢٤﴾

مہلت دینے کے بعد (اللہ آدمی اور اُس کے دل کے درمیان حائل ہو جایا کرتا ہے) اور یاد رکھو کہ (ایک دن) اُسی کی طرف سمیٹے جاؤ گے۔ اُس فتنے سے بچو جو خاص اُنھی لوگوں کو لاحق نہیں ہوگا جو تم میں سے ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ ۲۳-۲۴-۲۵

فطرت کی زمین کے اندر پاتا ہے۔ اگر کسی شخص کی فطرت کی زمین شور ہو چکی ہو تو یہ بیج ڈالنے کو تو قدرت اُس کے اندر بھی ڈال سکتی ہے، لیکن قدرت ہی کا قانون یہ ہے کہ وہ اُس کے اندر نشوونما نہ پاسکے۔“ (تذکر قرآن ۳/۲۵۸)

۲۷ یعنی حقیقی اور جاوداں زندگی بخشنے والی ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، اسی کو قبول کرنے سے بصارت کو بصیرت نصیب ہوتی ہے۔ اس سے عقل کو وہ نور حاصل ہوتا ہے جو آفاق و انفس کے اسرار و حقائق سے اُس کے لیے پردہ اٹھاتا ہے۔ اسی سے دل کو وہ زندگی نصیب ہوتی ہے جو اُس کو ایک مضغہ گوشت سے تجلیات و انوار الہی کا ایک آئینہ بنا دیتی ہے۔

۲۸ خدا کے حائل ہو جانے سے مراد یہاں خدا کے قانون کا حائل ہو جانا ہے۔ یہ، اگر غور کیجیے تو بڑی سخت تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جانتے بوجھتے رسول کی دعوت سے منہ موڑو گے تو ایک وقت ایسا آئے گا، جب لوٹنا بھی چاہو گے تو نہیں لوٹ سکو گے۔ اُس کے بعد خدا کا وہ قانون تمہارے اور اس دعوت کے درمیان حائل ہو جائے گا جو ہدایت و ضلالت کے باب میں مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ بار بار کی تنبیہ کے باوجود تم نے اپنے رویے کی اصلاح نہ کی تو اس جرم کی پاداش میں تمہارے دلوں پر مہر کر دی جائے گی اور خدا ہمیشہ کے لیے تمہیں راہ ہدایت سے محروم کر دے گا۔

۲۹ دنیا میں خدا کا قانون یہی ہے کہ بعض اوقات ایک گروہ کے جرائم کی سزا پوری قوم کو بھگتنا



وَاذْكُرُوا اِذَا اَنْتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْاَرْضِ  
تَخَافُونَ اَنْ يَّخْطَفَكُمْ النَّاسُ فَاُولٰٓئِكَ بِمَنْصُورٍ وَرَزَقٍ مِّنَ  
الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٢٦﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا لَا تَخُونُوا  
اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُونُوا اٰمَنِيَكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٧﴾ وَاَعْلَمُوْا

اُس وقت کو یاد کرو، جب تم تھوڑے تھے، زمین میں تمہیں بے زور سمجھا جاتا تھا، تم  
ڈرتے رہتے تھے کہ لوگ تمہیں اچک نہ لیں۔ پھر اللہ نے تمہیں پناہ دی اور اپنی نصرت  
سے تمہاری تائید کی اور تمہاری روزی کے لیے تمہیں پاکیزہ چیزیں عطا فرمائیں تاکہ تم  
شکر گزار رہو۔ ایمان والو، اللہ و رسول سے بے وفائی نہ کرو، (یہ امانت میں خیانت  
ہے) اور جانتے بوجھتے اپنی امانتوں میں خیانت کا ارتکاب نہ کرو اور جان رکھو کہ

پڑتی ہے۔ یہ اُس سے متنبہ فرمایا ہے کہ اپنے رویے کی اصلاح کرلو، ورنہ اندیشہ ہے کہ اُس طرح  
کے کسی فتنے میں مبتلا ہو جاؤ گے جو پوری جماعت، بلکہ آئندہ نسلوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا  
ہے۔ اللہ کے دین میں اسی بنا پر لوگوں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی بھلائی کی تلقین کریں  
اور برائی سے روکیں۔ قرآن اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تعبیر کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ  
علیہ وسلم نے اسی کے تحت ہدایت فرمائی ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے دائرہ اختیار میں لوگوں کو  
کسی برائی کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھے تو اُسے چاہیے کہ ہاتھ سے اُس کا ازالہ کرے۔ پھر اگر  
اس کی ہمت نہ ہو تو زبان سے، اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل سے اُسے ناگوار سمجھے اور یہ ایمان کا  
ادنیٰ ترین درجہ ہے۔\*

۵۰ خدا و رسول کی اطاعت کے اُسی مطالبے کو موکد کرنے کے لیے جس کا ذکر پیچھے ہوا ہے،  
یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات گنائے ہیں۔

\* مسلم، رقم ۷۷۱۔





أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۖ وَأَنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٢٨﴾  
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ

تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک آزمائش ہیں اور یہ بھی کہ اجر عظیم اللہ ہی کے پاس ہے۔ ۲۶-۲۸

ایمان والو، اگر تم خدا سے ڈرتے رہے تو وہ تمہارے لیے فرقان نمایاں کرے

۵۱ اصل الفاظ ہیں: 'وَتَخُونُوا أَمْنَتَكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ'۔ یہ پچھلے جملے پر عطف ہے، لیکن اس میں حرف 'لا' کا اعادہ نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اللہ و رسول کی خیانت ہی ہے جو لوگوں کے لیے اپنی امانتوں اور ذمہ داریوں میں خیانت کی راہ کھولتی ہے۔ یہ آیت ٹھیک اُس حکم کے مقابل میں ہے جو آیت ۲۴ میں بیان ہوا ہے۔ وہاں جو بات مثبت اسلوب میں کہی گئی ہے، یہاں اُس کے ضد سے روکا گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اللہ و رسول سے اطاعت کا جو عہد باندھ چکے ہو، وہ ایک امانت ہے۔ اُس کی خلاف ورزی، خفیہ ہو یا علانیہ، ہر حال میں خیانت ہے۔ اس خیانت سے بچو اور سماعنا و اطعنا کا اقرار کر کے اللہ و رسول سے بے وفائی اور غداری نہ کرو۔ اللہ کا حکم یہی ہے کہ کسی امانت میں کبھی خیانت نہ کی جائے۔ 'جانتے بوجھتے' کی قید یہاں اُن لوگوں کی مذمت کے لیے ہے جن کی طرف اشارہ ہے۔ تاہم یہ اپنی جگہ ایک حقیقت بھی ہے کہ کوئی فعل خدا کے ہاں جرم اُسی وقت بنتا ہے، جب اُس کا ارتکاب یہ جانتے ہوئے کیا جائے کہ وہ غلط ہے۔ ۵۲ یہ آخر میں اصل بیماری کا پتا دیا ہے کہ اس رویے کا باعث درحقیقت مال و اولاد کی محبت ہے۔ یہ اگرچہ انسان کی فطرت ہے، لیکن جب اس درجہ غالب آ جائے کہ اللہ و رسول سے بے وفائی یا دوسروں کے حقوق میں خیانت کا باعث بنے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ فتنہ بن گئی ہے۔ اس موقع پر یاد کر لینا چاہیے کہ خدا کے ہاں اُنھی کے لیے اجر عظیم ہے جو مال و اولاد کی محبت میں خدا و رسول سے بے وفائی نہیں کرتے۔

۵۳ یعنی اللہ و رسول سے بدعہدی کے مرتکب نہ ہوئے اور پیچھے جو ہدایات دی گئی ہیں، اُن



عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝۲۹ وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يَخْرِجُوكَ ط  
وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ط وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَكْرِينَ ۝۳۰

۵۴ گا اور تمہارے گناہ تم سے جھاڑ دے گا اور تمہاری مغفرت فرمائے گا۔ ۵۵ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑے فضل والا ہے۔ اُس وقت کو یاد رکھو، (اے پیغمبر)، جب منکرین تمہارے معاملے میں سازش کر رہے تھے کہ تمہیں قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا (ملک سے) نکال دیں۔ وہ یہ سازش کر رہے تھے اور اللہ بھی اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر فرمانے والا ہے۔ ۲۹-۳۰

پر خدا سے ڈرتے ہوئے عمل کرتے رہے۔

۵۴ فرقان اُس چیز کو کہتے ہیں جو حق و باطل کے درمیان امتیاز کر دے۔ آگے آیت ۴۱ میں غزوہ بدر کو اسی بنا پر فرقان سے تعبیر فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ عنقریب ایسے حالات پیدا کر دے گا جنہیں دیکھ کر اندھے بھی یقین کر لیں گے کہ آفتاب حق اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ طلوع ہو چکا ہے اور کسی تذبذب کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

۵۵ یعنی آگے تقویٰ پر مضبوطی سے جمے رہو گے تو اس وقت اگر کوتاہیاں ہوئی بھی ہیں تو اللہ معاف کر دے گا اور تمہاری مغفرت فرمائے گا۔

۵۶ یہ دارالندوہ کی اُس مشاورت کی طرف اشارہ ہے جس میں قریش کے لیڈروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں آخری فیصلہ کرنے کے لیے مختلف تجویزیں پیش کی تھیں۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بالآخر قتل کی تجویز پر اتفاق ہو گیا تھا اور اس کی تدبیر یہ سوچی گئی تھی کہ قریش کے تمام خاندان اس میں شریک ہوں گے۔ یہاں یہ واقعہ اُس وعدہ فرقان کو موکد کرنے کے لیے یاد دلایا گیا ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ اس کی تفصیلات حدیث و سیرت کی کتابوں میں







الانفال  
۸

وَإِذَا تُلِيٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَذَا إِنْ هَذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝۳۱ وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوِ اثْنَا

(یہ وہی لوگ ہیں کہ) جب ان کو ہماری آیتیں سنائی جاتی تھیں تو کہتے تھے کہ ہم نے سن لیا ہے، اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا ہی کلام پیش کر دیں، یہ تو وہی اگلوں کی کہانیاں ہیں۔ اور یاد کرو، جب انھوں نے کہا تھا کہ خدایا، اگر تیرے پاس سے یہی حق (نازل

دیکھ لی جاسکتی ہیں۔ اس میں سازش کا پہلو یہ تھا کہ جب سب خاندانوں کے لوگ مل کر قتل کا اقدام کریں گے تو آپ کا خون تمام قبیلوں پر تقسیم ہو جائے گا اور بنو عبد مناف کے لیے اس کے نتیجے میں ممکن نہیں رہے گا کہ سب سے لڑ سکیں، اس لیے مجبوراً خون بہا قبول کر لینے کے لیے راضی ہو جائیں گے۔

۷۵ مدعا یہ ہے کہ اُس پروردگار پر بھروسہ رکھو جس نے قریش کے لیڈروں کی طرف سے اس فیصلے کے بعد ایسی تدبیر فرمائی کہ پیغمبر اپنے خونی دشمنوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر صاف نکل گئے، راستے میں تعاقب کرنے والوں کو بھی منہ کی کھانی پڑی اور مسلمانوں کو وہ دارالہجرت بھی میسر ہو گیا جس نے جزیرہ نماے عرب میں اسلام کی تقدیر کا فیصلہ کر دیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اسلام کے پودے کی نشوونما کے لیے سب سے زیادہ زرخیز اور مہر پرور سرزمین یشرب ہی

کی سرزمین تھی جس کی طرف کفار نے خود اسلام کو دھکیل کر بھیجا۔ خدا اپنی اسکیمیں اسی طرح

بروے کار لاتا ہے۔ دشمن سمجھتا ہے کہ بازی اُس نے جیتی، لیکن حقیقت میں داؤں خدا کا

کامیاب ہوتا ہے۔ وہ حق کے دشمنوں ہی کے ہاتھوں جب چاہتا ہے، وہ کام کرا دیتا ہے جس

میں حق کی فتح مندی اور خود دشمن کی موت مضمر ہوتی ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۴۶۷)

\* السيرة النبوية، ابن هشام ۲/۱۰۷۔



بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝۳۲ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۝۳۳ وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ ۖ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝۳۴ وَمَا كَانَ

ہوا) ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کوئی دردناک عذاب ہم پر لے آ۔ اللہ (اُس وقت تو) ان کو عذاب دینے والا نہیں تھا، جب کہ تم ان کے درمیان موجود تھے اور نہ (اُس وقت) عذاب دینے والا ہو سکتا ہے، جب کہ یہ مغفرت چاہ رہے ہوں۔ لیکن اب ان میں کیا ہے کہ اللہ انھیں عذاب نہ دے، جب کہ یہ مسجد حرام سے روک رہے ہیں، دریاں حالیکہ یہ اُس کے جائز متولی بھی نہیں ہیں۔ اُس کے جائز متولی تو صرف خدا سے ڈرنے والے ہو سکتے ہیں۔ ہاں، مگر ان میں سے اکثر اس بات کو نہیں جانتے۔

۵۸ قریش کے لیڈروں کی طرف سے پیہم مطالبہ عذاب کے باوجود اللہ نے انھیں ڈھیل کیوں دی؟ یہ اس سوال کا جواب دیا ہے۔ فرمایا کہ عذاب کے معاملے میں اللہ کا قانون یہ ہے کہ جب تک اصلاح کی دعوت قبول کر کے خدا سے مغفرت چاہنے والے قوم کے اندر سے نکلتے رہتے ہیں اور جب تک پیغمبر اُن کے درمیان موجود ہوتا ہے، انھیں چھوڑ کر نکل نہیں جاتا، اللہ اتمام حجت کے باوجود اُن پر وہ فیصلہ کن عذاب نازل نہیں کرتا جو رسولوں کی قوموں پر نازل کیا جاتا ہے اور جس کا مطالبہ قریش کر رہے تھے۔ اس میں، اگر غور کیجیے تو یہ دعوت بھی ہے کہ یہ لوگ اگر اب بھی اپنی روش بدلنے کے لیے تیار ہو جائیں اور خدا سے معافی مانگ لیں تو اس عذاب سے بچ سکتے ہیں۔

۵۹ مطلب یہ ہے کہ عذاب میں تاخیر سے یہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ یہ عذاب کے مستحق نہیں ہیں۔ ان کے جرائم پہلے بھی کم نہیں تھے، لیکن اب تو یہ اس سرکشی پر اتر آئے ہیں کہ اُن لوگوں کو جو خالص خدا کی عبادت کرنے والے اور اصل دین ابراہیمی کے علم بردار ہیں، اُس عبادت گاہ





الانفال  
۸

میں آنے سے روک رہے ہیں جو خالص خدا ہی کی عبادت کے لیے اور ابراہیم علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں سے تعمیر کی گئی تھی۔

۶۰۔ بیت اللہ توحید کے مرکز کی حیثیت سے بنایا گیا تھا۔ ابراہیم و اسمعیل علیہما السلام اس کے پہلے متولی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی منصب کی رعایت سے سیدنا ابراہیم کو لوگوں کا امام قرار دیا تھا۔ سورہ بقرہ میں بیان ہوا ہے کہ یہ امامت انھیں عطا کی گئی تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا کہ کیا یہ منصب میری ذریت کو بھی حاصل رہے گا؟ جواب میں ارشاد ہوا کہ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ، میرا یہ عہد تمھاری ذریت کے صالحین کے لیے ہے، اس کا ظالموں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔\* یہ اُسی کے حوالے سے فرمایا ہے کہ اس گھر کی تولیت کا دعویٰ ان مشرکوں کو زیب نہیں دیتا۔ اس کے متولی تو وہی ہو سکتے ہیں جو اللہ کی توحید پر قائم رہنے والے اور اُس کے عہد و میثاق کی پابندی کرنے والے ہوں۔ ملت ابراہیم سے انحراف اور بیت اللہ الحرام کو بتوں کی نجاست سے آلودہ کر دینے کے بعد اب یہ کسی لحاظ سے بھی اُس کے جائز متولی نہیں رہے۔

۶۱۔ یہ اُس عام جہالت اور بے خبری کی طرف اشارہ ہے جس میں بنی اسمعیل کی اکثریت اُس زمانے میں مبتلا تھی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... ایک طویل مدت تک جاہلیت کی تاریکی میں زندگی گزارنے کی وجہ سے وہ اپنی اصل تاریخ بالکل بھلا بیٹھے تھے۔ انھیں قومی تفاخر کے طور پر اتنی بات تو یاد رہی کہ وہ حضرت ابراہیم و حضرت اسمعیل کی اولاد ہیں، لیکن اس سے آگے انھیں کچھ خبر نہیں تھی کہ حضرت ابراہیم اس سرزمین پر کیوں تشریف لائے، اُن کی دعوت کیا تھی، وہ جس ملت کے داعی ہوئے، اُس کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں، حضرت اسمعیل کو انھوں نے یہاں کیوں بسایا، خانہ کعبہ کی تعمیر کس مقصد کے لیے ہوئی اور اس گھر کے تعلق سے ذریت اسمعیل کو اللہ کے دین کی کیا کیا امانتیں اور کیا ذمہ داریاں سپرد ہوئیں؟ چند معاشرتی رسوم اور حج کے کچھ مناسک جو حضرت ابراہیم کے وقت سے چلے آ رہے تھے، اُن میں بھی اتنی تبدیلیاں ہو گئی تھیں کہ اصلی اور ملاوٹ میں امتیاز

\* ۱۲۴:۲۔



## صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ الْأَمْكَاءِ وَتَصَدِيهٖ طُفُوًا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٣٥﴾

(یہ اپنی نمازوں کے زعم میں نہ رہیں)۔ حقیقت یہ ہے کہ بیت اللہ کے سامنے ان کی نماز سیٹی بجانے اور تالی پٹنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔<sup>۶۲</sup> لو اب چکھو میرے عذاب کا مزہ، اُس کفر کی پاداش میں جو تم کرتے رہے ہو۔<sup>۶۳</sup> ۳۱-۳۵

مشکل ہو گیا تھا۔ خانہ کعبہ کو انھوں نے اپنا قومی معبد بنا لیا تھا جس کی کلید برداری اور اُس کے مختلف شعبوں کی سربراہی وراثت کے طور پر مختلف خاندانوں میں منتقل ہوتی رہتی۔ جن پر آبائی جاگیر کی طرح اُن کو فخر بھی ہوتا اور اسی حیثیت سے وہ اُن پر متصرف بھی ہوتے۔ قرآن نے اُن کی اسی جہالت کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے کہ یہ خانہ کعبہ کی تولیت کے مدعی تو ہیں، لیکن انھیں کچھ خبر نہیں کہ یہ خانہ کعبہ ہے کیا چیز اور اس کی تولیت کے شرائط کیا ہیں؟“ (تدبر قرآن ۳/۴۷۱)

۶۲ نماز میں یہ خرافات غالباً اُن بتوں کی پرستش کرنے والوں سے آئے ہوں گے جو قریش نے سارے عرب پر اپنی مذہبی سیادت قائم کرنے کے لیے کعبے میں لا کر رکھ دیے تھے۔ قرآن نے نہایت بلاغت کے ساتھ اُن کی عبادت کی ظاہری ہیئت ہی سے نمایاں کر دیا ہے کہ اس چیز کو انبیاء علیہم السلام کے سکھائے ہوئے طریقہ عبادت سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ استاذ امام لکھتے ہیں: ”...دین کی ہر بات میں وقار، متانت، فروتنی، خشیت اور پاکیزگی کی جھلک اور معرفت، حکمت، دانش اور روحانیت کی مہک ہوتی ہے۔ جس کی آنکھوں میں کچھ بصیرت اور جس کی روحانی قوت شامہ میں ذرا بھی زندگی ہو تو وہ صرف دیکھ اور سونگھ ہی کر جان جاتا ہے کہ فلاں چیز دین کی نہیں ہے۔ علمی تحقیق و کاوش کا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے اور اس کے وسائل و ذرائع الگ ہیں۔ یہاں قرآن نے یہی دکھایا ہے کہ یہ ان مدعیان تولیت کعبہ کی نماز ہے جس کی صورت ہی گواہی دیتی ہے کہ یہ شیطان کی ایجاد ہے۔ اس میں اُس نماز کی ادنیٰ جھلک بھی نہیں ہے جس کے اہتمام و قیام کے لیے یہ یہاں بسائے گئے تھے اور جس کی خاطر خدا کا یہ گھر ان کی تحویل میں





إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَسَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ﴿٣٦﴾ لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضُهُ عَلَىٰ بَعْضٍ

جن لوگوں نے کفر کا یہ رویہ اختیار کر رکھا ہے، وہ اپنے مال خدا کی راہ سے روکنے کے لیے خرچ کر رہے ہیں<sup>۶۳</sup>۔ سو وہ آگے بھی خرچ کرتے رہیں گے، پھر یہ اُن کے لیے حسرت بن جائے گا، پھر مغلوب ہوں گے اور جو اسی طرح منکر رہیں گے، اُن سب کو جمع کر کے جہنم کی طرف ہانک دیا جائے گا۔ اُس لیے کہ (اپنی جنت کے لیے) اللہ پاک سے

دیا گیا تھا۔“ (تدبر قرآن ۴۷۲/۳)

۶۳ یہ آخر میں قریش کو براہ راست خطاب کر کے واضح کر دیا ہے کہ جس عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے، اُس کی ابتدا ہو گئی ہے۔ پہلی قسط بدر میں وصول کر چکے ہو۔ استاذ امام کے الفاظ میں اب یکے بعد دیگرے چکھتے جاؤ اور گنتے جاؤ۔

۶۴ اشارہ ہے قریش کے لیڈروں کی اُس فیاضی کی طرف جس کے ساتھ وہ اسلام کو مٹانے کے لیے اپنا مال خرچ کر رہے تھے۔ بدر کے موقع پر اُنھوں نے فی الواقع بڑی دریادلی کے ساتھ فوج کی رسد اور سامان جنگ فراہم کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی تھی\*۔ فرمایا کہ اُن کی یہ دریادلی بھی خدا کے اُس فیصلے کو صادر ہونے سے نہیں روک سکے گی جو اُن کے جرائم کی وجہ سے اُن کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔

۶۵ یعنی دنیا میں مغلوب ہوں گے اور آخرت میں ہانک کر جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے۔ آیت میں 'يُحْشَرُونَ' کے ساتھ 'إِلَىٰ' کا صلہ ہے۔ ہانک کر لے جائے جانے کا مفہوم اُسی

\* السيرة النبوية، ابن ہشام ۱۸۹/۲۔



فَإِزْكُمُوهَ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿٣٧﴾

قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا إِن يَنْتَهُوا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَإِنْ يَعُودُوا فَقَدْ مَضَتْ سُنتُ الْأَوَّلِينَ ﴿٣٨﴾ وَقَاتِلُوهُمْ

ناپاک کو الگ کرے اور ناپاک کو ایک دوسرے پر رکھ کر سب کا ڈھیر بنائے، پھر اس ڈھیر کو جہنم میں جھونک دے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) یہی لوگ نامراد ہونے والے ہیں۔ ۳۷-۳۸  
ان منکروں سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ اگر یہ باز آ جائیں تو جو کچھ ہو چکا ہے، وہ انھیں معاف کر دیا جائے گا۔ اور اگر یہ پھر وہی کریں گے تو جان لیں کہ خدا کی سنت اگلوں نے پیدا کر دیا ہے۔

۶۶۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ اُس فرقان کا بیان ہے جو آخرت میں ظاہر ہوگا۔ وہاں اللہ تعالیٰ سارے خبیث کو طیب سے بالکل الگ کر دے گا، پھر خبیث کو ایک دوسرے پر تہ بہ تہ ڈھیر کر دے گا، پھر اس پورے ڈھیر کو جہنم میں جھونک دے گا۔ رُکُم کے معنی کسی شے کو ایک دوسرے پر تہ بہ تہ ڈھیر کرنے کے ہیں۔ کوڑے کرکٹ کو جلانا ہو تو اُس کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ سب کو جمع کر کے تہ بہ تہ ڈھیر کیا جاتا ہے، پھر اُس کو آگ دکھا دی جاتی ہے۔ تہ بہ تہ جمع کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آگ زیادہ مقدار میں ایندھن پا کر پورے زور سے بھڑکتی ہے اور جمع شدہ انبار کا ہر حصہ دوسرے حصے کو جلانے میں مددگار بن جاتا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہل کفر جس طرح اس دنیا میں تائید کفر میں ایک دوسرے کے پشت پناہ ہیں، اُسی طرح جہنم میں ایک دوسرے کو جلانے کے لیے باہم دگر ایندھن کا کام دیں گے۔“ (تدبر قرآن ۳/۴۷۳)

۶۷۔ یعنی کفر و شرک سے باز آ جائیں اور رسول جو دعوت دے رہا ہے، اُس پر لبیک کہیں۔







حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً وَيَكُورَ الدِّينُ كُلُّهُ ۚ فَإِنِ  
انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٣٩﴾ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَعَلْمُؤَا

کے معاملے میں گزر رہی چکی ہے۔ (ایمان والو) تم ان سے برابر جنگ کیے جاؤ، یہاں  
تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین (اس سرزمین میں) سب اللہ کے لیے ہو جائے۔ سو

۶۸۔ یہ اُس سنت کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت رسولوں کے مخاطبین اگر اُن کی تکذیب پر  
جھے رہیں تو لازماً ہلاک کر دیے جاتے ہیں، خواہ وہ قہر الہی سے ہلاک ہوں یا اہل ایمان کی تلواروں  
سے۔

۶۹۔ یہ لفظ یہاں کسی کو ظلم و جبر کے ساتھ اُس کے مذہب سے برگشتہ کرنے یا مذہب پر عمل سے  
روکنے کی کوشش کے لیے آیا ہے۔ یہی چیز ہے جسے انگریزی زبان میں 'persecution' سے  
تعبیر کیا جاتا ہے۔

۷۰۔ یہ اُس جنگ کی غایت ہے جس کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو دیا گیا  
تھا۔ آپ کی طرف سے اتمام حجت کے بعد خدا کا فیصلہ یہی تھا کہ سرزمین حرم میں نہ صرف یہ کہ  
مسلمانوں پر قریش کے ظلم و جبر کا خاتمہ کر دیا جائے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس سرزمین کو  
منکرین سے اس طرح پاک کر دیا جائے کہ یہاں اللہ کے دین، یعنی اسلام کے سوا کوئی اور دین  
باقی نہ رہ جائے۔ ظلم و جبر کے خلاف قتال کا حکم تو اب بھی موجود ہے، لیکن کسی سرزمین کو منکرین حق  
سے پاک کرنے یا انھیں زیر دست بنا کر رکھنے کے لیے قتال اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔

\* مسلمان اس کے پابند ہیں کہ سرزمین حرم کی یہ حیثیت قیامت تک اسی طرح برقرار رکھیں تاکہ توحید کا یہ  
مرکز باطل کی ہر آلودگی سے پاک رہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ذریعے سے یہ سرزمین اسی مقصد  
کے لیے خاص کی گئی ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ اس میں نہ غیر اللہ کی عبادت کے لیے کوئی معبد تعمیر کیا  
جائے اور نہ کسی کافر و مشرک کو مستقل طور پر رہنے کی اجازت دی جائے۔



اِنَّ اللّٰهَ مَوْلَاكُمْ ۖ نِعَمَ الْمَوْلٰى وَنِعَمَ النَّصِيْرُ ﴿٣٨﴾  
وَاَعْلَمُوْا اَنْمَّا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُوْلِ

اگر یہ باز آ جائیں تو جو کچھ کریں گے، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔ اور اگر منہ موڑیں تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا مولیٰ ہے۔ کیا ہی اچھا مولیٰ ہے اور کیا ہی اچھا مددگار! ۳۸-۴۰  
(تم نے جو کچھ تمہارا تو) جان لو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا تھا، اُس کا

اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس کا تعلق شریعت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے جو اِس دنیا میں ہمیشہ اُس کے براہ راست حکم اور انہی ہستیوں کے ذریعے سے روبہ عمل ہوتا ہے جنہیں وہ رسالت کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ اِس قانون کی رو سے اللہ کی حجت جب اِن رسولوں کے ذریعے سے کسی قوم پر پوری ہو جاتی ہے تو اِن کے منکرین پر اِسی دنیا میں عذاب آ جاتا ہے۔ یہ عذاب آسمان سے بھی آتا ہے اور بعض حالات میں اہل حق کی تلواروں کے ذریعے سے بھی۔ پھر اِس کے نتیجے میں منکرین لازماً مغلوب ہو جاتے ہیں اور اُن کی سرزمین پر حق کا غلبہ پوری قوت کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد یہی دوسری صورت پیش آئی۔ چنانچہ آپ اور آپ کے صحابہ کو جس طرح فتنے کے خلاف قتال کا حکم دیا گیا، اُسی طرح اِس مقصد کے لیے بھی تلوار اٹھانے کی ہدایت ہوئی۔ یہ خدا کا کام تھا جو انسانوں کے ہاتھ سے انجام پایا۔ اسے ایک سنت الہی کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ انسانی اخلاقیات سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ سورہ توبہ (۹) کی آیت ۱۴ کے الفاظ ”يُعَذِّبُهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيكُمْ“ (اللہ تمہارے ہاتھوں سے اُن کو سزا دے گا) میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔

۱۷ لہذا اُس کے لحاظ سے اِن کا اجر بھی انہیں عطا فرمائے گا۔

۲۱ اموال غنیمت سے متعلق چونکہ ناروا قسم کے سوالات اٹھا دیے گئے تھے، اِس لیے لوگوں کی کمزوریوں پر تبصرے کے بعد اب فیصلہ سنایا ہے تو آغاز اِس تنبیہی کلمے سے کیا ہے۔





الانفال  
۸

وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ إِن كُنْتُمْ  
أَمْنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ التَّقَىٰ

پانچواں حصہ اللہ کے لیے، اُس کے یتیم کے لیے، (پنجمبر کے) اقربا اور یتیموں، مسکینوں  
اور مسافروں کے لیے خاص رہے گا۔ (یہ اللہ کا حکم ہے، اس کی بے چون و چرا تعمیل

۳۷ پیچھے بیان ہو چکا ہے کہ زمانہ رسالت کی جنگوں پر اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کا کوئی حق تسلیم  
نہیں کیا۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ یہ سب اللہ و رسول کا ہے۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ اس کے باوجود یہ سارا  
مال نہیں، بلکہ اس کا پانچواں حصہ ہی اجتماعی مقاصد کے لیے خاص رہے گا اور باقی ازراہ عنایت  
مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ یہ تقسیم بھی صاف واضح ہے کہ صرف اس وجہ سے کی گئی ہے کہ  
لوگوں نے جنگ بہر حال لڑی تھی۔ اُس کے لیے زاد راہ کا بندوبست بھی کیا تھا اور اُس کی ضرورتوں  
کے لیے اسلحہ، گھوڑے اور اونٹ وغیرہ بھی خود ہی مہیا کیے تھے۔ لہذا جب اس طرح کے اموال  
مسلمانوں کو حاصل ہوئے جن کے لیے انھیں یہ اہتمام نہیں کرنا پڑا تو سورہ حشر (۵۹) کی آیات  
۶-۸ میں قرآن نے واضح کر دیا کہ یہ سب دین و ملت کی ضرورتوں اور قوم کے غربا و مساکین کے  
لیے خاص کر دیا گیا ہے، اس کا کوئی حصہ بھی مجاہدین میں تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ آیہ زیر بحث میں  
اللہ تعالیٰ نے ان اجتماعی مقاصد کی تفصیل کر دی ہے۔

سب سے پہلے اللہ کا حق بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ، ظاہر ہے کہ ہر چیز سے غنی اور بے نیاز ہے۔  
اُس کے نام کا حصہ اُس کے دین ہی کی طرف لوٹتا ہے۔ لہذا اس کا اصلی مصرف وہ کام ہوں گے جو  
دین کی نصرت اور حفاظت و مدافعت کے لیے مسلمانوں کا نظم اجتماعی اپنی دینی ذمہ داری کی حیثیت  
سے انجام دیتا ہے۔

دوسرا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا گیا ہے۔ آپ کی شخصیت میں اُس وقت نبوت و  
رسالت کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت کے سربراہ کی ذمہ داری بھی جمع ہو گئی تھی اور آپ کے



## الْجَمْعُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣١﴾

کرو)، اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اُس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن اتاری تھی، جس دن دونوں گروہوں میں مڈ بھڑ ہوئی تھی، اور (جان رکھو کہ) اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ۳۱

اوقات کا لمحہ لمحہ اپنے یہ منصبی فرائض انجام دینے میں صرف ہو رہا تھا۔ اس ذمہ داری کے ساتھ اپنی معاش کے لیے کوئی کام کرنا آپ کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس صورت حال میں ضروری تھا کہ اس مال میں آپ کا حق بھی رکھا جائے۔ اس کی نوعیت کسی ذاتی ملکیت کی نہیں تھی کہ اسے آپ کے وارثوں میں تقسیم کیا جاتا۔ لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد یہ آپ سے آپ اُن کاموں کی طرف منتقل ہو گیا جو آپ کی نیابت میں مسلمانوں کے نظم اجتماعی کے لیے انجام دینا ضروری تھے۔

تیسرا حق 'ذی القربی' کا بیان کیا گیا ہے۔ اس سے، ظاہر ہے کہ آپ کے وہ قرابت دار مراد ہیں جن کی کفالت آپ کے ذمے تھی اور جن کی ضرورتیں پوری کرنا اخلاقی لحاظ سے آپ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ آپ کی حیثیت تمام مسلمانوں کے باپ کی تھی۔ چنانچہ آپ کے بعد یہ ذمہ داری عرفاً و شرعاً مسلمانوں کے نظم اجتماعی کو منتقل ہوئی اور ذی القربی کا حق بھی، جب تک وہ دنیا میں رہے، اسی طرح قائم رہا۔

چوتھا حق یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا ہے۔ اُن کا حق بیان کرتے ہوئے اُس 'ل' کا اعادہ نہیں فرمایا جو اوپر اللہ، رسول اور ذی القربی، تینوں کے ساتھ آیا ہے، بلکہ اُن کا ذکر ذی القربی کے ذیل ہی میں کر دیا ہے۔ اس سے مقصود اس طبقے کی عزت افزائی ہے کہ گویا یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقربا ہی کے تحت ہیں۔ یہ حق کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔ ہر وہ معاشرہ جو ان طبقات کی ضرورتوں کے لیے حساس نہیں ہے، جس میں یتیم دھکے کھاتے، مسکین بھوکے سوتے اور مسافر اپنے لیے کوئی پرسان حال نہیں پاتے، اُسے اسلامی معاشرے کا پاکیزہ نام نہیں دیا جاسکتا۔





إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى وَالرَّكْبُ  
أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُمْ لَخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَدِ ۚ وَلَكِنَّ

یاد کرو، جب تم وادی کے قریبی کنارے پر تھے اور وہ دور کے کنارے پر، اور قافلہ  
تم سے نیچے تھا۔ اگر تم باہم وقت ٹھیرا کر نکلتے تو جو وقت ٹھیراتے، اُس میں لازماً آگے  
پیچھے ہو جاتے۔ لیکن اللہ نے کوئی فرق نہیں ہونے دیا، اس لیے کہ اللہ اُس معاملے کا

۴ یعنی وہ تائید و نصرت جو بدر کے مواقع پر نازل کی گئی۔ فیصلے کے دن سے مراد غزوہ بدر کا  
دن ہے۔ اُس کو فیصلے کے دن سے تعبیر کرنے کی وجہ پیچھے بیان ہو چکی ہے۔

۵ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ روئے سخن اُنھی نکتہ چینیوں کی طرف ہے جنہوں نے اموال غنیمت  
سے متعلق سوالات اٹھائے تھے۔ اس جملے میں ایک اور پہلو بھی قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے  
ہیں:

”... یوں نہیں فرمایا کہ اگر تم اُس نصرت الہی پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے تم پر اتاری، بلکہ یوں  
فرمایا کہ اپنے بندے پر اتاری، جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ کسی گروہ کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے  
کہ یہ کامیابی جو حاصل ہوئی ہے، یہ اُس کا کارنامہ ہے۔ یہ جو کچھ ہوا ہے، اللہ کی کارسازی اور  
اُس رسول کی برکت سے ہوا ہے جس کی مدد کے لیے اللہ نے اپنی غیبی فوج بھیجی۔ اللہ ہر چیز پر  
قادر ہے۔ نہ اللہ کسی کا محتاج ہے اور نہ اُس کا رسول کسی کا دست نگر ہے۔ اللہ جب چاہے گا،  
اپنے رسول کی مدد کے لیے اپنی افواج قاہرہ بھیج دے گا۔“ (تذکر قرآن ۳/۴۸۳)

۶ یعنی اُس کنارے پر جو مدینے سے قریب تھا۔

۷ مطلب یہ ہے کہ اگر تم دونوں فریق اپنے طور پر یہ طے کر کے نکلتے کہ ایک کو قافلے کی  
حفاظت کا بہانہ بنا کر حملہ کرنا ہے اور دوسرے کو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر حملہ آور کو سبق سکھانا اور  
اُس پر اپنی دھاک بٹھا دینی ہے تو کبھی اس طرح نہ پہنچ سکتے کہ قافلہ ابھی مسلمانوں کی زد میں ہوتا  
اور دونوں لشکر آمنے سامنے آ کھڑے ہوتے۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ قریش کے دل بادل لشکر کے



الانفال  
۸



لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ  
بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۖ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٧٢﴾  
إِذْ يُرِيكُهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ

فیصلہ کر دے جس کو ہو کر رہنا تھا تا کہ جس کو ہلاک ہونا ہے، وہ حجت دیکھ کر ہلاک ہو اور  
جسے زندگی حاصل کرنی ہے، وہ حجت دیکھ کر زندگی حاصل کرے<sup>۸</sup>۔ اور اس میں تو کوئی شبہ  
ہی نہیں کہ اللہ سمیع و علیم ہے۔ یاد کرو، (اے پیغمبر)، جب اللہ تمہارے خواب میں اُن کو

پہنچنے سے پہلے ہی قافلہ بہ حفاظت نکل چکا ہوتا اور اُن کے لیے حملے کا کوئی جواز باقی نہ رہتا۔ چنانچہ  
اُن کے اندر کے لوگ ہی اصرار کرتے کہ ہم جس اندیشے سے نکلے تھے، وہ غلط ثابت ہوا، اب حملہ  
کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور وہ مجبور ہو جاتے کہ سب تیاریوں کے باوجود جنگ کیے بغیر ہی مکہ  
لوٹ جائیں۔

۸ آیت میں 'هَلَكَ' اور 'حَيَّ' کے ساتھ 'عَنْ' آیا ہے۔ یہ منبع و مصدر کے مفہوم پر دلالت  
کے لیے ہے۔ عربی زبان میں یہ اس مفہوم کے لیے بھی آتا ہے۔ ہلاکت اور زندگی سے مراد  
روحانی و معنوی ہلاکت اور زندگی ہے اور حجت یا 'بَيِّنَةٌ' سے اُس فرقان کی طرف اشارہ مقصود ہے  
جو غزوہ بدر کے موقع پر ظاہر ہوا اور جس نے حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ہر سلیم الطبع انسان پر  
واضح کر دیا۔

۹ صفات الہی کا یہ حوالہ اُس پوری اسکیم کے تعلق سے آیا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ استاذ  
امام لکھتے ہیں:

”...مطلب یہ ہے کہ کہاں تم، کہاں قریش اور کہاں قافلہ، لیکن اللہ تعالیٰ نے سب کے بھید  
معلوم کر لیے، سب کی سرگوشیاں سن لیں اور سب کے ارادے تاڑ لیے اور پھر سب کو اس طرح  
جمع کر کے وہ بات پوری کر کے دکھا دی جو اُس نے طے کر لی تھی، اس لیے کہ وہ سمیع و علیم





وَلْتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ  
الصُّدُورِ ۝۴۳ وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ التَّقَيْتُمْ فِي آَعَيْنِكُمْ قَلِيلًا  
وَيُقَلِّلُكُمْ فِي آَعَيْنِهِمْ لِيَقْضَى اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۖ وَإِلَى اللَّهِ  
تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝۴۴

تھوڑا دکھا رہا تھا۔ اگر وہ کہیں تم کو اُنھیں زیادہ دکھا دیتا تو ضرور تم لوگ ہمت ہار جاتے  
اور جو معاملہ درپیش تھا، اُس کے بارے میں جھگڑنے لگتے، مگر اللہ نے بچا لیا۔ یقیناً، وہ  
دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ اور یاد کرو، جب تمھاری مڈ بھڑ کے وقت وہ تم لوگوں کی  
نگاہوں میں اُنھیں کم کر کے دکھا رہا تھا اور تمھیں اُن کی نگاہوں میں کم کر کے دکھا رہا تھا  
تا کہ اللہ اُس معاملے کا فیصلہ کر دے جس کو ہو کر رہنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام معاملات  
اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔ ۴۲-۴۴

ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۴۸۴)

۸۰ روایا میں چیزیں بعض اوقات اُن کی معنوی حقیقت کے اعتبار سے دکھائی جاتی ہیں۔ اس  
موقع پر بھی یہی ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کا لشکر انتہائی کم تعداد میں نظر آیا۔ یہ اُن کی  
معنوی قلت تھی جو قلت تعداد کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

۸۱ یہ اُسی گروہ سے کہا ہے جس کا ذکر سورہ کی ابتدا سے چلا آ رہا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اگر قریش  
کے لوگ کثیر تعداد میں دکھا دیے جاتے، جتنے کہ وہ فی الواقع تھے تو حضور بھی اُن کا ذکر اُسی صورت  
میں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ جو کمزور مسلمان اتنی قلیل تعداد کا سن کر بھی آمادہ جنگ نہیں ہو  
رہے تھے، وہ بالکل ہی ہمت ہار بیٹھتے اور ایسا اختلاف پیدا ہو جاتا کہ جنگ کے لیے نکلنا ہی ممکن نہ  
رہتا۔

۸۲ یعنی کمزوری کے اظہار سے بچا لیا اور کمزور مسلمان بھی کچھ بحث و تمحیص کے بعد مقابلے



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ  
كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٣٥﴾ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا  
فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٣٦﴾

ایمان والو، جب (آئندہ بھی) کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تا کہ تم کامیاب ہو۔ اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو<sup>۸۶</sup> اور آپس میں جھگڑو نہیں کہ اس کے نتیجے میں ہمت ہار جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ثابت قدم رہو، اس لیے کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے جو ثابت قدم رہنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

۸۳ یعنی اس لیے کم کر کے دکھا رہا تھا کہ ایک دوسرے کو اس طرح دیکھ کر کوئی فریق بھی خوف نہ کھائے اور وہ فرقان ظاہر ہو جائے جس کا ظہور خدا کی اسکیم میں طے ہو چکا تھا۔  
۸۴ اللہ کا ذکر ثابت قدمی کا ذریعہ ہے اور ثابت قدمی اس لیے ضروری ہے کہ اللہ کی نصرت اس کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ یہاں بہت ذکر کرنے کے لیے کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حالات زیادہ صبر آزما ہوں تو ذکر بھی زیادہ مقدار میں مطلوب ہوگا۔

۸۵ اصل الفاظ ہیں: 'لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ'۔ قرآن کی تعبیرات میں 'فَلَاح' ایک جامع لفظ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ دنیا اور آخرت، دونوں کی کامیابی پر مشتمل ہے۔ مجرد غلبہ تو ہو سکتا ہے کہ بغیر ذکر الہی کے بھی حاصل ہو جائے، لیکن وہ فلاح کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ فلاح اُسی غلبے سے حاصل ہوگی جس کا دروازہ ذکر الہی کی مدد سے کھلے اور جس میں غلبہ حاصل کرنے والوں کو خدا کی معیت حاصل ہو۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۸۷)

۸۶ اللہ و رسول کی اطاعت کا یہ خاص مفہوم بھی یہاں پیش نظر ہے کہ دشمن کے مقابلے میں







وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ  
وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٢٤﴾  
وَإِذْ زَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمْ الْيَوْمَ

والے ہوں۔ تم اُن لوگوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو  
اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کا رویہ یہ ہے کہ خدا کی راہ سے روکتے ہیں،  
دراں حالیکہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اللہ اُس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یاد کرو، جب  
شیطان نے اُن کے اعمال اُنھیں خوش نما بنا کر دکھائے اور کہا کہ آج لوگوں میں کوئی

پورے نظم اور ڈسپلن کے ساتھ اللہ و رسول کے احکام کی پیروی کی جائے، اس لیے کہ ذکر الہی سے  
محرومی جس طرح دل و دماغ کو منتشر کر دیتی ہے، ڈسپلن کی کم زوری اُسی طرح جماعت کے نظم کو  
درہم برہم کر کے رکھ دیتی ہے۔

۸۷۔ یہی بات اوپر افراد کو پیش نظر رکھ کر ارشاد ہوئی تھی۔ یہاں یہ جماعت کو پیش نظر رکھ کر کہی  
گئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مطلب یہ ہے کہ خدا کی مدد و نصرت اور اُس کی معیت کے طالب ہو تو اپنے جماعتی کردار

سے اُس کا استحقاق پیدا کرو۔ خدا منتشر بھیڑ کا ساتھ نہیں دیتا، بلکہ اُن لوگوں کا ساتھ دیتا ہے جو

اُس کی راہ میں جہاد کے لیے بنیان مرصوص بن کر کھڑے ہوں۔“ (تدبر قرآن ۳/۴۸۸)

۸۸۔ یہ اُس طمطراق اور جذبہ نمائش کا ذکر ہے جس کا مظاہرہ قریش کے لیڈروں نے جنگ بدر

کے لیے نکلتے ہوئے کیا تھا۔ مسلمانوں کو اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ طمطرنہ، طمطراق اور ریا کسی

بندہ مومن کے شایان شان نہیں ہے۔ رزم ہو یا بزم، خدا کے بندوں پر عبدیت کی تواضع اور فروتنی

ہر حال میں نمایاں رہنی چاہیے، اس لیے کہ اُن کی جنگ محض جنگ نہیں، بلکہ اللہ کی عبادت ہے اور

ضروری ہے کہ اُس کی یہ شان ہر جگہ قائم رہے۔ اُنھیں جو کچھ کرنا ہے، ہمیشہ اللہ کے لیے کرنا ہے



مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌّ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَآتِ الْفِتْنَةَ نَكَصَ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ وَقَالَ إِنِّي بَرِيٌّ مِّنْكُمْ إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ ۖ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٧٨﴾ اِذْ يَقُولُ الْمُنْفِقُونَ

نہیں جو تم پر غلبہ پا سکے اور (مطمئن رہو)، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مگر جب دونوں گرو ہوں گا آ مناسا منا ہوا تو وہ الٹے پاؤں چلتا بنا اور کہنے لگا کہ میں تم سے بری ہوں، میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ہو، میں اللہ سے ڈرتا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ یاد کرو، جب منافقین اور وہ بھی جن

اور اُس کی داد بھی آخرت میں اُسی سے لینی ہے۔ یہ اخلاص اُن سے جس طرح عبادت میں مطلوب ہے، اُسی طرح جنگ میں بھی مطلوب ہے۔

۷۹ شیطان نے یہ باتیں، ظاہر ہے کہ خود سامنے آ کر نہیں کہیں، بلکہ اپنے طریقے کے مطابق انسانوں میں سے اپنے پیروں سے کہلائیں۔ قرآن کے بعض دوسرے مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ اس طرح کے موقعوں پر اُس کی یہ خدمت مدینہ کے یہود انجام دیتے رہے۔ قرین قیاس ہے کہ اس موقع پر بھی شیطان کی انگلیخت سے اُنھی نے پہلے قریش کو بڑھاوے دیے ہوں گے کہ شاباش، آگے بڑھو، آج کس میں دم ہے کہ تمہارا مقابلہ کر سکے، مگر وقت آنے پر پیچھے ہٹ گئے ہوں گے کہ مبادا وہ بھی خدا کے عذاب کی گرفت میں آ جائیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خوب جانتے تھے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہی پیغمبر ہیں جن کے آنے کی پیشین گوئی اُن کے صحیفوں میں کی گئی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں وہ آپ کو اس طرح پہچانتے تھے، جس طرح کوئی مہجور باپ اپنے بیٹے کو پہچانتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی قوم سے باہر کسی نبوت و رسالت کو وہ کسی قیمت پر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، لہذا چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا یہ خطرہ مول لے اور انھیں اُس آزمائش سے نجات دلا دے جس میں وہ آپ کی بعثت کے بعد مبتلا ہو گئے تھے۔ دونوں لشکروں کو







وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّهُوا دِينَهُمْ وَمَنْ  
يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٤٩﴾  
وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ  
وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿٥٠﴾ ذَلِكَ بِمَا  
قَدَّمْتُمْ أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿٥١﴾

کے دلوں کو روگ لگا ہوا ہے، (خود تمہارے متعلق) کہہ رہے تھے کہ ان کے دین  
نے ان لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا ہے، دراصل حالیکہ جو اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں،  
اللہ ضرور اُن کی مدد کرتا ہے، اس لیے کہ اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا  
ہے۔ ۴۵-۴۹

اگر تم دیکھ پاتے (تو دیکھتے کہ اُس وقت کیا گزر رہی تھی)، جب فرشتے ان منکروں  
کی رو حیں قبض کر رہے تھے، ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے ہوئے اور یہ  
کہتے ہوئے کہ اب چکھو جلنے کا عذاب۔ یہ اُس کا بدلہ ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں آگے  
بھیجا تھا اور اس لیے ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ ۵۰-۵۱

آمنے سامنے دیکھ کر شیطان نے جو کچھ کہا ہے، اُس کا ظہور بھی یہود کے رویے میں ہوا، جب کہ  
قریش کی پیٹھ ٹھونکنے کے باوجود وہ اُن کا ساتھ دینے کے لیے کھلم کھلا میدان میں نہیں اترے۔  
قرآن نے یہاں اشارے کنایے میں اُن کو بھی متنبہ کر دیا ہے اور مسلمانوں کو بھی بتا دیا ہے کہ جو  
کچھ سامنے دیکھتے ہو، اُس کے پیچھے کون کون چھپا ہوا ہے۔

۹۰ یعنی ہوش و خرد سے عاری کر کے اس خبط میں مبتلا کر دیا ہے کہ مولے ہو کر بھی شہبازوں  
سے لڑ سکتے اور چیونٹی ہو کر بھی پہاڑوں سے ٹکرا سکتے ہو۔



كَذَابِ اِلٰ فِرْعَوْنَ ۚ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ كَفَرُوا بِآيَاتِ  
 اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوبِهِمْ ۖ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٥٢﴾  
 ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْهَا  
 مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۚ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٥٣﴾ كَذَابِ اِلٰ فِرْعَوْنَ ۚ

ان کے ساتھ وہی معاملہ ہوا ہے جو آل فرعون اور اُن سے پہلے کے لوگوں کے  
 ساتھ پیش آیا تھا۔ اُنھوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کر دیا تو اللہ نے اُن کے گناہوں پر  
 اُنھیں پکڑ لیا۔<sup>۹۲</sup> بے شک، اللہ قوی ہے، وہ سخت سزا دینے والا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوا  
 کہ اللہ کسی نعمت کو جو اُس نے کسی قوم کو عطا کی ہو، اُس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک  
 وہ خود اپنی حالت میں تبدیلی نہ کریں۔ نیز اس وجہ سے کہ اللہ سمیع و علیم<sup>۹۳</sup> ہے۔ وہی ہوا

۹۱ چنانچہ ٹھیک وہی معاملہ کر رہا ہے جس کے تم اپنے کرتوتوں کے نتیجے میں مستحق ہو چکے ہو۔  
 آیت میں اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلّٰمٍ لِّلْعَبِيْدِ کے الفاظ ہیں۔ ان میں مبالغہ پر جو نفی آئی ہے، وہ  
 مبالغہ فی النفی کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمہ اسی کے لحاظ سے کیا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو دوسرے  
 مقامات میں اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ\* (بے شک، اللہ ذرے کے برابر بھی کسی پر ظلم نہیں  
 کرتا) اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا\*\* (بے شک، اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا) کے  
 الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید اور کلام عرب، دونوں میں موجود ہیں۔

۹۲ اشارہ ہے اُن سزاؤں کی طرف جو پے در پے اُن پر نازل ہوئیں تاکہ وہ متنبہ ہوں اور  
 پیغمبر کی بات سننے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ بدر کے موقع پر قریش کو جو کچھ پیش آیا، اُس کی نوعیت  
 بھی یہی تھی۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ ان کے ساتھ وہی معاملہ ہوا ہے جو فرعون والوں اور اُن سے پہلے

\* النساء: ۴۰۔

\*\* یونس: ۱۰۔



وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ  
وَاعْرِقْنَاهُمْ لِفِرْعَوْنَ ۖ وَكُلُّ كَانُوا ظَالِمِينَ ﴿٥٣﴾

ہے جو آل فرعون اور اُن سے پہلے کے لوگوں کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اُنھوں نے اپنے  
پروردگار کی نشانیوں کو جھٹلایا تو بالآخر اُن کے گناہوں کی پاداش میں ہم نے اُنھیں ہلاک  
کیا اور فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا۔ یہ سب ظالم لوگ تھے۔ ۵۲-۵۳  
کے لوگوں کو پیش آیا تھا۔

۹۳ مطلب یہ ہے کہ خدا کا عذاب اندھے کی لاٹھی نہیں ہے۔ وہ تمام تر خدا کے سمع و علم پر مبنی  
ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی قوم کو سرفرازی کے لیے منتخب کر لینے کے بعد وہ جب اُسے تباہی کے حوالے کرتا  
ہے تو اُس کے کرتوتوں کی بنیاد پر کرتا ہے۔ قوموں کے عزل و نصب سے متعلق یہ خدا کی غیر متبدل  
سنت ہے۔ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت ۵۸ میں فرمایا ہے کہ خدا یہ معاملہ دنیا کی ہر قوم کے ساتھ کر  
رہا ہے اور قیامت تک کرتا رہے گا۔ رسولوں کی بعثت کے بعد، البتہ یہ بالکل مشہود ہو جاتا ہے۔ اُن  
کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود جب کوئی قوم آیات الہی کو جھٹلا دیتی ہے تو یہ اس بات کا  
اظہار ہوتا ہے کہ وہ آخری درجے میں بگڑ چکی ہے، لہذا اسی درجے میں ہلاکت اور تباہی کے حوالے  
کردی جاتی ہے۔

۹۴ یعنی تنبیہات سے آگے اب وہ نوبت بھی آگئی ہے جو پہلی قوموں کے معاملے میں آتی  
رہی ہے کہ وہ خدا کی کھلی ہوئی نشانیوں کو بھی جھٹلا دیتی تھیں۔ بدر میں خدا کے فرقان کو دیکھ لینے کے  
بعد قریش نے یہی کیا ہے، اس لیے اب اس کا نتیجہ بھی بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ فرعون اور اُس  
کے لشکروں کے لیے اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ خدا نے اُنھیں غرق کر دیا تھا۔

اس تشریح سے واضح ہے کہ 'كَذَّابِ الْفِرْعَوْنَ' کے الفاظ ان آیتوں میں اگرچہ دو مرتبہ  
آئے ہیں، مگر یہ تکرار کے لیے نہیں آئے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:





إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝  
الَّذِينَ عَاهَدْتَ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ  
وَّهُمْ لَا يَتَّقُونَ ۝۶ فَمَا تَتَّقُهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرَّدَ بِهِمْ مَنْ  
خَلَفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذْكُرُونَ ۝۷ وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ

یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ لوگ ہیں جنہوں نے انکار کر دیا ہے، پھر کسی  
طرح ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ خاص کر وہ لوگ جن سے، (اے پیغمبر)، تم نے عہد  
لیا، پھر ہر مرتبہ وہ اپنا عہد توڑ دیتے ہیں اور ذرا نہیں ڈرتے (کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا)۔ سو  
انہیں لڑائی میں پاؤ تو ان کو ایسی مار مارو کہ جو ان کے پیچھے ہیں، اُن کو بھی تتر بتر کر دو تاکہ وہ

”... یہ تکرار نہیں ہے، بلکہ دونوں جگہ دو باتیں بتائی گئی ہیں۔ پہلے یہ بتایا کہ یہ اُسی نوع کی  
تنبیہ ہے جس نوع کی تنبیہ فرعون اور دوسری قوموں کو کی گئی۔ پھر یہ بتایا کہ اگر اس تنبیہ سے  
انہوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو بالآخر ان پر بھی اُسی طرح فیصلہ کن عذاب آجائے گا، جس طرح اُن  
قوموں پر آیا۔“ (تدبر قرآن ۳/۴۹۷)

۹۵ اس لیے کہ انسان اُسی وقت تک انسان ہے، جب تک وہ سوچنے سمجھنے اور علم و عقل کی  
روشنی میں فیصلے کرنے کی صلاحیت سے بہرہ یاب ہے۔ یہ صلاحیت ختم ہو جائے تو اُس میں اور  
جانوروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ آیت میں 'شَرَّ الدَّوَابِّ' کے الفاظ آئے ہیں، ان میں  
جوزور اور شدت ہے، اُس کی وضاحت پیچھے آیت ۲۲ کے تحت ہو چکی ہے۔

۹۶ یہ اشارہ یہود اور بعض دوسرے قبائل کی طرف ہے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
ہجرت فرمانے کے بعد حسن جوار اور باہمی تعاون اور مددگاری کے معاہدے کر لیے تھے۔ لیکن جس  
طرح کے حالات کے لیے یہ معاہدے کیے گئے تھے، وہ جب پیش آتے تو یہ کبھی اُن کی پاس داری  
نہیں کرتے تھے، بلکہ ہمیشہ اُنہیں توڑ دیتے تھے۔







إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ إِنْ لَمْ يَحِبُّ الْخَائِنِينَ ⑤۸  
وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ ⑤۹  
وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ

سبق حاصل کریں۔ (تم لوگ، البتہ ہر حال میں عہد کی پابندی کرو) اور اگر کسی قوم سے بد عہدی کا اندیشہ ہو تو اُن کا عہد اُسی طرح برابری کے ساتھ اُن کے آگے پھینک دو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بد عہدوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۵۵-۵۸

یہ منکرین اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ نکل بھاگے ہیں، یہ ہرگز ہمارے قابو سے باہر نہیں جاسکتے۔ تم لوگوں سے جس قدر ہو سکے، ان کے لیے فوج اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار

۹۷ یعنی لڑائی کے لیے ابھی سامنے نہیں آئے، مگر پیچھے بیٹھے ہوئے پرتول رہے ہیں۔  
۹۸ اصل میں 'عَلَى سَوَاءٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان سے کیا مراد ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...عَلَى سَوَاءٍ“ کا مفہوم یہ ہے کہ اُنھی کے برابر اقدام تم بھی کرنے کے مجاز ہو۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دینا چاہیے، بلکہ جواب ہم وزن ہونا چاہیے۔ بعض لوگوں نے اس سے یہ لازم قرار دیا ہے کہ ختم معاہدہ کی اطلاع فریق ثانی کو دے دینی چاہیے۔ اُن کی اس بات کی کوئی دلیل ان الفاظ میں مجھے نظر نہیں آتی۔ البتہ، یہ بات مستحب ہوتی ہے کہ محض فرضی اندیشہ کسی معاہدے کو کالعدم قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ عملاً اُس کی خلاف ورزی کا اظہار ہوا ہو۔ اول تو یہاں 'تَخَافَنَّ' کا جو فعل استعمال ہوا ہے، اُس میں خود تاکید ہے۔ دوسرے 'عَلَى سَوَاءٍ' کی قید بھی ان کو نمایاں کر رہی ہے۔“

(تذکر قرآن ۳/۳۹۹)

۹۹ یعنی جب اللہ پسند نہیں کرتا تو اہل ایمان کو بھی پسند نہیں کرنا چاہیے۔



بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۖ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ

رکھو جس سے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے ان دشمنوں پر تمہاری ہیبت رہے اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی جنہیں تم نہیں جانتے ہو، اللہ انہیں جانتا ہے۔ (اس مقصد کے لیے) جو کچھ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے، وہ تمہیں پورا کر دیا جائے گا اور

۱۰۰ اصل الفاظ ہیں: اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ۔ یہ اُسی مفہوم میں ہے جس میں اُعْجِزَہ الصید کا جملہ بولا جاتا ہے، یعنی فاتہ ولم يقدر عليه۔

۱۰۱ اصل میں لفظ قوت آیا ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ عددی قوت کے لیے بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمہارے پاس مجاہدین کی ایک منظم فوج ہر وقت تیار رہنی چاہیے تاکہ بوقت ضرورت ان منکرین حق کے خلاف کارروائی کی جاسکے۔ یہ نہ ہو کہ جب کسی جنگی مہم کی صورت پیش آئے تو رضا کاروں کو اکٹھا کرنا شروع کر دو۔ اپنی استطاعت کے مطابق یہ فوجی قوت اب تمہیں تیار رکھنی چاہیے اور زیادہ سے زیادہ بڑھالینی چاہیے۔

۱۰۲ یعنی وہ گھوڑے جنہیں تربیت دے کر خاص اسی مقصد کے لیے تیار رکھا گیا ہو۔ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ اُس زمانے کی جنگ میں گھوڑوں کو وہی اہمیت حاصل تھی جو اس زمانے میں ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کو حاصل ہے۔

۱۰۳ یہ اُن قوتوں کی طرف اشارہ ہے جو ابھی سامنے نہیں آئی تھیں، لیکن اللہ کو معلوم تھا کہ جلد یا بدیر کسی نہ کسی صورت میں سامنے آجائیں گی۔ مثلاً یہود اور منافقین، نیز وہ قبائل جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر جانب داری کے معاہدے کر رکھے تھے، پھر رومی، غسانی اور ایرانی۔ یہ بھی متنبہ ہو چکے تھے اور سرزمین عرب میں جو کچھ ہو رہا تھا، اُسے تشویش کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ۱۰۴ یعنی اُسی اصول کے مطابق پورا کر دیا جائے گا جو نیکیوں کے اجر کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھا ہے۔





وَأَنْتُمْ لَا تَظْلَمُونَ ④

وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلَامِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ  
هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ⑤ وَإِنْ يُرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ  
اللَّهُ هُوَ الَّذِي آيَدَكَ بِصِرْهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ ⑥ وَالْفَ بَيْنَ

تمہارے لیے کوئی کمی نہ ہوگی۔ ۵۹-۶۰

یہ لوگ اگر صلح کی طرف جھکیں، (اے پیغمبر)، تو تم بھی اس کے لیے جھک جاؤ اور  
اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بے شک، وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ اگر وہ تم کو دھوکا بھی دینا  
چاہیں گے تو مطمئن رہو کہ اللہ تمہارے لیے کافی ہے۔ وہی ہے جس نے اپنی مدد سے  
اور ایمان والوں کے ذریعے سے تمہاری تائید کی اور ایمان والوں کے دل ایک

۱۰۵ سورہ توبہ میں منکرین حق کے استیصال کا آخری حکم آنے سے پہلے یہی ہدایت تھی کہ  
قریش اگر جنگ کرنا چاہیں تو اُن کے ساتھ جنگ اُس وقت تک جاری رکھی جائے، جب تک  
سرزمین عرب میں دین سب اللہ کے لیے نہ ہو جائے، لیکن وہ صلح کے خواہاں ہوں تو اُن سے صلح کر  
لی جائے تاکہ یہی مقصد امن کے ماحول میں اور دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے حاصل کیا جاسکے۔  
صلح حدیبیہ کا معاہدہ اسی ہدایت کے تحت کیا گیا تھا۔ قریش جب اس معاہدے پر قائم نہیں رہے تو  
اس کے بعد، البتہ حکم دے دیا گیا کہ اب ان سے ایمان کے سوا کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی۔ یہ  
ہدایات اگرچہ خاص اُن لوگوں کے لیے تھیں جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے  
اتمام حجت کیا گیا تھا، لیکن ان سے یہ رہنمائی بعد کے زمانوں کے لیے بھی یقیناً حاصل ہوتی ہے کہ  
جنگ کا مقصد اگر صلح سے حاصل ہو سکتا ہو تو صلح کو ترجیح دینی چاہیے اور محض اس اندیشے سے صلح کی  
پیش کش ٹھکرانی نہیں چاہیے کہ دشمن نیک نیتی سے صلح نہیں کرنا چاہتا، بلکہ غداری کا ارادہ رکھتا ہے۔  
۱۰۶ اس اجمال میں جو کچھ مضمحل ہے، قلم اُس کی تعبیر سے قاصر ہے۔



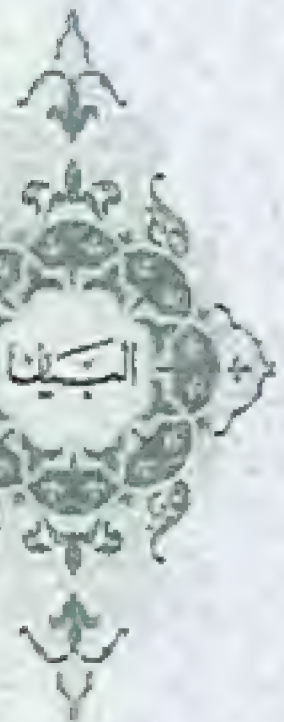
قُلُوبِهِمْ طَلَوْا أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ  
وَلَكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٦٣﴾  
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٤﴾

دوسرے کے ساتھ جوڑ دیے۔ اگر تم زمین میں جو کچھ ہے، سب خرچ کر ڈالتے، تب بھی  
اُن کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے، مگر اللہ نے اُنہیں جوڑ دیا۔ یقیناً اللہ زبردست ہے،  
بڑی حکمت والا ہے۔ ۶۱-۶۳

اے پیغمبر، تمہارے لیے اللہ کافی ہے اور یہی مومنین کافی ہیں جنہوں نے تمہاری

۷۰۷ اوپر فرمایا ہے کہ اللہ نے مومنوں کے ذریعے سے تمہاری تائید کی۔ یہ اُس کی وضاحت  
ہے کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی، بلکہ خاص تائید الہی کا کرشمہ تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... کسی شیطانی مقصد کے لیے کسی بھیڑ کا اکٹھا کر لینا تو مشکل نہیں ہوتا، ہر نعرہ باز یہ کام کر سکتا  
ہے، لیکن خاص اللہ کے کام کے لیے جس میں خدا کی خوشنودی اور آخرت کی طلب کے سوا کسی  
بھی دوسری چیز کا کوئی ادنیٰ شائبہ نہ ہو، کلمہ حق کے جاں نثاروں کی ایک جمعیت کا فراہم ہو جانا  
بغیر اس کے ممکن نہیں ہوا کہ اللہ نے تائید کی اور اُس کی توفیق بخشی نے رہنمائی فرمائی۔ جو لوگ  
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمع ہوئے تھے، اپنی یہ نئی زندگی اختیار کرنے سے پہلے، دور جاہلیت  
کی تمام برائیوں میں آلودہ تھے، اُن کے قبیلے جدا جدا تھے اور اُن میں شدید قسم کے تعصبات  
تھے، اُن کے دیوتا الگ الگ تھے اور یہ آنکھیں بند کر کے اُن کی پرستش کرتے تھے۔ اُن کے  
مفادات باہم متضاد تھے اور یہ اُن کے حاصل کرنے کے لیے جائز و ناجائز اور عدل و ظلم  
کے تمام حدود و قیود سے آزاد تھے۔ اس طرح کے لوگوں کو اُن کے تمام تعصبات و مفادات اور  
تمام رسوم و عادات سے چھڑا کر بالکل ایک نئے سانچے میں ڈھال دینا اور اُس سانچے کو اُن کی  
نگاہوں میں اتنا محبوب بنا دینا کہ اُس کی خاطر وہ قوم، وطن، خاندان، جایداد اور بیوی بچے،  
سب کو چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوں، یہ خدا ہی کے لیے ممکن ہے۔ کوئی انسان یہ کام نہیں انجام دے





يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ ۖ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ  
صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتِينَ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا  
مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ۝٦٥



الانفال  
٨

پیروی اختیار کر لی ہے۔ اے پیغمبر، ان مومنوں کو (اُس) جنگ پر ابھارو (جس کا حکم پیچھے دیا گیا ہے)۔ اگر تمھارے لوگوں میں بیس آدمی ثابت قدم ہوں گے تو دوسو پر غالب آئیں گے اور اگر تمھارے سو ہوں گے تو ہزار منکروں پر بھاری رہیں گے، اس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو بصیرت نہیں رکھتے۔ ۶۴-۶۵

سکتا، اگرچہ وہ دنیا جہان کے سارے وسائل اُس پر صرف کر ڈالے۔“ (تذبر قرآن ۵۰۵/۳) ۱۰۸ یعنی مدد کے لیے اللہ اور رفاقت کے لیے یہی تھوڑے سے مسلمان کافی ہیں، لہذا منکرین حق کی کثرت اور اپنے ساتھیوں کی قلت کی فکر نہ کرو۔ یہ گویا وہی بات دوسرے اسلوب میں فرمائی ہے جو اوپر 'فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ، هُوَ الَّذِي آيَدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ' کے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے۔

۱۰۹ یہ اُس جہاد کے لیے ذمہ داری کی حد بیان کی ہے جس کا حکم پیچھے 'حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً وَيَكُودَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ' کے الفاظ میں دیا گیا ہے۔ یہاں اُسی کے لیے ابھارنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ مسلمانوں کی جماعت چونکہ اُس وقت زیادہ تر مہاجرین و انصار کے سابقین اولین پر مشتمل تھی اور ایمان و اخلاق کے اعتبار سے اُس میں کسی نوعیت کا کوئی ضعف نہ تھا، اس لیے وہ پابند کیے گئے کہ دس کے مقابلے میں ایک بھی ہوں تو اس ذمہ داری کو پورا کریں۔ ایمان و اخلاق کی قوت کو یہاں 'فَقَهُ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...فقہ سے مراد بصیرت ایمانی ہے۔ یہی بصیرت انسان کا اصل جوہر ہے۔ اس بصیرت کے



اَلَّذِي خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۖ فَاِنْ  
يَكُنْ مِنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ؕ وَاِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ  
اَلْفٌ يَغْلِبُوْا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۶۶

اس وقت، البتہ اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے، اس لیے کہ اُس نے جان لیا کہ تم میں کچھ کمزوری ہے۔ سو تمہارے سو ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تمہارے ہزار ایسے ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر بھاری رہیں گے۔ اور اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو (اُس کی راہ میں) ثابت قدم رہیں۔ ۶۶

ساتھ جب مومن میدان جنگ میں نکلتا ہے تو وہ اپنے تنہا وجود کے اندر ایک لشکر کی قوت محسوس کرتا ہے، اُس کو اپنے دہنے بائیں خدا کی نصرت نظر آتی ہے، موت اُس کو زندگی سے زیادہ عزیز و محبوب ہو جاتی ہے، اس لیے کہ اُس کی بصیرت اُس کے سامنے اُس منزل کو روشن کر کے دکھا دیتی ہے جو اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ یہی بصیرت اُس کے اندر وہ صبر و ثبات پیدا کرتی ہے جو اُس کو تنہا اس بصیرت سے محروم دس آدمیوں پر بھاری کر دیتی ہے۔“  
(تدبر قرآن ۵۰۶/۳)

۱۰۔ یعنی اصل حکم تو وہی ہے، لیکن اس وقت بہت سے نئے لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی تعداد اگرچہ بہت بڑھ گئی ہے، مگر دین کی بصیرت کے لحاظ سے وہ سابقین اولین کے ہم پایہ نہیں رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ذمہ داری کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے، اب اُن کے سو پابند ہوں گے کہ اللہ کے حکم پر دو سو کے مقابلے میں جنگ کریں۔

سورہ انفال کی یہ آیتیں، اگر غور کیجیے تو جہاد و قتال کی ذمہ داری کے ساتھ اُس میں اللہ تعالیٰ کی نصرت کا ضابطہ بھی بالکل متعین کر دیتی ہیں۔ ان میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ جنگ میں نصرت الہی کا معاملہ ال ٹپ نہیں ہے کہ جس طرح لوگوں کی خواہش ہو، اللہ کی مدد بھی اُسی





الانفال  
۸

طرح آجائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک ضابطہ مقرر کر رکھا ہے اور وہ اسی کے مطابق اپنے بندوں کی مدد فرماتا ہے۔ آیات پر تدبر کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ نصرت الہی کا یہ ضابطہ درج ذیل تین نکات پر مبنی ہے:

اول یہ کہ اللہ کی مدد کے لیے سب سے بنیادی چیز صبر و ثبات ہے۔ مسلمانوں کی کسی جماعت کو اس کا استحقاق اُس وقت تک حاصل نہیں ہوتا، جب تک وہ یہ صفت اپنے اندر پیدا نہ کر لے۔ اس سے محروم کوئی جماعت اگر میدان جہاد میں اترتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے کسی مدد کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ 'صَبِرُواْ' اور 'صَابِرَةٌ' کی صفات سے ان آیتوں میں یہی بات واضح کی گئی ہے۔ 'وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ' کے الفاظ بھی آیات کے آخر میں اسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔

دوم یہ کہ جنگ میں اترنے کے لیے مادی قوت کا حصول ناگزیر ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے، اللہ کے حکم سے ہوتا ہے اور آدمی کا اصل بھروسہ اللہ پروردگار عالم ہی پر ہونا چاہیے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا عالم اسباب کے طور پر بنائی ہے۔ دنیا کی یہ اسکیم تقاضا کرتی ہے کہ نیکی اور خیر کے لیے بھی کوئی اقدام اگر پیش نظر ہے تو اُس کے لیے ضروری وسائل ہر حال میں فراہم کیے جائیں۔ یہ اسباب و وسائل کیا ہونے چاہئیں؟ دشمن کی قوت سے ان کی ایک نسبت اللہ تعالیٰ نے انفال کی ان آیتوں میں قائم کر دی ہے۔ یہ اگر حاصل نہ ہو تو مسلمانوں کو اس کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ جہاد کے شوق میں یا جذبات سے مغلوب ہو کر اس سے پہلے اگر وہ کوئی اقدام کرتے ہیں تو اُس کی ذمہ داری اُنھی پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس صورت میں اُن کے لیے کسی مدد کا ہرگز کوئی وعدہ نہیں ہے۔

سوم یہ کہ مادی قوت کی کمی کو جو چیز پورا کرتی ہے، وہ ایمان کی قوت ہے۔ 'عَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ ضَعْفًا' اور 'بَانَتْهُمْ قُوْمٌ لَاْ یَفْقَهُوْنَ' میں یہی بات بیان ہوئی ہے۔ 'ضَعْفٌ' کا لفظ عربی زبان میں صرف جسمانی اور مادی کمزوری کے لیے نہیں آتا، بلکہ ایمان و حوصلہ اور بصیرت و معرفت کی



مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ط  
تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ط وَاللَّهُ عَزِيزٌ

(انھیں اعتراض ہے کہ تم لوگوں نے یہ سب خون ریزی قیدی پکڑ کر اُن سے فدیہ لینے کے لیے کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ) کسی پیغمبر کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اُس کو قیدی ہاتھ آئیں، یہاں تک کہ (اس کے لیے) وہ ملک میں خون ریزی برپا کر دے۔ (قریش کے لوگو)، یہ تم ہو جو دنیا کا سرو سامان چاہتے ہو، اللہ تو آخرت چاہتا

کمزوری کے لیے بھی آتا ہے۔ اسی طرح 'لَا يَفْقَهُوْنَ' کے معنی بھی یہاں اس کے مقابلے میں ایمانی بصیرت سے محرومی ہی کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ منکرین حق چونکہ اس بصیرت سے محروم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس معرفت سے خوب خوب نوازا ہے، اس لیے تم اگر ہزار کے مقابلے میں سو بھی ہو گے تو اللہ کی نصرت سے تمھیں اُن پر غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ تاہم اس بصیرت میں کمی ہوئی تو یہ نسبت بھی اس کے ساتھ ہی تبدیل ہو جائے گی۔

نصرت الہی کا یہ ضابطہ قدسیوں کی اُس جماعت کے لیے بیان ہوا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں اور براہ راست اللہ کے حکم سے میدان جہاد میں اتری۔ بعد کے زمانوں میں، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی ایمانی حالت کے پیش نظر یہ نسبت کس حد تک کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔

اللہ آیت کی ابتدا 'مَا كَانَ' سے ہوئی ہے۔ یہ اسلوب بیان الزام اور رفع الزام، دونوں کے لیے اختیار کیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ رفع الزام اور پیغمبر کی تنزیہہ شان کے لیے ہے۔ قریش اس بہانے سے مدینہ پر حملہ آور ہوئے تھے کہ مسلمان اُن کے قافلہ تجارت کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ جب بدر میں شکست ہو گئی تو اپنی قوم کو اُس کے اثرات سے بچانے کے لیے اُنھوں نے پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ دیکھ لو، ہمارا اندیشہ غلط نہیں تھا، انھیں جب قافلہ لوٹنے کا موقع نہیں ملا تو اب قیدی





حَكِيمٌ ۞ لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا  
أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۞

ہے اور اللہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا  
(کہ ابھی تمہیں کچھ اور مہلت دینی ہے) تو جو طریقہ تم نے اختیار کیا تھا، اُس کے  
باعث تم پر ایک عذاب عظیم نازل ہو جاتا۔ ۶۷-۶۸

پکڑ کر اُن سے فدیہ وصول کر رہے ہیں۔ یہ وہی طریقے ہیں جو ہمیشہ سے دنیا داروں کے رہے  
ہیں۔ اس طرح کے کام خدا کے پیغمبر نہیں کرتے۔ قرآن نے یہ اُن کے اس پروپیگنڈے کا جواب  
دیا ہے کہ یقیناً خدا کے پیغمبر قیدی پکڑنے اور اُن سے مال حاصل کرنے کے لیے خون ریزی نہیں  
کرتے، مگر کسی مقصد حق کے لیے خون ریزی پر مجبور ہو جائیں تو قیدی بھی پکڑتے ہیں اور مال غنیمت  
بھی حاصل کرتے ہیں تاکہ اُن مجرموں کو سزا دیں جن کے خلاف وہ جنگ کرنے کے لیے مجبور  
ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر بھی جو خون ریزی ہوئی ہے، وہ قیدی پکڑ کر اُن سے فدیہ لینے کے  
لیے نہیں ہوئی، بلکہ قریش کے لیڈروں کو اُن کی سرکشی کی سزا دینے کے لیے ہوئی ہے اور اُس وقت  
تک ہوتی رہے گی، جب تک فتنہ باقی ہے اور دین اس سرزمین میں سب اللہ کے لیے نہیں ہو  
جاتا۔ پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اب وہ اسی کے مستحق ہیں۔

۱۱۲ یہ نہیں فرمایا کہ نبی اور اُس کے پیرو اہل ایمان آخرت کے طلب گار ہیں، بلکہ یہ فرمایا کہ  
اللہ آخرت چاہتا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:  
”... اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ نبی اور اہل ایمان کے ہاتھوں جو کچھ یہ ہو رہا  
ہے، یہ اُن کی اپنی مرضی سے نہیں ہو رہا ہے، بلکہ اللہ کی مرضی اور اللہ کے حکم سے ہو رہا ہے۔ نبی  
اور اہل ایمان کی حیثیت اس سارے کام میں محض آلہ اور واسطہ کی ہے۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں،  
یہی عین اللہ کا ارادہ اور اُس کی مرضی ہے۔ اللہ کی مرضی اپنے بندوں کے لیے یہ ہے کہ وہ ہر کام  
آخرت کو اپنا نصب العین بنا کر کریں تو نبی اور اُس کے ساتھیوں کا کوئی اقدام اللہ کی مرضی کے



الانفال  
۸



فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٦٩﴾

سو (مسلمانو، تم ان کے اعتراضات کی پروا نہ کرو اور فدیہ لے کر) جو مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے، اُس کو حلال و طیب سمجھ کر کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۶۹

خلاف کس طرح ہو سکتا ہے؟ گویا بدر اور اس سلسلہ کے تمام اقدامات کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لے لی۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ عزیز و حکیم ہے۔ وہ جو ارادہ فرماتا ہے، اُس کو کوئی روک نہیں سکتا اور اُس کا ہر ارادہ عدل و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اب تم جو اثر خالی کرنا چاہتے ہو، کرتے رہو۔“ (تدبر قرآن ۵۱۱/۳)

۱۱۳ اشارہ ہے اُس طریقے کی طرف جو پیغمبر اور اُس کے ساتھیوں کو گھروں سے نکالنے، انہیں تعذیب کا نشانہ بنانے اور مدینہ میں اُن کا تعاقب کر کے انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دینے کی صورت میں قریش نے اختیار کر رکھا تھا۔ اس کے لیے اصل میں لفظ اُخِذ آیا ہے۔ یہ لینے، پکڑنے، اختیار کرنے، کسی ڈھب کو اپنانے وغیرہ، سب مفاہیم کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہارے قیدی پکڑے گئے اور انہیں فدیہ لے کر رہا کر دیا گیا، ورنہ حق تو یہ تھا کہ تمہارے جرائم کی پاداش میں تم پر وہ فیصلہ کن عذاب اسی موقع پر نازل کر دیا جاتا جو پیغمبروں کے منکرین پر نازل کیا جاتا ہے اور تمہاری پوری قوم اس طرح مٹا دی جاتی کہ اُس کا نام و نشان بھی زمین پر باقی نہ رہتا۔

۱۱۴ یعنی جو چیز حلال و طیب ہے، اُسے بغیر کسی تردد کے کھاؤ برتو، لیکن اس بات سے ڈرتے رہو کہ کسی ایسی چیز میں آلودہ نہ ہو جاؤ جس سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ اس کے باوجود چھوٹی موٹی کوئی غلطی یا کوتاہی ہو گئی تو مطمئن رہو، اللہ غفور و رحیم ہے۔







يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ إِنَّ يَعْلَمَ اللَّهُ  
فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِيَكُمْ خَيْرًا مِّمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرَ لَكُمْ وَاللَّهُ  
غَفُورٌ رَحِيمٌ ④ وَإِنْ يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِنْ  
قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ⑤

اے پیغمبر، تمہارے قبضے میں جو قیدی ہیں، اُن سے کہہ دو کہ اللہ تمہارے دلوں میں  
کوئی خیر دیکھے گا تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے، اُس سے بہتر تم کو عطا فرمائے گا اور تمہارے  
گناہ معاف کر دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ اور  
اگر یہ تمہارے ساتھ بد عہدی کرنا چاہتے ہیں تو ان سے بعید نہیں، اس لیے کہ اس سے  
پہلے انھوں نے خدا سے بد عہدی کی ہے۔ پھر اسی کا نتیجہ تھا کہ اللہ نے تم کو ان پر قابو  
دے دیا اور اللہ سب کچھ جانتا ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ ۷۰-۷۱

۱۱۵ یعنی حق و انصاف کی نگاہ سے اس سارے معاملے پر غور کرنے کا رجحان اور قبول حق کے  
لیے آمادگی دیکھے گا تو اُس کی رحمت اور توفیق تمہاری طرف متوجہ ہوگی اور اس فدیے سے کہیں بڑھ  
کر، جو تم سے لیا گیا ہے، وہ تمہیں اسلام کی نعمت عطا فرمائے گا جس کا صلہ خدا کی ابدی جنت ہے۔  
۱۱۶ یہ اُس بد عہدی کی طرف اشارہ ہے جو قریش نے ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کیے ہوئے  
حرم اور اُن کی ملت کے معاملے میں کی۔ وہ اس گھر کے متولی اور ملت ابراہیمی کے داعی اور علم بردار  
بنائے گئے تھے، مگر انھوں نے توحید کے بجائے شرک اختیار کیا اور اُس معبود کو جو دنیا والوں کے  
لیے توحید کے مرکز کی حیثیت سے بنایا گیا تھا، اپنے سیاسی مفادات کے لیے بت کدے میں  
تبدیل کر دیا۔

۱۱۷ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور بدر کے قیدیوں کو دھمکی ہے کہ بد عہدی کریں گے تو خدا پھر  
انھیں تمہارے قابو میں دے دے گا اور جو سزا اس وقت انھیں دی گئی ہے، یہ اُس سے بڑی سزا



إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ أَوْوَا وَنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَالَكُمْ مِّنْ وَلَا يَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمْ

(ایمان والوں، اس صورت حال میں اگر کوئی مسلمان حمایت و نصرت کا خواہاں ہو تو اُس سے کہو کہ مدینہ آ جائے۔ اس لیے کہ) جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا ہے، اور جن لوگوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) پناہ دی اور (اُن کی) مدد کی ہے، وہی ایک دوسرے کے حامی و ناصر ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لائے، مگر ہجرت کر کے (مدینہ) نہیں آئے، تمہارا اُن سے حمایت و نصرت کا کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا، جب تک وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں<sup>۱۱۸</sup>۔

پائیں گے۔

۱۱۸ اُس زمانے کے عرب میں ایک دوسرے کی حمایت و نصرت کے بغیر کسی شخص کے لیے جینا آسان نہیں تھا۔ اسلام سے پہلے یہ حمایت و نصرت ہر شخص کو اُس کے خاندان اور قبیلے کے تعلق سے حاصل تھی۔ کوئی شخص یا خاندان کسی خطرے یا مصیبت میں مبتلا ہوتا تو خاندان اور قبیلے کے لوگ اُس کی حمایت و مدافعت کے لیے سربہ کف ہو جاتے تھے۔ اسلام قبول کر لینے کے بعد مسلمان ہر جگہ اس سے محروم ہونا شروع ہو گئے۔ پھر حالت جنگ نے اس صورت حال کو اور بھی سنگین بنا دیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ جو لوگ منکروں کے درمیان رہ رہے ہیں اور محض اپنے ایمان کی وجہ سے بے یار و مددگار ہو گئے ہیں، اُن کے لیے کیا کیا جائے؟ سورہ کے آخر میں یہ قرآن نے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ یہ حمایت و نصرت اُسی صورت میں ممکن ہے، جب کہ یہ لوگ ہمت کر کے ایک قدم اور آگے بڑھائیں اور ہجرت کر کے مدینہ آجائیں۔ ایمان و اسلام کی بنیاد پر حمایت و نصرت کا جو تعلق







الانفال  
۸

النَّصْرَ الْأَعْلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيثَاقٌ ۖ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ  
بَصِيرٌ ۝۴۲ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِعَهْدِهِمْ أُولَٰئَاءُ بَعْضٌ ۖ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ  
فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ۝۴۳ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا

ہاں، اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو اُن کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔ (یاد رکھو)، جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔ جو لوگ منکر حق ہیں، وہ ایک دوسرے کے حامی و ناصر ہیں، (اس لیے ایمان والو)، تم (اپنے ان مظلوم بھائیوں کے لیے) یہ نہیں کرو گے تو ملک میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہو جائے گا۔ (یہ بات اب تم میں سے ہر شخص کو سمجھ لینی

انصار و مہاجرین میں قائم ہو چکا ہے، وہ ہجرت کے بعد ہی ممکن ہے اور اسی نے اُن کو خدا کی راہ میں جہاد و قتال کے لیے بنیان مرصوص بنا دیا ہے۔ نئے ایمان لانے والے بھی آگے بڑھیں اور ایمان کے اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے اُن کے ساتھ شریک جہاد ہوں۔ جس حمایت و نصرت کے وہ خواہاں ہیں، اس کے نتیجے میں وہ آپ سے آپ اُن کو حاصل ہو جائے گی۔

۱۱۹ یعنی جس چیز کی نفی کی گئی ہے، وہ علی الاطلاق حمایت و نصرت کی ذمہ داری ہے۔ رہی یہ بات کہ کسی شخص کو دین کے معاملے میں ستایا جائے اور وہ طالب مدد ہو تو اُس کی مدد کرنا تم پر فرض ہے۔ یہ اس لیے فرمایا کہ اُس وقت مسلمانوں کی ایک منظم حکومت مدینہ میں قائم ہو چکی تھی اور اپنی طاقت کے لحاظ سے بھی وہ اس کے اہل تھے کہ اس ذمہ داری کو اٹھا سکیں۔

۱۲۰ یہ نہایت سخت تنبیہ ہے کہ اخلاقیات ہر حال میں اور ہر چیز پر مقدم ہیں اور جنگ و جدال کے موقع پر بھی ان سے انحراف کی اجازت نہیں ہے۔ اس ذیل میں سب سے اہم چیز عہد کی پابندی ہے۔ چنانچہ کوئی معاہدہ قوم اگر مسلمانوں پر ظلم بھی کر رہی ہو تو معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اُن کی مدد نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے معاہدے کو علانیہ ختم کر دیا



وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ  
الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٤٢﴾ وَالَّذِينَ  
آمَنُوا مِن بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنكُمْ

چاہیے کہ) جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا،  
اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو پناہ دی اور اُن کی مدد کی ہے، وہی سچے  
مومن ہیں۔ اُن کے لیے مغفرت ہے اور عزت کی روزی ہے<sup>۱۲۲</sup>۔ اور جو اس کے بعد ایمان  
لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے، وہ بھی تمہی لوگوں میں سے  
جائے۔

۱۲۱ یہ وجہ بیان ہوئی ہے کہ خاص دین کے معاملے میں یہ مدد کیوں ضروری ہے؟ استاذ امام  
لکھتے ہیں:

”...فرمایا کہ جہاں تک اسلام اور مسلمانوں کی عداوت کا تعلق ہے، اس معاملے میں تمام کفار  
ایک دوسرے کے دست و بازو بن گئے ہیں۔ جو اللہ کا بندہ اسلام قبول کر لیتا ہے، اُس کی  
تعذیب و ایذا رسانی سب کے نزدیک کارِ ثواب ہے۔ یہاں تک کہ ظالموں کے ظلم سے اُس کو  
بچانے کے لیے اُس کے اپنے بھائی بندوں کی حمیت بھی مردہ ہو چکی ہے۔ اُس کا مال اور اُس کی  
جان، سب مباح ہیں۔ ایسی حالت میں اگر تم بھی ان مظلوموں کی مدد نہ کرو گے تو اس کے معنی  
یہ ہیں کہ دین سے پھیرنے کے لیے سارے ملک میں ظلم و فساد عام ہو جائے گا۔“

(تذکر قرآن ۵۱۸/۳)

۱۲۲ یہ اُس وقت کی صورت حال میں ہجرت اور جہاد کی ترغیب و تشویق ہے۔ قرآن نے  
واضح کر دیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اس وقت یہی دو چیزیں صداقت کی کسوٹی ہیں۔ جو شخص بھی  
ایمان کا دعویٰ رکھتا ہے، اُس کے لیے ضروری ہے کہ ہجرت کر کے مدینہ آئے اور انصار و مہاجرین  
کے دوش بدوش اہل کفر کے خلاف جہاد میں شریک ہو۔ سچا ایمان اس وقت کسی کو مہاجر بننے کی سطح پر







الانفال  
۸

وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٤٥﴾

ہیں۔<sup>۱۲۳</sup> خون کے رشتہ دار، البتہ خدا کے قانون میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔  
اس میں شبہ نہیں کہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔<sup>۱۲۴</sup> ۷۲-۷۵

ملے گا اور کسی کو انصار بننے کی سطح پر۔ ان کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔ اس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ دین کی نصرت کے لیے ہجرت اور جہاد ایمان کے ایسے تقاضے ہیں کہ جب ان کا موقع آ جائے تو کوئی چیز بھی ان کا بدل نہیں ہو سکتی۔ ہر مسلمان سے اُس وقت ایمان کا پہلا اور آخری تقاضا یہی دو چیزیں ہوتی ہیں۔

<sup>۱۲۳</sup> یعنی بعد میں آنے والوں کے لیے بھی تمہارے دل میں کوئی تنگی نہیں ہونی چاہیے۔ خدا نے آج تمہیں اپنی دعوت پر لبیک کہنے کی توفیق دی ہے تو اس پر خدا کا شکر ادا کرو۔ وہی کل دوسروں کو بھی اس کی توفیق دے گا۔ اُن کا استقبال کسی احساس برتری کے ساتھ نہیں، بلکہ محبت و شفقت کے جذبات کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس میں، ظاہر ہے کہ نئے آنے والوں کے لیے ایمان و اسلام اور ہجرت و جہاد کے لیے ترغیب و تشویق بھی ہے۔

<sup>۱۲۴</sup> یہ برسر موقع یاد دہانی ہے کہ اوپر جس حمایت و نصرت کا ذکر ہوا ہے، اُس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ رحمی رشتوں کی بنیاد پر جو حقوق و فرائض اللہ تعالیٰ نے قائم فرمائے ہیں، وہ تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ ہرگز نہیں، وہ سب حقوق و فرائض بدستور قائم رہیں گے۔ رحم و قرابت اور اُس کی بنیاد پر وراثت وغیرہ کے حقوق خدا کے ابدی قانون کا حصہ ہیں۔ یہ حمایت و نصرت اُن میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گی۔ وہ ہر حال میں مقدم ہوں گے اور ایمان و اسلام کی بنیاد پر حمایت و نصرت کے ہر تقاضے سے پہلے پورے کیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت اُس کے بے خطا علم پر مبنی ہے۔ اُس نے ہر چیز کا ایک محل اور مقام متعین کر دیا ہے۔ تمام حقوق و فرائض اُسی کے مطابق ادا کرنے چاہئیں۔



## سورة التوبة

بِرَاءَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِّنَ  
الْمُشْرِكِينَ ۖ ۱ فَيَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَلِمُوا

۲

۱۲۵ اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے اُن مشرکوں کے لیے اعلان براءت ہے جن  
سے تم لوگوں نے معاہدے کیے تھے۔ سو، (اے مشرکین عرب)، اب ملک میں چار

۱۲۵ اس سورہ کی ابتدا میں 'بسم اللہ الرحمن الرحیم' نہیں لکھی جاتی۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک  
یہ ہے کہ سورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین پر اُس عذاب کا اعلان کیا گیا ہے جو  
پیغمبروں کی تکذیب کے نتیجے میں اُن کے منکرین پر لازماً آتا ہے۔ خدا کی زمین پر یہ اُس کی آخری  
دینونت کی سرگذشت ہے جس میں مشرکین کے قتل عام اور اہل کتاب کو محکوم بنا لینے کا حکم دیا گیا  
ہے۔ چنانچہ سورہ کی ابتدا جن الفاظ سے ہوئی ہے، اُن کے ساتھ کسی طرح موزوں نہیں تھا کہ خدا  
کی رحمت و شفقت کا حوالہ دیا جائے۔ یہ خدا کے جلال اور قہر و غضب کے ظہور کا موقع ہے، اس  
لیے 'بسم اللہ الرحمن الرحیم' سے ابتدا نہیں کی گئی۔

۱۲۶ دنیا میں انسان کو رہنے بسنے کا جو موقع دیا گیا ہے، وہ کسی حق کی بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ محض  
امتحان کے لیے ہے۔ پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد یہ امتحان پورا ہو جاتا ہے تو یہ  
ضرورت بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے کہ اُنہیں باقی رکھا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم کے مخاطبین اب اسی مقام پر پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ آگے جس قتل عام کا حکم دیا گیا ہے، وہ خدا  
کی اس سنت کا ظہور ہے کہ رسولوں کے مخاطبین اُن کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اسی دنیا میں  
عذاب سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ اس عذاب کا فیصلہ بھی خدا کرتا ہے اور جن پر یہ نازل کیا جاتا  
ہے، وہ بھی خدا کی طرف سے متعین کر کے بتا دیے جاتے ہیں۔ کوئی شخص، یہاں تک کہ خدا کا پیغمبر





التوبہ

اَنْكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ ۚ وَ اَنَّ اللَّهَ مُخْزِي الْكَافِرِيْنَ ۝۲ وَ اِذَا نَزَلَ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولُهُ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللَّهَ بَرِيٌّ ۙ  
مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۚ وَرَسُولُهُ ۙ فَاِنْ تَبَيَّنَ فُؤَادُكُمْ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ

مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ بھی کہ اللہ (اپنے پیغمبر کا) انکار کرنے والوں کو رسوا کر کے رہے گا۔<sup>۱۲۸</sup> (پھر حج کا موقع آئے تو اس سرزمین کے) سب لوگوں تک پہنچانے کے لیے بڑے حج کے دن<sup>۱۲۹</sup> اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے اعلان عام بھی کر دیا جائے کہ اللہ مشرکوں سے بری الذمہ ہے اور اُس کا

بھی اپنی طرف سے اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ سورہ توبہ اسی فیصلے کا اعلان ہے۔ تاہم اخلاقی لحاظ سے ضروری تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کے ساتھ تبلیغ و دعوت اور اتمام حجت کی مصلحت سے معاہدے کر رکھے ہیں، کسی اقدام سے پہلے انہیں ختم کر دیا جائے۔ یہ انہی معاہدات سے براءت کی گئی ہے۔ آیت میں لفظ 'بَرَاءۃ' کے بعد 'الی' ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں 'إِبْلَاح' کا مفہوم بھی مضمحل ہے۔ یعنی اس دست برداری کی اطلاع اُن تک پہنچادی جائے۔

۱۲۷ یہاں سے خطاب میں تبدیلی ہوئی ہے اور اُس کا رخ براہ راست مشرکین کی طرف ہو گیا ہے۔ یہ تبدیلی بتا رہی ہے کہ اس دھمکی کو معمولی نہ سمجھا جائے۔ یہ ایک فیصلہ کن دھمکی ہے جس کے نتائج اب پوری قطعیت کے ساتھ سامنے آنے والے ہیں۔

۱۲۸ عذاب سے پہلے چار ماہ کی یہ مہلت کب دی گئی؟ اس کی کوئی حتمی تاریخ تو متعین نہیں کی جاسکتی۔ تاہم آگے کی آیتوں سے اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اُس وقت دی گئی، جب قریش کی طرف سے معاہدہ حدیبیہ کی کوئی خلاف ورزی ابھی نہیں ہوئی تھی۔

۱۲۹ اس سے مراد حج ہی ہے۔ اہل عرب عمرے کو حج اصغر اور اس کے مقابلے میں حج کو حج اکبر کہتے تھے۔



تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ ۖ وَبَشِّرِ الَّذِينَ كَفَرُوا  
بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ  
يَنْقُصُوا شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ

رسول بھی<sup>۱۳۰</sup>۔ اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر منہ پھیرو گے تو  
جان رکھو کہ تم اللہ سے بھاگ نہیں سکتے۔ (اے پیغمبر)، ان منکروں کو دردناک عذاب  
کی خوش خبری سنا دو۔ وہ مشرکین، البتہ اس اعلان براءت سے مستثنیٰ ہیں جن سے تم

۱۳۰ مطلب یہ ہے کہ چار ماہ کی جو مہلت اوپر دی گئی ہے، اُس کے گزر جانے کے بعد اُن  
لوگوں کے خلاف اقدامات کی ابتدا کر دی جائے جن تک اعلان براءت کی اطلاع پہنچانا ممکن ہو۔  
اس کے بعد حج کے دن کا انتظار کیا جائے۔ اس میں ملک کے کونے کونے سے لوگ جمع ہوں گے  
جن کی وساطت سے یہ اطلاع سرزمین عرب کے باقی سب لوگوں تک بھی پہنچا دی جائے کہ اللہ و  
رسول نے مشرکین سے براءت کا اعلان کر دیا ہے۔ خدا کی طرف سے جو مہلت اُنھیں ملی ہوئی تھی،  
اُس کی مدت پوری ہو گئی ہے۔ وہ اب عذاب کی زد میں ہیں۔ چنانچہ تمام معاہدات ختم کر دیے گئے  
ہیں اور آئندہ بھی اُن کے ساتھ کسی معاہدے کا امکان باقی نہیں رہا۔ اس میں ضمناً یہ بشارت بھی  
ہے کہ عنقریب وہ موقع آنے والا ہے، جب مسلمان حج بھی کریں گے اور منکرین پر ایسا غلبہ بھی  
حاصل کر لیں گے کہ حج کے موقع پر اس طرح کا اعلان کر سکیں۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ  
مسلمان ۹ ہجری میں اس حج سے سعادت اندوز ہوئے۔ یہ حج سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی  
امارت میں کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق علی رضی اللہ عنہ نے قرآن کی  
یہ آیتیں لوگوں کو پڑھ کر سنائیں جس سے پورے عرب کے مشرکین تک اطلاع پہنچانے کا اہتمام کر  
دیا گیا۔

\* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۲/۴۳۶۔



إِلَىٰ مَدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴿٣١﴾ فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ  
الْحَرَامُ فَأَقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ

نے معاہدہ کیا، پھر اُس کو پورا کرنے میں اُنھوں نے تمھارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی ہے۔ سو اُن کا معاہدہ اُن سے اُن کی مدت تک پورا کرو، اِس لیے کہ اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بد عہدی سے بچنے والے ہوں۔ (بڑے حج کے دن) اِس (اعلان) کے بعد جب حرام مہینے گزر جائیں تو اِن مشرکوں کو جہاں پاؤ،

۳۱۔ یہ اُن معاہدوں کا بیان ہے جو مذکورہ اعلان سے مستثنیٰ تھے۔ مدعا یہ ہے کہ غیر موقت معاہدے تو مہلت کی مدت گزر جانے کے فوراً بعد ختم ہو جائیں گے۔ اِسی طرح وہ معاہدے بھی ختم ہو جائیں گے جو اگرچہ موقت تھے، مگر فریق ثانی کی طرف سے اُن کی خلاف ورزی ہو چکی ہے۔ لیکن ایسے موقت معاہدے جن کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوئی، اُنھیں ختم نہیں کیا جائے گا، بلکہ قراردادہ مدت تک برقرار رکھا جائے گا۔ مدت گزر جانے کے بعد، البتہ وہ بھی کالعدم ہوں گے اور جن مشرکین سے کیے گئے تھے، اُن کی دار و گیر بھی اُسی طرح شروع ہو جائے گی، جس طرح حکم دیا گیا ہے۔

۳۲۔ اِس سے وہ چار مہینے مراد نہیں ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، بلکہ وہی مہینے مراد ہیں جنھیں اصطلاح میں اشہر حرم کہا جاتا ہے۔ یہ تعبیر ان مہینوں کے لیے بطور اسم و علم استعمال ہوتی ہے، اِس لیے عربیت کی رو سے کوئی اور مہینے مراد نہیں لیے جاسکتے۔ حج اکبر کے موقع پر جس اعلان کے لیے کہا گیا ہے، اُس کے بعد ۲۰ دن ذوالحجہ اور ۳۰ محرم کے باقی ہوں گے۔ یہ اُنھی کے بارے میں فرمایا ہے کہ اِن دنوں میں چونکہ جنگ و جدال ممنوع ہے، اِس لیے یہ جب گزر جائیں تو اِس اعلان کے نتیجے میں جن لوگوں کے خلاف کارروائی کی ضرورت ہو، اُن کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا جائے، اِس سے پہلے کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ ذوالحجہ اور محرم کے پچاس دنوں کے لیے یہ تعبیر بالکل اُسی



وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ  
وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ⑤ وَإِنْ  
أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلِمَ اللَّهِ ثُمَّ  
أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ⑥ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ ⑦

قتل کرو اور اس مقصد کے لیے ان کو پکڑو، ان کو گھیرو اور ہر گھات کی جگہ ان کی  
تاک میں بیٹھو۔<sup>۱۳۳</sup> پھر اگر یہ توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کی  
راہ چھوڑ دو۔<sup>۱۳۴</sup> یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ اور اگر (مہلت کی  
اس مدت میں) ان مشرکوں میں سے کوئی شخص تم سے امان چاہے (کہ وہ تمہاری  
دعوت سننا چاہتا ہے) تو اُس کو امان دے دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔  
پھر اُس کو اُس کے مامن تک پہنچا دو۔ یہ اس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو خدا کی باتوں  
کو زیادہ نہیں جانتے۔<sup>۱۳۵</sup> ۶-۱

طرح اختیار کی گئی ہے، جس طرح ہم اپنی زبان میں بعض اوقات نومبر یا دسمبر کے مہینے میں کہتے  
ہیں کہ یہ سال گزر جائے تو فلاں کام کیا جائے گا۔

۱۳۳ یہ قتل عام کا حکم ہے جو مشرکین عرب کے لیے اُسی طرح کا عذاب تھا جو رسولوں کی  
تکذیب کے نتیجے میں اُن کے مخاطبین پر ہمیشہ نازل کیا جاتا رہا ہے۔

۱۳۴ یعنی خدا کے اس عذاب سے بچنے کے لیے صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ وہ کفر و شرک  
سے توبہ کر کے اسلام قبول کر لیں، اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے ایمان و اسلام کی  
شہادت کے طور پر وہ نماز کا اہتمام کریں اور حکومت کا نظم چلانے کے لیے اُس کے بیت المال کو  
زکوٰۃ ادا کریں۔ اس کے بعد فرمایا ہے کہ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ، یعنی اُن کی راہ چھوڑ دو۔ اس کے







التوبه  
۹

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ  
إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ

اللہ اور اُس کے رسول کے ہاں ان مشرکوں سے کوئی عہد کس طرح باقی رہ سکتا ہے؟<sup>۱۳۶</sup> ہاں جن لوگوں سے تم نے مسجد حرام کے پاس (حدیبیہ میں) عہد کیا تھا، سو جب

معنی یہ ہیں کہ ریاست اور قانون کی سطح پر ایمان و اسلام کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اس سے زائد سے کوئی مطالبہ کسی مسلمان سے نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ جب خدا نے اپنے پیغمبر کو خود اپنی حکومت میں اس کی اجازت نہیں دی تو دوسروں کو کس طرح دی جاسکتی ہے؟

۱۳۵ یعنی دین و شریعت اور نبوت و رسالت سے زیادہ واقف نہیں ہیں، اس وجہ سے رعایت کے مستحق ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ لمبے عرصے تک تبلیغ و دعوت کے بعد بھی اتمام حجت میں کوئی کسر رہ گئی ہو، لہذا ان میں سے کوئی شخص اگر بات سننے اور سمجھنے کے لیے امان چاہتا ہو تو امان دے دو اور اللہ کا کلام اچھی طرح سنا اور سمجھا کر اُس کے مامن تک پہنچا دو تا کہ وہ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور کر کے فیصلہ کر سکے کہ اُسے اسلام قبول کرنا ہے یا تلوار۔ اس کے بعد، ظاہر ہے کہ جب مہلت کی یہ مدت ختم ہو جائے گی تو اُس کے لیے بھی وہی حکم ہوگا جو اوپر بیان ہوا ہے۔

۱۳۶ یہاں سے روئے سخن اُن لوگوں کی طرف ہو گیا ہے جو ان مشرکوں کے لیے مزید مہلت کے خواہاں تھے۔ انھیں صاف نظر آ رہا تھا کہ اس اعلان کے نتیجے میں اب انھیں اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور زمانہ جاہلیت کے دوست احباب کے خلاف تلوار سونتی پڑے گی۔ یہ لوگ چونکہ ضعیف الایمان تھے، اس لیے قدرتی طور پر سخت آزمائش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ آگے جو کچھ فرمایا ہے، انھی کمزور مسلمانوں کی ذہنی کیفیت کو سامنے رکھ کر فرمایا ہے۔

۱۳۷ اصل الفاظ ہیں: 'الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ'۔ زبان کے اسالیب سے واقف ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ الفاظ اگر کسی معاہدے کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں تو



فَاسْتَقِمْوْا لَهُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ④ كَيْفَ وَإِنْ يَظْهَرُوا  
عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلَّا ذِمَّةً ۖ يُرْضُونَكُمْ بِأَفْوَهِهِمْ وَتَابُوا

تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں، تم بھی اُن کے ساتھ سیدھے رہو، اُس لیے کہ اللہ  
اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بد عہدی سے بچنے والے ہوں۔ ۱۳۹ — کس طرح باقی رہ سکتا  
ہے، جب کہ حال یہ ہے کہ اگر وہ تم پر کہیں غلبہ پالیں تو نہ تمہارے بارے میں کسی قرابت

صرف معاہدہ حدیبیہ ہی کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
نے جتنے بھی معاہدے مشرکین کے ساتھ کیے، اُن میں سے کوئی بھی مسجد حرام کے ساتھ اس طرح  
کی نسبت سے تعارف کا سزاوار نہیں ہو سکتا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس نسبت کے اظہار سے ایک طرف تو معاہدے کا تعارف ہو گیا۔ دوسری طرف اس  
سے اُس کی غیر معمولی حرمت بھی واضح ہوئی کہ کوئی ایسا ویسا معاہدہ نہیں ہے، بلکہ اس کی تکمیل  
جو احرام میں ہوئی ہے جس سے زیادہ کوئی دوسری جگہ مقدس و محترم نہیں ہو سکتی۔“

(تذبرقرآن ۳/۵۴۳)

۱۳۸ یہ بات اگرچہ اوپر بیان ہو چکی ہے کہ ایسے موقت معاہدے جن کی خلاف ورزی نہیں  
ہوئی، وہ باقی رہیں گے، لیکن معاہدہ حدیبیہ کی اہمیت چونکہ غیر معمولی تھی اور یہ دس سال کے لیے کیا  
گیا تھا، اس لیے سلسلہ کلام کو روک کر متنبہ کر دیا ہے کہ یہ معاہدہ بھی اُس وقت تک باقی رہے گا،  
جب تک قریش اس پر قائم رہتے ہیں۔

۱۳۹ اصل میں لفظ تَقْوٰی آیا ہے۔ اس کے لغوی معنی بچنے کے ہیں۔ جس چیز سے بچنے کی  
طرف اشارہ مقصود ہے، وہ سیاق سے مفہوم ہو رہی ہے، اس لیے لفظوں میں بیان نہیں ہوئی۔  
قرآن میں جگہ جگہ یہ لفظ اس طریقے سے استعمال ہوا ہے۔ لفظ فُسُق کے معاملے میں بھی آگے  
یہی اسلوب اختیار فرمایا ہے۔





التوبه  
۹

قُلُوبُهُمْ ۚ وَكَثَرُهُمْ فِسْقُونَ ۝۸۰ اِشْتَرَوْا بِآيَاتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيلًا  
فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيلِهِ ۖ اِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹۰ لَا يَرْقُبُوْنَ  
فِيْ مُؤْمِنٍ اِلَّا وَلَا ذِمَّةً ۖ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝۱۰۰ فَاِنْ تَابُوْا  
وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوْا الزَّكٰوةَ فَآخُوْا نَكُمْ فِي الدِّیْنِ ۖ

کا لحاظ کریں، نہ کسی عہد کا؟ اپنے منہ کی باتوں سے وہ تمہیں راضی کرنا چاہتے ہیں، مگر اُن کے دل انکار کر رہے ہیں اور اُن میں سے اکثر بد عہد ہیں۔ اللہ کی آیتوں کے عوض میں اُنہوں نے تھوڑی قیمت قبول کر لی، پھر اُس کی راہ سے رک گئے ہیں۔ یقیناً بہت برا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ کسی مسلمان کے معاملے میں نہ اُنہیں کسی قرابت کا لحاظ ہے، نہ عہد کا اور وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔ سو اگر توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام

۱۴۰ اصل میں 'اِلَّا' اور 'ذِمَّة' کے الفاظ آئے ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”تعلقات کی بنیاد دو ہی چیزوں پر ہوتی ہے۔ معاشرتی تعلقات کی بنیاد رشتہ رحم و قرابت کے پاس و لحاظ پر اور سیاسی روابط کی بنیاد باہمی معاہدات کی عائد کردہ ذمہ داریوں کے احترام پر۔ پہلی کو 'اِلَّا' سے تعبیر فرمایا ہے جو اُن حقوق کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ایک اصل و نسل، ایک جوہر و معدن سے ہونے یا قرابت اور پڑوس کی بنا پر ایک دوسرے پر آپ سے آپ قائم ہو جاتے ہیں۔ دوسری کو 'ذِمَّة' سے تعبیر فرمایا ہے جو اُن ذمہ داریوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کسی معاہدہ میں شریک ہونے والی پارٹیوں پر از روے معاہدہ عائد ہوتی ہیں۔“ (تدبر قرآن ۳/۵۴۲)

۱۴۱ یعنی دنیا کی متاع حقیر کو ترجیح دی اور خدا کی آیتوں کو چھوڑ کر اُسے اختیار کر لیا۔ آیت میں اسے 'اِشْتَرَاء' سے تعبیر کیا ہے۔ زمانہ قدیم میں خرید و فروخت مبادلہ اشیا کے طریقے پر ہوتی تھی۔ لفظ 'اِشْتَرَاء' میں یہ مفہوم اسی سے پیدا ہوا ہے۔



وَنُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أَيْمَةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَا

کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔<sup>۱۴۲</sup> ہم اُن لوگوں کے لیے اپنی آیتوں کی تفصیل کیے دے رہے ہیں جو جاننا چاہتے ہوں۔<sup>۱۴۳</sup> اور اُس عہد کے بعد بھی جو اُنہوں نے کر رکھا ہے، اگر وہ اپنے قول و قرار توڑ ڈالیں اور تمہارے دین میں عیب

<sup>۱۴۲</sup> پیچھے انہی شرائط کے بعد فرمایا ہے کہ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ۔ یہاں اُس کی جگہ فَاخُذُوا نَكْمٌ فِي الدِّينِ کے الفاظ ہیں۔ یہ دونوں تعبیرات مل کر حکم کا منشا ہر لحاظ سے واضح کر دیتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان شرائط کے پورا ہو جانے کے بعد اُن سے مزید کوئی مطالبہ نہیں کیا جائے گا، قانون اور ریاست کے نقطہ نظر سے وہ مسلمان سمجھے جائیں گے اور وہ تمام حقوق اُنہیں حاصل ہو جائیں گے جو ایک مسلمان کی حیثیت سے مسلمانوں کے نظم اجتماعی میں اُن کو حاصل ہونے چاہئیں۔ اُن میں اور پہلے ایمان لانے والوں کے حقوق و فرائض میں کوئی فرق نہیں ہوگا اور اخوت کا یہ رشتہ قائم ہو جانے کے بعد وہ تمام ذمہ داریاں بھی اُن میں سے ہر ایک پر عائد ہو جائیں گی جو عقل و فطرت کی رو سے ایک بھائی پر اُس کے بھائی کے بارے میں عائد ہونی چاہئیں۔

<sup>۱۴۳</sup> یہ مسلمانوں اور کفار، دونوں کے لیے تنبیہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جاننا اور سمجھنا چاہیں، اُن کے لیے اس باب میں اللہ کے احکام کی پوری وضاحت کر دی گئی ہے۔ کوئی ابہام باقی نہیں رہا ہے۔ اب اگر مسلمانوں میں سے کسی نے ان مشرکین کے ساتھ اس سے الگ ہو کر کوئی معاملہ کرنا چاہا تو اُس کی ذمہ داری خود اُسی پر ہے، اسی طرح مشرکین میں سے اگر کسی نے اس سے کچھ الگ امید باندھی تو اُس کی ذمہ داری بھی خود اُسی پر ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۵۴۴)

<sup>۱۴۴</sup> یعنی معاہدہ حدیبیہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اُس کے لیے یہ الفاظ عہد کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے آئے ہیں، ان سے کوئی نیا معاہدہ مراد نہیں ہے۔







اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذْتَهُونَ ﴿١٢﴾

الَاتُّقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا اَيْمَانَهُمْ وَهُمْ يُبَاخِرُ الرَّسُولَ  
وَهُمْ بَدَءُوكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ اَتُخْسِنُونَ ۚ فَاللَّهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ

لگائیں تو کفر کے ان سرخیلوں سے بھی لڑو۔<sup>۱۲۵</sup> ان کے قول و قرار کچھ نہیں، (یہ آج نہیں تو کل اپنا عہد توڑ دیں گے)، لہذا لڑو تا کہ یہ اس کفر و شرک سے باز آ جائیں۔ ۷-۱۲

(ایمان والو)، کیا اب بھی اُن لوگوں سے نہیں لڑو گے جنہوں نے اپنے قول و قرار توڑ دیے ہیں اور (اس سے پہلے) رسول کو (اُس کے وطن سے) نکالنے کی جسارت

۱۲۵ اصل میں 'اَئِمَّةَ الْكُفْرِ' کے الفاظ ہیں۔ ان کا اطلاق قریش کے سوا کسی اور پر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہی پورے عرب کے سردار اور پیشوا تھے اور دین کے معاملے میں تمام اہل عرب اُنھی کے تابع تھے۔ مدعا یہ ہے کہ اگر قریش بھی اپنا معاہدہ توڑ دیں تو اُن سے بھی لڑو اور ایمان و اسلام کی دعوت قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں تو جہاں پاؤ، قتل کر دو۔ سرزمین عرب کے تمام مشرکین کے لیے یہی اللہ کا حکم ہے۔ اس میں اب کسی کے لیے مزید رعایت کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

۱۲۶ یہ سورہ چند شذرات کا مجموعہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین پر عذاب کے مراحل میں ہر مرحلے کی مناسبت سے نازل ہوئے اور اُنھی مراحل کی ترتیب کے ساتھ سورہ میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ ان میں سے پہلا شذرہ آیت ۱۲ پر ختم ہو گیا ہے۔ یہاں سے دوسرا شروع ہوتا ہے جس کی پہلی آیت ہی واضح کر دیتی ہے کہ یہ کچھ فصل سے نازل ہوا ہے، اس لیے کہ اوپر جس معاہدے کے بارے میں فرمایا تھا کہ اگر توڑ دیں، یہ آیت بتا رہی ہے کہ وہ معاہدہ قریش نے توڑ دیا ہے۔



إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۖ قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصَرِّكُمْ عَلَيْهِمْ وَيُشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ۝۱۴۹

بھی کر چکے ہیں اور وہی ہیں جنہوں نے تم سے جنگ چھیڑنے میں پہل کی ہے۔ کیا تم اُن سے ڈرتے ہو؟ سو اللہ زیادہ حق دار ہے کہ تم اُس سے ڈرو، اگر تم فی الواقع مومن ہو۔ اُن سے لڑو، اللہ تمہارے ہاتھوں سے اُن کو سزا دے گا اور اُنھیں ذلیل و خوار کرے گا اور تمہیں اپنی مدد سے اُن پر غلبہ عطا فرمائے گا اور مومنوں کے ایک گروہ کے کلیجے (اس

۱۴۷ مطلب یہ ہے کہ ان کا یہ پہلا جرم نہیں ہے، اس سے پہلے یہ خدا کے رسول کو اُس کے وطن سے نکالنے کی جسارت کر چکے ہیں۔ قرآن کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کی تکذیب کے بعد جب کوئی قوم اُسے وطن سے نکالنے یا قتل کر دینے کا فیصلہ کر لیتی ہے تو اُس کی مہلت عمر بھی ختم ہو جاتی ہے۔ رسولوں کے باب میں یہی سنت الہی ہے۔ قرآن نے یہ اُسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس سے مزید وضاحت ہو گئی کہ یہ آیتیں قریش ہی سے متعلق ہیں، ان کا کسی دوسرے قبیلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۴۸ یعنی جب ہجرت کے موقع پر قتل کر دینے میں کامیاب نہیں ہوئے تو قافلے کی حفاظت کا بہانہ کر کے حملہ آور ہو گئے اور اس طرح خدا کے رسول اور اُس کے ساتھیوں کے خلاف صریح جارحیت کا ارتکاب کیا۔ یہ جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے جس سے اُس بات کی تائید ہوتی ہے جو پیچھے بیان ہو چکی ہے کہ اس جنگ کے لیے پیش قدمی تمام تر قریش کی طرف سے ہوئی تھی۔

۱۴۹ یہ قرآن نے خود صراحت فرمادی ہے کہ پیچھے جس قتل عام کا حکم دیا ہے، وہ درحقیقت خدا کا عذاب ہے جو آخری پیغمبر کے منکرین پر اُس کے ساتھیوں کے ہاتھوں سے نازل کیا جا رہا ہے۔ ۱۵۰ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ رسولوں کی تکذیب کا اصلی محرک استکبار ہوتا ہے اور استکبار کی سزا دنیا اور آخرت میں ذلت اور خواری ہی ہے۔





وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ<sup>ط</sup> وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ<sup>ط</sup>  
وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ<sup>⑮</sup>

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ  
وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِجَهَّةٍ<sup>ط</sup> وَاللَّهُ  
خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ<sup>⑯</sup> مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسْجِدَ اللَّهِ

سے) ٹھنڈے کرے گا اور اُن کے دلوں کا غم و غصہ دور فرمائے گا اور (ان منکروں میں سے) جن کو چاہے گا، اللہ اپنی عنایت سے توبہ کی توفیق بھی دے گا۔ اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۱۵۲-۱۵۳  
کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ یوں ہی چھوڑ دیے جاؤ گے، دراصل حالیکہ اللہ نے اُن لوگوں کو ابھی جانا ہی نہیں جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا اور اللہ اور اُس کے رسول اور اُن کے ماننے والوں کے سوا کسی کو دوست نہیں بنایا؟<sup>۱۵۳</sup> (یاد رکھو)، جو کچھ تم کر رہے ہو،

۱۵۱۔ اُس گروہ کی طرف اشارہ ہے جسے اسلام لانے کے جرم میں برسوں ستایا گیا تھا۔ اُن کی دل داری کے لیے فرمایا ہے کہ جن سنگ دلوں کے ہاتھوں تم مظالم کا ہدف بنے رہے ہو، اب اُن کی سزا کا وقت آ گیا ہے۔ مطمئن رہو، یہ سزا ایسی عبرت ناک ہوگی کہ تمہارے سینے اس سے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔

۱۵۲۔ مسلمانوں کا ایک گروہ آرزو مند تھا کہ اُن کے اعزہ و اقربا عذاب الہی سے دوچار ہونے کے بجائے ایمان لے آئیں۔ یہ اُن کو خوش خبری دی ہے کہ تمہاری یہ آرزو بھی کسی حد تک پوری ہو جائے گی اور اللہ اپنے علم و حکمت کے مطابق جس کو چاہے گا، توبہ اور اصلاح کی توفیق بھی عطا فرمائے گا۔

۱۵۳۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی جماعت کی تطہیر نہیں ہوئی اور وہ لوگ پوری طرح الگ نہیں



شَهِدِيْنَ عَلَىٰ اَنْفُسِهِمْ بِالْكَفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚ  
وَفِي النَّارِهِمْ خَالِدُوْنَ ۝۱۴۱ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسْجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ  
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتٰى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ

اللہ اُس سے خوب واقف ہے۔ (تم انھیں بیت اللہ کے متولی سمجھتے اور اسی بنا پر اُن سے ہم دردی رکھتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ) ان مشرکوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اللہ کی مسجدوں کا انتظام کریں، دریاں حالیکہ وہ خود اپنے اوپر کفر کے گواہ ہیں۔ وہی ہیں کہ اُن کے سارے اعمال ضائع ہو گئے اور وہ ہمیشہ آگ میں رہنے والے ہیں۔ اللہ کی مسجدوں کا انتظام کرنے والے تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روز آخر کو مانتے ہوں، نماز کا

ہوئے جو سچے مجاہدین ہوں اور اللہ و رسول اور اُن کے ماننے والوں کے سوا کسی کی دوستی اور قرابت کی پروا نہ کریں۔ اس وقت جو دینونت برپا ہے، اُس کے لیے اُنھیں الگ کرنا ضروری ہے۔ یہ امتحان اسی مقصد سے برپا کیا جا رہا ہے، ورنہ خدا کے لیے کچھ مشکل نہ تھا کہ آسمان سے عذاب نازل کرتا اور جن لوگوں سے تمھیں لڑنے کے لیے کہا جا رہا ہے، اُنھیں اُسی طرح صفحہ ہستی سے مٹا دیتا، جس طرح عاد و ثمود صفحہ ہستی سے مٹا دیے گئے تھے۔

۱۵۴ یہ قرآن کی بلاغت ہے۔ اس سے مراد اگرچہ مسجد حرام ہی ہے، لیکن اللہ کی مسجدوں کے الفاظ سے حکم بھی عام ہو گیا ہے اور اُس کی علت بھی پوری طرح واضح ہو گئی ہے۔

۱۵۵ قریش اپنے شرک کا خود اعتراف کرتے تھے۔ اُسی کو یہاں کفر سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شرک کے ساتھ خدا کو ماننا اُس کو نہ ماننے کے مترادف ہے۔

۱۵۶ اللہ شرک کے ساتھ کسی نیکی کو بھی قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ جو اعمال وہ حرم کی خدمت کے لیے کر رہے ہیں، آخرت میں اُن کا کوئی اجر اُن کے لیے باقی نہ رہے گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:





التوبه  
۹

فَعَسَىٰ أَوْلَىٰكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ﴿١٨﴾ أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

اہتمام کرتے ہوں، زکوٰۃ دیتے ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں۔ سو توقع ہے کہ یہی لوگ راہ یاب ہوں گے۔ کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور مسجد حرام کا انتظام کر دینے کو اُن لوگوں کے برابر کر دیا ہے جو اللہ اور روز آخر پر ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہے؟ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔

”...خدا کے ہاں صرف وہی نیکی باقی رہتی ہے جو توحید کے ساتھ ہو۔ مذہبی صحیفوں میں مشرک کو زانیہ عورت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح ایک عورت کا اپنے شوہر کے ساتھ سارا چاؤ پیار بے کار ہے، اگر وہ بدکار ہے، اُسی طرح بندے کا سارا کیا دھرا برباد ہے، اگر وہ اپنے رب کا کسی کو شریک ٹھیراتا ہے۔“ (تذبر قرآن ۳/۵۵۰)

۱۵۷۔ یعنی اُن کے اندر کسی غیر اللہ کا خوف نہ ہو۔ یہ شرک کے اصلی محرک سے اُس کی نفی کی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ حرم کی تولیت، بے شک اولاد ابراہیم کے سپرد کی گئی ہے، مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اُن صفات کے حامل بن کر رہیں جو اس منصب کے لیے بنیادی شرائط کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں اہم ترین شرط یہ ہے کہ وہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں۔

۱۵۸۔ اصل میں لفظ اِهْتَدَآءُ استعمال ہوا ہے۔ یہ ہدایت منزل کے مفہوم میں ہے۔ یعنی کامیابی کے ساتھ اُس منزل تک پہنچیں گے جو آخرت میں اُن کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ آیت میں ’عَسَىٰ‘ کا لفظ بھی قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اس بات کو ’عَسَىٰ‘ کے لفظ سے تعبیر کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ یہ راہ کوئی آسان راہ نہیں ہے۔ اس میں قدم قدم پر مشکلات اور آزمائشیں ہیں۔ صرف وہی لوگ جادۂ مستقیم پر استوار رہ سکتے ہیں جن کے پاس توفیق الہی کا زاد راہ ہو اور جن کو خدا سے استعانت کا سہارا



الظَّالِمِينَ ۝۱۹ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجْهَهُدُ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ لَا أَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝۲۰ يُلَبِّسُهُمْ رَبُّهُمْ رِحْمَةً مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّتِ لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ ۝۲۱ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝۲۲

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ

حقیقت یہ ہے کہ (مسجد حرام کے ان مجاوروں نے اپنے اوپر ظلم ڈھایا ہے اور اب) اللہ ان ظالم لوگوں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔<sup>۱۵۹</sup> اللہ کے ہاں اُن لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے جان و مال سے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور وہی کامیاب ہوں گے۔ اُن کا پروردگار انہیں اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسے باغوں کی بشارت دیتا ہے جن میں اُن کے لیے دائمی راحت ہے۔ وہ اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اجر عظیم اللہ ہی کے پاس ہے۔ ۱۶-۲۲

ایمان والو، اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا دوست نہ بناؤ، اگر وہ ایمان کے

حاصل ہو۔“ (تدبر قرآن ۳/۵۵۰)

۱۵۹ یعنی اُس منزل تک نہیں پہنچائے گا جو آخرت میں اہل ایمان کی منزل ہے۔

۱۶۰ یہ تقابل کے لیے نہیں، بلکہ تحقیرِ شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کا درجہ اللہ کے

ہاں بہت اونچا ہے۔

۱۶۱ یہاں سے تیسرا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے مضامین سے واضح ہے کہ یہ ۹ ہجری میں





التوبه  
۹

أُولِيََاءِ إِنْ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ ط وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ  
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ ٢٣ قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ  
وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا  
وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنْ  
اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ

مقابلے میں کفر کو عزیز رکھیں۔ تم میں سے جو لوگ انھیں دوست بنائیں گے، وہی  
(اپنے اوپر) ظلم کرنے والے ہوں گے۔ ان سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ اگر  
تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اور  
تمہارا وہ مال جو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس کے مندرے سے تم ڈرتے ہو اور  
تمہارے وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو،<sup>۱۶۲</sup> یہ سب تمہیں اللہ سے، اُس کے رسول سے اور

کسی وقت اُس حج سے پہلے نازل ہوا ہے جس میں تمام اہل عرب سے اعلان براءت کیا گیا تھا۔  
۱۶۲ یہ جن مرغوبات کی فہرست ہے، اُن میں، اگر غور کیجیے تو نہایت لطیف نفسیاتی ترتیب ملحوظ  
ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... پہلے باپ، بیٹے، بھائی، بیوی اور خاندان کو لیا ہے جن کی محبت یا عصیت آدمی کے لیے  
حق کی راہ میں حجاب اور آزمائش بنتی ہے۔ پھر اموال، کاروبار اور مکانات کا ذکر کیا ہے جو اصلاً  
مذکورہ متعلقین ہی کے تعلق سے مطلوب و مرغوب ہوتے ہیں اور آدمی صاحب توفیق نہ ہو تو اُس  
کے لیے یہ فتنہ بن جاتے ہیں۔ اموال کے ساتھ اقْتَرَفْتُمُوهَا کی قید ہے۔ اقْتِرَاف کے  
معنی اکتساب کے ہیں۔ یہ قید اُس مال کے محبوب ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جس  
مال کو آدمی نے خود کمایا اور بڑھایا ہو، وہ اُس کو زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ اسی طرح تجارت  
کے ساتھ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا کی قید اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ وہ تجارت



اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۖ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴿٢٣﴾ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ ۖ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ

اُس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں<sup>۱۶۳</sup> تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کر دے۔ اور (جان لو کہ) اس طرح کے بد عہد لوگوں کو اللہ راہ یاب نہیں کرے گا۔<sup>۱۶۵</sup> حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے بہت سے موقعوں پر تمہاری مدد کی ہے۔ ابھی حنین کے دن بھی، جب

کامیاب اور چلتی ہوئی تجارت ہے، اس لیے کہ کامیاب اور چلتی ہوئی تجارت ہی وہ چیز ہے جس کے متعلق تاجر کو ہر وقت یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ اُس پر کساد بازاری کا جھونکا نہ آجائے اور اس خطرے سے اُس کو بچائے رکھنے کے لیے وہ سارے جتن کرتا ہے، یہاں تک کہ وہی اُس کی معبود بن جاتی ہے۔ پھر نہ تو اُسے حلال و حرام کی تمیز باقی رہ جاتی ہے اور نہ ہجرت، جہاد اور اللہ کی راہ میں قطع علاق کی آزمائشیں اُسے گوارا ہوتیں۔ فرمایا کہ ان میں سے ہر چیز ایک بت ہے اور جب تک بندہ اللہ کی خاطر ان میں سے ہر بت کو توڑنے کے لیے تیار نہ ہو جائے، وہ ایمان کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔“ (تدبر قرآن ۳/۵۵۳)

۱۶۳۔ یہ چیز اُس وقت واضح ہو جاتی ہے، جب ایک طرف اللہ و رسول کا مطالبہ ہو اور دوسری طرف ان چیزوں کی محبت کا کوئی مطالبہ سامنے آجائے۔ آدمی اگر اُس وقت اللہ و رسول کے مطالبے کو مقدم نہ رکھے تو اس کے صاف معنی یہ ہوں گے کہ اُس کو اللہ و رسول سے زیادہ یہ چیزیں محبوب ہیں۔ ایمان و اسلام کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ یہ چیزیں محبوب نہ ہوں، بلکہ صرف یہ ہے کہ اللہ و رسول اور اُس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔

۱۶۴۔ یعنی اُسی انجام بد تک پہنچا دے جو اوپر مکذبین کے لیے بیان ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اوپر جس ترجیح کا ذکر ہوا ہے، وہ ایمان کا ایسا تقاضا ہے کہ جسے پورا نہ کیا جائے تو مومن و کافر اپنے انجام کے لحاظ سے یکساں ہو سکتے ہیں۔

۱۶۵۔ اوپر مشرکین کے بارے میں ارشاد ہوا تھا کہ اللہ انہیں راہ یاب نہیں کرے گا۔ یہاں





التوبه

عَنْكُمْ شَيْئًا وَصَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَرَحَبَتٍ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ  
مُذَّبِرِينَ ۝ ٢٥ ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى  
الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَذَلِكَ  
جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝ ٢٦ ثُمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَلَى مَنْ

تم اپنی کثرت پر اترارہے تھے۔ پھر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعتوں  
کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بالآخر اللہ نے اپنے  
رسول پر اور اُس کے ماننے والوں پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور (اُن کی مدد کے لیے)  
ایسی فوجیں اتار دیں جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور اُن لوگوں کو سزا دی جو (پیغمبر کے)  
منکر ہیں، اور اس طرح کے منکروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اس کے بعد اللہ، جس پر

وہی بات اُن لوگوں کے متعلق فرمائی ہے جو ایمان و اسلام کا عہد باندھ لینے کے بعد منافقت کا رویہ  
اختیار کریں اور اپنے ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے سے انکار کر دیں۔

۱۶۶ یعنی دلوں میں عزم، حوصلہ اور قرار پیدا کر دیا۔

۱۶۷ فرشتوں کی غیبی فوجوں کی طرف اشارہ ہے جو زمانہ رسالت کی مہمات میں ہمیشہ  
مسلمانوں کے ہم رکاب رہتی تھیں۔

۱۶۸ جن مذہب بین کو اوپر قتال کے لیے ابھارا ہے، یہ اُن کی ہمت افزائی فرمائی ہے کہ جس  
کام کے لیے تمہیں کہا جا رہا ہے، وہ خدا کا کام ہے۔ تمہاری قلت و کثرت اُس میں کچھ اہمیت نہیں  
رکھتی۔ اس سے پہلے بھی وہ خدا کی مدد سے ہوا ہے اور اب بھی اُسی کی مدد سے ہوگا۔ اُس پر بھروسہ  
رکھو۔ تم نے تقویٰ اختیار کیا اور ثابت قدم رہے تو وہ کسی حال میں تمہیں اپنی مدد سے محروم نہیں  
کرے گا۔ اس میں خاص طور پر غزوہ حنین کا حوالہ دیا ہے۔ یہ غزوہ فتح مکہ کے بعد شوال ۸ ہجری  
میں مکہ اور طائف کے درمیان وادی حنین میں پیش آیا تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے اس میں



يَسْأَلُ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢٤﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا  
الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ

چاہے، عنایت فرماتا اور اُسے توبہ کی توفیق بھی دیتا ہے۔ اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی  
شفقت ابدی ہے۔ ۲۳-۲۴

ایمان والو، یہ مشرکین بالکل ناپاک ہیں، لہذا اپنے اس سال کے بعد یہ مسجد حرام  
کے پاس نہ پھٹکنے پائیں (اس کے نتیجے میں) اگر تمہیں تنگ دستی کا اندیشہ ہے تو

۱۲ ہزار فوج تھی جسے اُس وقت کے حالات میں ایک لشکر جرار کہا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف منکرین  
اُن کے مقابلے میں بہت کم تھے۔ لیکن اس کے باوجود قبیلہ ہوازن کے تیر اندازوں نے اُن کا  
منہ پھیر دیا اور مسلمان شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اُس دن وہ اپنی  
کثرت تعداد کے غرے میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ بہتوں کے اندر نہ خدا کی یاد کی طرف توجہ باقی  
رہی، نہ نظم و اطاعت اور اخلاص و انابت کا وہ اہتمام رہا جس کی تاکید پیچھے سورہ انفال میں کی گئی  
ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے چند مٹھی بھر صحابہ، البتہ پوری استقامت کے ساتھ جمے  
رہے۔ چنانچہ اُنھی کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے کچھ تذکیر و تنبیہ کے بعد مدد فرمائی اور بالآخر فتح  
حاصل ہو گئی۔\*

۱۶۹ یہ وہی مضمون ہے جو اوپر آیت ۱۵ میں گزر چکا ہے۔

۱۷۰ جس اعلان براءت سے سورہ کی ابتدا ہوئی ہے، یہ اُسی کی تکمیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ  
مشرکین عقیدے کی جس نجاست میں مبتلا ہیں، اُس کے ساتھ یہ حج و عمرہ کے لیے بھی حدود حرم میں  
داخل نہیں ہو سکتے۔ بیت اللہ توحید کا مرکز ہے، اس میں اب ان میں سے کسی مشرک کا داخل ہونا

\* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۶۹/۴۔



يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنْ شَاءَ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٨﴾

(مطمئن رہو)، اللہ چاہے گا تو عنقریب اپنے فضل سے تمہیں غنی کر دے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۲۸

گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ خدا کے پیغمبر کی تکذیب کے بعد ان کے لیے اسلام ہے یا تلوار۔ تاہم معاہدات کی مدت پوری کرنے کے لیے کسی کو مہلت بھی دی گئی ہو تو اس سال کے بعد اُسے حرم میں آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ یہ حکم، ظاہر ہے کہ انھی مشرکین کے لیے تھا جن کے شرک کی نجاست اُن پر اتمام حجت کے درجے میں واضح کر دی گئی تھی۔ اس کا اُن لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے جو اُن کے بعد اب توحید کے اس مرکز کو دیکھنے اور اس کی دعوت کو سمجھنے کے لیے وہاں جانا چاہتے ہوں۔

اگلے حج کو اُس زمانے میں تجارت اور کاروبار کے پہلو سے بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ اُسی کے پیش نظر فرمایا ہے کہ اس حکم سے کسی کو تشویش نہ ہو کہ مشرکین نہیں آئیں گے تو اس سے کاروبار اور تجارت پر برا اثر پڑے گا جس سے مسلمانوں کی معاشی حالت جو پہلے ہی خراب ہے، خراب تر ہو جائے گی۔ لوگ مطمئن رہیں۔ خدا کی مدد اُن کے شامل حال ہے۔ وہ عنقریب اس پہلو سے بھی اُن کو مستغنی کر دے گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ یہ وعدہ پورا ہوا اور اس طرح پورا ہوا کہ ایک دن کے لیے بھی مکہ کی تجارت اس بندش سے متاثر نہ ہوئی اور کچھ عرصہ بعد تو یہ حال ہوا کہ مصر و شام اور روم و ایران کے خزانے بھی اونٹوں پر لد لد کر اسلام کے بیت المال میں پہنچنے لگے اور اللہ نے اپنے فضل سے مسلمانوں کو اس طرح غنی کر دیا کہ لوگ اپنی زکوٰۃ کا مال مدینہ کی گلیوں میں لیے پھرتے تھے، لیکن اُس کا کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔“ (تذکر قرآن ۵۵۶/۳)

اس میں مسلمانوں کے لیے یہ سبق ہے کہ وہ اگر ایمانی اقدار کی حفاظت کے لیے کسی وقت اپنے معاشی مصالح قربان کریں گے تو انھیں خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ وہ اُن کے نقصان کی تلافی





قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ  
مَآحَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ  
أَوْثُوا الْكُتُبَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ②٩

(ان مشرکوں کے علاوہ) اُن اہل کتاب سے بھی لڑو جو نہ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہیں، نہ اللہ اور اُس کے رسول کے حرام ٹھیرائے ہوئے کو حرام ٹھیراتے ہیں اور نہ دین حق کو اپنا دین بناتے ہیں<sup>۱۷۳</sup>، (اُن سے لڑو)، یہاں تک کہ اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں اور ماتحت بن کر رہیں<sup>۱۷۴</sup>۔ ۲۹

کے لیے ایسی راہیں کھول سکتا ہے جن کا وہ گمان بھی نہ رکھتے ہوں۔

۱۷۲۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے لحاظ سے سوچتے ہو، لیکن اللہ علیم و حکیم ہے، اُس نے یہ حکم دیا ہے تو اس کے نتائج و عواقب بھی اُس سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ اُس پر بھروسہ رکھو، اُس کے تمام کام علم و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

۱۷۳۔ یہ لوگ اگرچہ ایمان کے مدعی تھے، لیکن درحقیقت ان میں سے کسی چیز کو بھی نہیں مانتے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...ایمان کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اللہ کے شرائط کے تحت ہو، لیکن اُن کا ایمان اپنی خواہشوں اور بدعات کے تحت تھا۔ مشرکانہ عقائد ایجاد کر کے اُنھوں نے خدا کی نفی کر دی، اپنے آپ کو چیمپیئن اور مغفورا مت قرار دے کر آخرت کا ابطال کر دیا اور اللہ اور رسول کی حرام ٹھیرائی ہوئی چیزوں کو جائز بنا کر شریعت کو کالعدم کر دیا۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کیا کہ اللہ نے اپنے آخری رسول کے ذریعے سے اپنے وعدے کے مطابق جو دین حق بھیجا تو اُس کو نہ صرف یہ کہ قبول نہیں کیا، بلکہ اُس کی مخالفت میں اپنا پورا زور صرف کر دیا اور اُس کے خلاف برابر سازشوں میں سرگرم رہے۔“ (تذکر قرآن ۳/۵۵۹)



وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ  
ابْنُ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا

(اُن کا دین اب یہی ہے کہ) یہودی کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور  
نصاری کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ اُن کے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔ وہ اُنھی

۷۴ یعنی مغلوب ہو کر اور اپنی اس مغلوبیت اور محکومی کو تسلیم کر کے اُس کی علامت کے طور پر  
جزیہ ادا کریں۔ اوپر مشرکین کی سزا بیان ہوئی ہے کہ ایمان نہ لائیں تو قتل کر دیے جائیں۔ یہ اُن  
اہل کتاب کی سزا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود آپ کی  
دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ یہ رعایت اس لیے کی گئی ہے کہ اہل کتاب اصلاً  
توحید ہی سے وابستہ تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ بھی شرک کے مرتکب تھے، مگر بنی اسمعیل کی طرح  
اُنھوں نے شرک کو دین اور عقیدے کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا تھا۔ قرآن نے دوسری جگہ واضح  
کر دیا ہے کہ لوگ مشرک نہ ہوں تو قیامت میں بھی اسی طرح رعایت کے مستحق ہوں گے۔ یہاں  
یہ امر ملحوظ رہے کہ قرآن کا یہ حکم بھی اُس کے قانون اتمام حجت کی ایک فرع اور اُنھی اقوام کے  
ساتھ خاص تھا جن پر خدا کے آخری پیغمبر کی طرف سے حجت پوری ہو گئی۔ اُن کے لیے یہ اُسی  
طرح کا عذاب تھا جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں اُن کے مخاطبین پر ہمیشہ نازل کیا جاتا رہا  
ہے۔ اُن کے بعد اب دنیا کے کسی غیر مسلم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

۷۵ یہ وہی عزرا (Ezra) ہیں جنھیں یہودی اپنے دین کا مجدد کہتے ہیں۔ ان کا زمانہ  
پانچویں صدی قبل مسیح کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔ یہودی اپنے دور ابتلا میں تورات کو گم کر بیٹھے  
تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھی عزرا نے اُسے اپنی یادداشت سے از سر نو مرتب کیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل  
ان کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جزیرہ نماے عرب میں جو  
یہودی قبائل آباد تھے، اُن کے اندر یہ تعظیم اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اُنھوں نے ان کو خدا کا بیٹا بنا





مِنْ قَبْلِ قَتْلِهِمُ اللَّهُ أَنْ يُوَفَّقُوا ۚ (۳۰) اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ  
وَرُهَبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَا أُمُورًا  
إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَهًا وَاحِدًا ۚ لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَنَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ (۳۱)

منکروں کی سی بات کہہ رہے ہیں جو اُن سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ اُن پر خدا کی مار، وہ  
کہاں سے پھرے جاتے ہیں۔ اللہ کے سوا اُنھوں نے اپنے فقیہوں اور راہبوں کو  
رب بنا ڈالا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی۔ دریاں حالیکہ اُنھیں ایک ہی معبود کی عبادت کا  
حکم دیا گیا تھا، اُس کے سوا کوئی الہ نہیں، وہ پاک ہے اُن چیزوں سے جنھیں وہ شریک

ڈالا تھا۔

۱۷۶ یہ اُن مشرک اقوام کی طرف اشارہ ہے جو اپنی دیو مالاؤں میں آفتاب کو خدا بنا کر اُس  
کے لیے بیٹا فرض کیے ہوئے تھیں۔ یہود و نصاریٰ اُنھی سے متاثر ہوئے اور اپنی کتابوں کے بعض  
الفاظ کو موقع محل سے ہٹا کر اُن کے وہ معنی بیان کرنے لگے جو ان نئے مشرکانہ عقائد کے لیے  
بطور سند پیش کیے جاسکیں۔

۱۷۷ یعنی وہی حیثیت دے دی ہے جو رب العلمین کے لیے مانی چاہیے۔ چنانچہ اُن کے  
لیے تحلیل و تحریم کے خدائی اختیارات مان کر اُن کے ہر حکم اور ہر فیصلے کو اُسی طرح واجب الاطاعت  
سمجھتے ہیں، جس طرح خدا کے احکام اور فیصلوں کو واجب الاطاعت سمجھا جاتا ہے۔ اُن کے  
مقابلے میں کتاب الہی کی کوئی صریح آیت اور پیغمبر کا کوئی واضح ارشاد بھی پیش کر دیا جائے تو اُسے  
کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

۱۷۸ اصل میں 'سُبْحَنَهُ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ تزیہ کا کلمہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس کے اندر توحید کی نہایت واضح منطقی دلیل بھی ہے۔ وہ یوں کہ کسی چیز کی مسلم اور

بنیادی صفات سے بالکل متناقض صفات کا اُس کے ساتھ جوڑ ملانا بالبداهت خلاف عقل ہے۔





التوبه  
۹

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ  
يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ﴿٣٢﴾ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ  
بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ﴿٣٣﴾

ٹھیراتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ خدا کے اس نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھا دیں اور  
اللہ نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا، خواہ ان مشکروں کو یہ کتنا ہی  
ناگوار ہو۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ  
(اس سرزمین کے) تمام ادیان پر اس کو غالب کر دے، خواہ مشرکین بھی اسے کتنا ہی  
ناپسند کریں۔ ۱۸۰-۳۰-۳۳

اس اصول کے مطابق خدا کا کسی کو شریک ٹھیرانا اس کی شان الوہیت کے منافی ہے، کیونکہ اس  
سے اس کی مسلمہ صفات کی نفی لازم آتی ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۵۶۳)

۱۷۹۔ یہ اکمال دین کی تمثیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ جو کچھ چاہتے ہیں، اس کے  
علی الرغم جو دین ہم نے اپنے پیغمبر کو پہلی وحی سے دینا شروع کیا تھا، اسے پورا کریں گے اور اس کی  
دعوت وہاں تک پہنچا دیں گے، جہاں تک پہنچنا اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔

۱۸۰۔ یہ غلبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اور ان مشرکین کی خواہشوں کے علی الرغم  
قائم ہونا تھا جو آپ کے مخاطبین اولین تھے اور جن کا ذکر لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ کے الفاظ میں  
ہوا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ یہاں لفظ 'كُلِّ' کو اسی تخصیص کے ساتھ لیا جائے جو ہم نے ترجمے  
میں واضح کر دی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ قرآن کی یہ بات حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی اور رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں دین حق کا غلبہ پورے جزیرہ نماے عرب پر قائم ہو گیا۔ یہ ایک  
سنت الہی کا ظہور تھا جو رسولوں کے باب میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ ان کی طرف سے اتمام حجت  
کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں غلبہ عطا فرماتے اور ان کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں۔



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لِيَآكُلُونَ  
أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ  
يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ

ایمان والو، ان فقیہوں اور راہبوں میں بہتیرے ایسے ہیں جو لوگوں کا مال باطل طریقوں سے کھاتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔<sup>۱۸۲</sup> سو ان لوگوں کو دردناک عذاب کی خوش خبری دو جو (ان میں سے) سونا اور چاندی ڈھیر کر رہے ہیں اور اُسے اللہ کی راہ

اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ آخرت کی جزا و سزا کا تصور بھی اُسی معیار پر ثابت کر دیا جائے جس معیار پر سائنسی حقائق معمل (laboratory) کے تجربات سے ثابت کیے جاتے ہیں۔ اس کا انقلاب کی کسی جدوجہد سے کوئی تعلق نہیں ہے، جس طرح کہ دور حاضر کے بعض مفکرین نے سمجھا ہے۔ یہاں اس کا ذکر مسلمانوں کو یہ بتانے کے لیے ہوا ہے کہ یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور مشرکین اور اہل کتاب، دونوں کے خلاف جس آخری اقدام کا حکم اُنھیں دیا گیا ہے، وہ اسی فیصلے کے نفاذ کے لیے دیا گیا ہے۔

۱۸۱ اوپر وہ جرائم بیان ہوئے ہیں جن کے مرتکب یہ لوگ اپنے خالق کے حقوق کے معاملے میں ہوئے، اب ان کے وہ جرائم بیان ہو رہے ہیں جن کا ارتکاب یہ خلق کے معاملے میں کرتے رہے تھے۔ اس میں خاص طور پر علما اور مشائخ کا ذکر کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ خاص پہلو بھی ملحوظ رہے کہ عوام کے کردار کے بجائے یہاں علما اور مشائخ کے کردار کو بے نقاب کیا ہے تاکہ یہ حقیقت سامنے آجائے کہ جن کے علما اور مشائخ کا کردار اس درجہ فاسد ہو چکا ہے، اُن کے عوام کا کیا ذکر اور اب اُن کی اصلاح کی کیا توقع! اصلاح کا یہ ذریعہ علما و مشائخ ہی ہو سکتے تھے۔ جب وہی مال و دولت کے پجاری بن کر رہ گئے ہیں تو اصلاح کن کے ہاتھوں ہوگی۔“ (تدبر قرآن ۵۶۵/۳)

۱۸۲ یعنی جب کوئی دعوت اصلاح کے لیے اٹھتی ہے تو سب سے پہلے یہی اپنے الزامات،



بِعَذَابِ الْيَمِّ ۝۳۴ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا  
جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۝ هَذَا مَا كُنْتُمْ لَا نَفْسَكُمْ  
فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ۝۳۵

میں خرچ نہیں کرتے۔ اُس دن جب اُن کے اِس سونے اور چاندی پر دوزخ میں آگ  
دہکائی جائے گی، پھر اُن کی پیشانیاں اور اُن کے پہلو اور اُن کی پیٹھیں اُس سے داغی  
جائیں گی۔ یہی ہے جس کو تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا، سو چکھو اُس کو جو تم جمع  
کرتے رہے ہو۔ ۱۸۳-۳۴-۳۵

اعتراضات اور فتوؤں کے ساتھ اُس کا راستہ روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۱۸۳ زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد حال اور مستقبل کی ذاتی اور کاروباری ضرورتوں کے لیے  
روپیہ جمع رکھنا ممنوع نہیں ہے، لیکن خلق یا خالق کی طرف سے اُس کے انفاق کا کوئی مطالبہ سامنے  
آ جائے اور آدمی اُسے خرچ کرنے سے انکار کر دے تو اُس کی سزا وہی ہے جو قرآن نے آگے  
بیان کر دی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہی انفاق حکمت کا خزانہ بخشا ہے، اسی سے نور قلب میں افزونی ہوتی ہے۔ اگر مال کے

ڈھیر رکھتے ہوئے کوئی شخص اپنے پاس پڑوس کے یتیموں، بے کسوں، ناداروں سے بے پروا رہے یا  
دعوت دین، اقامت دین، تعلیم دین اور جہاد فی سبیل اللہ کے دوسرے کاموں سے بے تعلق ہو  
جائے تو وہ عند اللہ مواخذے اور مسئولیت سے بری نہیں ہو سکتا، اگرچہ اُس نے اپنے مال کا  
قانونی تقاضا پورا کر دیا ہو۔“ (تدبر قرآن ۵۶۶/۳)

۱۸۴ یہ سزا جرم کی مناسبت سے ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی  
ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”... دولت جمع کرنے کی سرگردانی میں بڑا دخل دو چیزوں کو ہوتا ہے: ایک ہم چشموں میں اپنا



إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ  
خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ  
فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا  
يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿٣٦﴾ إِنَّمَا النَّسِيءُ

(ایمان والو، تم ان سے لڑو اور یاد رکھو کہ) اللہ کے نزدیک، جس دن سے اُس نے  
زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے، مہینوں کی تعداد اللہ کے نوشتے میں بارہ ہی ہے<sup>۱۸۵</sup> جن  
میں چار مہینے حرمت والے ہیں<sup>۱۸۶</sup>۔ یہی دین قیم ہے<sup>۱۸۷</sup>، سو ان چار مہینوں میں (کسی کے  
خلاف اقدام سے) اپنی جان پر کوئی ظلم نہ کر بیٹھو اور مشرکوں سے، (خاص کر) سب مل  
کر لڑو، جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے

سراونچا رکھنے کی خواہش، دوسری اپنے ذاتی آرام و راحت کی طلب۔ فرمایا کہ جو لوگ دنیا میں  
سر بلندی اور فخر کی خاطر دولت جمع کریں گے، اُن کی دولت بروز قیامت اُن کی پیشانی پر داغ  
لگائے گی۔ اسی طرح جو لوگ نرم ریشمین و مخملیں گدوں، غالیچوں، قالینوں اور صوفوں کے درپے  
ہو کر انفاق کی سعادت سے محروم رہیں گے، اُن کی یہ بچائی ہوئی دولت اُن کے پہلوؤں اور اُن  
کی پیٹھوں کو زخمی کرے گی۔“ (تدبر قرآن ۳/۵۶۷)

۱۸۵ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ اہل عرب نسی کی خاطر، جس کا ذکر آگے آ رہا ہے، مہینوں کی تعداد  
۱۳ یا ۱۴ بنا لیتے تھے، جب کہ چاند مہینے میں ایک ہی دفعہ ہلال بن کر طلوع ہوتا ہے اور اس حساب  
سے سال کے ۱۲ ہی مہینے بنتے ہیں۔

۱۸۶ یعنی ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم حج کے لیے اور ربیعہ کے لیے۔

۱۸۷ یعنی یہ حکم کہ سال میں چار مہینے حج و عمرہ کی غرض سے جنگ و جدال کے لیے حرام ہوں  
گے۔ فرمایا کہ یہ ٹھیک وہی دین ہے جو خدا نے اپنے پیغمبروں، خاص طور پر ابراہیم و اسمعیل علیہما السلام





التوبة  
۹

زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا  
وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِّيُطَاعِ عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحِلُُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ

جو زیادتی سے بچنے والے ہوں۔<sup>۱۸۸</sup> (حقیقت یہ ہے کہ) مہینوں کا ہٹا دینا ان کے کفر ہی میں ایک اضافہ ہے جس سے یہ منکرین گم راہی میں مبتلا کیے جاتے ہیں۔<sup>۱۸۹</sup> کسی سال یہ حرام مہینے کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اُس کو حرام ٹھیراتے ہیں تاکہ خدا کے حرام کیے ہوئے مہینوں کی گنتی پوری کر کے خدا کے حرام کیے ہوئے کو (اپنے لیے) حلال بنا

کے ذریعے سے اُن کے ماننے والوں کو دیا تھا۔

۱۸۸ مطلب یہ ہے کہ پیچھے جس قتال کا حکم دیا گیا ہے، وہ اگرچہ خدا کا عذاب ہے، لیکن اُس میں بھی حرام مہینوں کا لحاظ ضروری ہے۔ تاہم ان کے حدود حرمت کا لحاظ رکھتے ہوئے جنگ لازماً کی جائے گی اور یہ جنگ مشرکین سے من حیث الجماعت ہوگی۔ اس میں کسی رشتہ و قرابت، کسی دوستی اور کسی سیاسی، معاشرتی یا معاشی مفاد کی بنا پر کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ یہ جنگ کفر کے استیصال کے لیے ہے، اس میں اس نوعیت کے تمام تعلقات بالائے طاق رکھ دیے جائیں گے۔ یہی ایمان و اسلام کا تقاضا ہے۔

۱۸۹ اصل میں 'نَسِيءٌ' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ عرب جاہلیت کی اصطلاح ہے۔ اس کے دو طریقے تھے: ایک یہ کہ کسی کے خلاف لڑائی چھیڑنا پیش نظر ہو تو حرام مہینے کی جگہ حلال مہینہ رکھ کر لڑائی کو جائز کر لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ تجارتی اغراض کے لیے قمری سال کو شمسی سال کے مطابق کرنے کے لیے اُس میں کبیسہ کا ایک مہینہ بڑھا دیا جائے تاکہ حج ہمیشہ ایک ہی موسم میں آتا رہے۔

۱۹۰ نسی کا یہ طریقہ اہل عرب اس لیے اختیار کرتے تھے کہ اس طرح کاروباری مفادات بھی محفوظ رہتے تھے اور حرام مہینوں کی تعداد بھی پوری ہو جاتی تھی جو دین داری کا تقاضا تھا، لیکن قرآن



زَيْنَ لَهُمْ سُوءَ أَعْمَالِهِمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٣٦﴾  
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ أَنْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ

لیں۔ ان کے برے اعمال ان کے لیے خوش نما بنا دیے گئے ہیں<sup>۱۹۱</sup>۔ اللہ کا فیصلہ ہے کہ  
اس طرح کے منکر لوگوں کو وہ راہ یاب نہیں کرے گا۔ ۳۶-۳۷

ایمان<sup>۱۹۲</sup> والو، تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں (جہاد

نے اسے کفر میں ایک اور اضافہ قرار دیا۔ اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام کے جس دین سے وہ پہلے  
ہی بڑی حد تک منحرف تھے، اُن کی یہ حیلے بازی اُس سے مزید انحراف کا باعث بن جاتی تھی۔ فرمایا  
کہ اس سے یہ خدا کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، لیکن الٹا اُس کے قانون کی زد میں آ جاتے ہیں اور  
گم راہی کے حوالے کر دیے جاتے ہیں۔ خدا کا قانون یہی ہے کہ جو لوگ دین و شریعت کے  
معاملے میں حیلہ بازی کے طریقے اختیار کریں، وہ کبھی راہ یاب نہیں ہوتے۔ اللہ انہیں خود اُن  
کے پیدا کیے ہوئے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

۱۹۱ یعنی اس حیلہ بازی کو بڑی فقاہت سمجھتے ہیں، لیکن نہیں جانتے کہ یہ آخری درجے کی بد عملی  
ہے جو شیطان نے ان کی نگاہوں میں خوش نما بنا دی ہے۔

۱۹۲ یہ چوتھا شذرہ ہے اور ۹ ہجری میں کسی وقت نازل ہوا ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم غزوہ تبوک کی تیاری کر رہے تھے۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے خلاف اعلان جنگ کے بعد  
یہاں سے روئے سخن اب منافقین کی طرف ہے اور سورہ کے آخر تک اُنھی کا تعاقب فرمایا ہے۔  
استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس سے پہلے منافقین کے رویے پر جو تنقید بھی ہوئی، اُس کا لب و لہجہ نرم رہا ہے، لیکن  
اس سورہ میں جس طرح مشرکین اور اہل کتاب کے باب میں آخری فیصلے کا اعلان کر دیا گیا





التوبه  
۹

اَتَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ط اَرْضَيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنْ الْاٰخِرَةِ ؕ فَمَا  
مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝۳۸ اَلَا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبُكُمْ  
عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا وَاللّٰهُ  
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۳۹ اَلَا تَضُرُّوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذَا خَرَجَهُ

کے لیے) نکلو تو زمین پر ڈھیر ہوئے جاتے ہو؟ کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے ہو؟ سو (حقیقت یہ ہے کہ) دنیا کی زندگی کا یہ سرو سامان تو آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔ (اس لیے اٹھو)، اگر نہیں اٹھو گے تو (یاد رکھو کہ) خدا تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اگر تم پیغمبر کی مدد نہیں کرو گے تو

ہے، اُسی طرح منافقین کے بارے میں بھی ایک قطعی فیصلہ سنا دیا گیا ہے تاکہ اُن میں سے جن کے اندر توبہ اور اصلاح کی کوئی صلاحیت باقی ہے، وہ توبہ اور اصلاح کے بعد اسلامی معاشرے کے صالح جزو بن جائیں اور جو بالکل مردہ ہو چکے ہیں، وہ خس و خاشاک کے اُس ڈھیر میں شامل ہو جائیں جس کے صاف کر دینے کا آخری فیصلہ قدرت کی طرف سے ہو چکا ہے۔“

(تدبر قرآن ۵۷۲/۳)

۱۹۳ اصل الفاظ ہیں: 'اَتَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ'۔ ان میں، اگر غور کیجیے تو قرآن نے اُس حالت کی تصویر کھینچ دی ہے جسے بیان کرنا مقصود ہے۔

۱۹۴ یہ اُن لوگوں کی سزا ہے جنہیں خدا اپنے کسی مشن کے لیے منتخب کر لے اور وہ اُس کے تقاضوں کو پورا کرنے سے انکار کر دیں۔ ذریت ابراہیم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو معاملہ ہمیشہ رہا ہے، وہ اسی قانون کے تحت ہے۔

۱۹۵ یہ مختصر سا جملہ بہ یک وقت کئی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ استاذ امام امین احسن



الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ  
لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ  
بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ

کچھ پروا نہیں، اس لیے کہ اُس کی مدد تو اللہ نے اُس وقت فرمائی، جب انھی منکروں  
نے اُس کو اس طرح نکالا تھا کہ وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں<sup>۱۹۶</sup>  
تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اللہ نے<sup>۱۹۷</sup>  
اُس وقت اُس پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور ایسے لشکروں سے اُس کی مدد کی جو تم کو نظر  
اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

”... ایک یہ کہ خدا تمہیں عذاب دینے پر قادر ہے، دوسری یہ کہ تمہاری جگہ دوسروں کو اٹھا کھڑا  
کرنے پر قادر ہے، تیسری یہ کہ وہ اپنی ہر اسکیم بروے کار لانے پر قادر ہے، اپنے کسی بھی  
ارادے کی تکمیل میں وہ کسی کا محتاج نہیں۔“ (تدبر قرآن ۳/۵۷۶)

۱۹۶ یہ سفر ہجرت کی طرف اشارہ ہے جس میں صرف سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے  
ساتھ تھے۔

۱۹۷ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس اندیشے سے  
کہ آپ کا تعاقب کیا جائے گا، مکہ سے نکل کر تین دن کے لیے غار ثور میں پناہ گیر ہو گئے تھے۔ یہ  
اُسی موقع کا ذکر ہے۔ آپ کا تعاقب کرنے والے عین اُس غار کے دہانے تک پہنچ گئے تھے جس  
میں آپ چھپے ہوئے تھے۔ سیدنا ابوبکر کو سخت خوف لاحق ہوا کہ کہیں کوئی شخص آگے بڑھ کر غار  
میں جھانک نہ لے، لیکن آپ کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا اور اپنے ساتھی کی تسلی کے لیے  
آپ کی زبان مبارک سے وہ بے مثل الفاظ نکلے جو قرآن نے یہاں نقل کیے ہیں\*۔

\* السيرة النبوية، ابن هشام ۲/۱۱۱۔





التوبه  
۹

وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ③۰  
 انْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي  
 سَبِيلِ اللَّهِ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ③۱ لَوْ كَانَتْ  
 عَرْضًا قَرِيبًا وَسَفَرًا قَاصِدًا لَا تَبَعُوكَ وَلَكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ  
 الشُّقَّةُ وَسَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا خُرْجَانَا مَعَكُمْ ۚ يَهْلِكُونَ  
 أَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ③۲

نہیں آئے اور منکروں کی بات اُس نے نیچی کر دی اور خدا کی بات ہی اونچی رہی۔ اللہ  
 زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ ۱۹۸۔ ۳۸-۴۰

تم نکلو، خواہ تم ہلکے ہو یا بوجھل، اور اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد  
 کرو۔ ۱۹۹۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانو۔ (اے پیغمبر)، اگر فائدہ نزدیک اور  
 سفر ہلکا ہوتا تو یہ لوگ ضرور تمہارے پیچھے ہو لیتے، مگر یہ منزل ان پر کٹھن ہو گئی۔ اب  
 یہ اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم نکل سکتے تو ضرور تمہارے ساتھ نکلتے۔ یہ اپنے  
 آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ۴۱-۴۲

۱۹۸۔ یہ بالا جمال اُن سب تائیدات الہی کا حوالہ ہے جو اُس وقت تک ظاہر ہو چکی تھیں۔  
 ۱۹۹۔ یعنی سروسامان کم ہو یا زیادہ، اسے جہاد سے جی چرانے کا بہانہ نہ بناؤ۔ یہ نفیر عام کا  
 موقع ہے۔ اس نوعیت کا کوئی عذر بھی اس وقت مقبول نہیں ہے۔  
 ۲۰۰۔ یعنی تبوک کا سفر جس میں روم جیسی بڑی اور منظم طاقت سے مقابلہ تھا، مسافت طویل تھی،  
 موسم شدید گرم تھا اور نئے سال کی فصل پک کر کٹنے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔\*

\* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۱۳۱/۴۔



عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنْتَ لَهُمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ  
صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِينَ ﴿٣٣﴾ لَا يَسْتَآذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ  
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ

اللہ تم کو معاف کرے، (اے پیغمبر)، تم نے اس سفر سے انھیں رخصت کیوں دے دی؟ تمہیں چاہیے تھا کہ ایسا نہ کرتے، یہاں تک کہ تم پر کھل جاتا کہ کون سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے۔ جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر سچا ایمان رکھتے ہیں، وہ کبھی تم سے رخصت مانگنے نہیں آئیں گے کہ انھیں اپنے جان و مال کے ساتھ جہاد

۲۰۱ اللہ اور اُس کے رسول کے سامنے جھوٹے عذرات پیش کیے جائیں تو اُس کا نتیجہ، ظاہر ہے کہ یہی ہے اور یہی ہونا چاہیے۔

۲۰۲ تبوک کے موقع پر جہاد کے لیے نفیر عام کا اصلی مقصد یہی تھا کہ جزا و سزا کے اس مرحلے میں منافقین کے چہرے سے بھی نقاب الٹ دی جائے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کریم النفسی اور چشم پوشی اُن کے آڑے آئی اور آپ نے یہ جاننے کے باوجود کہ جو عذرات وہ پیش کر رہے ہیں، سب جھوٹے ہیں، انھیں قبول کر لیا اور رخصت دے دی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہایت دل نواز اسلوب میں آپ کو اس پر توجہ دلائی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... بات کا آغاز ہی عفو کے اعلان سے فرمایا کہ واضح ہو جائے کہ مقصود سرزنش اور عتاب نہیں، بلکہ توجہ دلا دینا ہے کہ منافقین تمہاری کریم النفسی سے بہت غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ تم اپنی چشم پوشی کی وجہ سے اُن کے عذرات کو لا طائل سمجھنے کے باوجود اُن کو اجازت دے دیتے ہو جس سے وہ دلیر ہو جاتے ہیں کہ اُن کی مکاری کامیاب ہو گئی، حالاں کہ اگر تم اجازت نہ دیتے تو اُن کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ اُن کے جھوٹوں اور سچوں میں امتیاز ہو جاتا۔ تمہاری اجازت کے بغیر جو گھر میں بیٹھ رہتے، ہر شخص پہچان جاتا کہ یہ منافق ہیں، لیکن وہ تمہاری اجازت کو اپنے چہرے کی نقاب بنا لیتے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۳/۵۸۳)





التوبه

بِالْمُتَّقِينَ ۝ إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ  
وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ ۝ وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ  
لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً وَلَكِنْ كَرِهَ اللَّهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيلَ  
اقْعُدُوا مَعَ الْقَاعِدِينَ ۝

لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَا أَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ  
يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيكُمْ سَمْعُونُ لَهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝

سے معاف رکھا جائے۔ اللہ اُن کو خوب جانتا ہے (جن کے عذر حقیقی ہیں اور) جو اُس  
سے ڈرنے والے ہیں۔ تم سے رخصت مانگنے تو وہی آتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت  
کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں، سوا اپنے اسی  
شک میں حیران بھٹک رہے ہیں۔ اگر وہ نکلنا چاہتے تو ضرور اُس کا کچھ سامان کرتے،  
لیکن اللہ نے اُن کا اٹھنا پسند نہیں کیا، اس لیے اُنھیں روک کر بٹھا دیا اور کہہ دیا گیا کہ  
بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ ۲۰۳-۲۰۶

(حقیقت یہ ہے کہ) اگر یہ لوگ تمہارے اندر شامل ہو کر نکلتے تو تمہارے لیے خرابی  
ہی کو بڑھانے کا باعث بنتے اور تمہارے درمیان ان کی سب دوڑ دھوپ فتنہ انگیزی  
کے لیے ہوتی، اس لیے کہ تمہارے اندر ایسے بھی ہیں جو کان لگا کر ان کی سن لیتے ہیں۔

۲۰۳ یہ توفیق کے باب میں سنت الہی کا بیان ہے اور اسلوب طنزیہ ہے۔ آگے کی بعض  
آیتوں میں یہ طنز اور بھی تیز ہو گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ جب تم نے اٹھنا پسند نہیں کیا تو خدا نے بھی  
تمہیں اس کی توفیق نہیں دی، بلکہ یہی پسند کیا کہ جاؤ گھروں میں بیٹھنے والے بوڑھوں، بچوں اور  
عورتوں کی طرح تم بھی بیٹھے رہو۔ تمہارے لیے یہی موزوں ہے۔



لَقَدْ ابْتَغُوا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ حَتَّى جَاءَ الْحَقُّ  
وَوَضَّاهُ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كَرِهُونَ ﴿٢٨﴾

اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ انھوں نے پہلے بھی فتنہ انگیزی کی کوشش کی ہے اور تمھارے لیے معاملات کا الٹ پھیر کرتے رہے ہیں، یہاں تک کہ ان کی مرضی کے خلاف حق آیا اور اللہ کا حکم ظاہر ہو گیا۔ ۲۷-۲۸

۲۰۴ یہ اُن سادہ لوح مسلمانوں کی طرف اشارہ ہے جن کی سادہ لوحی کے سبب سے منافقین بالعموم انھیں چکما دینے میں کامیاب ہو جاتے اور اس طرح فتنہ انگیزی کے لیے کچھ نہ کچھ راستہ نکال لیتے تھے۔

۲۰۵ قرآن کے مخاطبین ان سب چیزوں سے واقف تھے، اس لیے اُس نے صرف اجمالی اشارہ کر دیا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

”...یہی لوگ تھے جنھوں نے جنگ بدر کے موقع پر... اللہ اور رسول کا منشا واضح ہونے کے باوجود مسلمانوں کو قافلہ تجارت پر حملہ کرنے کی راہ بھانے کی کوشش کی، انھی لوگوں نے جنگ احد کے موقع پر پہلے تو شہر میں محصور ہو کر مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا، پھر جب ان کا مشورہ قبول نہیں ہوا تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر عین موقع پر الگ ہو گیا۔ پھر جنگ کے بعد اسی کے ہم خیالوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہ پروپیگنڈا کیا کہ نعوذ باللہ آپ قوم کے بدخواہ ہیں کہ خیر خواہوں کے مشورے کے خلاف ایک غلط مقام پر لے جا کر ہمارے بھائیوں کو کٹوا دیا اور شکست کا سبب بنے۔ پھر یہی لوگ تھے جنھوں نے جنگ مریسج کے موقع پر اپنی فتنہ انگیزی سے ایسی صورت پیدا کر دی کہ انصار اور مہاجرین کے درمیان تلوار چلتے چلتے رہ گئی۔ اسی سلسلے میں ان کی ایک نہایت سنگین شرارت واقعہ افک کی شکل میں ظاہر ہوئی جو بات کا بتنگڑ بنانے کی ایک نہایت گھنونی مثال ہے۔ حنین کے موقع پر تقسیم غنیمت کے معاملے میں انھوں نے اپنی بد طینتی سے دلوں میں سخت کدورت پیدا کر دینے کی کوشش کی۔







التوبة  
۹

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ اٰذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۖ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ  
سَقَطُوْا ۖ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۭ بِالْكَافِرِيْنَ ۝۴۹ اِنْ تُصِْبَكَ  
حَسَنَةٌ تَّسُوْهُمۡ ۚ وَاِنْ تُصِْبَكَ مُصِيْبَةٌۭ يَقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَا

ان میں ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے رخصت دیجیے اور مجھ کو فتنے میں نہ  
ڈال لے۔ ۲۰۶ سن لو، یہ فتنے میں پڑ چکے اور (اب) دوزخ ان منکروں کو گھیرے ہوئے  
ہے۔ ۲۰۸ اگر تمہیں کوئی اچھائی پیش آتی ہے تو انہیں دکھ ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی

غرض جو موقع بھی ان کے ہاتھ آیا، اُس سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے مسلمانوں کے درمیان  
پھوٹ ڈلوانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔“ (تدبر قرآن ۵۸۵/۳)

۲۰۶ یعنی روم جانے کے لیے نہ کہیے کہ مبادا وہاں کوئی فتنہ ہمیں اپنی گرفت میں لے لے۔  
روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ اس سے اُن کی مراد رومی عورتوں کے حسن و جمال کا فتنہ تھا\*۔ یہ  
اُسی طرح کا عذر ہے، جیسا کہ بعض مدعیان تقویٰ مسجد کی حاضری سے متعلق پیدا کر لیتے ہیں کہ  
گھر ہی میں نماز پڑھ لیتے ہیں، اس لیے کہ وہاں جائیں گے تو ریا کے فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے۔  
استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اگرچہ یہ عذر پیش تو ایک آدھ احمقوں نے ہی کیا ہوگا، لیکن یہ عذر کی ایک ایسی قسم تھی جس پر  
تقویٰ اور دین داری کا ملمع چڑھانے کی کوشش کی گئی تھی، اس وجہ سے قرآن نے اس کا خاص طور پر  
ذکر فرمایا تا کہ مسلمانوں کو شیطان کے ایک خاص حربے سے آگاہ کر دیا جائے کہ کبھی کبھی وہ تقویٰ  
کے بھیس میں بھی حملہ آور ہوتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۵۸۶/۳)

۲۰۷ نہایت بلیغ فقرہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تبوک جانا تو دور کی بات ہے، اپنی بد عملی پر  
فریب کاری کا یہ ملمع چڑھا کر اور اس طرح کے عذرات پیش کر کے یہ گھر بیٹھے ہی فتنے میں مبتلا ہو

\* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۲/۵۷۵۔



أَمْرًا مِّن قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَهُمْ فَرِحُونَ ۝ قُل لَّن يُصِيبَكَ  
إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ  
الْمُؤْمِنُونَ ۝ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا أَحَدَى الْحُسَيْنِ ط  
وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ أَن يُصِيبَكُمْ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهِ أَوْ

ہے تو کہتے ہیں کہ (خوب ہوا)، ہم نے پہلے ہی اپنا بچاؤ کر لیا تھا اور خوش خوش لوٹے  
ہیں۔<sup>۲۰۹</sup> انھیں بتا دو کہ ہمیں وہی چیز پہنچے گی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ رکھی ہے۔ وہ ہمارا  
مولیٰ ہے اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ ان سے کہہ دو کہ تم ہمارے  
معاملے میں جس چیز کے منتظر ہو، وہ اس کے سوا کیا ہے کہ دو بھلائیوں میں سے ایک  
بھلائی ہے۔<sup>۲۱۰</sup> لیکن ہم تمہارے معاملے میں جس چیز کے منتظر ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ تم پر  
چکے ہیں۔

۲۰۸ اس سے دو باتیں واضح ہوئیں: ایک یہ کہ اس قسم کے تمام بہانے تراشنے والے اگرچہ  
بظاہر مسلمان بنے ہوئے ہیں، مگر درحقیقت منکر ہیں۔ دوسری یہ کہ تبوک کے سفر سے تو یہ اس طرح  
کی بہانہ سازی سے بچ سکتے ہیں، لیکن خدا کی دہکائی ہوئی جہنم سے نہیں بچ سکتے۔ یہ جہاں چاہیں،  
بھاگ کر دیکھ لیں، وہ ہر طرف سے ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

۲۰۹ یہ اُسی کفر سے پردہ اٹھایا ہے جس کا ذکر پیچھے ہوا کہ ان کے سینے ایمان سے خالی ہیں،  
اس لیے کہ ان کے دلوں میں تو مسلمانوں کے لیے اس درجے کی بدخواہی بھری ہوئی ہے۔

۲۱۰ یعنی جس سفر کے لیے نکل رہے ہیں، اُس میں کامیابی یا ناکامی۔ یہ دونوں ہمارے لیے  
بھلائی ہیں۔ اس لیے کہ پہلی چیز حاصل ہوئی تو اپنے پروردگار کا شکر ادا کریں گے جس کے بعد  
ازیا و نعمت کی توقع ہے اور دوسری چیز سے دوچار ہوئے تو صبر و استقامت کے ساتھ اور توبہ و انابت





التوبه

بَايِدِينَا ۖ فَتَرَبَّصُوا اِنَّا مَعَكُمْ مُتَرَبِّصُونَ ﴿٥٢﴾  
 قُلْ اَنفِقُوا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يَتَقَبَّلَ مِنْكُمْ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا  
 فَسِقِينَ ﴿٥٣﴾ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقَبَّلَ مِنْهُمْ نَفَقَتُهُمْ اِلَّا اَنَّهُمْ كَفَرُوا  
 بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُونَ اِلَّا وَهُمْ

اپنے ہاں سے عذاب بھیجے گا یا ہمارے ہاتھوں سے۔ سو انتظار کرو، ہم بھی تمہارے  
 ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہیں۔ ۴۹-۵۲

(اپنے نفاق کو چھپانے کے لیے یہ کچھ نہ کچھ خرچ کرنے کے لیے بھی تیار ہو  
 جاتے ہیں)، ان سے کہہ دو، تم اپنے مال خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے، وہ تم سے  
 ہرگز قبول نہ کیے جائیں گے، اس لیے کہ تم بد عہد لوگ ہو۔ ان کا انفاق درخور قبول  
 نہیں ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انھوں نے اللہ سے اور اس کے رسول  
 سے کفر کیا ہے اور نماز کے لیے آتے ہیں تو مارے باندھے آتے ہیں اور خرچ کرتے

کے جذبے سے اپنی کمزوریوں کی اصلاح کریں گے جس کے نتیجے میں امید ہے کہ دنیا اور آخرت،  
 دونوں میں خدا کی رحمت و عنایت شامل حال ہو جائے گی۔

۲۱۱ اس کتاب میں کئی جگہ بیان ہو چکا ہے کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد خدا کا  
 عذاب بالعموم انھی دو صورتوں میں آتا ہے۔ رسول کے ساتھی تعداد میں کم ہوں اور انھیں کوئی  
 دارالہجرت بھی میسر نہ ہو سکے تو ابرو بباد کے لشکر منکرین کو تباہ کر دیتے ہیں۔ وہ معتد بہ تعداد میں ہوں  
 اور کسی سر زمین میں ان کے لیے آزادی اور تمکن کے ساتھ رہنے بسنے کا سامان بھی ہو جائے تو ان  
 کی تلواریں بے نیام ہوتی ہیں اور منکرین حق کا استیصال کر دیتی ہیں۔

۲۱۲ یعنی حقیقت میں کفر کیا ہے، اس لیے کہ اللہ و رسول پر ایمان کے جو تقاضے ہیں، یہ ان



كَرْهُونَ ۝ فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ  
لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَتَرْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ۝  
وَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِنْكُمْ وَلَكِنَّهُمْ قَوْمٌ  
يَفْرُقُونَ ۝ لَوْ يَجِدُونَ مَدْجًا أَوْ مَغْرَبًا أَوْ مَدْخَلًا لَوَلَّوْا  
إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ ۝

ہیں تو بادل نا خواستہ خرچ کرتے ہیں۔ سو ان کے مال و اولاد کو کچھ وقعت نہ دو، اللہ تو  
اب یہی چاہتا ہے کہ ان کے ذریعے سے انہیں دنیا کی زندگی میں عذاب دے اور  
ان کی جانیں اس حالت میں نکلیں کہ یہ کافر ہوں۔ ۵۳-۵۵

یہ خدا کی قسمیں کھا کھا کر اطمینان دلاتے ہیں کہ تم میں سے ہیں، دریاں حالیکہ یہ تم  
میں سے نہیں ہیں، بلکہ ایسے لوگ ہیں جو ڈرتے ہیں۔ اگر یہ کوئی ٹھکانا، کوئی غار یا کوئی  
گھس بیٹھنے کی جگہ پالیتے تو رسی تڑا کر ادھر بھاگ کھڑے ہوتے۔ ۵۶-۵۷

میں سے کسی کو بھی پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

۲۱۳ یعنی اس بنا پر ان سے دین کی کسی سچی خدمت کی توقع نہ کرو، اس لیے کہ یہ مال و اولاد  
ان کے لیے آخرت میں کسی بڑے مرتبے کو حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں، بلکہ غلامی کا پھندا ہے۔  
اپنی گردنیں یہ اب اس پھندے سے چھڑانہ سکیں گے۔

۲۱۴ اللہ کا یہ چاہنا اس سنت کے مطابق ہے جو اس نے لوگوں کی ہدایت اور گم راہی کے لیے  
مقرر کر رکھی ہے۔ اس کی وضاحت ہم پیچھے ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں۔

۲۱۵ یعنی اس بات سے ڈرتے ہیں کہ تم سے الگ ہو گئے تو اسی انجام کو پہنچا دیے جائیں گے  
جو اس سے پہلے کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے لیے بیان ہو چکا ہے۔





التوبه  
۹

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا  
وَإِنْ لَّمْ يُعْطُوا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ﴿٥٨﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا  
آتَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ سَيُؤْتِينَا اللَّهُ مِنْ

ان میں ایسے بھی ہیں، (اے پیغمبر)، جو صدقات<sup>۲۱۷</sup> (کی تقسیم) کے معاملے میں تم پر عیب لگاتے ہیں۔ (یہ وہ لوگ ہیں جنہیں لالچ نے تمہارے ساتھ باندھ رکھا ہے)۔<sup>۲۱۸</sup> چنانچہ اگر اُس مال میں سے انہیں دیا جائے تو راضی رہتے ہیں اور اُس میں سے نہ دیا جائے تو فوراً ناراض ہو بیٹھتے ہیں۔ ان کے لیے کہیں بہتر ہوتا، اگر یہ اُس پر راضی رہتے جو اللہ اور اُس کے رسول نے انہیں دیا تھا اور کہتے کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے، اللہ آگے

۲۱۶ یعنی جانتے ہیں کہ اب فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا، ورنہ بھاگ کر کہیں پناہ لے چکے ہوتے۔

۲۱۷ ان میں زکوٰۃ بھی شامل ہے، مگر یہ لفظ اُس کی نسبت عام ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس میں وہ تمام عطا یا شامل ہیں جو بہ نیت اجر و ثواب دیے جائیں۔ عام اس سے کہ وہ

زکوٰۃ کا مال ہو یا انفاق و تبرع کی نوعیت کا کوئی اور مال۔ چونکہ اسی انفاق سے آدمی کے ایمان

کی صداقت اور پختگی واضح ہوتی ہے، اس وجہ سے اس کو صدقہ کہتے ہیں جس کی اصل صدق

ہے جس کی روح قول و فعل کی کامل مطابقت اور رسوخ و استحکام ہے۔“ (تدبر قرآن ۵۹۱/۳)

۲۱۸ اوپر مال دار منافقین کا ذکر کرتا۔ چنانچہ فرمایا کہ انہیں خوف نے تمہارے ساتھ باندھ رکھا

ہے۔ اب یہ اُن منافقین کا ذکر ہو رہا ہے جو مال دار نہیں تھے۔

۲۱۹ یہ شرطیہ جملہ ہے جس کی جزا اصل میں حذف کر دی گئی ہے تاکہ وہ شدت نمایاں ہو

جائے جو متکلم اس جملے سے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔ عربی زبان

میں یہ اسلوب اسی طریقے سے زجر، شفقت، حسرت و ملامت اور التفات و عنایت کے پہلوؤں کو



فَضْلِهِ وَرَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ ﴿٥٩﴾ إِنَّمَا الصَّدَقَتُ  
لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي  
الرِّقَابِ وَالْغَرَمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةٌ مِّنَ  
اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٦٠﴾

اپنے فضل سے ہم کو بہت کچھ دے گا اور اُس کا رسول بھی، ہمیں تو اللہ چاہیے۔ (انہیں  
بتا دو کہ) صدقات تو درحقیقت فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور اُن کے لیے جو  
اُن کے نظم پر مامور ہوں، اور اُن کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہے۔ نیز اس  
لیے کہ گردنوں کے چھڑانے میں اور تاوان زدوں کے سنبھالنے میں اور خدا کی راہ میں  
اور مسافروں کی بہبود کے لیے خرچ کیے جائیں۔ یہ اللہ کا مقرر کردہ فریضہ ہے اور اللہ  
علیم و حکیم ہے۔ ۶۰-۵۸

نمایاں کرنے کے لیے بھی اختیار کیا جاتا ہے۔

۲۲۰ مطلب یہ ہے کہ بیت المال میں جو صدقات جمع ہوتے ہیں، وہ اُن مصارف کے  
لیے خاص ہیں جو نظم اجتماعی کی ضرورتوں اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں خدا  
نے اپنے علم و حکمت سے مقرر فرمایا ہے، لہذا صدقات انہی میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ یہ مال کے  
حریص ناخواندہ مہمانوں کے لیے نہیں ہیں اور نہ اُن کی خواہشوں کے مطابق تقسیم کیے جاسکتے  
ہیں۔

آیت میں جو مصارف بیان ہوئے ہیں، اُن کی تفصیل یہ ہے:

فقرا و مساکین کے لیے۔ فقیر کا لفظ اُس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنی معیشت کے لیے  
دوسروں کی مدد کا محتاج ہو۔ یہ غنی کا مقابل ہے اور ہر قسم کے حاجت مندوں کے لیے عام ہے۔  
مسکین اس کے مقابل میں سخت ہے۔ مسکنت کے لفظ میں عاجزی، درماندگی، بے بسی اور بے چارگی



شامل ہے۔ اس اعتبار سے مسکین اُسے کہا جائے گا جو عام حاجت مندوں کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال ہو۔

’الْعَمَلِينَ عَلَيْهَا‘، یعنی ریاست کے تمام ملازمین کی خدمات کے معاوضے میں۔ اس لیے کہ ریاست کے تمام ملازمین درحقیقت ’العاملین علی أخذ الضرائب وردھا إلى المصارف‘ ہی ہوتے ہیں۔ ’متصدقین‘ یا اس طرح کے بعض دوسرے الفاظ کے بجائے قرآن نے یہ لفظ اسی مدعا کو ادا کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔

’الْمَوْلَّةَ قُلُوبُهُمْ‘، یعنی اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں تمام سیاسی اخراجات کے لیے۔ ’فِي الرِّقَابِ‘، یعنی ہر قسم کی غلامی سے نجات کے لیے۔ ’الْغَرَمِينَ‘، یعنی کسی نقصان، تاوان یا قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کی مدد کے لیے۔

’فِي سَبِيلِ اللَّهِ‘، یعنی دین کی خدمت کے کاموں میں۔ ’أَبْنِ السَّبِيلِ‘، یعنی مسافروں کی مدد اور اُن کے لیے سڑکوں، پلوں، سراؤں وغیرہ کی تعمیر کے لیے۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ زکوٰۃ اور دوسرے تمام صدقات جس طرح فرد کے ہاتھ میں دیے جا سکتے ہیں، اُسی طرح اُس کی بہبود کے کاموں میں بھی خرچ کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے مصارف پر تملیک ذاتی کی جو شرط بالعموم عائد کی جاتی ہے، اُس کے لیے کوئی ماخذ قرآن و سنت میں موجود نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”ہمارے فقہاء کا ایک گروہ ’إِنَّمَا الصَّدَقَتُ لِلْفُقَرَاءِ‘ کے ’ل‘ کو تملیک ذاتی کے مفہوم کے لیے خاص کرتا ہے اور پھر اُس سے یہ نتیجہ نکال لیتا ہے کہ صدقات و زکوٰۃ کی رقوم فقرا و مساکین کی کسی ایسی اجتماعی بہبود پر صرف نہیں ہو سکتیں جس سے ملکیت ذاتی تو کسی کی بھی قائم نہ ہو، لیکن اُس کا فائدہ بحیثیت مجموعی سب کو پہنچے۔ ہمارے نزدیک یہ رائے کسی مضبوط دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ اول تو ’ل‘ کچھ تملیک ہی کے معنی کے لیے خاص نہیں ہے، بلکہ یہ متعدد معانی





وَمِنْهُمْ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ  
قُلْ أُذُنٌ خَيْرٌ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةٌ

انہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو (اپنی باتوں سے) پیغمبر کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص تو سراپا کان ہے۔<sup>۲۲۱</sup> کہہ دو، وہ تمہاری بھلائی کے لیے کان ہے۔<sup>۲۲۲</sup> وہ اللہ پر

کے لیے آتا ہے اور ان سب معانی کے لیے یہ خود قرآن میں استعمال ہوا ہے، تملیک ذاتی ہی کے معنی کے لیے اس کو خاص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ آخر بہود، نفع رسانی اور استحقاق کے معانی کے لیے بھی جب اس کا استعمال معروف ہے تو ان معانی میں یہ کیوں نہ لیا جائے؟ پھر آیت میں آپ نے دیکھا کہ بعض چیزیں 'فی' کے تحت بیان ہوئی ہیں اور 'فی' کا متبادر مفہوم تملیک نہیں، بلکہ خدمت، مصرف، رفاہیت اور بہود ہی ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۵۹۳)

۲۲۱ یعنی ہر وقت ہر شخص کی بات سننے اور اُسے مان لینے کے لیے تیار رہتا ہے۔ یہ ہجو ملح کا جملہ ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یہ مفہوم اس جملے میں یہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ ہر ایک کی بات سن لینا جہاں آدمی کی شرافت اور کریم النفسی کی دلیل ہے، وہیں یہ اُس کی سادگی، بھولے پن اور بے بصیرتی کی بھی دلیل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ لفظ اس کے اسی مفہوم کو پیش نظر رکھ کر استعمال کرتے۔ وہ اپنی نجی مجلسوں میں اللہ، اُس کے رسول اور آیات الہی کا مذاق اڑاتے۔ جب آں حضرت تک کسی ذریعے سے اُس کی خبر پہنچتی اور آپ اُس پر کچھ خفگی یا ناراضی کا اظہار فرماتے تو منافقین اپنی صفائی میں لوگوں سے یہ کہتے کہ یہ نیک آدمی ہیں۔ جو بات کوئی شخص کان میں ڈال جاتا ہے، اُس کو سچ جان لیتے ہیں اور اُس کی بنا پر ہم جیسے وفا شعاروں اور اطاعت گزاروں سے بدگمان ہو جاتے ہیں، ورنہ بھلا ہماری زبانوں سے اللہ و رسول کی شان میں کوئی توہین کا کلمہ قصداً نکل سکتا ہے؟ ازراہ سخن گستری، مذاقا اور تفریحاً بلا ارادہ تحقیر کوئی لفظ زبان سے نکل گیا ہو تو اُس کی بات اور ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۵۹۸)



لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ  
أَلِيمٌ ﴿٦١﴾ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيَرْضَوْكُمْ وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ



التوبه  
٩

ایمان رکھتا ہے، ایمان والوں پر اعتماد کرتا ہے اور اُن کے لیے سراسر رحمت ہے جو تم  
میں سے پوری سچائی کے ساتھ ایمان لائے ہیں۔<sup>۲۲۳</sup> (سن لو)، جو اللہ کے رسول کو دکھ  
دے رہے ہیں، اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ وہ تمہارے سامنے خدا کی قسمیں  
کھاتے ہیں کہ تمہیں راضی کریں، حالاں کہ اگر وہ مومن ہیں تو اللہ اور اُس کا رسول زیادہ

۲۲۲ یہ نہایت بلیغ اسلوب میں منافقین کی بات کا جواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یقیناً  
سراپا گوش ہے، مگر کس لیے؟ تم اس رحیم و شفیق ہستی کی قدر پہچانتے تو سمجھ لیتے کہ تمہاری بھلائی  
کے لیے سراپا گوش ہے۔ تمہاری طرف سے کسی اچھی بات، اچھے کام اور اچھے ارادے کی خبر پہنچے تو  
اُس کو سننے اور ماننے کے لیے ہر وقت تیار ہے۔ تمہاری بری خبروں اور سازشوں کے لیے کی جانے  
والی سرگوشیوں کو سننے کے لیے کان نہیں لگائے ہوئے ہے کہ جو کچھ ملے، اُسے قیمتی سوغات سمجھ کر  
اپنے دل میں محفوظ کر لے۔

۲۲۳ یعنی برائی کی کوئی بات پہنچے تو تو ہر ایرے غیرے سے سن کر اُس کو باور نہیں کر لیتا۔ ہاں،  
خدا پر ایمان رکھتا اور سچے اہل ایمان پر ضرور اعتماد کرتا ہے۔ چنانچہ جب اُن کی طرف سے کوئی بات  
پہنچتی ہے تو یقیناً باور کرتا ہے۔ وہ تمہارا بدخواہ نہیں ہے، بلکہ دیکھ سکتے ہو کہ تم میں سے جن لوگوں  
نے صحیح ایمان کا رویہ اختیار کیا ہے، اُن کے لیے سراپا رحمت ہے۔ خدا توفیق دے تو اپنی اصلاح  
کر کے تم بھی اُس کی رحمت و شفقت کے سزاوار بن سکتے ہو۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ آیت میں  
ایمان کا صلب 'اورل'، دونوں کے ساتھ آیا ہے۔ 'ب' کے ساتھ یہ ایمان لانے اور 'ل' کے  
ساتھ محض کسی کی بات کو ماننے اور اُسے باور کر لینے کے مفہوم میں آتا ہے۔ ہم نے ترجمہ اسی کے  
لحاظ سے کیا ہے۔



أَنْ يُرْضَوْهُ إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٦٢﴾ أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ مَنْ يُحَادِدِ اللَّهَ  
وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا ذَلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ ﴿٦٣﴾  
يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي

حق دار ہیں کہ وہ اُس کو راضی کریں۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ جو اللہ اور اُس کے رسول کی  
مخالفت کرے گا تو کیا نہیں جانتے کہ اُس کے لیے دوزخ کی آگ ہے، جس میں وہ  
ہمیشہ رہے گا؟ یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔ ۶۱-۶۳

یہ منافق ڈرتے ہیں کہ کہیں اُن پر کوئی ایسی سورت نہ اتار دی جائے جو اُن کے

۲۲۴ اصل میں ”یُرْضَوْهُ“ کا لفظ آیا ہے۔ پیچھے اللہ و رسول، دونوں کا ذکر ہے، لیکن اس  
میں واحد کی ضمیر آگئی ہے۔ یہ، اس بات کی طرف متوجہ کر رہی ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول کی رضا  
ایک ہی ہے۔ اس جملے میں، اگر غور کیجیے تو منافقین کے رویے پر بڑی بر محل گرفت ہے۔ استاذ امام  
لکھتے ہیں:

”... بسا اوقات آدمی کا عذر گناہ بدتر از گناہ بن جاتا ہے۔ منافقین نے اپنی صفائی پیش کرنے  
کے لیے جو روش اختیار کی، وہ اُن کو اور زیادہ مجرم ثابت کرنے والی بن گئی۔ وہ راست باز  
ہوتے تو اللہ اور رسول کو راضی کرنے کی کوشش کرتے نہ کہ جھوٹی قسموں کے ذریعے سے  
مسلمانوں کے سامنے اپنے کو معصوم اور پیغمبر کو کان کا کچا ثابت کرنے میں لگ جاتے۔ یہ تو پیغمبر  
کے خلاف پروپیگنڈے کی نہایت عیارانہ مہم ہوئی۔“ (تدبر قرآن ۵۹۹/۳)

۲۲۵ آیت میں ”فَإِنَّ“ کا عطف ”أَنَّ“ پر ہے اور ”يُحَادِدُ“ کا لفظ اُس مخالفت کو بیان کرتا ہے  
جس میں کوئی شخص کسی کے مقابل میں دشمن بن کر کھڑا ہو جائے۔

۲۲۶ یعنی اس وقت جس رسوائی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے یہ سارے جتن کر رہے  
ہیں، اُس سے بڑی رسوائی ہے۔ یہ سوچیں کہ اُس رسوائی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کیا





التوبه  
۹

قُلُوبِهِمْ طُفِّلَ اسْتَهْزَءُوا إِنَّ اللَّهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُونَ ﴿٦٣﴾ وَلَئِنْ  
سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ طُفِّلَ بِاللَّهِ وَآيَاتِهِ  
وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُونَ ﴿٦٤﴾ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ  
إِنْ نَعَفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿٦٥﴾

دلوں کے بھید اُن پر کھول دے۔ ان سے کہو، (کچھ دیر اور) مذاق اڑالو، اللہ اُس  
چیز کو کھول کر رہے گا جس سے تم ڈرتے ہو۔ (ان کے اس رویے کے بارے میں)  
اگر ان سے پوچھو گے تو کہہ دیں گے کہ ہم تو محض سخن گستری اور دل لگی کر رہے تھے۔  
ان سے کہو، کیا تم اللہ سے، اُس کی آیتوں سے اور اُس کے رسول سے ہنسی دل لگی کر  
رہے تھے؟ باتیں نہ بناؤ، تم نے ایمان کے بعد کفر کیا ہے۔ اگر ہم تمہارے کسی گروہ  
سے درگزر بھی کر لیں گے تو دوسرے کو ضرور (اسی دنیا میں) سزا دیں گے، اس لیے کہ وہ  
فی الواقع مجرم ہیں۔ ۶۳-۶۶

تدبیر کریں گے۔

۲۲۷ اصل الفاظ ہیں: اَنْ تُنْزَلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ۔ ان میں  
'علی' کا صلہ بتا رہا ہے کہ تُنْزَلَ یہاں تُقرء علیہم کے مفہوم میں ہے، یعنی انہیں پڑھ کر سنا  
دی جائے۔ پیچھے فرمایا ہے کہ منافقین خدا کی قسمیں کھا کر مسلمانوں کو اپنی معصومیت کا قائل کرنے  
کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ اُس کا پس منظر واضح کر دیا ہے کہ یہ سب اس اندیشے سے ہو رہا ہے کہ  
اس سورہ میں اُن کو لب و لہجہ بدلا ہوا نظر آ رہا ہے۔ چنانچہ گھبرائے ہوئے ہیں کہ کہیں سارے راز  
بے نقاب نہ ہو جائیں۔

۲۲۸ یعنی دنیا میں درگزر کر لیں گے اور اُس کا معاملہ آخرت پر اٹھا رکھیں گے۔ یہ اس لیے  
فرمایا ہے کہ منافقین کے بہت سے گروہ تھے اور اُن میں سے ہر ایک کے نفاق کی نوعیت اور اُن کے



الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ  
بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللَّهَ  
فَنَسِيَهُمْ إِنَّ الْمُنْفِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٦٧﴾ وَعَدَ اللَّهُ الْمُنْفِقِينَ  
وَالْمُنْفِقَاتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا هِيَ حَسْبُهُمْ وَلَعْنَهُمُ  
اللَّهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٦٨﴾ كَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوا أَشَدَّ

منافق مرد اور منافق عورتیں، سب ایک ہی طرح کے لوگ ہیں۔ یہ برائی کی تلقین کرتے، بھلائی سے روکتے اور اپنے ہاتھ (ہر خیر کے لیے) بند رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی منافق ہیں جو بڑے بد عہد ہیں۔ ان منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کھلے منکروں کے لیے اللہ کی طرف سے دوزخ کی آگ کی وعید ہے، جس میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے لیے یہی کافی ہے۔ ان پر اللہ کی لعنت ہے اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔ (ایمان کا جھوٹا دعویٰ کرنے

شر و فساد کا درجہ بھی ایک نہیں تھا۔

۲۲۹ یعنی محض کم عقل مسخرے نہیں ہیں، بلکہ اس تمسخر سے اُن کے پیش نظر یہی ہے کہ مسلمانوں کے حوصلے پست کر دیے جائیں اور وہ اُس جدوجہد میں ناکام ہو جائیں جو وہ پیغمبر کی قیادت میں کر رہے ہیں۔

۲۳۰ یعنی نظر انداز کر کے توفیق خیر سے محروم کر دیا۔ یہ اُن کی بے توفیقی کی وجہ بیان کر دی ہے کہ وہ جب خدا کو بھلا بیٹھے تو خدا نے بھی اپنی سنت کے مطابق انہیں شیطان کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ دیکھ سکتے ہو کہ اب وہی اُن کی باگ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے، انہیں جہاں چاہتا ہے، لے جاتا ہے۔

۲۳۱ اس لیے کہ انہوں نے پیغمبر سے سمع و طاعت کا عہد کیا اور پھر اُسے توڑ دیا ہے۔ بظاہر یہ





التوبه  
۹

مِنْكُمْ قُوَّةً وَآكُثَرَ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا فَاسْتَمْتَعُوا بِخَلْقِهِمْ  
فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلْقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلْقِهِمْ  
وَخُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوا أُولَئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا  
وَالْآخِرَةِ ۚ وَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٦٩﴾ أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ  
مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ ۖ وَقَوْمِ إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ  
مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَةِ ۖ أَتَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ اللَّهُ

۲۳۲ والوں، انہی لوگوں کی طرح جو تم سے پہلے ہو گزرے۔ وہ زور میں تم سے زیادہ اور مال و  
اولاد کی کثرت میں تم سے بڑھے ہوئے تھے۔ سو انہوں نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھایا اور  
تم نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھالیا، اُسی طرح جیسے تمہارے اگلوں نے اپنے حصے سے فائدہ  
اٹھایا تھا اور تم نے وہی بخشش کیں، جیسی انہوں نے بخشش کی تھیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن  
کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور یہی نامراد ہونے والے ہیں۔ کیا انہیں اُن  
لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے گزرے ۲۳۳۔ نوح کی قوم، عاد و ثمود، ابراہیم کی  
قوم، ۲۳۴ مدین والوں اور اُن بستیوں کی خبر، جنہیں الٹ دیا گیا؟ اُن کے رسول اُن کے پاس

مسلمان ہیں، لیکن پس پردہ اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کے درپے ہیں۔

۲۳۲ یہاں سے خطاب براہ راست ہو گیا ہے جس سے کلام میں زیادہ شدت پیدا ہو گئی

ہے۔

۲۳۳ یہ کَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ کے اجمال کی تفصیل ہے۔

۲۳۴ اس سے ابراہیم علیہ السلام کی وہ قوم مراد ہے جسے انہوں نے دعوت دی، مگر اُس نے

اُن کی یہ دعوت رد کر دی اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ اُس کو چھوڑ کر نکل آئے۔ ابراہیم علیہ السلام



لِيُظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٤٠﴾

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ  
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ  
الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ  
اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٤١﴾ وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ  
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسْكَنٌ طَيِّبٌ

کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے۔ سو ایسا نہ تھا کہ اللہ اُن پر ظلم کرتا، بلکہ وہ خود ہی اپنی  
جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ ۶۷-۷۰

مومن مرد اور مومن عورتیں، وہ بھی ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ (اِن منافقوں  
کے برخلاف) وہ بھلائی کی تلقین کرتے اور برائی سے روکتے ہیں، نماز کا اہتمام کرتے  
ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں  
جنہیں اللہ عنقریب اپنی رحمت سے نوازے گا۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ زبردست ہے،  
وہ بڑی حکمت والا ہے۔ اِن مومن مردوں اور مومن عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے اُن  
باغوں کے لیے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے، اور ابد

نبوت کے ساتھ رسالت کے منصب پر بھی فائز تھے۔ قرآن نے جس طریقے سے یہاں اُس قوم کا  
ذکر کیا ہے، اُس سے واضح ہے کہ اُن سب قوموں کی طرح جن پر رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت  
کیا گیا، اُن کی ہجرت کے بعد وہ بھی عذاب کی زد میں آ گئی تھی۔

۲۳۵ اِس سے قوم لوط کی بستیاں مراد ہیں۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے یہ بات واضح

ہو جاتی ہے۔





التوبه  
۹

فِي جَنَّتِ عَدْنٍ ط وَرِضْوَانٍ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ذَٰلِكَ هُوَ  
الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ④۲

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ط  
وَمَا أُولَٰئِهِمْ جَهَنَّمُ ط وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ④۳ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا  
وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهُمْ وَابِلَاءٌ

کے باغوں میں پاکیزہ مکانوں کے لیے۔ اور خدا کی خوشنودی، وہ سب سے بڑھ کر  
ہے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ ۴۱-۴۲

اے پیغمبر، ان سب منکروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان کے لیے سخت بن  
جاؤ۔ ۲۳۷ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ یہ خدا کی قسمیں کھاتے ہیں کہ  
انہوں نے وہ بات نہیں کہی، حالاں کہ کفر کی وہ بات انہوں نے ضرور کہی ہے ۲۳۸ اور اس

۲۳۶ یہاں سے پانچواں شذرہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے مضامین سے واضح ہے کہ یہ تبوک  
میں یا تبوک سے واپسی کے سفر میں کسی وقت نازل ہوا ہے۔

۲۳۷ جہاد کا لفظ قتال اور شدت احتساب، سب کو شامل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار اور  
منافقین ایک ہی زمرے کے لوگ ہیں۔ تمہاری کریم النفسی سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی شرارتوں میں  
اور دلیر ہو گئے ہیں۔ اُن کے ساتھ اپنا رویہ اب یکسر تبدیل کر لو اور جس کے خلاف جس اقدام کا حکم  
دیا گیا ہے، وہ کرو۔ چنانچہ منکروں کو جہاں پاؤ، قتل کرو، جیسا کہ پیچھے ہدایت کی گئی ہے اور منافقوں  
کے ساتھ احتساب اور دارو گیر کا جہاد کرو اور رافت و شفقت کے بجائے سختی کے ساتھ پیش آؤ تاکہ  
اُن پر واضح ہو جائے کہ اب انہیں مسلمانوں کی طرح مسلمان بن کر رہنا ہوگا، ورنہ اُسی انجام سے  
دوچار ہوں گے جو پیغمبر کے منکروں کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔



يَنَالُوا وَمَا نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ  
فَإِنْ يَتُوبُوا يَكُ خَيْرًا لَهُمْ ۚ وَإِنْ يَتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا

طرح اسلام لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے ہیں اور انھوں نے وہ چاہا ہے جو پا نہیں سکے ہیں۔<sup>۲۳۹</sup> ان کا یہ عناد اسی بات کا صلہ ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول نے اپنے فضل سے ان کو غنی کر دیا ہے۔<sup>۲۴۰</sup> سو اگر یہ اب بھی توبہ کر لیں تو ان کے لیے بہتر ہے اور

۲۳۸ یہ اُسی طرح کی کسی بات کا حوالہ ہے، جس طرح کی باتوں کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے کہ منافقین اپنی مجلسوں میں اللہ، اُس کے رسول اور اُس کی آیتوں کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن جب پوچھا جائے تو صاف مکر جاتے ہیں کہ انھوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی، وہ تو محض ہنسی دل لگی کر رہے تھے۔

۲۳۹ یہ اُن منصوبوں کی طرف اشارہ ہے جو منافقین نے اسلام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے بنائے، مگر اللہ نے اُن کے راز برسر موقع فاش کر دیے اور انھیں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ ہر موقع پر انھوں نے منہ کی کھائی۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یہ قرآن نے نہایت بلاغت کے ساتھ دو لفظوں میں اُن کے تمام حیثانہ منصوبوں اور ساتھ ہی اُن کی محرومیوں اور ناکامیوں کی طرف اشارہ فرما دیا ہے۔

۲۴۰ اشارہ ہے اُن غنائم کی طرف جو فتوحات کے نتیجے میں حاصل ہوئے اور جن سے سب سے زیادہ فائدہ انھی منافقین نے اٹھایا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اول تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دل داری کے خیال سے ان کو دیتے بھی زیادہ تھے، پھر یہ اپنی طماعی کے سبب سے لیتے بھی سو بہانوں سے تھے۔ مزید براں ان کے پاس صرف لینے ہی والے ہاتھ تھے، دینے والے ہاتھ تو سرے سے تھے ہی نہیں۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا کوئی موقع آیا تو... صاف کترا جاتے۔ اس طرح یہ لوگ مال دار بن گئے اور اس مال داری کا صلہ اسلام کو، جس کے نام پر وہ مال دار بنے، انھوں نے یہ دیا کہ اُس کے خلاف سازشیں اور





التوبه  
۹

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ④۳  
وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ  
وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ④۵ فَلَمَّا اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا  
بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ④۶ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى  
يَوْمٍ يَلْقَوْنَہٗ بِمَا اَخْلَفُوْا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ④۷  
اَلَمْ يَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلٰمُ

اگر اعراض کریں گے تو اللہ ان کو دردناک سزا دے گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور زمین میں ان کا نہ کوئی حمایتی ہوگا، نہ مددگار۔ ۷۳-۷۴

ان میں وہ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اُس نے ہم کو اپنے فضل سے نوازا تو ہم ضرور صدقہ کریں گے اور خوب نیکیاں کرنے والوں میں سے ہوں گے۔ مگر جب اللہ نے اپنے فضل سے اُن کو عطا فرمایا تو اُس میں بخل کرنے لگے اور برگشتہ ہو کر منہ پھیر لیا۔ سو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے اُس دن تک کہ اُس سے ملیں گے، اُن کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا، اس لیے کہ اُنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی کی اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے۔ ۷۳ کیا اُن کو خبر نہیں کہ اللہ اُن کے رازوں اور

ریشہ دوانیاں کرتے رہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۶۱۰)

۷۳ یعنی انہی لوگوں میں جو اب اسلام کی بدولت غنی ہو گئے ہیں۔

۷۴ اصل الفاظ ہیں: تَوَلَّوْا وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ تَوَلَّوْا کے بعد وہم مُّعْرِضُوْنَ کے الفاظ واضح کرتے ہیں کہ انفاق کا نام لیا جائے تو منہ موڑ کر اس طرح چل دیتے ہیں کہ پیچھے مڑ کر دیکھتے بھی نہیں۔



الْغُيُوبِ ۚ ۴۸) الَّذِينَ يَلْمِزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جَهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۴۹) اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ

اُن کی سرگوشیوں کو جانتا ہے اور اللہ ہر غیب کو خوب جاننے والا ہے؟ وہ جو صدقات کے معاملے میں اُن مسلمانوں پر طعن کرتے ہیں جو خوش دلی سے دیتے ہیں اور جن کے پاس دینے کے لیے وہی کچھ ہے جو وہ اپنی محنت مزدوری سے کمالاتے ہیں تو اُن کا وہ مذاق اڑاتے ہیں۔ اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لیے دردناک

۲۴۳ یہ اُس سنت کے مطابق ہوا جو اللہ تعالیٰ نے ہدایت و ضلالت کے باب میں مقرر کر رکھی ہے۔ آدمی جب ایک مدت تک کسی روگ کی رضاعت و پرورش کرتا رہتا ہے تو بالآخر ہمیشہ کے لیے توبہ اور اصلاح کی توفیق سے محروم ہو جاتا ہے۔

۲۴۴ یعنی فعلاً بھی جانتا ہے اور اُس کی صفت بھی ہے کہ وہ علام الغیوب ہے۔

۲۴۵ آیت کی ابتدا 'الَّذِينَ يَلْمِزُونَ' کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ یہ 'الَّذِينَ' پیچھے 'نَجَّوْهُمْ' میں 'هُمْ' کی ضمیر سے بدل ہے۔ ہم نے ترجمہ اسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۲۴۶ یعنی خود کچھ کرتے نہیں اور دوسروں کے انفاق پر غصے سے کھولتے اور حسد سے جلتے ہیں۔ چنانچہ اغنیا کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے اور غریبوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... جو فیاض اور مخلص مسلمان فیاضی اور خوش دلی سے خدا کی راہ میں دیتے ہیں، اُن کو تو

کہتے ہیں کہ یہ ریاکار اور شہرت پسند ہے۔ اپنی دین داری اور سخاوت کی دھونس جمانے کے

لیے ایسا کرتا ہے۔ جو غریب بے چارے کچھ رکھتے ہی نہیں۔ اپنی محنت مزدوری کی گاڑھی

کمائی ہی سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اُن کی حوصلہ شکنی کے لیے اُن کا یہ مذاق

اڑاتے اور اُن پر پھبتیاں چست کرتے ہیں کہ لو آج یہ بھی اٹھے ہیں کہ حاتم کا نام دنیا سے





التوبه

أَوَلَا تَسْتَغْفِرُ لَهُمْ<sup>ط</sup> إِنْ تَسْتَغْفِرُ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ<sup>ط</sup> ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ<sup>ط</sup> وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ<sup>٨٠</sup>

فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُولِ اللَّهِ وَكَرِهُوا أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوا يَفْقَهُونَ<sup>٨١</sup> فَلْيَضْحَكُوا

عذاب ہے۔ تم ان کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو۔ اگر تم ستر مرتبہ بھی ان کے لیے مغفرت چاہو گے تو اللہ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور اس طرح کے بد عہد لوگوں کو اللہ راہ نہیں دکھاتا۔<sup>۲۳۷</sup> ۸۰-۷۵

(تبوک کے اس سفر میں) جو لوگ پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے، وہ اللہ کے رسول سے پیچھے بیٹھ رہنے پر بہت خوش ہوئے اور انھیں اچھا نہیں لگا کہ اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ اس گرمی میں نہ نکلو۔ کہہ دو،

مٹا کر رکھ دیں۔“ (تذبر قرآن ۶۱۳/۳)

<sup>۲۳۷</sup> یعنی وہ راہ نہیں دکھاتا جو انھیں جہنم کے راستے سے ہٹا کر اس غایت کی طرف گامزن کر دے جو سچے اہل ایمان کی منزل ہے۔ اس تنبیہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کس درجہ رحیم و شفیق تھے اور اس طرح کے منافقوں کے لیے کس قدر الحاح کے ساتھ مغفرت اور نجات کی دعائیں کرتے رہتے تھے۔

<sup>۲۳۸</sup> یعنی اگرچہ رخصتیں مانگ کر خود پیچھے رہے، مگر حقیقت میں پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے۔



قَلِيلًا وَلَيَبْكَوْا كَثِيرًا ۖ جَزَاءٌ لِّمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٨٦﴾ فَإِنْ رَجَعَكَ  
اللَّهُ إِلَى طَائِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَأْذَنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوا  
مَعِيَ أَبَدًا وَلَنِ تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا إِنَّكُمْ رَضِيتُمْ بِالْقُعُودِ أَوَّلَ

دوزخ کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے۔ اے کاش، وہ سمجھتے! اب وہ ہنسیں کم اور  
روئیں زیادہ، اُس کے بدلے میں جو کچھ کرتے رہے۔ سو، (اے پیغمبر)، اللہ اُن میں  
سے کسی گروہ کی طرف اگر تمھیں واپس لے جائے اور وہ تم سے جہاد کے لیے نکلنے کی  
اجازت مانگیں تو صاف کہہ دینا کہ تم میرے ساتھ کبھی نہ نکلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو  
اس لیے کہ اللہ و رسول کے سامنے لایعنی عذرات پیش کر کے اس کے مستحق ہی نہیں رہے کہ اللہ کی راہ  
میں جہاد کی سعادت سے بہرہ یاب ہوں۔

۲۴۹ مطلب یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جہاد کے شہداء سے بھاگ کر اُنھوں نے دوزخ میں  
جانا پسند کیا ہے تو یہ خوش ہونے کی نہیں، بلکہ رونے اور ماتم کرنے کی چیز ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:  
”... عام طور پر مفسرین نے یہاں انشا کو خبر کے معنی میں لیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح  
نہیں ہے۔ یہاں عمل اور جزاء، دونوں کو نگاہوں کے سامنے متحضر کر دیا گیا ہے، اس لیے کہ جس  
کے اندر بصیرت ہو، وہ اس دنیا میں اپنے عمل کے آئینے میں اپنی جزا کو بھی دیکھ لیتا ہے اور اُس پر  
اس کا اثر بھی وہی پڑتا ہے جو پڑنا چاہیے۔ البتہ اندھے بہرے لوگ اس سے محروم رہتے  
ہیں۔“ (تدبر قرآن ۶۱۸/۳)

۲۵۰ اس جملے کا اسلوب بیان پیش نظر رہے تو مدعا یہ ہے کہ جن کے کرتوتوں کی وجہ سے اُن  
کے منہ دیکھنے کے روادار نہیں ہو، اُن کے منہ اگر اپنی تقدیر سے دکھا دے اور جو یہ گمان کیے بیٹھے  
ہیں کہ رومیوں کی افواج قاہرہ سے بچ کر واپس نہیں آ سکو گے، اُن کی خواہشات کے علی الرغم اگر  
خدا تمھیں کامیاب و کامران اُن کی طرف پلٹا دے۔





التوبہ  
۹

مَرَّةٍ فَاقْعُدُوا مَعَ الْخُلَفَاءِ ۖ ۸۳

وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّا تَابَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ ۚ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَسِقُونَ ۚ ۸۴ وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ۚ ۸۵ وَإِذَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ

کر کسی دشمن سے لڑو گے۔ تم نے پہلے بیٹھ رہنے کو پسند کیا تو اب بھی اُن کے ساتھ بیٹھے رہو جو پیچھے رہنے والے ہیں۔ ۸۱-۸۳

اور آئندہ اُن میں سے جو مر جائے، اُس کے جنازے پر کبھی نماز نہ پڑھنا اور نہ اُس کی قبر پر دعا کے لیے کھڑے ہونا، اس لیے کہ اُنھوں نے اللہ اور اُس کے رسول کا انکار کیا ہے اور اس حال میں مرے ہیں کہ بد عہد تھے۔<sup>۲۵۱</sup> تم اُن کے مال و اولاد کو کچھ وقعت نہ دو، اللہ یہی چاہتا ہے کہ ان کے ذریعے سے اُنھیں دنیا کی زندگی میں عذاب دے اور اُن کی جانیں اس حالت میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔<sup>۲۵۲</sup> جب کوئی

<sup>۲۵۱</sup> اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کے لیے استغفار سے روکا گیا تھا۔ اب جہاد میں ساتھ لے جانے اور اُن میں سے کوئی مر جائے تو اُس کے جنازے کی نماز پڑھنے اور اُس کی قبر پر کھڑے ہونے سے بھی روک دیا گیا۔ اس سے بڑی رسوائی اور اس سے بڑی سزا کیا ہو سکتی تھی جو مسلمانوں کے معاشرے میں اور خدا کے رسول کی موجودگی میں کسی شخص کو دی جاسکتی ہے۔

<sup>۲۵۲</sup> اللہ کا یہ چاہنا اُس سنت کے مطابق ہے جو اُس نے لوگوں کی ہدایت اور گم راہی کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔



أَنْ آمِنُوا بِاللَّهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُنْ مَعَ الْقَعِدِينَ ﴿٨٧﴾ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ﴿٨٨﴾ لَكِنَّ الرَّسُولَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَأُولَئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٨٩﴾ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ جَنَّاتٍ

سورت اترتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ، جس طرح کہ ایمان لانے کا حق ہے اور اُس کے رسول کے ساتھ ہو کر جہاد کرو تو اُن کے قدرت والے بھی تم سے رخصت مانگنے آ کھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیجیے، ہم یہاں ٹھہرنے والوں کے ساتھ رہ جائیں گے۔<sup>۲۵۴</sup> انھوں نے پسند کیا کہ اُن عورتوں کے ساتھ ہوں جو پیچھے گھروں میں بیٹھی رہتی ہیں اور اُن کے دلوں پر اس کے نتیجے میں مہر کر دی گئی، اس لیے کچھ نہیں سمجھتے۔ اللہ کے رسول نے، البتہ اپنے جان و مال سے جہاد کیا ہے اور اُن لوگوں نے بھی جو اُس کے ساتھ ایمان لائے ہیں، اور اب وہی ہیں جن کے لیے (دنیا و آخرت کی) بھلائیاں ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اللہ نے اُن کے لیے

۲۵۳ اصل الفاظ ہیں: أَنْ آمِنُوا بِاللَّهِ۔ اِن میں فعل اپنے کامل معنی میں ہے۔ ہم نے ترجمے میں اسے کھول دیا ہے۔

۲۵۴ یہ اُن کے مافی الذہن کی تعبیر ہے۔ قرآن کے بعض دوسرے مقامات میں بھی اس طرح کی چیزوں کو قول سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اپنے دل میں اس طرح سوچتے ہیں کہ عذر قبول کر لیا گیا تو اُن کے ساتھ رہیں گے جن کا عذر حقیقی ہے اور جو یہاں عافیت میں بیٹھے ہیں۔ ۲۵۵ یعنی مردوں کی طرح میدان جہاد میں اتر کر اپنے ایمان و اسلام کا حق ادا کرنے کے





التوبه  
۹

تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ⑧٩  
وَجَاءَ الْمُعَذِّرُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ  
الَّذِينَ كَذَبُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ سَيُصِيبُ الَّذِينَ كَفَرُوا  
مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ⑨٠

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَى وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا  
يَجِدُونَ مَا يَنْفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ مَا عَلَى

ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔  
یہی بڑی کامیابی ہے۔ ۸۴-۸۹

بدوی عربوں میں سے بھی بہانہ کرنے والے آئے کہ انھیں بھی (پیچھے رہنے کی)  
اجازت مل جائے اور جنھوں نے اللہ اور اُس کے رسول سے (ایمان کا) جھوٹا عہد کیا  
تھا، وہ (اس کے بغیر ہی گھروں میں) بیٹھے رہے۔ ۲۵۷۔ ان کے منکروں کو عنقریب ایک  
دردناک عذاب پکڑے گا۔ ۲۵۸۔ ۹۰

اُن لوگوں پر، البتہ کوئی گناہ نہیں جو کمزور ہیں اور اُن پر جو بیمار ہیں اور اُن پر بھی جو  
خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں پاتے، جب کہ وہ اللہ اور اُس کے رسول کی خیر خواہی کرتے  
بجائے اپنے لیے یہی پسند کیا کہ عورتوں کی طرح گھروں میں بیٹھیں۔

۲۵۶ پیچھے شہری منافقین کا رویہ زیر بحث تھا جو مدینہ اور اُس کے گرد و نواح میں رہتے تھے۔  
یہاں سے آگے اُن منافقین کا ذکر شروع ہوتا ہے جو دیہات میں رہتے تھے۔  
۲۵۷ یعنی کوئی جھوٹا سچا عذر پیش کرنے کی زحمت بھی نہیں اٹھائی۔

۲۵۸ یعنی ان بدوی عربوں کے منکروں کو۔ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ ان میں سچے اہل ایمان



الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ ط وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۙ وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا اتَّوَكَّلْتَ لْتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۖ تَوَلَّوْا ۖ وَأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ ۙ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ رَضُوبَانِ

۲۵۹۔ ایسے نیکو کاروں پر کوئی الزام نہیں ہے اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ اسی طرح اُن پر بھی کوئی الزام نہیں ہے کہ جب تمہارے پاس آتے ہیں کہ اُن کے لیے سواری کا بندوبست کر دو، تم کہتے ہو کہ میں تمہارے لیے سواری کا بندوبست نہیں کر سکتا تو اس طرح لوٹتے ہیں کہ اُن کی آنکھوں سے اس غم میں آنسو بہ رہے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے خرچ پر جانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ الزام تو اُن لوگوں پر ہے جو تم سے رخصت مانگتے ہیں، دریاں حالیکہ وہ مال دار ہیں۔ وہ اس پر راضی ہو

بھی تھے جو دین کی نصرت کے ہر موقع پر ایثار و قربانی کے لیے پیش پیش رہتے تھے۔

۲۵۹۔ یہ قید نہایت اہم ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس لیے کہ بہت سے مریض اور غریب ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو گھر بیٹھے بیٹھے اپنی ریشہ دوانیوں اور فتنہ پرداز یوں سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔ اس قسم کے لوگ گناہ سے بری نہیں ہوں گے۔ گناہ سے بری صرف وہی ہوں گے جو اپنی کمزوری، بیماری یا غربت کے سبب سے اگر میدان جنگ میں نہ پہنچ سکیں تو جہاں ہیں، وہیں اپنے امکان کے حد تک اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کریں اور اگر کچھ نہیں کر سکتے تو اپنے اپنے بستروں پر اور گھروں میں صدق دل سے اسلام اور مسلمانوں کی فتح مندی کی دعائیں اور اپنی محرومی پر غم کریں کہ افسوس ہے کہ وہ جہاد کے اہل نہیں رہے۔“ (تذبر قرآن ۳/۶۲۶)





التوبه  
۹

يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٩٣﴾  
يَعْتَذِرُونَ إِلَيْكُمْ إِذَا رَجَعْتُمْ إِلَيْهِمْ قُلْ لَا تَعْتَذِرُوا لَنْ تُؤْمِنَ  
لَكُمْ قَدْ نَبَأَ اللَّهُ مِنْ أَخْبَارِكُمْ وَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ  
ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عِلْمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٩٤﴾

گئے کہ اُن کے ساتھ ہوں جو پیچھے (گھروں میں) بیٹھنے والی ہیں اور اللہ نے اس کے  
نتیجے میں اُن کے دلوں پر مہر کر دی۔ اب وہ کچھ نہیں جانتے کہ کس انجام کی طرف بڑھ  
رہے ہیں؟ ۹۱-۹۳

تم لوگ (اس سفر سے) اُن کی طرف پلٹو گے تو وہ تمہارے سامنے طرح طرح  
کے عذرات پیش کریں گے۔ تم صاف کہہ دینا کہ یہاں نہ بناؤ، ہم تمہاری کسی بات کا  
اعتبار نہ کریں گے، اللہ نے ہم کو تمہارے حالات بتا دیے ہیں۔ اب اللہ اور اُس کا  
رسول تمہارا عمل دیکھیں گے، پھر تم اُس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے کا

۲۶۰ آیت میں خطاب مسلمانوں سے ہے اور اُنھی کے لحاظ سے ہر جگہ جمع کے صیغے استعمال  
ہوئے ہیں، مگر لفظ 'قُلْ' واحد ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت  
فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”... اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سب مسلمانوں کی  
طرف سے منافقین کو جواب دلوادیا گیا ہے۔ گویا پیغمبر کی زبان تمام مومنین مخلصین کے دلوں کی  
ترجمان ہے۔ پیغمبر اور امت کے درمیان جو اعتماد، جو حسن ظن اور جو کامل ہم آہنگی تھی، یہ  
اسلوب اُس کو بھی نہایت لطیف طریقے سے ظاہر کر رہا ہے اور اس میں منافقین پر تعریض کا جو  
پہلو ہے، وہ بھی نمایاں ہو رہا ہے۔“ (تذکر قرآن ۶۲/۳)



سَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لَتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ط فَأَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ط اِنَّهُمْ رَجِسٌ ۭ وَ مَا وَلِيْهِمْ جَهَنَّمَ جَزَاءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۙ ﴿٩٥﴾  
يَحْلِفُونَ لَكُمْ لَتَرْضَوْا عَنْهُمْ ط فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى  
عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۙ ﴿٩٦﴾ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا  
يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهِ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۙ ﴿٩٧﴾

جاننے والا ہے اور وہ تمہیں بتا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ تمہاری واپسی پر وہ تمہارے سامنے اب اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ تم اُن سے صرف نظر کرو۔ تو اُن سے صرف نظر ہی کر لو، اس لیے کہ وہ سراسر گندگی ہیں اور اُس کے بدلے میں جو کماتے رہے، اُن کا ٹھکانا جہنم ہے۔ وہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے کہ تم اُن سے راضی ہو جاؤ۔ سو اگر تم اُن سے راضی ہو بھی جاؤ تو اللہ راضی نہیں ہوگا، اس لیے کہ ایسے بد عہد لوگوں سے اللہ ہرگز راضی ہونے والا نہیں ہے۔ یہ بدوی عرب کفر اور نفاق میں زیادہ سخت اور اسی لائق ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول پر جو کچھ اتارا ہے، اُس کے حدود سے بے خبر رہیں۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ ۹۷-۹۸

۲۶۱ اصل میں لفظ اَعْرَاضُ آیا ہے۔ یہ، اگر غور کیجیے تو نہایت بلاغت کے ساتھ دو مختلف، بلکہ متضاد معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ پہلے درگزر کر لینے کے معنی میں اور اس کے بعد منہ پھیر لینے کے مفہوم میں۔ یعنی وہ تم کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے کہ جو کچھ ہو چکا ہے، اُسے نظر انداز کرو۔ سو ٹھیک ہے، اُنھیں اب نظر انداز ہی کر دو۔ اس طرح کی گندگی کو نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہے۔

۲۶۲ اس لیے کہ اُنھوں نے کبھی ان حدود کو سمجھنے اور ان میں بصیرت پیدا کرنے کی کوشش ہی





وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَيَتَرَبَّصُّ بِكُمُ  
الدَّوَابِّ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٩٨﴾ وَمِنَ  
الْأَعْرَابِ مَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرْبًا  
عِنْدَ اللَّهِ وَصَلَواتِ الرَّسُولِ ۚ أَلَا إِنَّهَا قُرْبَةٌ لَهُمْ سِيقَ خِلْمِهِمْ  
اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٩٩﴾

ان بدویوں میں وہ بھی ہیں جو خدا کی راہ میں خرچ کو ایک تاوان سمجھتے ہیں اور تمہارے لیے زمانے کی گردشوں کے منتظر ہیں۔ بری گردش انھی پر ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ اور انھی بدویوں میں وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر سچا ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اُس کو اور رسول کی دعاؤں کو خدا کے ہاں تقرب کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ سو اس میں شبہ نہیں کہ یہ دونوں اُن کے لیے تقرب کا ذریعہ ہیں۔ اللہ اُن کو ضرور اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۹۸-۹۹

نہیں کی اور اللہ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھ اور بصیرت اُنھی کو عطا فرماتا ہے جو اپنے آپ کو اس کا سزاوار ثابت کرتے ہیں۔

۲۶۳۔ یعنی وہ دعائیں جو اُن کے ایمان و اخلاص اور اس انفاق کے نتیجے میں اُن کو حاصل ہوتی ہیں۔

۲۶۴ اصل الفاظ ہیں: 'أَلَا إِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ'۔ ان میں ضمیر مونث سے غلط فہمی نہ ہو۔ قرآن جس زبان میں نازل ہوا ہے، اُس کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جب ایک مذکر اور مونث کو جمع کر کے اُن کے لیے کوئی منصوب یا مجرور ضمیر لانا پیش نظر ہو تو وہ جس طرح عام قاعدے کے مطابق مثنیٰ



وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ  
اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ  
جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ①

مہاجرین و انصار کے اُن لوگوں سے اللہ راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے جو  
سب سے پہلے سبقت کرنے والے ہیں اور وہ بھی جنہوں نے خوبی کے ساتھ اُن کی  
پیروی کی ہے۔ اللہ نے اُن کے لیے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں  
بہتی ہوں گی۔ وہ اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ ۱۰۰

صورت میں آتی ہے، اسی طرح اگر معنی میں ابہام کا اندیشہ نہ ہو اور مذکور مونث، دونوں کی طرف  
ضمیر کے رجوع کے قرائن بالکل واضح ہوں تو واحد مونث بھی آ سکتی ہے، بلکہ کلام عرب کے تتبع  
سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے مواقع پر یہ بالعموم واحد مونث ہی آتی ہے۔

۲۶۵ یہ اب عام مسلمانوں اور منافقین، دونوں کے سامنے نمونے اور مثال کی حیثیت سے  
اُن لوگوں کو پیش کر دیا ہے جو پیغمبر کے ساتھیوں میں گل سرسبد اور اصل سرمایہ تھے۔ استاذ امام لکھتے  
ہیں:

”... فرمایا کہ اس امت کا ہر اول دستہ مہاجرین و انصار میں سے وہ سابقون اولون ہیں جنہوں  
نے سب سے پہلے نبی کی دعوت پر لبیک کہی، جو اُس وقت اسلام کی طرف بڑھے، جب ایک  
قدم بھی اُس کی طرف بڑھنا گونا گوں مزاحمتوں کا مقابلہ کیے بغیر ممکن نہ تھا اور جو اُس وقت نبی  
کی حمایت و مدافعت کے لیے اٹھے، جب اُس کی حمایت و مدافعت تمام احمر و اسود سے لڑائی  
مول لینے کے ہم معنی تھی۔

دوسرے درجے پر وہ لوگ ہیں جو اگرچہ اولیت و اسبقیت کا درجہ تو حاصل نہ کر سکے، تاہم  
اُنہوں نے پورے اخلاص اور پوری راست بازی سے سابقین اولین کے نقش قدم کی پیروی





التوبه  
۹

کی۔ اس پیروی میں اُنھوں نے کسی نمائش، کسی مصلحت، کسی غرض یا کسی نوع کے تذبذب اور نفاق کو دخیل نہیں ہونے دیا۔ ایک مرتبہ بڑھ کر اُنھوں نے پیچھے مڑنے کا نام نہیں لیا۔ جن سے کٹنا تھا، اُن کو کاٹا تو اس طرح کہ کوئی تسمہ لگا نہیں رہنے دیا اور جن سے جڑے تو اس طرح نہیں کہ:

منہ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

بلکہ اس طرح جڑے کہ:

تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگر

اسی خلوص و صداقت اور ظاہر و باطن کی اسی کامل ہم آہنگی اور ہم رنگی کو یہاں 'اِحْسَان' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ 'اِحْسَان' کے معنی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ کسی کام کو کمال حسن و خوبی سے انجام دینے کے بھی ہیں۔

... فرمایا کہ اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ اُن سے اس لیے راضی ہوا کہ وہ اپنے بندوں سے حق کی راہ میں جو صبر و ثبات، جو عزیمت و استقامت، جو جاں بازی و سرفروشی چاہتا ہے، اُس کا اُنھوں نے حق ادا کر دیا اور اُنھوں نے اللہ اور رسول سے جو عہد باندھا، زندگی کے تمام نشیب و فراز میں، تمام مزاحمتوں اور مخالفتوں کے علی الرغم، پوری خوبی سے اُس کو نبھایا۔ اُن کے رب نے اُن کو جو قوتیں اور صلاحیتیں عطا فرمائیں، اُن کو اُنھوں نے درجہ کمال تک پروان چڑھایا اور اُن کو اپنے رب ہی کی رضا طلبی میں صرف کیا۔ شیطان کو اُن میں سا جھی بننے کا، اپنے امکان کی حد تک کوئی موقع نہیں دیا۔

اللہ سے اُن کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اُن کے ساتھ جو معاملہ کیا، اُس کو ہر رنگ میں اُنھوں نے اُس کے عدل، اُس کی حکمت اور اُس کی رحمت پر محمول کیا۔ اُن کو اگر کوئی افتاد پیش آئی تو اُس کو اُنھوں نے اپنی کسی خامی کا علاج سمجھا، کوئی مشکل پیش آئی تو اُس کو صبر و عزیمت کا امتحان جانا، سکھ ملا تو دل و جان سے اُس کے شکر گزار ہوئے، دکھ ملا تو صابر و مطمئن رہے، کسی حال میں بھی اپنی امید کے چراغ کو اُنھوں نے گل نہیں ہونے دیا۔ طوفان اٹھے، بجلیاں چمکیں، بلکہ کبھی کبھی برق خرمن سوز سارے خرمن کو جلا کر خاکستر بھی کر گئی، لیکن اُن کے



وَمِمَّنْ حَوْلَكُم مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنْفِقُونَ ۖ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ  
مَرَدُّوًا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۖ سَنُعَذِّبُهُمْ  
مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ ۝۱۰۱  
وَاخْرُؤْنَ اعْتَرِفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ  
سَيِّئًا ۖ طَعَسَىٰ اللَّهُ أَن يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝۱۰۲

تمہارے ارد گرد جو بدوی رہتے ہیں، اُن میں بھی بہت سے منافق ہیں اور مدینہ  
والوں میں بھی۔ وہ اپنے نفاق میں طاق ہو چکے ہیں۔ تم اُن کو نہیں جانتے، ہم اُن کو  
جانتے ہیں۔<sup>۲۶۶</sup> اُنہیں عنقریب ہم دو مرتبہ سزا دیں گے۔<sup>۲۶۷</sup> پھر وہ ایک عذاب عظیم کی  
طرف دھکیل دیے جائیں گے۔ ۱۰۱

(ان کے علاوہ) کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف  
کر لیا ہے۔ اُنہوں نے ملے جلے عمل کیے تھے، کچھ بھلے اور کچھ برے۔ امید ہے کہ  
اللہ اُن پر عنایت فرمائے، اِس لیے کہ اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔<sup>۲۶۸</sup>

نفس مطمئنہ کو کوئی چیز بھی ہلا نہ سکی۔ وہ بدستور رَاضِیۃٌ مَّرْضِیۃٌ کی چٹان پر جمار ہا اور بالآخر

اُس نے فَاذْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَاذْخُلِیْ جَنَّتِیْ کی ابدی بشارت حاصل کی۔“

(تدبر قرآن ۳/۶۳۵)

<sup>۲۶۶</sup> یہ مسلمانوں کو بھی تنبیہ ہے کہ ان کے معاملے میں ہوشیار رہو اور منافقین کو بھی کہ  
دوسرے تمہیں پہچاننے میں دھوکا کھا سکتے ہیں، لیکن اللہ خوب جانتا ہے کہ تم کیسے بھگل بنائے  
ہوئے ہو۔

<sup>۲۶۷</sup> یعنی ایک مرتبہ مسلمانوں کے ہاتھوں اور دوسری مرتبہ عالم برزخ میں، جب دنیا سے  
رخصت ہوں گے۔





التوبه  
۹

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ  
إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۳﴾ أَلَمْ يَعْلَمُوا

تم اُن کے مالوں کا صدقہ قبول کر لو، اس سے تم اُنھیں پاکیزہ بناؤ گے اور اُن کا تزکیہ کرو گے۔ اور اُن کے لیے دعا کرو، اس لیے کہ تمھاری دعا اُن کے لیے وجہ تسکین ہوگی۔

۲۶۸ یہ لوگ منافق نہیں تھے۔ تاہم کمزوریوں میں ضرور مبتلا تھے۔ چنانچہ تبوک کے موقع پر بھی ان سے کمزوری صادر ہوئی، لیکن جیسے ہی متنبہ کیے گئے، انھیں سخت ندامت ہوئی اور باتیں بنانے کی کوشش کرنے کے بجائے انھوں نے صدق دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ بعض لوگوں نے یہاں تک کیا کہ اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا اور کہا کہ ہم پر خواب و خور حرام ہے، جب تک اللہ و رسول کی طرف سے معاف نہ کر دیے جائیں۔ انھیں بشارت دی گئی ہے کہ ان کے اعمال اچھے رہے تو امید ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول فرمائے گا۔ اس سے قیامت کی جزا و سزا کو بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اسی طرح کے لوگ ہیں جن کے بارے میں توقع کی جاسکتی ہے کہ وہاں بھی کسی سزا کے بغیر ہی معاف کر دیے جائیں گے۔

۲۶۹ یعنی وہ صدقہ جواب یہ اپنے گناہوں کی تلافی کے لیے کریں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ توبہ اور تطہیر کے لیے سب سے زیادہ موثر چیز اللہ کی راہ میں انفاق ہی ہے۔

۲۷۰ آیت میں تطہیر اور تزکیہ کے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...قرآن میں ان دونوں کے مواقع استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ ”تطہیر“ میں غالب پہلو ظاہری اور باطنی نجاستوں اور رذائل سے پاک کرنے کا ہے اور تزکیہ میں رذائل سے پاک کرنے کے ساتھ ساتھ صلاحیتوں اور خوبیوں کو نشوونما دینے اور فضائل اخلاق سے آراستہ کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے۔“ (تذکر قرآن ۳/۶۳۹)

\* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۲/۵۰۵۔



اِنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاِنَّ  
 اللّٰهَ هُوَ الْتَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٣﴾ وَقُلْ اَعْمَلُوا فَاَسِيْرِي اللّٰهُ عَمَلَكُمْ  
 وَرَسُوْلُهُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عَلِيْمِ الْغَيْبِ  
 وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ج ﴿١٠٥﴾  
 وَاٰخِرُوْنَ مُرْجُوْنَ لَا مَرِئَ لِلّٰهِ اِمَّا يَعْذِبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوبُ  
 عَلَيْهِمْ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٠٦﴾

اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی ہے جو اپنے  
 بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور اُن کے صدقات کی پذیرائی فرماتا ہے اور نہیں جانتے  
 کہ اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے؟ اور اُن سے کہہ دو کہ عمل کرو، اب  
 اللہ اور اُس کا رسول اور اُن کے ماننے والے تمہارے عمل کو دیکھیں گے اور تم جلد اُس  
 کے حضور پیش کیے جاؤ گے جو تمام کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے، پھر وہ تمہیں بتا دے  
 گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ ۱۰۲-۱۰۵

اسی طرح کچھ دوسرے ہیں جن کا معاملہ ابھی خدا کے فیصلے تک ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ  
 انہیں سزا دے گا یا اُن پر شفقت فرمائے گا اور اُن کی توبہ قبول کر لے گا۔ اللہ سب کچھ

۲۷۱ پیچھے منافقین کے بارے میں فرمایا تھا کہ نہ اُن کے صدقات قبول کیے جائیں گے اور نہ  
 پیغمبر اُن کے لیے دعا و استغفار کریں گے، بلکہ اُن میں سے کوئی مر جائے تو اُس کے جنازے کی  
 نماز بھی نہیں پڑھیں گے۔ یہ اُس کے برعکس ہدایت کی گئی ہے کہ اُن لوگوں کے لیے رحمت و برکت  
 کے یہ سب دروازے کھول دیے جائیں جنہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا ہے۔

۲۷۲ اوپر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا۔ اب یہ براہ راست ان لوگوں کو توبہ اور توبہ کے



## وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ

جانتا ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ ۲۷۳-۱۰۶

اور جنہوں نے ایک مسجد بنائی ہے، اس لیے کہ اسلام کو نقصان پہنچائیں اور

لیے صدقہ و انفاق کی ترغیب ہے۔

۲۷۳ آگے آیت ۱۱۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین آدمی تھے۔ روایتوں میں ان کے نام کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع بیان ہوئے ہیں۔ تبوک کے موقع پر جو کمزوری ان سے صادر ہوئی، اُس کا انہوں نے بھی نہایت سچائی کے ساتھ اعتراف کر لیا تھا، مگر اللہ نے اپنے علم و حکمت کے تقاضے سے ان کا معاملہ موخر کر دیا اور فرمایا کہ ابھی دیکھیں گے کہ انہیں سزا دی جائے یا معاف کیا جائے۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ یہ زیر عتاب ہیں اور اللہ ابھی ان سے راضی نہیں ہوا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ جس درجے اور مرتبے کے یہ لوگ تھے، اُس کے لحاظ سے اس طرح کی کمزوری ان سے متوقع نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر اپنی اس غلطی کا اُس شدت کے ساتھ انہوں نے احساس بھی نہیں کیا، جس شدت کے ساتھ اُس کا احساس انہیں کرنا چاہیے تھا۔ چنانچہ تزکیہ و تطہیر کے لیے ان کا معاملہ موخر کر دیا گیا۔

۲۷۴ اس جملے میں خبر محذوف ہے۔ آگے وَلَيَحْلِفَنَّ کا جملہ اُسی پر عطف ہوا ہے۔ استاذ

امام لکھتے ہیں:

”یہ منافقین کے سب سے زیادہ شریر گروہ کا ذکر ہے۔ ان لوگوں کی جس شرارت کی طرف یہاں اشارہ ہے، وہ یہ ہے کہ اگرچہ مدینہ میں دو مسجدیں پہلے سے موجود تھیں، ایک مضافات شہر میں مسجد قبا، دوسری شہر کے اندر مسجد نبوی، لیکن انہوں نے اپنے مفسدانہ اغراض کے لیے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی ایک الگ مسجد بنائی۔ مقصود تو ان کا یہ تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں وہ کرنا چاہتے تھے، اُس کے لیے ایک اڈا مہیا کریں، لیکن اُس کو نام مسجد کا دیا تا کہ اس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر اپنی دین داری کی دھونس بھی جمائیں اور اپنے





الْمُؤْمِنِينَ وَارْصَادًا لِّلْمَنَ حَارِبَ اللّٰهِ وَرَسُولَهُ مِنْ قَبْلُ  
وَلِيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰى ط وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿١٠٤﴾  
لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ط الْمَسْجِدُ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ

کفر کو تقویت دیں اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں اور اُن لوگوں کے لیے ایک  
کمین گاہ فراہم کریں جو اس سے پہلے خدا اور اُس کے رسول کے ساتھ برسرِ جنگ  
رہے ہیں، (وہ بھی آئیں گے) اور (آ کر) قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو صرف بھلائی  
چاہی تھی۔ مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ تم اُس میں کبھی کھڑے نہ ہونا،  
(اے پیغمبر)۔ وہی مسجد اس کی حق دار ہے کہ تم اُس میں (عبادت کے لیے) کھڑے

مقاصد بھی پورے کر سکیں۔ اُس کو مسلمانوں کی نظروں میں مقبول اور مقدس بنانے کے لیے  
انہوں نے یہ کوشش بھی کی کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اُس میں ایک مرتبہ نماز پڑھ دیں تاکہ اُس  
کو بھی لوگوں کی نگاہوں میں وہی احترام حاصل ہو جائے جو مسجدِ قبا کو حاصل ہے، لیکن نبی  
صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اغراضِ مشنؤمہ بھانپ کر پہلے تو ان کو ٹال دیا، پھر جب اُس کے  
بارے میں یہ آیتیں نازل ہو گئیں تو اُس میں نماز پڑھنا تو الگ رہا، آپ نے تبوک سے واپسی  
پر اُس کو گروا بھی دیا۔\* (تدبر قرآن ۶۴۱/۳)

۲۷۵ مطلب یہ ہے کہ ہمارے پیش نظر تو صرف اتنی بات تھی کہ اللہ کے ذکر اور اُس کی  
عبادت کے لیے ایک جگہ اور بنادی جائے اور جو مسلمان اندھیری راتوں یا سردی اور بارش میں مسجد  
کی دوری کے باعث جماعت کی حاضری سے محروم رہ جاتے ہیں، وہ بھی جماعت کا ثواب حاصل  
کر سکیں۔

۲۷۶ اصل میں 'اَحَقُّ' کا لفظ ہے، مگر موقعِ کلام سے واضح ہے کہ یہ نسبت اور تقابل سے مجرد

\* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۵۰۸/۲۔





التوبه  
۹

أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ ۖ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَّخِذُوا اللَّهَ مِثْبَ  
الْمُطَهَّرِينَ ۝ (۱۰۸) أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ  
وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَمْ مَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ شَفَا جُرْفٍ هَارٍ  
فَأَنهَارِبُهُ فِي نَارِ جَهَنَّمَ ۖ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ (۱۰۹)  
لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۖ

ہو جس کی بنیاد اول دن سے خدا کے تقویٰ پر قائم کی گئی ہے۔ اُس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ اُنھی کو پسند کرتا ہے جو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہوں۔ پھر کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے تقویٰ اور اُس کی خوشنودی پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک کھوکھلی لگر کے کنارے پر اٹھائی جو گرنے کو ہے اور وہ اُس کو لے کر دوزخ کی آگ میں جا گری؟ اس طرح کے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی راہ نہ دکھائے گا۔ یہ عمارت جو اُنھوں نے بنائی ہے، ہمیشہ اُن کے دلوں

ہو کر آیا ہے۔ عربی زبان میں 'أَفْعَلُ' اس طریقے سے بھی آتا ہے۔

۲۷۷ جملے کا اسلوب بتا رہا ہے کہ اس سے مسجد قبا مراد ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد ضرار اسی کے توڑ پر بنائی گئی تھی۔

۲۷۸ اس میں، اگر غور کیجیے تو مسجد قبا کے نمازیوں کی تعریف کے ساتھ مسجد ضرار کے مفسدین پر تعریض بھی ہے کہ یہ ظاہر و باطن، دونوں میں آلودہ غلاظت ہیں اور اللہ اس طرح کے لوگوں کو سخت ناپسند کرتا ہے۔

۲۷۹ یعنی اُس منزل کی راہ نہ دکھائے گا جو قیامت میں اہل ایمان کے لیے مقرر کی گئی ہے۔

\* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۲/۵۰۹۔



وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝۱۱۰

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةُ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ ۚ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ

میں بے یقینی کی بنیاد بنی رہے گی، الا یہ کہ اُن کے دل ہی ٹکڑے ہو جائیں۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ ۱۰۷-۱۱۰

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ (پیغمبر کے ہاتھ پر بیعت کر کے) ایمان لائے ہیں، اُن کے جان و مال اللہ نے اس وعدے پر اُن سے خرید لیے ہیں کہ اُن کے بدلے میں وہ اُن کو جنت عطا فرمائے گا۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔ یہ اللہ کے ذمے ایک سچا وعدہ ہے، تورات اور انجیل اور قرآن میں۔ اور اللہ سے

۲۸۰ یہ تعلق بالحال کا ایک خوب صورت اسلوب ہے۔ ہم اپنے محاورے میں کہتے ہیں کہ یہ داغ اب کپڑے کے ساتھ ہی جائے گا۔ اسی طرح فرمایا ہے کہ 'إِلَّا أَنْ تُقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ'۔

۲۸۱ اسلام کی حقیقت یہی بیع و شرا ہے، لیکن یہاں خاص طور پر اس کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ پیغمبر کی موجودگی میں اس بیع و شرا کا سب سے بڑا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اُس کے ماننے والے منکرین حق کے لیے خدا کے عذاب کا تازیانہ بن جائیں اور اُن کو ماریں، خواہ اُن میں سے بعض اس کے نتیجے میں خود بھی مارے جائیں۔ پیچھے جن لوگوں کا ذکر ہوا ہے، اُن کے نفاق کا اصلی سبب یہی تھا کہ وہ خدا سے اپنے جان و مال چراتے تھے۔ چنانچہ واضح کر دیا ہے کہ پیغمبر کے ہاتھ پر جو بیعت کی جاتی ہے، اُس کا سب سے بڑا تقاضا اس وقت خدا کی راہ میں قتال ہی ہے۔







التوبه  
۹

الْعَظِيمُ ۝ التَّائِبُونَ الْعِبَادُونَ الْحَمِيدُونَ السَّكَائِبُونَ  
الرُّكْعُونَ السُّجِدُونَ الْأَمْرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ  
الْمُنْكَرِ وَالْحَفَظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ ۖ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝

بڑھ کر کون ہے جو اپنے وعدے کو پورا کرنے والا ہو؟ سوا اپنے اس سودے پر خوشی مناؤ جو تم نے اللہ سے کیا ہے۔ (یاد رکھو)، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ وہ توبہ کرنے والے ہیں، عبادت کرنے والے ہیں، شکر کرنے والے ہیں، (خدا کی راہ میں) سیاحت کرنے والے ہیں، (اُس کے آگے) رکوع اور سجدہ کرنے والے ہیں، بھلائی کی تلقین کرنے والے ہیں، برائی سے روکنے والے ہیں اور حدودِ الہی کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ وہی سچے مومن ہیں، (اے پیغمبر)، اور ان مومنوں کو خوش خبری دے دو۔ ۱۱۱-۱۱۲

۲۸۲ یعنی جان و مال کی قربانی کے عوض جنت کا وعدہ۔ انجیل میں جس چیز کو آسمانی بادشاہی سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ یہی ہے۔ پیغمبر کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کو جو بادشاہی دنیا میں حاصل ہوتی ہے، وہ اسی کی ابتدا ہے۔ تورات کے مترجمین نے اسی بنا پر ہر جگہ اسے ایک ایسے ملک پر چسپاں کر دیا ہے، جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے، یعنی فلسطین کی سرزمین جس کے وہ دنیا میں امیدوار تھے۔

۲۸۳ اصل میں مبتدا محذوف ہے، یعنی 'ہم التائبون'۔ یہ منافقین کے سامنے اُن اوصاف کی وضاحت کر دی ہے، جن کا حامل ہر سچے مومن کو ہونا چاہیے تاکہ وہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ ایمان کے تقاضے کیا ہیں اور کون سا روئے کفر اور نفاق میں داخل ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”یہاں اہل ایمان کے کردار کے جواجز ابیان ہوئے ہیں، اُن میں سب سے پہلے توبہ کا ذکر

ہے۔ توبہ کے معنی رجوع الی اللہ کے ہیں۔ خدا کی بندگی اور اطاعت کی راہ میں بندے کا پہلا



قدم یہی ہے کہ وہ شیطانی راہوں میں ہرزہ گردی چھوڑ کر اپنے رب کی طرف لوٹتا ہے اور اُس کی صراطِ مستقیم پر چلنے کا عزم کرتا ہے۔ پھر یہی توبہ ہے جو ہر گام پر اُس کو سنبھالتی ہے۔ جب کبھی اُس کا کوئی قدم راہ سے بے راہ ہو جاتا ہے، یہ توبہ اُس کی دست گیری کرتی اور اُس کو راہ پر لگاتی ہے۔

توبہ کے بعد عبادت کا ذکر ہے۔ یہ خدا کے سب سے بڑے حق کا حوالہ ہے۔ جو بندہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے، اُس پر خدا کا اولین حق اُس کی عبادت کا عائد ہوتا ہے اور چونکہ خدا کے سوا کوئی اور اس حق میں سا جھی نہیں ہے، اس وجہ سے اس کا بلا شرکت غیرے ہونا اس کی صفت لازمی ہے اور ساتھ ہی اطاعت بھی چونکہ اس کا بدیہی تقاضا ہے، اس وجہ سے وہ بھی اس کا جزو لا ینفک ہے۔ عبادت کے ساتھ حمد کا ذکر ہے جو تمام عبادات کی روح ہے، اس لیے کہ نماز اور زکوٰۃ وغیرہ... سب خدا کی شکر گزاری اور اُس کی نعمتوں کے اعتراف کے مظاہر ہیں۔ اگر بندے کے اندر شکر گزاری اور اعترافِ نعمت کا جذبہ بطور ایک صفت کے راسخ نہ ہو تو نہ تو وہ عبادت کا حق ادا کرنے پر آمادہ ہی ہوتا ہے اور نہ اُس کی عبادت کے اندر کوئی روح ہی ہوتی ہے۔

اس کے بعد سیاحت کا ذکر ہے... یہ اُن تمام سرگرمیوں، مشقتوں اور ریاضتوں کی ایک جامع تعبیر ہے جو آدمی اپنے ظاہر و باطن کی تربیت و اصلاح، دین کو سمجھنے اور سمجھانے، اُس کو پھیلانے اور بڑھانے کے لیے والہانہ اور سرفروشانہ اختیار کرتا ہے اور جن کی راہ میں اپنی زندگی کی لذتیں، راحتیں، امنگیں اور خوشیاں بے دریغ قربان کرتا ہے۔

پھر نماز کا ذکر ہے جس کے لیے 'الرَّكْعَةُ السَّجْدَةُ' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ نماز کا ذکر قرآن میں جہاں جہاں اس اسلوب سے ہوا ہے، وہاں صرف فرض نمازیں مراد نہیں ہیں، بلکہ خلوت کی نمازیں مراد ہیں۔ یہی نمازیں اُن تمام چیزوں کی محافظ بھی ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اور یہی اُس ریاضت کو بھی زندگی اور نشوونما بخشی ہیں جو سیاحت کے لفظ سے تعبیر کی گئی۔ اس کے بعد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر ہے۔ اوپر جو باتیں بیان ہوئی ہیں، اُن کا بیش تر تعلق فرد کی اپنی اصلاح و تربیت سے ہے۔ اب یہ اُن کا تعلق قوم اور جماعت کے ساتھ







التوبه

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أَوْلَىٰ قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿٣٨٥﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِابْنِهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا

نبیؐ اور اُس کے ماننے والوں کے لیے زیبا نہیں کہ (جن) مشرکین (سے اعلان براءت ہو چکا ہے، اُن) کے لیے مغفرت کی دعا کریں، اگرچہ وہ اُن کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جب کہ اُن پر کھل چکا کہ وہ دوزخ کے لوگ ہیں۔ ابراہیم نے تو اپنے باپ

واضح کیا جا رہا ہے کہ وہ نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے ہیں۔ وہ دوسروں کے خیر و شر سے بے تعلق رہ کر زندگی نہیں گزارتے، بلکہ دوسروں کی اصلاح و تربیت کے لیے بھی اپنے اندر تڑپ رکھتے ہیں اور اپنی طاقت و صلاحیت کے مطابق اصلاح منکر کا فرض انجام دیتے ہیں۔

آخر میں حفظ حدود اللہ کا ذکر ہے۔ یہ درحقیقت تقویٰ کی تعبیر ہے اور خاتمہ پر ایک ایسی صفت کا حوالہ دے دیا گیا ہے جو سب سے زیادہ جامع ہے۔ یعنی وہ زندگی کے تمام مراحل میں برابر چوکنے رہتے ہیں کہ خدا نے جو حدود قائم فرمائے ہیں، اُن میں سے کوئی حد ٹوٹنے نہ پائے۔ نہ وہ خود کسی حد کو توڑنے کی جسارت کرتے ہیں اور نہ اپنے امکان کی حد تک کسی دوسرے کو اُس کے توڑنے کی اجازت دیتے ہیں۔“ (تذبر قرآن ۳/۶۴۷)

۲۸۴ اس جملے کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۲۸۵ یہ چھٹا اور آخری شذرہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر تبوک سے واپسی کے بعد مدینہ طیبہ میں کسی وقت نازل ہوا ہے۔

۲۸۶ یہ اُس مرحلے کا حکم ہے، جب پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت اور اعلان براءت کے بعد بھی لوگ ایمان لانے سے انکار کر دیں۔ پیغمبر اور اُس کے ساتھیوں کی دعائیں قوم کے لیے خدا کی امان ہوتی ہیں۔ جزا و سزا کے اس مرحلے میں ضروری تھا کہ انھیں اس امان سے محروم کر دیا جائے



تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ط إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴿١١٣﴾  
وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّى يُبَيِّنَ لَهُمْ

کے لیے صرف اُس وعدے کے سبب سے مغفرت مانگی تھی جو اُس نے اپنے باپ سے کر لیا تھا۔ مگر جب اُس پر واضح ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو وہ اُس سے بے تعلق ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم بڑا نرم دل اور بردبار تھا۔ (تم یاد رکھو کہ) اللہ کا طریقہ

اور جو عذاب اُن کے لیے مقدر ہو چکا ہے، وہ اُس کو بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ پھر یہ دعائیں حمیت حق کے بھی منافی تھیں، اس لیے کہ اس وضاحت کے بعد کہ وہ جہنم کے مستحق ہو چکے ہیں، اگر کسی رشتہ و تعلق کی بنا پر مغفرت کی دعا کی جائے تو اس کے صاف معنی یہی ہوں گے کہ قرابت کی حمیت حمیت حق پر غالب ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، البتہ اس طرح کے اتمام حجت اور اعلان براءت کا موقع باقی نہیں رہا۔ چنانچہ کوئی حرج نہیں کہ کفر و شرک کے کسی مرتکب کے لیے بھی اُن الفاظ میں دعا کر دی جائے جو سیدنا مسیح علیہ السلام نے اختیار فرمائے ہیں کہ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ، وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ، فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ\*، (آپ اُنھیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ زبردست ہیں، بڑی حکمت والے ہیں)۔

۲۸۷ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وعدے کی اہمیت کس قدر غیر معمولی ہے۔

۲۸۸ یہ باپ کے معاملے میں ابراہیم علیہ السلام کی دردمندی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پسندیدگی کا اظہار ہے۔ تاہم جب واضح ہو گیا کہ باپ فی الواقع خدا کا دشمن ہے تو اُنھوں نے سختی کے ساتھ اعلان براءت بھی کر دیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... چونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ بندہ اُس کی محبت میں موم بھی بنے اور پتھر بھی، اس وجہ سے حضرت ابراہیم نے اپنے دل کے یہ دونوں پہلو نمایاں کیے اور یہی صحیح نمونہ ہے دین کے

\* المائدہ ۵: ۱۱۸۔





مَا يَتَّقُونَ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١١٥﴾ إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ  
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۚ وَمَا لَكُم مِّنْ دُونِ اللَّهِ  
مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿١١٦﴾

یہ نہیں ہے کہ وہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد پھر گم راہی میں مبتلا کر دے، جب تک کہ اُنھیں صاف صاف وہ چیزیں نہ بتا دے جن سے اُنھیں بچنا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ اللہ ہی ہے کہ زمین اور آسمانوں پر جس کی بادشاہی ہے۔ وہی زندگی دیتا اور وہی مارتا ہے اور اللہ کے سوا نہ تمھارا کوئی حامی ہے اور نہ

مددگار۔ ۱۱۳-۱۱۶

خدمت گزاروں کے لیے۔ جب تک اُن کے سینے میں درد مند دل نہ ہو، خلق کی ہدایت کے لیے اُن کا اٹھنا بے سود اور جب تک عزم میں لوہے کی صلابت اور پہاڑ کی استقامت نہ ہو، دین کے لیے اُن کا وجود بالکل ناکارہ!“ (تذکر قرآن ۳/۶۵۵)

۲۸۹ یہ مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ خدا نے تمھیں راہ ہدایت دکھانے کے بعد اُن خطرات سے بھی آگاہ کر دیا ہے جو اس راہ کے مسافر کو پیش آ سکتے ہیں۔ رشتہ و قرابت کی بنا پر اُن لوگوں کے لیے دعائیں جن کے بارے میں خدا نے اعلان کر دیا ہو کہ وہ اُس کے دشمن ہیں، تمھارے ایمان کے لیے فتنہ بن سکتی تھیں۔ چنانچہ صاف صاف بتا دیا ہے کہ یہ تمھارے لیے زیبا نہیں ہے۔ آگے صفات الہی کے حوالے سے یاد دہانی ہے۔ یہ اسی تنبیہ کا جزو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غایت درجہ احتیاط کرو۔ تمھارا معاملہ اُس ہستی کے ساتھ ہے جو زمین و آسمان کا بادشاہ ہے، موت و حیات کا مالک ہے، ظاہر و باطن، ہر چیز کا جاننے والا ہے، اُس سے متعلق کسی نفاق کا شائبہ بھی دل و دماغ میں رہنے دو گے تو اندیشہ ہے کہ کسی بڑے خطرے سے دوچار ہو جاؤ گے۔ پھر اُس کے سوا کوئی حامی اور مددگار نہ پاسکو گے۔



لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ۝۱۱۴ وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ

اللہ نے نبی پر اور (نبی کے ساتھی) اُن مہاجرین و انصار پر رحمت کی نظر کی جنہوں نے تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا، اس کے بعد کہ اُن میں سے بعض کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے۔ پھر اللہ نے اُن پر رحمت کی نظر کی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اُن پر مہربان ہے، بڑا رحم فرمانے والا ہے۔ اسی طرح اُن تینوں پر رحمت کی نظر کی جن کا

۲۹۰ آیت میں فعل تَابَ کا صلہ علی کے ساتھ آیا ہے اور اُس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ یہ اس طرح آئے تو رحمت و عنایت کے مضمون پر متضمن ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس طرح کی کوئی غلطی صادر نہیں ہوئی تھی، جس طرح کی غلطیوں پر پیچھے لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے۔ آپ کا معاملہ صرف یہ تھا کہ اپنی کریم النفسی کے باعث آپ نے بعض موقعوں پر منافقین سے چشم پوشی فرمائی تھی، در اں حالیکہ اُس وقت یہ چشم پوشی تطہیر کی اُس مہم کے خلاف تھی جو عذاب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے پیش نظر تھی۔ اس کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے۔ اسی طرح مہاجرین و انصار کا سواد اعظم اگرچہ ہر قسم کے شدائد و مصائب کے باوجود ثابت قدمی کے ساتھ راہ حق پر قائم رہا، مگر ایک چھوٹے سے گروہ سے تبوک کے موقع پر کچھ کمزوری صادر ہوئی۔ یہ اُسی کا حوالہ ہے کہ اُن میں سے بعض کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے۔ تاہم یہ لوگ بھی جلد بیدار ہو گئے اور توبہ و استغفار سے اپنے دلوں کو راہ حق پر استوار کر لیا۔ اس آیت نے سب کو بشارت دے دی کہ اللہ کی رحمت اُن کی طرف متوجہ ہے۔ وہ تبوک کے موقع پر اور اس سے پہلے بھی تنگی کے ہر وقت میں پیغمبر کے ساتھ رہے ہیں۔ اللہ نے اسی بنا پر اُن کی ہر کوتاہی معاف کر دی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... إِنْ الْفَاطَ كَا حَوَالَهٗ اِيْكَ تُو اِس حَقِيْقَت كُو وَاَصْح كُر رِهَا هٗ كَه اَصْل اِيْمَان اُن كَا اِيْمَان هٗ كُو



خَلِفُوا حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ  
أَنفُسُهُمْ وَظَنُّوْا أَنَّ لَا مَدْجَاصَ ۚ اللَّهُ إِلَّا إِلَهُ ۚ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ

معاملہ اٹھا رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین اپنی وسعت کے باوجود اُن پر تنگ ہو  
گئی اور وہ خود اپنی جانوں سے تنگ آ گئے اور اُنھوں نے اندازہ کر لیا کہ خدا سے خدا کے  
سوا کوئی پناہ کی جگہ نہیں ہے، پھر اللہ نے اپنی رحمت سے توجہ فرمائی کہ وہ اُس کی طرف

مصائب و شدائد کی کسوٹیوں پر جانچے اور پرکھے جا چکے ہوں۔ دوسری بات اس سے یہ نکلی کہ  
دراصل مہاجرین و انصار کے ایمان کی یہی خصوصیت ہے جو اُن کے لیے سفارش بنی کہ اللہ تعالیٰ  
اُن پر اپنی رحمت کی نظر اور اُن کی توبہ قبول فرمائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے وفادار و جاں نثار بندوں کو  
توفیق خیر سے محروم نہیں فرماتا۔ جب اُن سے کوئی کمزوری صادر ہو جاتی ہے، اُن کے دل میں وہ  
توبہ کی بے قراری پیدا کرتا ہے، پھر وہ توبہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ  
نظر انداز صرف اُن کو کرتا ہے جو صرف زبان سے عشق کا دعویٰ کرتے ہیں، اس راہ میں چوٹ  
کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔“ (تدبر قرآن ۶۵۷/۳)

۲۹۱۔ ان کا ذکر پیچھے آیت ۱۰۶ میں ہو چکا ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں پورے  
پچاس دن زیر عتاب رہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم پر مسلمانوں کی پوری جماعت نے ان کا مقاطعہ کر  
دیا۔ اللہ کے پیغمبر نے بھی رخ پھیر لیا۔ اعزہ و اقربا، دوست احباب، یہاں تک کہ بیوی بچے بھی  
بالکل غیر بن کر رہ گئے۔ اسی کو بیان کیا ہے کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود اُن پر تنگ ہو گئی۔ اس کا  
اثر ان کے باطن پر یہ پڑا کہ خدا اور رسول کی ناراضی کے احساس نے انھیں خود اپنے وجود سے بے زار  
کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ نہ باہر سکون کی کوئی جگہ نظر آتی تھی اور نہ اپنے دل کے اندر  
سکون و اطمینان کا کوئی گوشہ تلاش کر سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل پگھل اٹھے اور یہ  
توبہ و انابت کے اُس معیار تک پہنچ گئے جو اس مرتبے کے لوگوں سے مطلوب تھا۔ استاذ امام لکھتے

\* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۵۱۹/۲۔



## لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١١٨﴾

پلیٹیں ۲۹۲۔ یقیناً اللہ ہی ہے جو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۱۷-۱۱۸

ہیں:

”...جتنی ہی شدت کے ساتھ ان لوگوں پر عتاب ہوا، اتنی ہی بے قراری کے ساتھ ان لوگوں نے اپنے آپ کو خدا کے آگے ڈال دیا کہ جب گرفت خدا کی طرف سے ہے تو اس سے پناہ صرف وہی دے سکتا ہے۔ چنانچہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تین میں سے دو صاحبوں نے تو بالکل ہی خانہ نشینی اختیار کر لی، رات دن گریہ وزاری اور توبہ واستغفار کے سوا ان کا کوئی کام ہی نہیں رہ گیا۔ تیسرے صاحب اگرچہ کسی کسی وقت باہر نکلتے، لیکن صرف اس امید میں کہ شاید کسی گوشے سے خدا اور رسول کی رضا کی کوئی مہک آجائے۔ اگر ان کے اندر نفاق کا کوئی جرثومہ ہوتا تو جب یہ خدا اور رسول کی طرف سے پھینکے گئے تھے، کسی اور کی پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتے۔ لیکن یہ راسخ الایمان لوگ تھے، اس وجہ سے ٹھیک اُس بچے کی طرح جو ماں کی جھڑکی سے سہم کر خود ماں ہی سے چمٹتا ہے، یہ خدا کے عذاب سے بچنے کے لیے خدا ہی کی طرف بھاگے۔“ (تدبر قرآن ۶۵۹/۳)

۲۹۲ اصل الفاظ ہیں: ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا۔ لِيَتُوبُوا میں فعل کامل اور حقیقی معنی میں ہے۔ اپنے گناہ کا اعتراف تو یہ پہلے ہی کر چکے تھے، لیکن آزمائش کے ان سخت مراحل سے گزرنے کے بعد ان کے دل اچھی طرح گداز ہو گئے تو اللہ نے رحمت کی نظر فرمائی اور انہیں اُس توبہ کی توفیق بخشی جس نے دل و دماغ کو ہر آلودگی سے پاک کر دیا۔ قرآن کے ان الفاظ سے ایک اور حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...توبہ کی ابتدا اصلاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ وہی پہلے بندے کے دل میں رجوع الی اللہ کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ پھر جب بندہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوبارہ اُس پر رحمت کی نظر

\* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۵۲۰/۲۔





التوبه  
۹

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿١١٩﴾  
مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ

ایمان والو، (ان غلطیوں سے بچنا چاہتے ہو تو) اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔<sup>۲۹۳</sup> حقیقت یہ ہے کہ مدینہ والوں اور اُن کے گرد و نواح کے بدویوں کے لیے

فرماتا اور اُس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ اگر اُس کے اندر ایمان ہو تو ہر گناہ پر اُس کا دل کڑھتا اور آزرده ہوتا ہے اور ایک احساس ندامت کے ساتھ اُس کے اندر اپنے رب کی طرف رجوع ہونے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اگر آدمی اپنے اس جذبے کے مطابق عمل کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے دل اور زبان پر وہ الفاظ اور کلمات بھی جاری فرما دیتا ہے جو اُس کو پسند ہیں اور جن کو وہ شرف قبولیت بخشا ہے۔ اس سے محروم صرف وہ بد قسمت لوگ رہتے ہیں جن کا ضمیر کند اور جن کا ایمان مردہ ہو جایا کرتا ہے۔ ایسے لوگ خدا سے بے پروا ہو جایا کرتے ہیں جس کی سزا اُن کو یہ ملتی ہے کہ خدا بھی اُن سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ آدم و ابلیس کی سرگذشت، جو سورہ بقرہ میں بیان ہوئی ہے، وہ اس کی نہایت حقیقت افروز مثال ہے۔“ (تذکر قرآن ۳/۶۶۰)

۲۹۳ اصل میں لفظ صَدِّقِينَ استعمال ہوا ہے۔ یہ منافقین کا ضد ہے، یعنی وہ لوگ جن کے قول و فعل میں پوری مطابقت ہو۔ پیچھے جن کوتاہیوں پر گرفت ہوئی ہے، اُن سے بچنے کے لیے یہاں خدا سے ڈرنے اور سچے لوگوں کی معیت اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ پہلی چیز اندر سے انسان کی حفاظت کرتی ہے اور دوسری باہر سے اُس کو شیطان کے مقابل میں مدد پہنچاتی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اگر آدمی کا رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا کافروں، منافقوں اور جاہلوں کے ساتھ ہو تو کمزور تو درکنار بسا اوقات مضبوط آدمی بھی کچھ نہ کچھ اُن کا اثر قبول کر ہی لیتا ہے۔ اسی طرح راسخ الایمان اور راسخ العمل لوگوں کے فیض صحبت سے کمزور آدمی کے اندر بھی اپنی کمزوریوں پر غالب آنے کا



يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنْفُسِهِمْ عَنْ نَفْسِهِ ۚ ذَٰلِكَ  
بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ  
وَلَا يَطْئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَبِيًّا  
وَلَا يَكُتِبَ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ  
أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٩٢﴾ وَلَا يَنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً

زیبا نہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر پیچھے بیٹھے رہیں اور نہ یہ زیبا تھا کہ اپنی جان کو  
اُس کی جان سے عزیز رکھیں۔ یہ اس لیے کہ جو پیاس، تکان اور بھوک بھی اُن کو خدا کی  
راہ میں لاحق ہوتی ہے اور (پیغمبر کے) منکروں کو رنج پہنچانے والا جو قدم بھی وہ اٹھاتے  
ہیں اور (اُس کے) کسی دشمن کو جو چرکا بھی لگاتے ہیں، اُن سب کے بدلے میں ایک نیکی  
اُن کے لیے لکھ دی جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ خوبی اختیار کرنے والوں کا اجر  
ضائع نہیں کرتا۔ اسی طرح جو چھوٹا یا بڑا انفاق وہ کرتے ہیں اور (راہ حق میں) جو وادی

حوصلہ پیدا ہو جایا کرتا ہے اور وہ بالتدریج اُن کے زمرے کا آدمی بن جاتا ہے۔“

(تدبر قرآن ۶۶۰/۳)

۲۹۲ اصل میں لفظ ”مُحْسِنِينَ“ آیا ہے۔ یہ اُس شرط کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اللہ کے  
ہاں اعمال کی مقبولیت کے لیے ضروری ہے۔ یعنی جب کوئی عمل کیا جائے تو اُس کی روح اور  
قالب، دونوں پورے توازن کے ساتھ پیش نظر ہوں، اُس کا ہر جزو بہ تمام و کمال ملحوظ رہے اور اُس  
کے دوران میں آدمی اپنے آپ کو خدا کے حضور میں سمجھے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کا معاملہ اپنی  
راہ میں دکھ اٹھانے اور مصیبتیں جھیلنے والوں سے یہ ہے تو اُن کے لیے بھی زیبا نہیں کہ وہ اپنے  
جان و مال کو پیغمبر کے مقابل میں ترجیح دیں۔





التوبه  
۹

وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢١﴾ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿١٢٢﴾  
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا

بھی قطع کرتے ہیں، سب اُن کے لیے لکھا جاتا ہے تاکہ اللہ اُن کے عمل کا اچھے سے اچھا بدلہ اُنھیں دے۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ مسلمان، سب کے سب نکل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ اُن کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکلتے تاکہ دین میں بصیرت پیدا کرتے اور اپنی قوم کے لوگوں کو (اُن کے ان رویوں پر) خبردار کرتے، جب اُن کی طرف لوٹتے، اس لیے کہ وہ خدا کی گرفت سے بچتے؟<sup>۲۹۵</sup> ۱۱۹-۱۲۲ ایمان والو، (ان تنبیہات کے بعد اب نکلنا اور جس طرح کہ پیچھے حکم دیا گیا ہے)،

۲۹۵ یہ وہ اہتمام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کے لیے تجویز فرمایا ہے جو دور دراز کے علاقوں میں رہنے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات بھی آپ سے براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ بالبداهت واضح ہے کہ یہی اہتمام آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی ہونا چاہیے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ سب مسلمانوں کے لیے تو یہ ممکن نہیں ہے، لیکن اُن کی ہر جماعت میں سے کچھ لوگوں کو لازماً اس مقصد کے لیے نکلنا چاہیے کہ وہ دین کا علم حاصل کریں اور اپنی قوم کے لیے نذیر بن کر اُسے آخرت کے عذاب اور خدا کی گرفت سے بچانے کی کوشش کریں۔ یہ، اگر غور کیجیے تو بعینہ وہی کام ہے جو اللہ کے نبی اور رسول اپنی قوم میں کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دعوت و انداز کا کام آپ کے بعد اس



فِيكُمْ غُلْظَةً ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿١٢٣﴾ وَإِذَا مَا أَنْزَلَتْ  
سُورَةٌ مِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ أَيْكُمُ زَادَتْهُ هَذِهِ آيَمَانًا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ

اپنے گرد و پیش کے منکروں سے جنگ کرو اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں، اور  
جانے رہو کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرنے والے ہوں۔ (ان پر افسوس،  
یہ کہاں نکلیں گے؟ ان کا حال تو یہ ہے کہ) جب کوئی سورت اترتی ہے تو ان میں سے  
بعض وہ بھی ہیں جو پوچھتے ہیں کہ اس نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا  
امت کے علما کو منتقل ہوا ہے اور ختم نبوت کے بعد یہ ذمہ داری اب قیامت تک اُنھیں ہی ادا کرنی  
ہے۔

۲۹۶ آیت میں خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روئے سخن اُنھی منافقین کی طرف ہے جو اپنی  
دوستیوں، رشتہ داریوں اور کاروباری تعلقات کے پیش نظر اُن لوگوں کے خلاف کسی اقدام کے لیے  
تیار نہیں تھے جن کے ساتھ اس سورہ میں جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہر شخص کو  
اُنھی سے لڑنا ہے جو اُس کے گرد و پیش میں رہتے ہیں اور کسی نہ کسی لحاظ سے اُس کے اپنے ہیں۔  
ایمان و اخلاص کا اصلی امتحان اسی سے ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ گوسالہ پرستی کے جرم کی پاداش میں  
جب بنی اسرائیل کے قتل عام کا حکم دیا گیا تھا تو اُس میں بھی یہی تقاضا کیا گیا تھا۔ آیت میں  
”يُلُونَكُمْ“ کی قید اسی پہلو کو نمایاں کر رہی ہے۔

۲۹۷ یعنی محسوس کر لیں کہ تمہارے اندر اب اُن کے لیے دوستی، موالات اور محبت کی کوئی جگہ  
باقی نہیں رہ گئی ہے۔ جزا و سزا کے مرحلے میں یہی تقاضا ہے جس کے پیش نظر ترک موالات کا حکم دیا  
جاتا ہے۔ اس کا اُن لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا جو ابھی مرحلہ دعوت کے مخاطبین ہوں۔

۲۹۸ یہ فتح و نصرت کی بشارت ہے اور ہمیشہ اسی شرط کے ساتھ ہوتی ہے کہ لوگ تقویٰ پر قائم  
رہیں اور جنگ و جدال کے موقع پر بھی خدا کے مقرر کردہ حدود سے کوئی تجاوز نہ کریں۔





التوبه  
۹

اٰمَنُوْا فَرٰدَتْهُمْ اِيْمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝۱۲۳ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ  
قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَرٰدَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰی رِجْسِهِمْ وَمَا تُوَاوَهُمْ كُفْرُوْنَ ۝۱۲۴  
اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُوْنَ  
وَلَا هُمْ يَذْكُرُوْنَ ۝۱۲۵ وَاِذَا مَا اُنْزِلَتْ سُورَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ

۲۹۹ ہے؟ سو حقیقت یہ ہے کہ جو فی الواقع ایمان لائے ہیں، اُن کے ایمان میں تو اُس نے  
اضافہ کر دیا اور وہ اُس سے خوشیاں مناتے ہیں۔ رہے وہ جن کے دلوں میں نفاق کا  
روگ ہے تو اُن کی نجاست پر اُس نے ایک اور نجاست بڑھادی اور وہ مرنے تک منکر  
ہی رہے۔ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہر سال میں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ وہ آزمائش میں ڈالے  
جاتے ہیں، پھر بھی نہ توبہ کرتے ہیں، نہ یاد دہانی حاصل کرتے ہیں؟ اور (کسی نئی مہم

۲۹۹ یہ تعریض کا جملہ ہے۔ اس سے اُن کا مقصود خدا کے احکام کی تحقیر اور اُن لوگوں کی  
حوصلہ شکنی تھا جو پورے اخلاص کے ساتھ اُن احکام کو سننے اور اُس پر عمل کے لیے آمادہ رہتے تھے۔  
۳۰۰ اصل الفاظ ہیں: 'فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'۔ ان میں فعل اپنے کامل اور حقیقی معنی میں ہے۔  
ہم نے ترجمہ اُسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۳۰۱ یہ محض استعارہ نہیں، بلکہ ایک حقیقت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...قرآن کا ہر حکم اہل ایمان کے لیے ایک میدان مسابقت کھولتا ہے اور جب وہ اس میدان  
کی بازی جیت لیتے ہیں تو اُن کی قوت ایمانی میں مزید دوسرے میدان جیتنے کے لیے عزم و حوصلہ  
پیدا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ درجہ بدرجہ وہ سعادت کی آخری منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ برعکس  
اس کے اہل نفاق ایک محرومی کے بعد دوسری محرومی اور ایک پسپائی کے بعد دوسری پسپائی کی  
ذلتیں سہتے سہتے عزم و ایمان کی آخری رmq سے بھی بالکل خالی ہو جاتے ہیں اور اُن کے دلوں پر  
نفاق پر نفاق کی اتنی موٹی تہیں جم جاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل کے اندر جتنی



إِلَىٰ بَعْضٍ ۖ هَلْ يَرِيكُمْ مِّنْ أَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوا ۖ صَرَفَ اللَّهُ  
قُلُوبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿١٢٤﴾  
لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ

کی تیاری کے لیے) جب کوئی سورت اتاری جاتی ہے تو ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ  
تمہیں کوئی دیکھتا تو نہیں، پھر نکل بھاگتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دل (اپنے قانون  
کے مطابق) پھیر دیے ہیں، اس لیے کہ یہ سمجھنے والے لوگ ہی نہیں ہیں۔ ۱۲۳-۱۲۷  
(لوگو)، تمہارے پاس خود تم میں سے ایک رسول آیا ہے۔ تمہارا نقصان میں پڑنا

صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں، سب اُن کے نیچے دب دبا کر مردہ ہو جاتی ہیں۔“

(تذبر قرآن ۳/۶۶۵)

۳۰۲ یہ معاملہ ابتلا کے اُسی قانون کا حصہ ہے جو رسولوں کے براہ راست مخاطبین سے متعلق  
قرآن میں بیان ہوا ہے۔ اس طرح کی آزمائشیں عام لوگوں کی زندگی میں بھی اُن کی تذکیر و  
تنبیہ کے لیے وقتاً فوقتاً پیش آتی رہتی ہیں، تاہم ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر شخص کو اور ہر سال پیش  
آئیں۔

۳۰۳ یعنی نہ عقل بیدار ہوتی ہے کہ تذکر حاصل کریں اور نہ دل پگھلتے ہیں کہ خدا کی طرف  
متوجہ ہو جائیں۔

۳۰۴ یعنی اپنے اُس قانون کے مطابق جو اُس نے لوگوں کی ہدایت و ضلالت کے لیے مقرر  
کر رکھا ہے۔

۳۰۵ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اللہ تعالیٰ نے تمام خلق پر عموماً اور اہل عرب پر خصوصاً جو  
احسان عظیم فرمایا، یہ اُس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ روئے سخن اُنھی شامت زدہ لوگوں کی طرف ہے  
جو اس نعمت عظمیٰ کی قدر کرنے کے بجائے اسے اپنے لیے ایک مصیبت سمجھ رہے تھے۔





التوبه  
۹

حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿١٢٨﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ  
حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ  
رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿١٢٩﴾

اُس پر بہت شاق ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کا حریص ہے۔ ایمان والوں کے لیے سراپا  
شفقت اور سراسر رحمت ہے۔ پھر بھی یہ روگردانی کرتے ہیں تو، (اے پیغمبر)، کہہ  
دو کہ میرے لیے اللہ کافی ہے۔ اُس کے سوا کوئی الہ نہیں۔ میں نے اُسی پر بھروسہ کیا  
اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔ ۱۲۸-۱۲۹

۳۰۶ یہ تمام صفات حرف عطف کے بغیر آئی ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ ان میں کامل  
اتصال کا اظہار ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جس ہستی کی ناقدری کر رہے ہو، اُس کا حال تو یہ ہے کہ  
جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کو ہر تکلیف، ہر پریشانی، ہر دکھ اور ہر کرب سے محفوظ رکھنے کے لیے  
بے تاب ہوتا ہے، وہ تمہارے لیے اُسی طرح بے تاب ہے، تمہیں دنیا کی ہر سعادت سے بہرہ مند  
دیکھنا چاہتا ہے اور ایمان پر قائم ہو جاؤ تو تمہارے لیے سراپا رافت و رحمت ہے۔ ان آخری دو صفات  
کے بارے میں استاذ امام امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

”... ایک کے اندر دفع شر کا پہلو نمایاں ہے، دوسرے کے اندر عطاے خیر اور پایداری رحمت  
کا۔ یہ دونوں صفتیں اللہ تعالیٰ کی صفات حسنیٰ میں سے ہیں جو بعینہ یہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم  
کے لیے استعمال ہوئی ہیں، جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ خلق کے ساتھ رافت و رحمت کے  
معاملے میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم بالکل صفات الہی کے مظہر تھے۔“

(تذبر قرآن ۳/۶۶۷)

۳۰۷ یعنی تمہاری یہ بات اگر ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی کہ خدا کی راہ میں اور اُس کے حکم پر  
جس جہاد و قتال کے لیے تم انہیں بلا رہے ہو، اُس میں خود ان کے لیے دنیا اور آخرت کی کیا کیا



سعادتیں پوشیدہ ہیں تو پروانہ کرو اور انھیں صاف صاف بتا دو کہ یہ میری کوئی ضرورت نہیں ہے،  
میرے لیے میرا پروردگار ہی کافی ہے۔

کوالا لپور

۲۳ جولائی ۲۰۱۱ء



التوبہ  
۹











## باب سوم یونس - النور

قریش کو انداز  
نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ماننے والوں کو غلبہ حق کی بشارت  
اور اُن کا تزکیہ و تطہیر





## باب سوم

### یونس - النور

۱۰ — ۲۴

یہ قرآن مجید کا تیسرا باب ہے۔ اس میں یونس (۱۰) سے النور (۲۴) تک پندرہ سورتیں ہیں۔ ان سورتوں کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے پہلی چودہ سورتیں ام القریٰ مکہ میں اور آخری سورہ — النور — ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ قرآن مجید کے دوسرے ابواب کی طرح یہ چیز اس باب میں بھی ملحوظ ہے کہ یہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا اور ایک مدنی سورہ پر ختم ہو جاتا ہے۔

اس کے مخاطب اصلاً قریش مکہ ہیں۔ اہل کتاب کو انھی کے ضمن میں بعض موقعوں پر تنبیہ کی گئی ہے، اس لیے کہ ان سورتوں کے زمانہ نزول میں وہ بھی قریش کی حمایت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لیے میدان میں آ چکے تھے۔ تزکیہ و بشارت کے مضامین میں، البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ماننے والے بھی جگہ جگہ مخاطب ہوئے ہیں، بلکہ سورہ طہ میں تمام تر خطاب آپ ہی سے کیا گیا ہے۔

اس کا موضوع قریش کو انداز، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ماننے والوں کو سرزمین عرب میں غلبہ حق کی بشارت اور ان کا تزکیہ و تطہیر ہے، جس میں غلبہ حق کی بشارت کا پہلو نمایاں ہے۔





# یونس - ہود

۱۰—۱۱





## یونس - ہود

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع انذار و بشارت ہے۔ دوسری سورہ میں اس انذار و بشارت کے تاریخی دلائل، البتہ زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ دونوں میں خطاب قریش سے ہے اور ان کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القرئی مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلہ اتمام حجت میں نازل ہوئی ہیں۔

---



## سورة یونس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الرَّاقِفَتِلْكَ اٰیَةُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ ۝ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا  
اَنْ اَوْحٰیْنَآ اِلٰی رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ  
اٰمَنُوْا اَنْ لَّهُمْ قَدَمٌ صَدَقَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ

—۱—

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورہ 'الر' ہے۔ یہ اُس کتاب کی آیتیں ہیں جو سراسر حکمت ہے۔ کیا ان لوگوں کو  
اس پر حیرانی ہوگئی کہ ہم نے انھی میں سے ایک شخص پر وحی کی ہے کہ لوگوں کو خبردار کرو اور  
جو مان لیں، انھیں خوش خبری پہنچا دو کہ اُن کے لیے اُن کے پروردگار کے پاس بڑی

۱۔ اس نام کے کیا معنی ہیں؟ اس کے متعلق ہم نے اپنا نقطہ نظر سورہ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے  
تحت تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

۲۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کتاب کی صداقت کا معیار خود اس کی حکمت ہے۔  
یہ اس کے لیے کسی خارجی شہادت کی محتاج نہیں ہے۔

۳۔ یعنی اس میں انکار و استعجاب اور حیرانی کی کیا بات ہے؟ خدا نے اپنا پیغام پہنچانے کے  
لیے انھی کے اندر سے ایک شخص کو منتخب کیا ہے تو یہی قرین عقل ہے۔ یہ اُس کے ماضی و حاضر اور  
اخلاق و کردار سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اُس کی راست بازی اور امانت و دیانت کو جانتے  
ہیں۔ پھر یہی نہیں، ان کا معلم و مرشد اور ان کے لیے نمونہ و مثال بھی کوئی جن یا فرشتہ نہیں، بلکہ  
انسان ہی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ خدا نے انھی کے ایک بہترین فرد کا انتخاب کیا ہے۔ استاذ امام کے







یونس  
۱۰

إِنَّ هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ①

إِنَّ رَبَّكُمْ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ

عزت کا مرتبہ ہے؟ (اس حقیقت کو سمجھنے کے بجائے) ان منکروں نے کہہ دیا کہ یہ شخص تو کھلا جادوگر ہے۔ ۱-۲

(لوگو!)، حقیقت یہ ہے کہ تمہارا پروردگار وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو

الفاظ میں یہ گویا انہی کی زبان اور انہی کے ضمیر کی گواہی ہے جو ان کے آگے پیش کی جا رہی ہے۔  
۴ اصل میں 'قَدَمَ صِدْقٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی ایسا مرتبہ جس میں عزت، بلندی اور لازوال سرفرازی ہو۔ یہ معنی لفظ 'صِدْق' سے پیدا ہوئے ہیں جو رسوخ و استحکام اور تمکن پر دلیل ہوتا ہے۔

۵ یعنی جب دیکھا کہ اس کی بات لوگوں کو متوجہ کر رہی ہے تو کہہ دیا کہ یہ شخص الفاظ کی جادوگری کا ماہر ہے۔ اس کو کوئی مافوق ہستی اور اس کے کلام کو کوئی مافوق چیز سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ محض فصاحت و بلاغت اور حسن بیان کا کمال ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

۶ یہاں سے آگے اُس انداز و بشارت کی دلیل بیان ہو رہی ہے جس سے سورہ کی ابتدا ہوئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... (اس میں) مقدمات کی ترتیب اس طرح ہے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور جس کا خالق ہونا تمہیں خود بھی تسلیم ہے، وہی تمہارا رب اور آقا و مولیٰ ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ خالق تو کوئی اور ہو، آقا و مولیٰ کوئی اور بن جائے؟ اگر تم نے کچھ اور رب بنا کر اُن سے کچھ امیدیں باندھ رکھی ہیں تو یہ محض تمہاری حماقت ہے جو عقل و فطرت اور خود تمہارے اپنے مسلمہ کے خلاف ہے۔ پھر یہ کائنات کسی اتفاقی حادثے کے طور پر ظہور میں نہیں آ گئی ہے،



ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۖ مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ ۚ  
ذَٰلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٣﴾ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ  
جَمِيعًا ۚ وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ

چھ دن میں پیدا کیا، پھر معاملات کا نظم سنبھالے ہوئے اپنے عرش پر قائم ہو گیا۔ اُس کی اجازت کے بغیر کوئی (اُس کے حضور میں) سفارش کرنے والا نہیں ہے۔ تمہارا پروردگار وہی اللہ ہے، لہذا اُسی کی بندگی کرو۔ پھر کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ تم سب کو (ایک دن) اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ یہ خدا کا سچا وعدہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہی

بلکہ یہ خدائی دنوں کے حساب سے چھ دنوں یا بالفاظ دیگر چھ ادوار میں درجہ بدرجہ ارتقا پذیر ہوئی ہے۔ یہ تدریج و ترتیب اور یہ ارتقا خود شاہد ہے کہ نہ اس کا ظہور کوئی اتفاقی حادثہ ہے، نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا ہے، بلکہ یہ نہایت اہتمام سے پیدا کیا ہوا ایک باغایت و بامقصد کارخانہ ہے اور اس کی مقصدیت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان جو اس کائنات میں خلیفہ کی حیثیت رکھتا ہے یوں ہی شتر بے مہار نہ چھوڑ دیا جائے، بلکہ اُس کے سامنے ایک ایسا دن آئے جس میں وہ لوگ پورے انصاف کے ساتھ اپنے اعمال کا صلہ پائیں جنہوں نے خالق کائنات کی پسند کے مطابق زندگی بسر کی اور وہ لوگ اپنے جرائم کی سزا بھگتیں جنہوں نے اس دنیا کو کھیل تماشا سمجھا اور ساری زندگی بطالت میں گزاری۔“ (تذکر قرآن ۲۳/۴)

یعنی پیدا کرنے کے بعد نہ کسی گوشے میں خاموش بیٹھ گیا ہے اور نہ اپنی مخلوقات کے معاملات دوسروں کے سپرد کر کے اُن سے بے تعلق ہو گیا ہے، بلکہ عرش حکومت پر متمکن ہے اور اپنی دنیا کا نظم خود چلا رہا ہے۔

۵۔ اس لیے لوگوں کو اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ کسی کی سعی و سفارش انہیں خدا کے عذاب سے بچالے گی۔





یونس  
۱۰

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ  
شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٣﴾  
هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَرَهُ مَنَازِلَ

خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اُس کو دہرا دے گا، اِس لیے کہ جو لوگ ایمان لائے اور  
اُنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اُن کو انصاف کے ساتھ (اُن کے عمل کا) بدلہ دے۔  
اِس کے برخلاف جنھوں نے انکار کر دیا ہے، اُن کے انکار کے بدلے میں جو وہ کرتے  
رہے، اُن کے لیے کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہے۔ وہی اِس نے سورج کو

۹ یعنی تمھیں بھی اور تمھارے اُن معبودوں کو بھی جنھیں تم اپنے گمان کے مطابق خدا کے شریک  
اور اُس کے حضور میں سفارش کرنے والے سمجھتے ہو۔ آیت میں 'جَمِيعًا' کی تاکید اسی مضمون کو  
ظاہر کرتی ہے۔

۱۰ یعنی جس طرح ابتدا کی ہے، اُسی طرح دوبارہ پیدا کر دے گا۔ اُسے کوئی دشواری پیش نہ  
آئے گی۔ اِس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جب خلق اور اعادہ خلق، دونوں میں کسی کا کوئی حصہ نہیں  
ہے تو مرجع و مولیٰ بھی وہی ہے۔ اُس کے سوا کوئی دوسرا یہ حیثیت کس بنیاد پر حاصل کر سکتا ہے؟  
۱۱ اوپر توحید کا استدلال تھا۔ اب جزا و سزا کے قطعی ہونے کی دلیل بیان ہو رہی ہے۔ استاذ  
امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”... اِس کارخانہ کائنات پر جو شخص بھی غور کرے گا، اُس کو یہ حقیقت نہایت نمایاں طور پر نظر  
آئے گی کہ یہ کسی کباڑیے کا مال گودام نہیں، بلکہ اِس کے ہر گوشے میں اِس کے خالق کی عظیم  
قدرت اور اُس کی بے پایاں رحمت و ربوبیت نمایاں ہے۔ اِس کے اندر نہایت اعلیٰ اہتمام  
ہے۔ بے نظیر ترتیب و انتظام ہے، بے مثال اقلیدس و ریاضی ہے۔ سورج معین نظام اوقات  
کے ساتھ نکلتا اور اپنی تابانیوں سے سارے جہان کو روشن کرتا ہے۔ اُس کے فیض سے گرمی،



لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ  
يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٥﴾ إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ

تاباں اور چاند کو روشنی بنایا اور اُس کے لیے منزلیں ٹھیرا دیں تاکہ تم اُس سے برسوں کی گنتی  
اور اُن کا حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ بامقصد ہی بنایا ہے۔<sup>۱۲</sup> وہ اُن لوگوں کے

سردی، خزاں اور بہار کے مختلف موسم پیدا ہو جاتے ہیں جن میں سے ہر ایک ہماری دنیا کی  
زندگی اور اُس کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ چاند اُس سے کسب نور کر کے اپنی معین منزلیں طے  
کرتا اور ہماری تاریک راتوں میں مختلف زاویوں سے ہمارے لیے شمع برداری بھی کرتا ہے اور  
ہمارے مہینوں اور سالوں کی تقویم بھی بناتا ہے۔ — کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دنیا خیر و شر اور نیکی و  
بدی کے درمیان امتیاز کے بغیریوں ہی چلتی رہے گی یا یوں ہی ختم ہو جائے گی؟ اگر یہ مان لیا  
جائے تو یہ ساری قدرت و حکمت بے مقصد و بے غایت ہو جاتی ہے جو اس کائنات کے ہر گوشے  
میں جلوہ گر ہے۔ پھر تو یہ دنیا بالکل باطل اور ایک کھیل تماشا بن کے رہ جاتی ہے اور یہ ایک ایسی  
خلاف عقل، ایسی خلاف عدل اور ایسی خلاف فطرت بات ہے کہ کوئی سلیم العقل اور کوئی مستقیم الفطرت  
انسان ایک لمحے کے لیے بھی اس کو باور نہیں کر سکتا۔ کچھ اینٹیں ایک جگہ بکھری ہوئی پڑی ہوں تو  
اُن کو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ یونہی پڑی ہوئی ہیں، لیکن کیا یہی گمان تاج محل، لال قلعہ اور لاہور و دلی  
کی جامع مسجدوں کے متعلق بھی کر سکتے ہیں؟“ (تدبر قرآن ۲۵/۴)

۱۲ آیت میں سورج کے لیے ضیاء اور چاند کے لیے نُور کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔  
اس کی وجہ یہ ہے کہ نور خنک روشنی کو کہتے ہیں اور ضیا میں روشنی کے ساتھ تپش کا مفہوم بھی پایا جاتا  
ہے۔ چاند اور سورج کی روشنی میں یہ فرق ایک امر واقعی ہے۔ لفظ 'تاباں' سے یہی مفہوم ادا کرنے  
کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۳ چنانچہ جو عاقل بھی اس نظام عالم کو دیکھے گا، یہی پکارے گا کہ یہ اتھاہ معنویت اور یہ  
حیرت انگیز نظم و ترتیب بے مقصد نہیں ہے، بلکہ ضرور کسی عظیم غایت کے ساتھ وجود پذیر ہوا ہے۔





یونس  
۱۰

وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَّقُونَ ⑥  
إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنَّنُوا  
بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غِفْلُونَ ⑦ أُولَٰئِكَ مَا لَهُمْ النَّارُ  
بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ⑧ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ  
يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِآيَاتِهِمْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي

لیے جو جاننا چاہیں، اپنی نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے۔ یقیناً رات اور دن کے الٹ  
پھیر میں اور جو کچھ زمین اور آسمانوں میں اللہ نے پیدا کیا ہے، اُس میں اُن لوگوں کے  
لیے نشانیاں ہیں جو ڈرتے ہیں<sup>۱۲</sup>۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہماری ملاقات کی توقع نہیں  
رکھتے اور اسی دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں اور جو ہماری نشانیوں سے  
غافل ہیں، اُنھی کا ٹھکانا جہنم ہے، اُن کے کرتوتوں کی پاداش میں۔ اس کے برخلاف جو  
لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اُن کا پروردگار اُن کے ایمان کی

<sup>۱۲</sup> یعنی اس بات کی نشانیاں کہ یہ کائنات بے مقصد نہیں ہے، بلکہ ایک عظیم نتیجے تک پہنچنے  
والی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس نظام پر جو شخص بھی غور کرتا ہے، وہ لازماً اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ اضداد کے اندر  
ایک مشترک مقصد کے لیے یہ حیرت انگیز توافق اسی شکل میں وجود میں آ سکتا ہے، جب یہ مانا  
جائے کہ یہ سارا کارخانہ صرف ایک قادر و قیوم کے ارادے کے تحت کام کر رہا ہے اور پھر اس  
سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس نے ربوبیت و پرورش کا یہ سارا نظام کھڑا کیا ہے اور اُس کو اس اہتمام  
سے چلا رہا ہے، وہ انسان کو مطلق العنان اور غیر مسئول نہیں چھوڑے گا، بلکہ اس کے بعد ایک  
ایسا دن لازماً آنا ہے جس میں وہ اس ربوبیت کا حق پہچاننے والوں کو اُن کی حق شناسی کا انعام  
دے گا، اور اس سے بے پروا رہنے والوں کو جہنم میں جھونک دے گا۔“ (تذکرہ قرآن ۲۶/۴)



جَنَّتِ النَّعِيمَ ⑨ دَعَوُهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا  
 سَلَامٌ ۖ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ⑩  
 وَلَوْ يُعَجِّلُ اللَّهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ  
 إِلَيْهِمْ أَجْلُهُمْ ۖ فَذُرِّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَ نَافِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ⑪

بدولت اُنھیں (اُن کی) منزل تک پہنچا دے گا۔ اُن کے نیچے، راحت کے باغوں میں  
 (اُن کے لیے) نہریں بہ رہی ہوں گی۔ وہاں اُن کی صدا ہوگی کہ اے اللہ، تو پاک ہے<sup>۱۵</sup>  
 اور اُن کا تحیہ وہاں سلام ہوگا اور (جب دیکھیں گے کہ ہر طرف نعمت ہی نعمت ہے تو) اُن  
 کی آخری بات یہ ہوگی کہ شکر اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے عالم کا پروردگار ہے۔ ۳-۱۰  
 (یہ عذاب مانگتے ہیں<sup>۱۶</sup>)، اگر اللہ لوگوں کے لیے عذاب کے معاملے میں بھی اُسی  
 طرح جلدی کرتا، جس طرح وہ اُن کے ساتھ رحمت میں جلدی کرتا ہے تو اُن کی مدت  
 پوری کر دی گئی ہوتی۔ (لیکن یہ نہیں سمجھتے)، سو ہم اُن لوگوں کو جو ہماری ملاقات کی

۱۵ یعنی اس بات سے پاک ہے کہ کبھی کوئی عبث کام کرے۔

۱۶ یعنی جب آیات الہی کو جھٹلانے کے انجام سے ان لوگوں کو ڈرایا جاتا ہے تو فوراً مطالبہ  
 کرتے ہیں کہ تم سچے رسول ہو تو جس عذاب کی دھمکیاں سناتے ہو، اُس کی کوئی جھلک دکھا کیوں  
 نہیں دیتے؟ آگے اسی مطالبے کا جواب ہے۔

۱۷ اصل میں اُسْتِعْجَالُهُمْ بِالْخَيْرِ کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں اُسْتِعْجَالُ 'تعجیل'  
 کے معنی میں اور اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو مختصری نے بیان کر دی  
 ہے کہ تعجیلہ لهم الخیر کی جگہ یہ الفاظ سرعت اجابت پر دلالت کے لیے آگئے ہیں\*۔

\* الکشاف ۲/۳۱۶۔





یونس  
۱۰

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِيًا  
فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّكَانٌ لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرِّ مَسَّهُ ۚ كَذَٰلِكَ  
زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢﴾

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا ۖ وَجَاءَتْهُمْ  
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ  
الْمُجْرِمِينَ ﴿١٣﴾ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ

توقع نہیں رکھتے، اُن کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں<sup>۱۸</sup>۔ (حقیقت یہ ہے کہ انہیں کوئی عذاب دکھا بھی دیا جائے تو ایمان نہ لائیں گے۔ اس لیے کہ) انسان کا معاملہ یہ ہے کہ جب اُس پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو وہ لیٹے، بیٹھے یا کھڑے، (ہر حال میں) ہم کو پکارتا ہے۔ پھر جب اُس کی تکلیف ہم اُس سے ٹال دیتے ہیں تو اس طرح چل دیتا ہے گویا جو تکلیف اُسے پہنچی، اُس میں کبھی اُس نے ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ حد سے گزرنے والوں کے لیے اُن کے اعمال اِسی طرح خوش نما بنا دیے گئے ہیں۔ ۱۱-۱۲

تم سے پہلے کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا تھا، جب اُنھوں نے (اِسی طرح) ظلم کا ارتکاب کیا۔ اُن کے رسول اُن کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور اُنھوں نے ایمان لا کر نہیں دیا۔ ہم مجرم لوگوں کو اِسی طرح (اُن کے جرائم کا) بدلہ دیتے

۱۸۔ اِس لیے کہ عذاب سے پہلے انہیں زیادہ سے زیادہ مہلت مل جائے اور جب گرفت کی جائے تو یہ کوئی عذر نہ پیش کر سکیں۔

۱۹۔ یعنی پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود اُسے ماننے سے انکار کر دیا۔ قرآن کی اصطلاح میں یہی ظلم ہے جس کے نتیجے میں قوموں پر اللہ کا عذاب اتار رہا ہے۔ قرآن نے آگے



لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ۝۱۴

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۚ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا أَتَأْتِنَا بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۖ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَائِي نَفْسِي ۚ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۚ إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝۱۵ قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ

ہیں۔ اب اُن کے بعد ہم نے زمین میں اُن کی جگہ تمہیں دی ہے تاکہ دیکھیں، تم کیسے عمل کرتے ہو۔ ۱۳-۱۴

لیکن ان کا حال بھی وہی ہے، (اے پیغمبر) کہ جب ہماری کھلی ہوئی آیتیں انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو ہماری ملاقات کا کھٹکا نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں ترمیم کر دو۔ کہہ دو، (یہ خدا کا کلام ہے)، مجھے کیا حق ہے کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی ترمیم کروں؟ میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے۔ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ کہہ دو، اگر

اس کی وضاحت کر دی ہے۔

۲۰ یعنی قرآن کو آپ کی تصنیف سمجھتے اور مطالبہ کرتے ہیں کہ اُس میں ایسی ترمیم کر دی جائے جس کے بعد وہ اُن کے دینی تصورات کے مطابق ہو جائے۔ اس وقت جو قرآن پیش کیا جا رہا ہے، وہ انہیں گوارا نہیں ہے، اس لیے کہ وہ نہ اُن کے مشرکانہ عقائد کے ساتھ کسی مصالحت کے لیے تیار ہے اور نہ دین داری کے اُن رسوم کو کوئی اہمیت دیتا ہے جنہیں وہ اپنا سرمایہ فخر بنائے ہوئے ہیں۔



مَاتَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرِكُمْ بِهِ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا  
مِّن قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾ فَمَن أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ  
كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ ﴿١٧﴾

اللہ چاہتا تو نہ میں یہ قرآن تمہیں سناتا، نہ اللہ اس کی خبر تمہیں دیتا۔ یہ اُسی کا فیصلہ ہے، اس لیے کہ میں تو اس سے پہلے ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں۔ (میں نے کب اس طرح کی کوئی بات کبھی کی ہے)؟ پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ سو اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے یا اُس کی

۲۱ اوپر جو کچھ فرمایا ہے، یہ اُس کی ایسی زبردست دلیل ہے کہ کوئی سلیم الطبع انسان اس کو جھٹلانے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے کب دیکھا ہے کہ میں اُن مباحث میں دل چسپی لے رہا ہوں یا اُن کے بارے میں کچھ خیالات و افکار کا اظہار کر رہا ہوں یا اُن کی ترتیب و تدوین کے لیے مشق و مزاوت میں مصروف ہوں یا اُن سے متعلق کسی علم و فن کا اکتساب کر رہا ہوں جو اس وقت قرآن کی سورتوں میں پے درپے زیر بحث آرہے ہیں؟ پورے چالیس سال میں نے تمہارے درمیان گزارے ہیں۔ میری باتوں اور میری حرکات و سکنات میں تم نے کب ایسی کوئی چیز محسوس کی ہے جسے اُس دعوت کی تمہید کہا جاسکے جو میں اس وقت پیش کر رہا ہوں؟ جو کچھ میں آج کہہ رہا ہوں، اُس کے نشو و ارتقا کے کوئی نشانات تم نے کبھی میری زندگی میں پائے ہیں؟ تم جانتے ہو کہ انسانی دماغ اپنی عمر کے کسی مرحلے میں بھی ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس کے نشو و ارتقا کے نشانات اُس سے پہلے کے مرحلوں میں نہ پائے جاتے ہوں؟ تم کہتے ہو کہ میں خدا پر جھوٹ باندھ رہا ہوں۔ اس سے پہلے کسی جھوٹ، فریب، جعل یا مکاری و عیاری کا کوئی ادنیٰ شائبہ تم نے کبھی میری سیرت و کردار میں دیکھا ہے؟ آج تک تم مجھے صادق اور امین سمجھتے رہے ہو۔ اب کس طرح کہہ رہے ہو کہ وہی صادق اور امین راتوں رات بر خود غلط، لپاٹیا اور مفتری بن گیا





وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ ط قُلْ أَتَدْعُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ط سُبْحَنَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ ①

آیتوں کو جھٹلا دے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے مجرم کبھی فلاح نہیں پائیں گے۔ ۱۵-۱۷

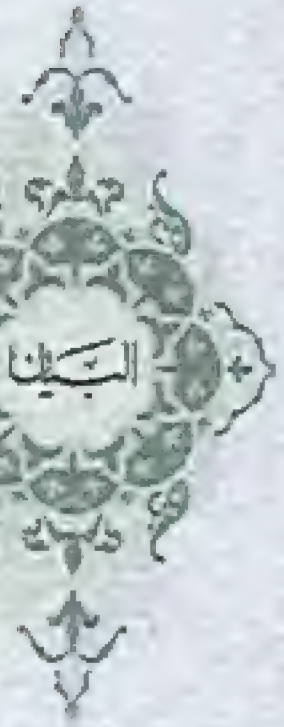
(یہ اس وقت بھی جھوٹ باندھ رہے ہیں۔ چنانچہ) اللہ کے سوا اُن کی پرستش کر رہے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکیں، نہ نفع اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ ان سے کہو، کیا تم اللہ کو اُس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ خود بھی نہیں جانتا، نہ آسمانوں میں کہیں اور نہ زمین میں! وہ پاک اور برتر ہے اُن چیزوں سے جنہیں

ہے؟ خدا کے بندو، تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے؟

۲۲ یعنی اگر یہ خدا کی آیات نہیں ہیں اور میں انہیں خود تصنیف کر کے آیات الہی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہوں تو مجھ سے بڑا کوئی ظالم نہیں ہے، اور اگر میں سچا ہوں اور تم خدا کی آیات کو جھٹلا رہے ہو تو پھر تم سے بڑا کوئی ظالم نہیں ہے۔

۲۳ یعنی دنیا میں تو ہو سکتا ہے کہ اُن کی یہ باتیں چل جائیں، لیکن خدا کے حضور میں کبھی فلاح نہیں پائیں گے۔

۲۴ یہ 'نفسی الشیء بنفی لازمہ' کا اسلوب ہے، جس طرح امرؤ القیس ایک صحرائی راستے کی تعریف میں کہتا ہے کہ 'لا یہتدای بمنارہ'۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے ان شریکوں کا کوئی وجود ہوتا تو سب سے زیادہ اُس کو پتا ہوتا جس کی خدائی میں انہیں شریک کر رہے ہو۔ پھر جب اُس کو پتا نہیں تو خود اندازہ کر سکتے ہو کہ خدا پر کتنا بڑا جھوٹ باندھ رہے ہو۔





وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ  
سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِي مَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ①٩  
وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَقُلْ إِنَّمَا الْغِيبُ

یہ شریک ٹھیراتے ہیں۔<sup>۲۵</sup> (اپنے اس شرک کے لیے یہ باپ دادوں کا حوالہ نہ دیں)۔  
حقیقت یہ ہے کہ لوگ ایک ہی امت تھے،<sup>۲۶</sup> انھوں نے بعد میں اختلاف کیا ہے اور اگر  
تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ کر لی گئی ہوتی تو ان کے درمیان  
اُس چیز کا فیصلہ کر دیا جاتا جس میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔ ۱۸-۱۹  
اور یہ جو کہتے ہیں کہ نبی پر اُس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی<sup>۲۸</sup> کیوں نہیں

<sup>۲۵</sup> اس لیے کہ نہ اُس کی صفات سے ان چیزوں کو کوئی مناسبت ہے اور نہ اُس کی صفات  
میں کوئی تضاد مانا جاسکتا ہے۔

<sup>۲۶</sup> یعنی خدا نے انسانیت کی ابتدا دین فطرت سے کی تھی۔ اُس وقت تمام انسان توحید کے  
ماننے والے تھے۔ انسانیت کی ابتدا شرک سے نہیں ہوئی۔ یہ نجاست تو انسان کے عقائد کو بہت  
بعد میں لاحق ہوئی ہے۔

<sup>۲۷</sup> یعنی یہ بات کہ اختلافات کا حتمی فیصلہ قیامت کے دن سنایا جائے گا۔ اُس سے پہلے  
انھیں گوارا کیا جائے گا تا کہ لوگوں کے عقل و فہم اور ضمیر و وجدان کو آزمائش میں ڈال کر انھیں  
جنت کے لیے منتخب کیا جائے۔

<sup>۲۸</sup> اصل میں لفظ 'آیۃ' آیا ہے۔ آگے کی آیات سے واضح ہے کہ اس سے یہاں عذاب کی  
نشانی مراد ہے جسے دیکھ کر واضح ہو جائے کہ پیغمبر جس فیصلہ کن عذاب کی وعید سن رہا ہے، وہ بھی آ  
کر رہے گا۔



لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝۲۰ وَاِذَا اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّاءٍ مَّسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِىْ اٰيَاتِنَا قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۚ اِنَّ رُّسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ۝۲۱

اتاری گئی تو ان سے کہو، (یہ غیب کے معاملات ہیں<sup>۲۹</sup> اور) غیب کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ سو انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں<sup>۳۰</sup>۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ (عذاب کی نشانی مانگتے ہیں، مگر) جب کسی تکلیف کے بعد جو انہیں پہنچی ہو، ہم ان لوگوں کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو ہماری نشانیوں کے معاملے میں یہ اُسی وقت حیلے بنانے لگتے ہیں<sup>۳۱</sup>۔ ان سے کہو، اللہ اپنے حیلوں میں کہیں تیز ہے۔ یاد رکھو، جو حیلہ بازیاں تم کر رہے ہو، ہمارے فرشتے انہیں لکھ رہے ہیں<sup>۳۲</sup>۔ ۲۱-۲۰

۲۹ یعنی یہ معاملات کہ اللہ عذاب کی کوئی نشانی دکھائے یا کسی قوم پر وہ عذاب نازل کرے جس کی وعید سنائی جا رہی ہے۔

۳۰ یہ قوم کو مبتلائے عذاب دیکھنے کی تمنا نہیں، بلکہ حسرت و اندوہ کے ساتھ ایک ایسی چیز کا انتظار ہے جو قوم کی ضد کے باعث خدا کا فیصلہ بن چکی ہے۔

۳۱ چنانچہ کبھی وعدے کرتے ہیں کہ اس مرتبہ ہلاکت سے بچ گئے تو خدا کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے اور کبھی اس طرح کے فلسفے بیان کرتے ہیں کہ یہ گردش زمانہ ہے۔ اس قسم کے نرم گرم حالات ہر قوم کو پیش آتے ہیں۔ انہیں خدا کی تنبیہ یا عقیدہ و عمل کے کسی فساد کا نتیجہ کیوں سمجھا جائے؟

۳۲ یہ نہایت سخت تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لکھ رہے ہیں تو عنقریب ان حیلہ باز یوں کا نوٹس بھی لیں گے۔





هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي  
الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهَمَّ بَرِّيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ  
عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُم أُحِيطَ بِهِمْ  
دَعَوْا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَذِهِ لَنَكُونَنَّ  
مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّا أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ

(اس کی مثال یہ ہے کہ) وہ اللہ ہی ہے جو تمہیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور کشتیاں لوگوں کو لے کر موافق ہوا سے چل رہی ہوتی ہیں اور لوگ اُس سے شاداں و فرحاں ہوتے ہیں کہ یکایک اُس پر تند ہوا آ جاتی ہے اور کشتی کے مسافروں پر ہر طرف سے موجیں اٹھنے لگتی ہیں اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اُس وقت وہ اپنی اطاعت کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اُس کو پکارنے لگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس سے نجات دے دی تو یقیناً ہم شکر گزار ہو کر رہیں گے۔ پھر جب وہ انھیں نجات دے دیتا ہے تو فوراً ہی بغیر کسی حق

۳۳ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ زمین میں سفر کے تمام ذرائع و وسائل خدا ہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور وہ تدبیر و حکمت بھی اُسی نے عطا فرمائی ہے جس سے کام لے کر انسان نئی نئی ایجادات کرتا اور اس طرح اپنے لیے سفر کی مزید سہولتیں پیدا کر لیتا ہے۔

۳۴ اصل میں فعل 'جَرَيْنَ' آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ 'فُلْک' مذکر مونث، واحد جمع، سب کے لیے آ جاتا ہے۔ یہاں سے اسلوب میں بھی تبدیلی ہوئی ہے اور وہ تمثیل کے تقاضے سے حاضر کے بجائے غائب کا ہو گیا ہے تاکہ عموم پر دلالت کرے۔ تمثیلات میں یہی اسلوب زیادہ موزوں اور موثر ہوتا ہے۔



يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَى أَنْفُسِكُمْ مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا زُتُمْ  
إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَذُنِبَكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٢٣﴾ إِنَّمَا مَثَلُ  
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ  
الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتَّى إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ  
زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَدِرُونَ عَلَيْهَا لَا أَتَاهَا أَمْرُنَا

۳۵ کے زمین میں سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ لوگو، تمہاری سرکشی کا وبال تمھی پر آنے والا  
ہے۔ دنیا کی زندگی کا نفع اٹھا لو، پھر تم کو پلٹ کر ہمارے ہی پاس آنا ہے، اُس وقت ہم  
تمہیں بتا دیں گے جو کچھ تم کر رہے تھے۔ دنیا کی یہ زندگی (جس نے تمہیں غفلت  
میں ڈال دیا ہے)، اس کی مثال اس طرح ہے جیسے بارش کہ ہم نے اُسے آسمان سے برسایا  
تو زمین کی نباتات اُس سے خوب گھنی نکلیں، وہ بھی جنہیں آدمی کھاتے ہیں اور وہ بھی  
جنہیں جانور کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب زمین اپنی رونق پر آگئی اور اُس نے بناؤ  
سنگھار کر لیا اور زمین والوں نے خیال کیا کہ اب وہ اُس پر پوری قدرت رکھتے ہیں ۳۹ تو

۳۵ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ مخلوق اپنے خالق کے سامنے سرکشی کرے تو وہ ہر حال میں بغیر کسی  
حق کے ہوگی۔

۳۶ یہاں سے خطاب پھر براہ راست قریش سے ہو گیا ہے۔

۳۷ یہ نہایت سخت وعید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری یہ سرکشی تم پر خدا کی حجت پوری کر دے  
گی اور بالآخر اُس کے فیصلہ کن عذاب کی زد میں آ جاؤ گے جو کسی کو باقی نہ چھوڑے گا۔

۳۸ اصل الفاظ ہیں: 'مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا'۔ ان میں لفظ 'مَتَاع' ایک فعل محذوف سے  
منصوب ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔







یونس  
۱۰

لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَبِ بِالْأَمْسِ ۚ كَذَلِكَ  
نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٣﴾

وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى دَارِ السَّلَامِ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ  
مُسْتَقِيمٍ ﴿٢٤﴾ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ ۖ وَلَا يَرْهَقُ  
وُجُوهُهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا  
خَالِدُونَ ﴿٢٥﴾ وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا

اچانک رات یا دن میں (کسی وقت) ہمارا حکم اُس پر آ گیا، پھر ہم نے اُسے ایسا کاٹ  
کر ڈھیر کر دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ ہم اُن لوگوں کے لیے جو غور کریں، اپنی  
نشانیوں اسی طرح کھول کر بیان کرتے ہیں۔ ۲۲-۲۳

(لوگو، تم اس زندگی کے فریب میں مبتلا ہو) اور اللہ تمہیں سلامتی کے گھر کی  
طرف بلاتا ہے اور اس کے لیے جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق)،  
سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔ (پھر) جن لوگوں نے بھلائی کی، اُن کے لیے بھلائی ہے  
اور اُس پر مزید بھی۔ اُن کے چہروں پر نہ سیاہی چھائے گی، نہ ذلت۔ وہی جنت

۳۹ یہ اُس حوصلے اور امنگ کی تعبیر ہے جس سے فصل کو اُس کے جو بن پر دیکھ کر اُس کے  
مالکوں کے دل لبریز ہو جاتے ہیں۔

۴۰ یعنی جنت کی طرف، جس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہاں نہ ماضی کے پچھتاوے ہوں گے  
نہ مستقبل کے اندیشے، وہ سراسر سلامتی ہوگی۔

۴۱ یعنی اس قانون کے مطابق کہ جو سیدھی راہ کے سچے طالب ہوں، وہ اس کے مستحق ہیں کہ  
اللہ انہیں سیدھی راہ دکھائے۔



وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ مَا لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَانِمًا أُغْشِيَتْ  
وُجُوهُهُمْ قِطْعًا مِّنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا ۖ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ  
النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٤﴾

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ  
أَنْتُمْ وَشُرَكَائُكُمْ ۖ فَزَيْلَنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاءُهُمْ مَا كُنْتُمْ

کے لوگ ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس کے برخلاف جنہوں نے برائیاں  
کمائیں ہیں تو (خدا کا قانون یہ ہے کہ) برائی کا بدلہ اُس کے برابر ہے۔ اُن پر ذلت  
چھائے گی۔ اُنہیں کوئی خدا سے بچانے والا نہ ہوگا۔ اُن کے چہرے ایسے  
ہوں گے جیسے اندھیری رات کے ٹکڑوں سے ڈھانک دیے گئے ہیں۔ وہی دوزخ  
کے لوگ ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۲۵-۲۷

یہ اُس دن کو یاد رکھیں، جب ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے، پھر جنہوں نے  
شرک کیا ہے، اُن سے کہیں گے کہ تم اپنی جگہ ٹھہرو اور تمہارے بنائے ہوئے شریک

۲۲ یعنی بھلائی کے لیے تو مزید بھی ہے، لیکن برائی کا بدلہ پورے انصاف کے ساتھ بالکل  
برابر ہے، اُس میں کمی بیشی نہ ہوگی۔

۲۳ سلسلہ کلام کے بیچ میں یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن ہستیوں سے مدد  
اور سفارش کی امیدیں باندھتے ہو، اُن میں سے کوئی بھی وہاں کام نہ آئے گا۔

۲۴ یعنی ان کو بھی اور ان کے معبودوں کو بھی۔ آیت میں 'جَمِيعًا' کی تاکید اسی مدعا کے  
لیے ہے۔

۲۵ اصل میں 'مَكَانَكُمْ' کا لفظ ہے۔ اس سے پہلے 'امْكثُوا' یا 'اقفُوا' یا ان کے ہم معنی کوئی





یونس  
۱۰

إِنَّا نَتَعَبُدُونَ ۝۲۸ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن كُنَّا  
عَن عِبَادَتِكُمْ لَغْفِلِينَ ۝۲۹ هُنَالِكَ تَبْلُغُوا كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ  
وَرُدُّوْا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝۳۰  
قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّن يَمْلِكُ السَّمْعَ  
وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ

بھی۔ پھر اُن کے درمیان جدائی ڈال دیں گے اور اُن کے شریک کہیں گے: تم ہماری  
عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ سو اللہ ہمارے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے کافی  
ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم تمہاری عبادت سے بالکل بے خبر تھے۔ اُس وقت ہر شخص  
اپنے اُس عمل سے دوچار ہو گا جو اُس نے پہلے کیا تھا اور لوگ اللہ، اپنے مالک حقیقی کی  
طرف لوٹا دیے جائیں گے اور (دوسروں کو معبود بنا کر) جو جھوٹ اُنھوں نے گھڑ رکھے  
تھے، سب اُن سے جاتے رہیں گے۔ ۲۸-۳۰

ان سے پوچھو، زمین و آسمان سے کون تمہیں روزی دیتا ہے؟ یا تمہارے کان اور

لفظ محذوف ہے۔ عربی زبان میں یہی اسلوب ہے۔ اس طرح کے موقعوں پر ہماری زبان میں  
طرف یا مفعول کو حذف کر دیتے ہیں۔

۲۶ مطلب یہ ہے کہ معبود اپنے عابدوں سے اظہار براءت کر دیں گے اور بالکل الگ ہو کر  
کھڑے ہو جائیں گے۔ آگے اس کی وضاحت کر دی ہے۔

۲۷ اصل الفاظ ہیں: 'إِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغْفِلِينَ'۔ 'إِنْ' میں 'إِنْ' درحقیقت 'إِنْ'  
ہے جس پر 'لَغْفِلِينَ' کالام دلالت کر رہا ہے۔

۲۸ اصل میں 'تَبْلُغُوا كُلُّ نَفْسٍ' کے الفاظ ہیں۔ 'بلا یلو' کے معنی جانچنے اور تجربہ کرنے



وَمَنْ يُدَبِّرْ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝  
 فَذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ ۚ فَإِنِّي  
 تُصْرَفُونَ ۝ كَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ

آنکھیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟  
 کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ اس کے جواب میں وہ ضرور کہیں گے کہ اللہؑ، تو کہو،  
 پھر اُس سے ڈرتے نہیں ہو؟ سو یہی اللہ تمہارا پروردگار حقیقی ہے۔ پھر حق کے بعد گم راہی  
 کے سوا اور کیا ہے؟ آخر تم کدھر پھرے جاتے ہو؟ اسی طرح تیرے پروردگار کی بات  
 کے ہیں۔ یعنی اپنے عمل کا تجربہ کرے گا اور اُس کے نتائج بھگتے گا۔

۴۹ اس سے واضح ہے کہ خدا کی جو صفات یہاں بیان ہوئی ہیں، اہل عرب اُن میں سے کسی کو  
 بھی اپنے معبودوں سے متعلق نہیں سمجھتے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...وہ جن دیویوں دیوتاؤں کو پوجتے تھے، اُن کے متعلق اُن کا عقیدہ یہ نہیں تھا کہ یہ آسمان و  
 زمین کے خالق ہیں یا ابرو ہوا اور سورج اور چاند کے موجد ہیں یا زندگی اور موت پر متصرف ہیں یا  
 نظام کائنات کا سررشتہ ان کے ہاتھ میں ہے، بلکہ صرف یہ مانتے تھے کہ یہ خدا کے محبوب اور  
 چہیتے ہیں۔ خدا ان کی سنتا ہے، جو کام خدا سے کرانا چاہیں، کر سکتے ہیں، ان کو اگر راضی رکھا  
 جائے تو یہ خدا سے سفارش کر کے دنیا کی نعمتیں بھی دلواتے ہیں اور اگر بالفرض مرنے کے بعد  
 اٹھنا ہی ہوا اور حساب کتاب کی نوبت آئی تو اُس وقت بھی یہ دست گیری کریں گے اور اپنی  
 بندگی کرنے والوں کو نہ صرف بخشوا لیں گے، بلکہ اونچے اونچے درجے دلوائیں گے۔“

(تذبرقرآن ۴/۴۷)

۵۰ یعنی جب یہ ساری باتیں مانتے ہو تو اُس خدا کے قہر و جلال سے ڈرتے نہیں کہ اُس پر افترا  
 کر کے دوسروں کو اُس کی خدائی میں شریک بنا دیتے ہو؟

۵۱ مطلب یہ ہے کہ جس کو خدا مانتے ہو، تمہارا رب حقیقی بھی وہی ہے۔ اُس کے سوا جنہیں





فَسَقُّوْا اِنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۳

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَّبْدُوْا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهُ  
قُلِ اللّٰهُ يَّبْدُوْا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهُ فَاَنۢى تُؤْفَكُوْنَ ۝۳۴ قُلْ هَلْ مِنْ

ان سرکشی کرنے والوں کے حق میں پوری ہو چکی ہے کہ یہ ایمان نہ لائیں گے۔ ۳۳-۳۴  
ان سے پوچھو، تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ہے جو پہلی بار پیدا  
کرتا ہو، پھر اُس کا اعادہ بھی کرے؟ کہہ دو، اللہ ہی ہے جو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر  
رب بنائے بیٹھے ہو، اُن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

۵۲ یعنی خدا سے متعلق جن باتوں کو مانتے ہو، اُن کا منطقی نتیجہ تو یہی نکلتا ہے کہ اپنا رب بھی تنہا  
اُسی کو تسلیم کرو۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہی حق ہے تو اس حق کے خلاف جو کچھ بھی مانتے ہو، اُسے  
صریح ضلالت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟

۵۳ اصل میں تُصَرِّفُوْنَ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی پھرائے جانے کے ہیں۔ اس میں یہ  
اشارہ ہے کہ عقل و منطق تو کسی اور طرف لے جا رہی ہے، لیکن تم نے اپنی باگ کس کے ہاتھ  
میں دے دی ہے جو تمہیں اس طرح ہرزہ گردی کر رہا ہے؟

۵۴ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے آپ کی طرف التفات ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ان کے  
تضادات فکر و عمل کو دیکھ کر آپ پریشان نہ ہوں۔ سنت الہی یہی ہے کہ ایمان و ہدایت کی راہ اُنھی  
لوگوں پر کھلتی ہے جو اُس کے سچے طالب ہوں اور اپنے اس مطلوب تک پہنچنے کے لیے عقل و دل کی  
صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اس کے برخلاف جو لوگ عقل و فطرت کو ٹھکرا کر اپنی باگ خواہشوں  
کے ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کے لیے ہدایت کی راہ کبھی نہیں کھولتا، بلکہ اُن کی  
اختیار کردہ ضلالت ہی کو اُن پر مسلط کر دیتا ہے۔ آیت میں کَلِمَتُ رَبِّكَ سے یہی سنت الہی  
مراد ہے اور کَذٰلِكَ کا اشارہ مشرکین کے اُس رویے کی طرف ہے جو پیچھے مذکور ہوا ہے۔



شُرَكَائِكُمْ مِّنْ يَّهْدِي إِلَى الْحَقِّ ۖ قُلِ اللَّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ ۚ أَفَمَنْ يَّهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمَّنْ لَا يَهْدِي إِلَّا أَنْ يُّهْدَىٰ ۚ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝ ٣٥ وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۚ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ۝ ٣٦

اُس کا اعادہ کرے گا۔ سو کہاں بھٹکے جاتے ہو؟ پوچھو، تمہارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو؟ کہہ دو، اللہ ہی ہے جو حق کی رہنمائی کرتا ہے۔ پھر بتاؤ، جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے، وہ اس کا مستحق ہے کہ اُس کی پیروی کی جائے یا وہ جو رہنمائی کے بغیر خود بھی راہ نہیں پاتے؟ آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان ذرا بھی حق کی جگہ نہیں لے سکتا۔ یقیناً اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ ۳۶-۳۵

۵۵ یعنی جب یہ مانتے ہو کہ خلق کا ابد اور اعادہ صرف خدا ہی کی شان ہے تو اُس کی جزا و سزا میں دوسروں کو کس طرح شریک ٹھیراتے ہو؟ یہ اس لیے پوچھا ہے کہ مشرکین یہ سمجھتے تھے کہ اگر قیامت ہوئی بھی تو اُن کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، اُن کے شرکا و شفعا انھیں خدا کی پکڑ سے بچالیں گے۔

۵۶ مطلب یہ ہے کہ جو دنیا اور آخرت، دونوں کے لحاظ سے بے کار ہیں، انھیں کس طرح معبود بنا کر پوجنے کے لیے تیار ہو جاتے ہو؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مخلوق کی ایک بہت بڑی ضرورت خالق سے یہ وابستہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے معاملات میں رہنمائی فرماتا ہے کہ کیا حق ہے اور کیا باطل، کیا تم کہہ سکتے ہو کہ تمہارے ان معبودوں سے تمہیں اس طرح کی کوئی رہنمائی حاصل ہوتی ہے؟ کیا عقل جو تمہارے اندر





یونس  
۱۰

وَمَا كَانَ هَذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ  
تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ

یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے کہ خدا سے پرے ہی پرے تصنیف کر لیا جائے، بلکہ اُن  
پیشین گوئیوں کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے موجود ہیں اور قانون الہی کی تفصیل ہے۔

رہنمائی کا چراغ ہے، یہ اُن کی بخشی ہوئی تمھیں ملی ہے؟ کیا یہ تمھاری ہدایت کے لیے کوئی وحی  
بھیجتے ہیں؟ کیا انھوں نے تمھاری تربیت و تزکیہ کے لیے کوئی کتاب اتاری، کوئی رسول بھیجا،  
کوئی شریعت نازل کی، کوئی قانون اتارا؟ اگر ان کاموں میں کوئی کام بھی انھوں نے نہیں  
کیا، نہ کرتے ہیں، نہ کریں گے تو آخر کس غرض کے لیے ان کے پیچھے لگے ہو؟ پیروی کا  
سزاوار وہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اُس کی توفیق بخشتا ہے یا وہ جو خود رہنمائی اور  
دست گیری کے محتاج ہیں؟ تمھاری عقل کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے اُلٹے فیصلے کرتے ہو؟“

(مذہب قرآن ۵۰/۴)

۵۷ یہ مخاطبین کے لیے دھمکی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ اللہ ان کے کرتوتوں  
سے بے خبر نہیں ہے، اس لیے وہ وقت عنقریب آجائے گا، جب وہ یہ سب کچھ ان کے سامنے رکھ  
دے گا اور ان میں سے کوئی اپنے جرائم کا انکار نہ کر سکے گا۔

۵۸ اس لیے کہ اس کا مافوق انداز کلام خود بتا رہا ہے کہ کوئی انسان اس شان کی کوئی چیز پیش  
نہیں کر سکتا۔

۵۹ اشارہ ہے آخری نبوت کے لیے تورات و انجیل کی اُن پیشین گوئیوں کی طرف جو اپنے  
محمل و مصداق کی منتظر تھیں۔ قرآن کے نزول سے وہ سب سچی ثابت ہوئیں اور نتیجے کے طور پر  
قرآن کے بارے میں بھی ثابت ہو گیا کہ وہ فی الواقع اُس خدا کا کلام ہے جس نے صدیوں پہلے  
سے بتا رکھا تھا کہ وہ اس شان کی ایک کتاب نازل کرے گا۔

۶۰ اصل میں لفظ 'الکتاب' آیا ہے۔ اس کے ایک معنی قانون و شریعت کے بھی ہیں۔ ہمارے



مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝۳۷ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ  
مِثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝۳۸  
بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۖ كَذَلِكَ كَذَّبَ  
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ۝۳۹

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ پروردگار عالم کی طرف سے ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر  
نے اسے گھڑ لیا ہے؟ ان سے کہو، اگر تم سچے ہو تو اس جیسی ایک سورت بنا لاؤ اور اللہ  
کے سوا جن کو (مدد کے لیے) بلا سکتے ہو، بلا لو۔ نہیں، یہ بات نہیں ہے، بلکہ یہ اُس چیز کو  
جھٹلا رہے ہیں جو ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کی حقیقت ابھی ان پر  
ظاہر نہیں ہوئی۔ ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی اسی طرح جھٹلایا تھا، پھر دیکھ لو کہ ان  
ظالموں کا انجام کیا ہوا۔ ۳۷-۳۹

نزدیک یہاں یہ اسی معنی میں ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ابراہیمی دین کے جن احکام سے تم واقف ہو، یہ  
اُسی کی تفصیل ہے اور یہ اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ قرآن اُسی خدا کی طرف سے نازل کیا گیا  
ہے جس کی طرف سے ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام اور دوسرے نبیوں کے صحیفے نازل کیے گئے تھے۔

۶۱ مطلب یہ ہے کہ تم اگر اسے خدا کی کتاب نہیں سمجھتے تو اپنی ہدایت، مضامین اور اپنے  
اسلوب بیان کے لحاظ سے جس شان کا یہ کلام ہے، اُس شان کی کوئی ایک سورہ ہی بنا کر پیش کر دو۔  
تمہارے گمان کے مطابق یہ کام اگر بغیر کسی علمی اور ادبی پس منظر کے تمہاری قوم کے ایک فرد محمد  
(صلی اللہ علیہ وسلم) کر سکتے ہیں تو تمہیں بھی اس میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے۔

۶۲ یعنی یہ بات نہیں ہے کہ قرآن کی صداقت کے دلائل ان پر واضح نہیں ہو سکے۔ اصل یہ  
ہے کہ قرآن اپنی تکذیب کے جو نتائج بیان کر رہا ہے، وہ ان کے علم کی گرفت میں نہیں آ رہے اور





وَمِنْهُمْ مَّنْ يُؤْمِنُ بِهِ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَا يُؤْمِنُ بِهِ ۖ وَرَبُّكَ  
 أَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٣٩﴾ وَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ  
 عَمَلُكُمْ أَنْتُمْ بَرِيءُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٤٠﴾  
 وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ ۖ أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا  
 لَا يَعْقِلُونَ ﴿٤١﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَنْظُرُ إِلَيْكَ ۖ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ

(تم مطمئن رہو، اے پیغمبر)۔ ان میں وہ بھی ہیں جو اس قرآن کو مانیں گے  
 اور وہ بھی جو نہیں مانیں گے۔ (یہ آ مادہ فساد ہیں)، اور تیرا پروردگار ان مفسدوں  
 سے خوب واقف ہے۔<sup>۶۳</sup> یہ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو کہہ دو کہ میرے لیے میرا عمل ہے  
 اور تمہارے لیے تمہارا عمل، تم پر میرے عمل کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور مجھ پر  
 تمہارے عمل کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔<sup>۶۴</sup> (تم اُن کے درپے کیوں ہوتے ہو جو  
 اندھے اور بہرے ہو چکے ہیں)؟ ان میں وہ بھی تو ہیں جو تمہیں کان لگا کر سنتے  
 ہیں۔ پھر کیا بہروں کو سناؤ گے، اگرچہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں؟ اور ان میں وہ بھی تو ہیں

اُن کی حقیقت ابھی ان پر ظاہر نہیں ہوئی، لہذا بے خوف ہیں اور بار بار مطالبہ کرتے ہیں کہ جس  
 عذاب کی خبر دی جا رہی ہے، اُس کا کوئی نمونہ دکھا دیا جائے تو یہ مان لیں گے۔ ان کے انکار کی وجہ  
 ان کی یہ بے خونی ہے۔ اسی نے انہیں غیر سنجیدہ بنا دیا ہے اور یہ اس طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔  
 ایسا نہیں ہے کہ علم و استدلال کی بنیاد پر مطمئن ہو گئے ہیں کہ قرآن خدا کی کتاب نہیں ہے۔

<sup>۶۳</sup> اس میں پیغمبر کے لیے تسلی کے ساتھ مکذبین قرآن کے لیے دھمکی بھی ہے کہ تیرا پروردگار  
 خوب واقف ہے تو ایک دن ان کی شرارتوں کا مزہ بھی انہیں چکھا دے گا۔

<sup>۶۴</sup> یہ پیغمبر کے لیے اظہار براءت کا حکم ہے جس کے بعد صرف عذاب ہی کا انتظار ہوتا



وَلَوْ كَانُوا لَا يَبْصُرُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا

وَلَكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَانٌ لَّمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ  
يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ۖ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ وَمَا  
كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝ وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ

جو پوری توجہ سے تمہیں دیکھتے ہیں۔ پھر کیا اندھوں کو راہ دکھاؤ گے، اگرچہ وہ کچھ نہ دیکھتے ہوں؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا، بلکہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ ۴۰-۴۴

(اس وقت یہ مست ہیں، لیکن) جس دن اللہ انہیں اکٹھا کرے گا، اُس دن محسوس کریں گے کہ گویا دن کی ایک گھڑی ہی کے لیے دنیا میں تھے۔ یہ ایک دوسرے کو پہچان رہے ہوں گے، (گویا ابھی مل کر آئے ہیں)۔ (اُس دن واضح ہو جائے گا کہ) فی الواقع سخت گھائے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلا دیا اور راہ راست پر نہیں آئے۔ ہم جس چیز کا وعدہ اُن سے کر رہے ہیں، اُس کا ہے۔

۶۵ یعنی یہ جو دیکھتے ہو کہ لوگوں میں سے زیادہ ایسے اندھے بہرے ہو جاتے ہیں کہ بالآخر عذاب کے مستحق ٹھہرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ نے ان پر کوئی ظلم کیا ہے۔ ہرگز نہیں، یہ ان کی خواہشیں اور ان کے تعصبات ہیں جنہوں نے انہیں اس طرح اندھا بہرا کر دیا ہے کہ حق کی ہر صدا اور اُس کا ہر داعی ان کے لیے اجنبی ہو گیا ہے۔ ان کے اس رویے کا نتیجہ یہی نکلتا تھا اور یہی نکلا ہے کہ اب یہ عذاب کی زد میں ہیں۔





یونس  
۱۰

فَالْيَنَّا مَرَجَعُهُمْ ثُمَّ اللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٣٧﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣٨﴾

کوئی حصہ ہم تمہیں دکھائیں، (اے پیغمبر)، یا تم کو وفات دیں اور اس کے بعد ان سے نمٹیں، بہر کیف ان کو لوٹنا ہماری ہی طرف ہے، پھر اللہ اُس پر گواہ ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ (اُس کا قانون یہی ہے کہ) ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب اُن کا رسول آجاتا ہے تو اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔ (اس کے جواب میں) یہ کہتے ہیں کہ تم لوگ

۶۶ یہ اُسی قانون کا بیان ہے جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کر چکے ہیں کہ نبوت و رسالت کو ذریت ابراہیم کے لیے خاص کر دینے سے پہلے دنیا کی تمام قوموں پر خود انہی کے رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت کیا گیا۔ قرآن میں اس کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسول اپنے مخاطبین کے لیے خدا کی عدالت بن کر آئے اور اُن کا فیصلہ کر کے دنیا سے رخصت ہوئے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ رسولوں کی دعوت میں یہ فیصلہ انداز، انداز عام، اتمام حجت اور ہجرت و براءت کے مراحل سے گزر کر صادر ہوتا اور اس طرح صادر ہوتا ہے کہ آسمان کی عدالت زمین پر قائم ہوتی، خدا کی دینونت کا ظہور ہوتا اور رسول کے مخاطبین کے لیے قیامت صغریٰ برپا ہو جاتی ہے۔ اس دعوت کی جو تاریخ قرآن میں بیان ہوئی ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر بالعموم دو ہی صورتیں پیش آتی ہیں: ایک یہ کہ پیغمبر کے ساتھی بھی تعداد میں کم ہوتے ہیں اور اُسے کوئی دارالہجرت بھی میسر نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ وہ معتد بہ تعداد میں اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلتا ہے اور اُس کے نکلنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کسی سرزمین میں اُس کے لیے آزادی اور تمکین کے ساتھ رہنے بسنے کا سامان کر دیتا ہے۔

پہلی صورت میں رسول کے قوم کو چھوڑ دینے کے بعد، عام اس سے کہ وہ اُس کی وفات کی صورت میں ہو یا ہجرت کی صورت میں، یہ فیصلہ اس طرح صادر ہوتا ہے کہ آسمان کی فوجیں نازل



قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ  
إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٩﴾ قُلْ  
أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتًا أَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعِجِلُ مِنْهُ

سچے ہو تو (ہمارے لیے) یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ ان سے کہو، (میں اس معاملے میں کیا کہہ سکتا ہوں)؟ میں تو اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے۔ (اُس کے ہاں) ہر قوم کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ جب اُن کا وقت آ جاتا ہے تو پھر نہ ایک گھڑی پیچھے ہوتے ہیں، نہ آگے۔ ان سے کہو، یہ بتاؤ کہ اگر اُس کا عذاب تم پر رات یا دن میں کسی وقت آ پڑے تو کیا کر لو گے؟

ہوتیں، ساف و حاصب کا طوفان اٹھتا اور ابرو باد کے لشکر قوم پر اس طرح حملہ آور ہو جاتے ہیں کہ رسول کے مخالفین میں سے کوئی بھی زمین پر باقی نہیں رہتا۔ تاہم یہ معاملہ اُنھی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جن کے لیے قرآن اپنی اصطلاح میں 'مُشْرِكِينَ' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو اصلاً توحید ہی سے وابستہ ہوتے ہیں، اُن کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوتا۔ اُن کے بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ اُن کے استیصال کے بجائے اُن پر ذلت اور محکومی کا عذاب مسلط کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ معلوم ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا اور قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح، قوم لوط، قوم شعیب اور اس طرح کی بعض دوسری قومیں اس کے برخلاف زمین سے مٹا دی گئیں\*۔

دوسری صورت کے لیے بھی یہی قانون ہے، لیکن اُس میں عذاب کا یہ فیصلہ رسول اور اُس کے ساتھیوں کی تلواروں کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں قوم کو کچھ مزید مہلت مل جاتی ہے۔ رسول اس عرصے میں دارالہجرت کے مخاطبین پر اتمام حجت بھی کرتا ہے۔ اپنے اوپر ایمان لانے والوں کی تربیت اور تطہیر و تزکیہ کے بعد انھیں اس معرکہ حق و باطل کے لیے منظم بھی

\* یہ وہی ضابطہ ہے جو قیامت میں اختیار کیا جائے گا۔ چنانچہ سورہ نساء (۴: ۴۸) میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہاں بھی شرک کو معاف نہیں کرے گا۔ اس کے نیچے، البتہ جس کے لیے جو گناہ چاہے گا، معاف فرما دے گا۔





یونس  
۱۰

الْمُجْرِمُونَ ۝ اَنْتُمْ اِذَا مَا وَقَعَ اَمْنٌ مِّنْكُمْ بِهِ ط الْاَنْ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ  
تَسْتَعْجِلُونَ ۝ اَنْتُمْ قِلَّةٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمْتُمْ اَوْ قَوَّاعِدَ اَبِ الْخُلْدِ  
هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ۝ ۵۲  
وَيَسْتَبِئُوْنَكَ اَحَقُّ هُوَ اَمْ قُلُومِ اِي وَرَبِّيْ اِنَّهٗ لَحَقُّ ۝ وَمَا اَنْتُمْ  
بِمُعْجِزِيْنَ ۝ ۵۳ وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِى الْاَرْضِ لَا فَعَّاتٌ

آخر کیا چیز ہے جس کے بھروسے پر یہ مجرم جلدی مچائے ہوئے ہیں؟ پھر کیا جب آ  
پڑے گا، اُسی وقت اُس کو مانو گے؟ اب مانے ہو، تم اسی کے لیے جلدی مچائے  
ہوئے تھے۔ اُس وقت ان ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کے عذاب کا  
مزرہ چکھو، یہ اُسی کا بدلہ مل رہا ہے جو کچھ تم کماتے تھے۔ ۴۵-۵۲

وہ تم سے پوچھتے ہیں: کیا یہ واقعی سچ ہے؟ کہہ دو، ہاں، میرے پروردگار کی  
قسم، یہ شدنی ہے اور تم خدا کو عاجز نہیں کر سکتے۔ اُس وقت ہر شخص کے پاس جس  
کرتا ہے اور دارالہجرت میں اپنا اقتدار بھی اس قدر مستحکم کر لیتا ہے کہ اُس کی مدد سے وہ منکرین کے  
استیصال اور اہل حق کی سرفرازی کا یہ معرکہ سر کر سکے۔

۶۷۔ یہاں اسلوب تبدیل کر کے اُن کے لیے 'مجرم' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:  
”... یہاں مجرموں کے لفظ میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ جو لوگ جرم  
سے بری ہیں، اگر وہ اس طرح کا سوال کرتے تو اس کے لیے تو ایک جواز ہو سکتا تھا، لیکن جو  
لوگ مجرم ہیں اور جن کے جرم ہی کی پاداش میں یہ برق خاطف گرنے والی ہے، اُن کی یہ  
ڈھٹائی اُن کی بدبختی اور شامت کے سوا اور کس چیز کی دلیل ہے!“ (تدبر قرآن ۶۱/۴)

۶۸۔ اس سوال میں انکار و استہزاء کا وہ پہلو نمایاں ہو گیا ہے جو اوپر 'مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ' کے  
سوال میں ذرا مخفی تھا۔



بِهِ<sup>ط</sup> وَأَسْرُوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوْا الْعَذَابَ<sup>ج</sup> وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ  
وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝۵۴ إِلَّا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ<sup>ط</sup> إِلَّا  
إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝۵۵ هُوَ يُحْيِي  
وَيُمِيتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝۵۶

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشَفَاءٌ  
لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝۵۴ قُلْ بِفَضْلِ

نے ظلم کا ارتکاب کیا ہے، اگر وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے تو (اپنے آپ کو  
بچانے کے لیے) وہ اُس کو فدیے میں دینا چاہے گا۔ (اُس وقت) یہ دل ہی دل  
میں پچھتائیں گے، جب عذاب کو (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیں گے اور ان کے  
درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ سنو، زمین  
اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، سب اللہ کا ہے۔ سن رکھو، اللہ کا وعدہ شدنی ہے، مگر  
(افسوس کہ) ان میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں۔ (حقیقت یہ ہے کہ) وہی زندگی  
بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۵۳-۵۶

لوگو، تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس نصیحت آگئی ہے اور جو سینوں  
میں (دھڑکتے) ہیں، اُن کی شفا اور اُن کے لیے ہدایت و رحمت جو ماننے والے

۶۹ یہ اُن کی رعونت پر ضرب لگائی ہے کہ اس وقت تو مذاق اڑا رہے ہو، لیکن جب حقیقت  
سامنے آجائے گی تو خدا کے مقابلے میں بے بسی کے سوا تمہارے پاس کچھ بھی نہ ہوگا۔  
۷۰ بے مطلب یہ کہ تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی وہاں تمہارا استقبال کرنے  
کے لیے نہیں ہوگا، بلکہ تنہا خدا ہوگا جس کے حضور میں پیش کر دیے جاؤ گے۔





اللّٰهُ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا ۖ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿٥٨﴾  
 قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّن رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ  
 حَرَامًا وَحَلَالًا ۖ قُلْ أَللّٰهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُونَ ﴿٥٩﴾ وَمَا  
 ظَنُّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ

ہوں۔ انھیں بتاؤ، (اے پیغمبر)، یہ اللہ کے فضل اور اُس کی رحمت سے آئی ہے۔  
 سو چاہیے کہ اس پر وہ خوشی منائیں۔ یہ اُس سے بہتر ہے جو کچھ وہ جمع کر رہے  
 ہیں۔ ۵۷-۵۸

ان سے پوچھو، ذرا بتاؤ تو سہی کہ اللہ نے تمہارے لیے جو رزق اتارا تھا، پھر تم  
 نے اُس میں سے کچھ کو حرام اور کچھ کو حلال ٹھیرا لیا۔ پوچھو، اس کا حکم تمہیں اللہ  
 نے دیا ہے یا تم اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہو؟ اُن لوگوں کا قیامت کے دن کیا گمان

۱۔ یہ اُن بیماریوں کی طرف اشارہ ہے جو دلوں کو لگ جاتی ہیں اور انسان کو تمام انسانی  
 اوصاف سے محروم کر کے حیوانات کے درجے تک گرا دیتی ہیں۔

۲۔ یعنی دنیا میں ہدایت اور آخرت میں خدا کی رحمت و عنایت جو اُس کے ماننے والوں کو  
 لازماً حاصل ہو جائے گی۔

۳۔ اس جملے میں فعل محذوف ہے، یعنی قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهِ جَاءَ۔ ہم نے ترجمے  
 میں اُسے کھول دیا ہے۔

۴۔ اس سلسلہ کلام کی ابتدا آیت ۳۷ میں منکرین کے اس خیال کی تردید سے ہوئی تھی کہ  
 قرآن کو یہ پیغمبر خود گھڑ کر لے آئے ہیں۔ اُن سب چیزوں پر استدلال کے بعد جو اس معاملے  
 میں الجھن کا باعث بن رہی تھیں، یہ اب بطور التفات قرآن کی قدر و قیمت واضح کر دی ہے۔



لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٦٠﴾  
وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ  
مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ وَمَا يَعْزُبُ  
عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ

ہے جو اللہ پر جھوٹ لگاتے ہیں؟ (یہ اللہ کی عنایت ہے کہ اُس نے انہیں مہلت دے رکھی ہے، ورنہ اس جسارت پر ان کا قصہ ابھی پاک ہو جاتا)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، مگر اُن میں سے اکثر شکر ادا نہیں کرتے۔ ۵۹-۶۰

(تم ان کی پروا نہ کرو اور اپنا کام کیے جاؤ، اے پیغمبر)۔ تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور (ہم نے جو کچھ نازل کیا ہے)، اُس میں سے قرآن کا جو حصہ بھی پڑھ کر سناتے ہو اور تم لوگ جو کام بھی کرتے ہو، ہم تمہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں،

۵۷۔ یہ افتراء علی اللہ کے جرم کی انتہائی شاعت کا اظہار ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:  
”...سوال کر کے جواب دیے بغیر بات ختم کر دی ہے جو متکلم کے انتہائی غضب کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا یہ شامت زدہ لوگ اس جرم عظیم کو کوئی معمولی بات سمجھے بیٹھے ہیں؟ قیامت آئے گی تو انہیں پتا چلے گا کہ اس جسارت کی ان کو کیا سزا ملتی ہے۔“

(تذبر قرآن ۶۴/۴)

۶۷۔ اصل الفاظ ہیں: ”مَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ“۔ ان میں ضمیر مجرور کا مرجع وہی کتاب ہے جس کا ذکر آیت ۵۷-۵۸ میں گزر چکا ہے اور قرآن سے مراد اُس کا کوئی جزو یا حصہ ہے۔  
۷۷۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ آپ کے جاں نثار ساتھیوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے تسلی و بشارت کے اس پیغام میں شامل کر لیا ہے۔







ذٰلِكَ وَلَا اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝۶۱ اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۶۲ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝۶۳ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۶۴ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ

جس وقت تم اُس میں مشغول ہوتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرے پروردگار سے ذرّہ برابر بھی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے، نہ زمین میں، نہ آسمان میں اور نہ ذرّے سے چھوٹی، نہ بڑی، مگر وہ ایک واضح کتاب میں درج ہے۔ (لوگو) سنو، (خدا کا پیغمبر اور اُس کے ساتھی، سب اللہ کے دوست ہیں اور) اللہ کے دوستوں کے لیے، جو ایمان لائے اور خدا سے ڈرتے رہے، (قیامت کے دن) نہ کوئی خوف ہوگا، نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔ اُن کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ (یہ خدا کی بات ہے اور) خدا کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ تمہیں رنجیدہ نہ کرے،

۸ بچھے کی بات پر اس قید سے کیا پیش نظر ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس قید سے ایک تو اُس غیر معمولی انہماک پر بھی روشنی پڑی جو اقامت دین کی اس جدوجہد میں صحابہ کو تھا۔ دوسرے اس سے تسلی کے مضمون کی بلاغت بھی دوچند ہو گئی ہے، اس لیے اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تم اپنے تن، من، دھن ہر چیز سے بے پروا ہو کر خدا کے کلمہ کی سر بلندی کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہوتے ہو تو اُس وقت ہم تمہارے پیچھے تمہاری حفاظت و نگرانی میں مصروف ہوتے ہیں۔“ (تذبر قرآن ۶۵/۴)

۹ اس لیے کہ رسولوں کے باب میں خدا کی سنت یہی ہے کہ انہیں اور اُن کے ساتھیوں کو دنیا میں بھی لازماً غلبہ حاصل ہوتا ہے۔



جَمِيعًا ۖ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦٥﴾

أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ  
يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءُ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ

(اے پیغمبر)۔ تمام عزت اللہ ہی کے لیے ہے، (تم اُس پر بھروسہ رکھو اور اپنا کام  
کیے جاؤ)، وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ ۶۱-۶۵

سن رکھو کہ جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، سب اللہ ہی کے ہیں اور  
جو اللہ کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں، وہ شریکوں کی پیروی نہیں کرتے۔<sup>۸۲</sup> حقیقت

۸۰ باتوں سے یہاں خدا کے وعدے مراد ہیں جنہیں دوسرے مقامات میں سنن الہیہ سے بھی  
تعبیر کیا گیا ہے۔

۸۱ اشارہ ہے منکرین کی اُن باتوں کی طرف جو وہ طنز و استہزا کے طور پر کہتے تھے کہ یہ اگر خدا  
کے پیغمبر ہیں تو ان پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا جاتا یا ان کے منصب کی منادی کے لیے ان کے  
ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... ان آیات کے نزول کے دور میں مسلمانوں کا جو حال تھا، اُس کے لحاظ سے تمکن اور غلبہ  
کی وہ بشارت جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی، کفار کے لیے طنز و استہزا کا موضوع بن سکتی تھی۔  
وہ کہہ سکتے تھے اور اُنھوں نے کہا بھی ہوگا کہ ذرا اس نئے دین کے سرپھروں کا حوصلہ دیکھو کہ کسی  
کو دو وقت کی قرینے کی روٹی اور تن ڈھانکنے کو سلیقے کا لباس نصیب نہیں، لیکن حکومت و سلطنت  
کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اسی کو پیش نظر رکھ کر فرمایا کہ تمہیں مخالفین کی اس طرح کی باتیں غم  
میں نہ ڈالیں۔ تمہارے لیے جو بشارت ہے، وہ حتمی اور قطعی ہے۔ عزت کا مالک اللہ ہے۔ یہ  
چیز جس کو بھی ملتی ہے، اللہ ہی کے دیے ملتی ہے۔ اب اللہ نے اگر یہ عزت تمہیں اور تمہارے  
ساتھیوں کو دینے کا فیصلہ فرمالیا ہے تو اُس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے؟“ (تدبر قرآن ۶۶/۴)







یونس  
۱۰

الْأَيْخَرُصُونَ ﴿٦٦﴾ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ  
وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿٦٧﴾ قَالُوا  
اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَنَهُ ۖ هُوَ الْغَنِيُّ ۖ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا

یہ ہے کہ وہ محض گمان کی پیروی کرتے اور نرے اٹکل دوڑاتے ہیں۔ (سنو)، وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے رات کو تاریک بنایا تاکہ اُس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنا دیا تاکہ معاش کی جدوجہد کرو۔<sup>۸۳</sup> اِس میں یقیناً اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو سنتے ہیں۔<sup>۸۲</sup> انھوں نے کہا ہے کہ خدا نے اولاد بنا رکھی ہے۔ وہ اِس سے پاک ہے

۸۲ اِس لیے کہ خدا کا تو کوئی شریک ہے ہی نہیں کہ اُس کی پیروی کی جائے۔

۸۳ اِس جملے میں عربیت کے اسلوب پر مقابل کے الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں۔ انھیں کھول دیجیے تو پوری بات اِس طرح ہے: 'جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ (مُظْلِمًا) لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا (لِتَعْمَلُوا فِيهِ)۔'

۸۴ یہ کیا نشانیاں ہیں؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”سب سے پہلے تو اُس توافق پر نگاہ کیجیے جو رات اور دن کے اندر باوجود یکہ وہ دونوں ضدین کی نسبت رکھتے ہیں، پایا جاتا ہے کہ دونوں مل کر انسان کی خدمت کر رہے ہیں۔ رات اُس کے لیے راحت کا بستر بچھاتی ہے اور دن اُس کے لیے سرگرمیوں کا میدان کھولتا ہے۔ یہی حال اِس کائنات کے تمام اضداد کا ہے کہ وہ پوری وفاداری اور سازگاری کے ساتھ اپنے سے بالاتر مقصد کی خدمت میں سرگرم ہیں اور اُس سے ذرا انحراف اختیار نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ اِس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ ایک بالاتر اور حکیم ارادہ اِس کائنات کے پورے نظام پر حاوی اور قاہر ہو اور وہ اِس کے اجزائے مختلفہ میں ربط و تعلق پیدا کر کے اِس کو اپنی حکمت کے تحت چلا رہا ہو۔ یہ اُس توحید کی دلیل ہوئی جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہے۔



فِي الْأَرْضِ إِنْ عِنْدَكُمْ مِنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ  
مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾ قُلْ إِنْ الَّذِينَ يَفْتُرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ  
لَا يُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نَذِقُهُمُ  
الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٧٠﴾

(کہ کسی کو اولاد بنائے)۔ وہ ایسی ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، سب اُسی کا ہے۔ تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیا تم خدا پر ایسی بات لگاتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے؟ کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ جو اللہ پر جھوٹ لگاتے ہیں، وہ ہرگز فلاح نہیں پائیں گے۔ اُن کے لیے یہی تھوڑا سا فائدہ ہے جو دنیا میں اُٹھالیں گے۔ پھر اُن کو ہماری ہی طرف پلٹنا ہے۔ پھر اُن کے اس کفر کی پاداش میں ہم اُن کو سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ ۶۶-۷۰

دوسری چیز جو ظاہر ہو رہی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ کارخانہ کائنات نہ کوئی اتفاقی حادثے کے طور پر ظہور میں آ جانے والی شے ہے اور نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا ہے، بلکہ اس کے ہر گوشے میں عظیم قدرت، حیرت انگیز حکمت اور نہایت گہری غایت و مصلحت پائی جاتی ہے۔ یہ چیز مقتضی ہے کہ یہ دنیا نہ یوں ہی چلتی رہے، نہ یوں ہی تمام ہو جائے، بلکہ ضروری ہے کہ یہ کسی عظیم غایت پر منتہی ہو اور یہ غایت بغیر اس کے پوری نہیں ہو سکتی کہ اس کے بعد آخرت کو تسلیم کیا جائے۔

تیسری چیز وہ ربوبیت کا نظام ہے جو اس کے ہر گوشے میں جلوہ گر ہے۔ ربوبیت مسئولیت کو مقتضی ہے۔ جس نے ہمارے لیے زندگی اور پرورش کا یہ سارا نظام قائم کیا ہے، اُس کا ہم پر فطری طور پر حق قائم ہوتا ہے اور لازم ہے کہ ایک دن اُس حق کی بابت ہم سے پرسش ہو۔ جنہوں نے اس حق کو پہچانا ہو، وہ اُس کا انعام پائیں اور جنہوں نے اس کی نافرمانی کی ہو، وہ اُس کی سزا بھگتیں۔ اس اعتبار سے یہ جزا و سزا کی دلیل ہوئی۔“ (تدبر قرآن ۶۸/۴)





یونس  
۱۰

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِي وَتَذِكْرِيٰ بَايَاتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاجْعَلُوْا اَمْرَكُمْ وُشْرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْا اِلَيَّ وَلَا تَنْظُرُوْنَ ۝۴۱ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَالَتْكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيْ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۴۲ فَكَذَّبُوْهُ فَجَعَلْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهُ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلِيْفَ وَاعْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِآيَاتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝۴۳

انھیں نوح کی سرگذشت سناؤ، (اے پیغمبر)، جب اُس نے اپنی قوم سے کہا: میری قوم کے لوگو، اگر میرا دعوت کے لیے کھڑا رہنا اور اللہ کی آیتیں سنا کر یاد دہانی کرنا تم پر گراں ہو گیا ہے تو سن لو کہ میں نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا۔ سو تم سب مل کر اپنی بات ٹھیرالو اور اپنے شریکوں کو بھی ساتھ ملاؤ، پھر تمھارے اس فیصلے میں تمھیں کوئی تردد نہ رہے، پھر میرے ساتھ جو کرنا چاہتے ہو، کر گزرو اور مجھے مہلت نہ دو۔ اس کے بعد بھی اعراض کرو گے تو میرا کیا نقصان ہے کہ میں نے تم سے کوئی صلہ نہیں مانگا ہے۔ میرا صلہ تو اللہ کے ذمے ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (خدا کا) فرماں بردار بن کر رہوں۔ اس پر بھی اُنھوں نے اُسے جھٹلادیا تو ہم نے اُس کو نجات دی اور اُن کو بھی جو اُس کے ساتھ کشتی میں تھے اور اُنھیں جانشین بنایا اور اُن سب لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا۔ سو دیکھ لو کہ اُن کا انجام کیا ہوا جنھیں (اس عذاب سے پہلے) متنبہ کر دیا گیا تھا۔ ۷۱-۷۳

۷۵ دوسری جگہ تصریح ہے کہ نوح علیہ السلام یہ ذمہ داری سیکڑوں برس تک ادا کرتے رہے۔ اُنھوں نے یہ غالباً اسی بنا پر فرمایا ہے۔



ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ فَجَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ  
فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَلِكَ نَطْبَعُ  
عَلَىٰ قُلُوبِ الْمُعْتَدِينَ ۝٤٣

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَىٰ وَهَارُونَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ  
بِآيَاتِنَا فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ۝٤٤ فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ  
مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا إِنَّ هَذَا السِّحْرُ مُبِينٌ ۝٤٥ قَالَ مُوسَىٰ أَتَقُولُونَ

پھر نوح کے بعد ہم نے کتنے رسولوں کو اُن کی قوموں کی طرف بھیجا۔ سو وہ کھلی کھلی  
نشانیوں لے کر اُن کے پاس آئے، مگر جس چیز کو پہلے جھٹلا چکے تھے، اُسے پھر انھوں  
نے مان کر نہیں دیا۔ ہم حد سے گزر جانے والوں کے دلوں پر اسی طرح مہر لگا دیا  
کرتے ہیں۔ ۴۳

اُن کے بعد پھر ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اُس کے  
سرداروں کی طرف بھیجا تو وہ بھی اکڑ بیٹھے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ مجرم لوگ تھے۔  
چنانچہ جب ہماری طرف سے حق اُن کے سامنے آیا تو انھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کھلا

۴۶ اصل الفاظ ہیں: ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ۔ اِن میں 'إِلَيَّ' کا صلہ اقدام پر دلیل ہے۔ یعنی جو  
فیصلہ کرنا ہے، کر لو اور میرے خلاف جو اقدام کرنا چاہتے ہو، کرو۔

۴۷ یہ اُسی سنت الہی کی طرف اشارہ ہے جس کی رو سے کوئی شخص حق کے مقابلے میں سرکشی  
اختیار کرتا اور جانتے بوجھتے اُسے ماننے سے انکار کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے مہلت دی  
جاتی ہے۔ پھر اس مہلت سے وہ اگر فائدہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو اس جرم کی پاداش میں اُس  
کے دل و دماغ پر مہر کر دی جاتی ہے تاکہ وہ قبول حق کی سعادت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے۔





یونس  
۱۰

لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَكُمْ<sup>ط</sup> اَسْحَرْ هَذَا<sup>ط</sup> وَلَا يُفْلِحُ السَّحَرُونَ<sup>④</sup>  
قَالُوا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اَبَاءَنَا وَتَكُونَ لَكُمَا  
الْكِبْرِيَاءُ فِي الْاَرْضِ<sup>ط</sup> وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِينَ<sup>⑤</sup> وَقَالَ فِرْعَوْنُ

جادو ہے۔ موسیٰ نے کہا: کیا تم حق کے بارے میں یہ کہتے ہو، جب کہ وہ تمہارے پاس آ گیا ہے؟ کیا یہ جادو ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ قطعی حق ہے اور حق کے مقابلے میں جادو گر کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔<sup>۹۲</sup> انھوں نے جواب دیا: کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہمیں اُس طریقے سے پھیر دو جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور اس ملک میں تم دونوں کی بڑائی قائم ہو جائے۔<sup>۹۳</sup> ہم تمہاری بات ماننے والے نہیں

۸۸ یعنی عقل و فطرت کے تقاضوں سے انحراف کے باعث پہلے ہی مجرم ہو چکے تھے۔

۸۹ اشارہ ہے اُن معجزات کی طرف جن کے ساتھ موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے اپنا یہ دعویٰ اُن کے سامنے پیش کیا کہ وہ دونوں خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے اُن کے پاس آئے ہیں۔

۹۰ اصل الفاظ ہیں: 'اَتَقُولُونَ لِلْحَقِّ؟' اِن میں 'لِلْحَقِّ' کا 'ل' 'فی' کے معنی میں ہے اور 'تَقُولُونَ' کا مفعول بلاغت کے تقاضے سے حذف ہو گیا ہے۔

۹۱ اس جملے کی بلاغت بھی قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...حق جب تک نگاہوں سے اوجھل ہو، اُس وقت تک تو اُس کی نسبت کوئی شخص اگر کوئی نظریاتی بحث اٹھائے تو اُس کو کسی حد تک معذور قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن جب حق سامنے موجود ہو تو اُس کے باب میں کٹ جتنی کرنا ویسا ہی ہے، جس طرح کوئی نصف النہار کے سورج کے بارے میں تردد کا اظہار کرے۔“ (تدبر قرآن ۷۷/۴)

۹۲ مطلب یہ ہے کہ معجزے کو جادو کہنے کی جسارت کر رہے ہو تو اسے جادو گروں کے سامنے پیش کر کے دیکھ لو، تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ کیا ہے اور جادو کیا ہوتا ہے؟ تم دیکھو گے کہ جادو گر



اَتْتُونِي بِكُلِّ سِحْرِ عَلِيمٍ ۙ ﴿٩٩﴾ فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُم مُّوسَى  
الْقَوْمَ مَا أَنْتُمْ مُّلقُونَ ۙ ﴿١٠٠﴾ فَلَمَّا الْفُؤَا قَالَ مُّوسَى مَا جِئْتُمْ بِهِ  
السَّحَرُ إِنَّ اللَّهَ سَيُطِئُهُ ۙ إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ ۙ ﴿١٠١﴾

ہیں۔ فرعون نے حکم دیا کہ تمام ماہر جادو گروں کو میرے پاس حاضر کرو۔ چنانچہ جب جادو گر آ گئے تو موسیٰ نے اُن سے کہا: تمہیں جو ڈالنا ہے، ڈالو۔ ۹۹ پھر جب اُنھوں نے ڈالا تو موسیٰ نے کہا: یہ جو کچھ تم لائے ہو، یہ جادو ہے۔ یقین رکھو، اللہ ابھی اسے باطل کیے دیتا ہے، اس لیے کہ اللہ (اس طرح کے موقعوں پر) فساد کرنے والوں کے کام کو اس کے مقابلے میں بالکل خائب و خاسر ہو کر رہ جائیں گے۔

۹۳ مصر کے ارباب اقتدار اسرائیلیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے پہلے ہی خوف زدہ تھے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون پر اپنی حکومت قائم کرنے اور لوگوں کو اُن کے آبائی دین سے برگشتہ کرنے کا یہ الزام اسی پس منظر میں لگایا گیا ہے تاکہ قبطنی عصبیت پوری قوت کے ساتھ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ دعوت حق کے جواب میں اس طرح کے اشغلی ہر دور کے ارباب اقتدار چھوڑتے رہے ہیں۔

۹۴ موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد بتا رہا ہے کہ اُنھیں اپنے رب کے وعدوں پر کس درجہ اعتماد تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اُن کو اللہ تعالیٰ کے وعدہ نصرت پر پورا بھروسہ تھا کہ خواہ جادو گر جتنا بڑا جادو بھی دکھائیں، اُن کے پاس اس کا توڑ موجود ہے۔ اس وجہ سے اُنھوں نے کسی پیش بندی سے بے نیاز ہو کر اُنھی کو پہل کرنے کا موقع دیا اور یہ گویا میدان مقابلہ میں اُن کی پہلی جیت تھی۔ اس لیے کہ اس کے بعد حریف کو جو شکست ہوئی، وہ خود اُس کے اپنے منتخب کیے ہوئے میدان میں ہوئی۔“ (تدبر قرآن ۷۸/۴)

۹۵ یہ فرعونیوں کی بات کا جواب ہے کہ جو کچھ میں نے پیش کیا تھا، وہ جادو نہیں ہے، بلکہ جادو



وَيُحِقُّ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ﴿٨٢﴾ فَمَا  
 أَمَّنَ لِمُوسَى إِلَّا ذُرِّيَّتَهُ مِّنْ قَوْمِهِ عَلَى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِمْ  
 أَن يَفْتِنَهُمْ وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الْمُسْرِفِينَ ﴿٨٣﴾

سدھرنے نہیں دیتا اور اللہ اپنے کلمات سے حق کو حق کر دکھاتا ہے، اگرچہ مجرموں کو کتنا  
 ہی ناگوار ہو۔<sup>۹۶</sup> پر موسیٰ کو اُس کی قوم کے چند نو جوانوں کے سوا کسی نے نہیں مانا،<sup>۹۷</sup> فرعون  
 کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے بڑوں کے ڈر سے کہ کہیں فرعون انھیں کسی فتنے میں نہ ڈال  
 دے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرعون اُس ملک میں بڑا جبار تھا اور اُن لوگوں میں سے تھا جو حد  
 در حقیقت یہ ہے جو تمھارے جادوگر پیش کر رہے ہیں۔

۹۶ یعنی اُن موقعوں پر فساد کرنے والوں کے عمل کو باطل کر دیتا اور حق کو حق کر دکھاتا ہے،  
 جب اُس کے پیغمبر اتمام حجت کے لیے کسی قوم کی طرف مبعوث کیے جاتے ہیں۔ یہ اُسی سنت الہی  
 کا حوالہ ہے جس کی وضاحت ہم آیت ۴۷ کے تحت کر چکے ہیں۔

۹۷ اصل میں 'فَمَا أَمَّنَ لِمُوسَى' کے الفاظ آئے ہیں۔ اللہ و رسول پر ایمان کو بالعموم 'أَمَّنَ'  
 بہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے بجائے 'أَمَّنَ لَهُ' کے الفاظ یہاں اس لیے اختیار کیے گئے ہیں کہ  
 ان نو جوانوں نے حضرت موسیٰ کے دعوے کی صداقت تو بے شک تسلیم کر لی تھی، مگر تسلیم و تفویض اور  
 اطاعت و انقیاد کے اُس مقام تک ابھی نہیں پہنچے تھے جس پر 'أَمَّنَ بِهِ' کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔  
 آگے کی آیات میں اسی بنا پر انھیں ایمان کے ان تقاضوں کو پورا کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے کہ 'أَمَّنَ لَهُ' کی یہ سعادت بھی بنی اسرائیل کے نو جوانوں ہی کو حاصل ہوئی۔  
 دعوت حق کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ معاملہ صرف موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نہیں ہوا۔ اس دعوت پر  
 لبیک کہنے کی سعادت پہلے مرحلے میں بالعموم نو جوانوں ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟  
 استاذ امام لکھتے ہیں:



وَقَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِ إِنَّ كُنْتُمْ آمِنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوا وَإِنْ كُنْتُمْ مَّسْلُمِينَ ﴿٨٣﴾ فَقَالُوا عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٨٥﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٨٦﴾

سے گزر جاتے ہیں۔ موسیٰ نے کہا: میری قوم کے لوگو، تم خدا پر ایمان لائے ہو تو اُسی پر بھروسہ کرو، اگر تم واقعی اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر چکے ہو۔<sup>۹۸</sup> اس پر اُنھوں نے جواب دیا: ہم نے خدا ہی پر بھروسہ کیا ہے۔ اے ہمارے رب، ہمیں ان ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا اور اپنی رحمت سے ہمیں اس منکر قوم سے نجات عطا فرما دے۔ ۸۶-۸۵

”... اس کی واضح نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ حضرات انبیاء جس ہمہ گیر دعوت اسلام کو لے کر اٹھتے ہیں، اُس کو ابتدائی مراحل میں آگے بڑھ کر قبول کرنا بڑی بلند حوصلگی، بلکہ بڑے جان جو کھم کا کام ہوتا ہے۔ اس کی ہمت وہ لوگ آسانی سے نہیں کر سکتے جو روایات و رسوم سے مرعوب اور حالات و مصالح کی رعایت کے خوگر ہوں۔ ایسے لوگوں کا حجاب آہستہ آہستہ ہی ٹوٹتا ہے۔ نوجوانوں میں اس طرح کی مرعوبیت و مغلوبیت کم ہوتی ہے، اس وجہ سے اُن کو جب دعوت حق اپیل کر لیتی ہے تو وہ اُس کے لیے دنیوی عواقب سے بے پروا ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، نہ وہ اپنے بڑوں اور بزرگوں کی سرزنش کی کچھ زیادہ پروا کرتے نہ وقت کے ارباب اقتدار کی برہمی کو خاطر میں لاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کے معاملے میں حالات کا یہ خاص پہلو بھی قابل لحاظ ہے کہ ملک میں جو ارسٹوکریسی برسر اقتدار تھی، وہ نسلاً بھی حضرت موسیٰ کی قوم سے بالکل الگ تھی اور اُس دور میں جو شخص تخت حکومت پر تھا، وہ بھی، جیسا کہ آیت کے الفاظ سے واضح ہے، طبعاً نہایت جبار اور سرکش تھا۔ ایسے حالات میں، ظاہر ہے کہ وہی لوگ اُن کا ساتھ دینے کے لیے آگے بڑھ سکتے تھے جو اپنی حمیت حق کے جوش و جذبہ کو دبا سکنے پر قادر نہ ہوں۔“ (مذہر قرآن ۷۹/۴)

۹۸ اسلام کی حقیقت یہی حوالگی ہے۔ سچا ایمان اسی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے جس کا لازمی

تقاضا خدا پر توکل ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ایمان کا یہی تقاضا لوگوں کو بھایا ہے۔





یونس  
۱۰

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَنْ تَبَوِّا الْقَوْمَ كَمَا بِمِصْرَ بُيُوتًا  
وَأَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ ۖ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٩٩﴾  
وَقَالَ مُوسَىٰ رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَئَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا  
فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوهُ عَنِ سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ

(خدا سے یہی تعلق جوڑنے کے لیے) ہم نے موسیٰ اور اُس کے بھائی (ہارون) کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر ٹھیرا لو اور جو گھر تم لوگ اپنے لیے ٹھیراؤ، انھیں قبلہ بنا لو اور (اُن میں) نماز کا اہتمام رکھو اور (اے موسیٰ)، ایمان والوں کو خوش خبری دو (کہ کامیابی بالآخر انھی کو حاصل ہوگی)۔ موسیٰ نے دعا کی: اے ہمارے رب، تو نے فرعون کو اور اُس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں شان و شوکت اور

۹۹ فتنہ کے معنی یہاں ہدف اور نشانہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کو اتنی ڈھیل نہ دے کہ وہ ہم کو بالکل ہی ظلم و ستم کی آماج گاہ بنالیں۔

۱۰۰ یعنی مصر کے مختلف حصوں میں کچھ گھر مسجد کی حیثیت سے مخصوص کر لیے جائیں جن میں بنی اسرائیل نماز کے اوقات میں جمع ہوں اور مل کر خدا کی عبادت کریں۔ انبیاء علیہم السلام کے دین میں اصلاح و تربیت کا یہی نظام ہمیشہ سے قائم رہا ہے۔ حضرت موسیٰ نے بھی اپنی قوم کی مذہبی تنظیم کا آغاز کیا تو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اسی کی ہدایت فرمائی۔

۱۰۱ اس سے مراد وہ گھر ہیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون نے اپنے اور اپنے متعلقین اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی نماز کے لیے مخصوص کیے ہوں گے۔ فرمایا کہ عارضی طور پر انھی گھروں کو قبلہ کی حیثیت دے دی جائے تاکہ نماز کی اقامت میں وہ وحدت پیدا ہو جائے جو اُس کے لیے ہمیشہ مطلوب رہی ہے۔ مصر سے ہجرت کے بعد بنی اسرائیل کے لیے یہی حیثیت تابوت کو حاصل ہوئی، یہاں تک کہ بیت المقدس تعمیر ہوا اور انھوں نے اُس کو اپنا قبلہ بنالیا۔



أَمْوَالِهِمْ وَأَشَدُّ دَعْوَى قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوْا الْعَذَابَ  
الْأَلِيمَ ۝ ۸۸ قَالَ قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيمَا وَلَا تَتَّبِعَنَّ  
سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝ ۸۹

مال و اسباب سے نوازا ہے۔ اے ہمارے رب، تاکہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ لوگوں کو  
تیری راہ سے بھٹکا دیں۔ اے ہمارے رب، اُن کے مال اب تو غارت کر دے اور اُن  
کے دلوں کو اس طرح بند کر دے کہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ  
لیں۔ فرمایا: تمھاری اور تمھارے بھائی کی دعا قبول ہوئی۔ اب تم دونوں ثابت قدم رہو  
اور اُن لوگوں کے راستے پر نہ چلو جو علم نہیں رکھتے۔ ۸۷-۸۹

۱۰۲۔ یہ بشارت جس طرح ظاہر ہوئی، اُس کا ذکر آگے آیت ۹۳ میں ہوا ہے۔

۱۰۳۔ اصل الفاظ ہیں: رَبَّنَا، لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيلِكَ۔ اِن میں 'ل' انجام اور نتیجے کو ظاہر  
کرتا ہے۔ یعنی مال و اسباب عطا ہوئے تو اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کی اس عنایت پر شکر گزار ہونے  
کے بجائے سرکشی پر اتر آئے۔

۱۰۴۔ یہ ہجرت سے پہلے کی دعا ہے جو فرعون اور اُس کے اکابر پر اتمام حجت کے بعد کی گئی۔  
اس طرح کی دعا اللہ کے رسول اُسی وقت کرتے ہیں، جب وہ اپنے مخاطبین کے ایمان سے آخری  
درجے میں مایوس ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ محض دعا نہیں ہوتی، بلکہ خود خدا کے فیصلے کا اعلان ہوتا  
ہے۔

۱۰۵۔ مطلب یہ ہے کہ تم اور تمھارے ساتھی اب ان سرکشوں کی چھوت سے اپنے آپ کو محفوظ  
رکھیں اور ان کے ساتھ جو معاملہ ہونے والا ہے، اُس پر اپنے دل میں نرمی کے جذبات نہ پیدا  
ہونے دیں کہ مبادا کوئی سفارش کا کلمہ تمھاری زبان سے نکل جائے۔





یونس  
۱۰

وَجَوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَءِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا  
وَعَدُوًّا حَتَّى إِذَا أَذْرَكَهُ الْفَرَقُ ۖ قَالَ أَمُنْتُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا الَّذِي  
أَمَنْتُ بِهِ بَنُو إِسْرَءِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ ٩٠ ۚ أَلَمْ يَكُنْ  
عَصِيَّتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝ ٩١ ۚ فَالْيَوْمَ نُجَيِّدُكَ بِبَدَنِكَ  
لِتَكُونَ لِمَنْ خَلَفَكَ آيَةً ۖ وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَغَفُلُونَ ۝ ٩٢

بنی اسرائیل کو، (اس کے بعد)، ہم نے سمندر پار کرایا تو فرعون اور اُس کے لشکروں  
نے سرکشی اور شرارت کی راہ سے اُن کا پیچھا کیا۔ یہاں تک کہ جب فرعون ڈوبنے لگا  
تو بول اٹھا: میں نے مان لیا کہ اُس کے سوا کوئی الہ نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے  
ہوئے ہیں اور میں بھی سراطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں — کیا اب؟ اس  
سے پہلے تو تم نافرمانی کرتے رہے اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھے۔ سو آج  
ہم تیرے بدن کو بچالیں گے تاکہ اپنے بعد آنے والوں کے لیے تو (خدا کے عذاب  
کی) نشانی بن کر رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل

بظاہر یہ تنبیہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو کی گئی ہے، لیکن روئے سخن، اگر غور کیجیے  
تو انھی سرکشوں کی طرف ہے جو اب عذاب کے مستحق ہو گئے ہیں۔

۱۰۶ فرعون کا یہ فعل یوں تو ہر پہلو سے سرکشی اور شرارت تھا، لیکن یہاں یہ الفاظ خاص طور پر اُس  
سرکشی اور شرارت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو اُس نے بنی اسرائیل کو جانے کی اجازت دینے کے  
بعد پھر اُن کا پیچھا کر کے کی۔

۱۰۷ یہ الفاظ ضروری نہیں ہے کہ کہے گئے ہوں۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ یہ صورت حال کی

تصویر ہو۔



وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّآ صِدْقٍ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ  
فَمَا اخْتَلَفُوا حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْعِلْمُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ  
يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٩٣﴾

ہی رہتے ہیں۔ ہم نے بنی اسرائیل کو عزت کا ٹھکانا دیا اور انھیں نہایت عمدہ رزق عطا فرمایا۔ پھر انھوں نے جو کچھ بھی اختلافات کیے، اُس وقت کیے جب اُن کے پاس (خدا کا بھیجا ہوا) علم آ چکا تھا۔ یقین رکھو کہ تمہارا پروردگار قیامت کے دن اُن کے درمیان

۱۰۸ خدا کی یہ بات حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ فرعون کی لاش کو غرقابی کے بعد سمندر نے قبول نہیں کیا، بلکہ عذاب الہی کی ایک عبرت ناک نشانی کے طور پر باہر پھینک دیا۔ یہ لاش بعد میں لوگوں کو ملی بھی اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ خدا کے مقابلے میں سرکشی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ جزیرہ نماے سینا کے مغربی ساحل پر جبل فرعون اور حمام فرعون اسی واقعے کی یادگاریں ہیں۔ ابوزنیمہ سے چند کلومیٹر اوپر شمال کی جانب علاقے کے باشندے آج بھی اُس جگہ کی نشان دہی کرتے ہیں، جہاں یہ لاش پڑی ہوئی ملی تھی۔ دور حاضر میں اہل مصر کی جو مومی کی ہوئی لاشیں دریافت ہوئی ہیں، اُن میں سے بھی ایک لاش کے بارے میں، جسے فرعون منفیہ کی لاش قرار دیا جاتا ہے، عام خیال یہ ہے کہ یہ اُسی فرعون کی لاش ہے۔ یہ لاش قاہرہ کے عجائب خانے میں محفوظ ہے اور زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس لاش کے بارے میں اثریات کے ماہرین، چاہے اختلاف کریں کہ یہ اُسی فرعون کی لاش ہے یا کسی اور کی، لیکن اُن کے اٹکل پچواندازوں کے مقابل میں قرآن کا یہ چودہ سو سال پہلے کا بیان زیادہ قابل اعتماد ہے۔ اس طرح قدرت نے اُس کی لاش کو عبرت کی ایک ایسی نشانی بنا دیا جو آج کے فرعونوں کے لیے بھی محفوظ ہے، لیکن دیکھنے کے لیے آنکھوں کی ضرورت ہے اور اس دنیا میں عبرت پذیر آنکھوں سے زیادہ کم یاب کوئی شے بھی نہیں۔“ (تذکر قرآن ۸۴/۴)





یونس  
۱۰

فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِّمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَأُونَ  
الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ  
مِنَ الْمُمْتَرِينَ ۙ ۙ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونُوا  
مِنَ الْخَاسِرِينَ ۙ ۙ إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَةُ رَبِّكَ

اُن چیزوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ ۹۰-۹۳ سو، (اے پیغمبر)، تمہیں اگر اُس چیز کے بارے میں کوئی شک ہو جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تو (اہل کتاب کے) اُن (صالحین) سے پوچھ لو جو تم سے پہلے خدا کی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس حق ہی آیا ہے، لہذا ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ بنو اور نہ اُن لوگوں میں شامل ہو جنہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا ہے کہ تم بھی نامرادوں

۱۰۹ یعنی حق کے پوری طرح واضح ہو جانے کے بعد اختلاف کیا جس کی وجہ، ظاہر ہے کہ فرقہ بندی کے داعیات اور تعصبات ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کی تمام ذمہ داری اب اُنھی پر ہے۔ ۱۱۰ یہ بڑی سخت وعید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت تو ہر دھاندلی اور کتمان حق کی ہر کوشش کے لیے توجیہات تلاش کر سکتے ہو، مگر جب فیصلے کا دن آئے گا تو تمام حقائق بے نقاب ہو جائیں گے اور تمہارا سب کچا چھٹا تمہارے سامنے ہوگا۔ اُس وقت کہنے کے لیے کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ ۱۱۱ یہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر بات درحقیقت اُنھی لوگوں کو سنانی مقصود ہے جو آپ کی دعوت میں شک کر رہے تھے۔ مدعا یہ ہے کہ جو کچھ نازل کیا گیا ہے، وہ ایسا واضح حق ہے کہ کسی سلیم الطبع شخص کو اُس کے بارے میں کوئی تردد لاحق نہیں ہونا چاہیے۔

۱۱۲ اصل میں فعل 'يَقْرَأُونَ' استعمال ہوا ہے۔ یہ اپنے حقیقی مفہوم میں ہے، یعنی جو کتاب کو



لَا يُؤْمِنُونَ ۙ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوْا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ۙ  
فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ أَمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا  
كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخُرِّيِّ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَنَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ۙ

میں سے ہو جاؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرے پروردگار کی بات جن لوگوں پر پوری ہو چکی ہے، اُن کے سامنے، خواہ ساری نشانیاں آجائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے، جب تک کہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ سو ایسا کیوں نہ ہوا کہ قوم یونس کے سوا کوئی اور بستی بھی ایمان لاتی، پھر اُس کا ایمان اُسے نفع دیتا؟ جب اُس بستی کے لوگ ایمان لے آئے تو ہم نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب اُن سے ٹال دیا تھا اور ایک مدت کے لیے اُن کو رہنے بسنے کا موقع دیا تھا۔ ۹۴-۹۸

پڑھنے کا حق ادا کر رہے ہیں۔ اہل کتاب میں اسی طرح کے لوگ تھے جن سے تائید و تصدیق کی توقع کی جاسکتی تھی۔

۱۱۳ یعنی یہ بات کہ جو لوگ حق کے سچے طالب نہیں ہوتے اور اپنے دلوں پر ضد اور ہٹ دھرمی کے قفل چڑھا لیتے ہیں، انہیں کبھی ایمان کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں یہ سنت الہی اس سے پہلے کئی جگہ بیان ہو چکی ہے۔

۱۱۴ یہ قریش کے لیے ترغیب و ترہیب ہے کہ اب بھی موقع ہے، تم چاہو تو قوم یونس کی طرح تم بھی خدا کے پیغمبر پر ایمان لا کر اپنے آپ کو اُس عذاب سے بچا سکتے ہو جو اتمام حجت کے بعد اب تمہارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے، اگر غور کیجیے تو اس میں تسلی کا یہ مضمون بھی پیدا ہو گیا ہے کہ تمہاری قوم کے لوگ اگر نہیں مان رہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم سے پہلے جتنے رسول آئے ہیں، اُن کی قوم کے لوگ بھی عذاب الہی کو آنکھوں سے دیکھ لینے کے





یونس  
۱۰

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلَّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ  
النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٩٩﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُوْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ

اگر تمھارا پروردگار چاہتا تو زمین پر جتنے لوگ ہیں، سب کے سب ایمان لے آتے۔  
پھر کیا لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ مومن ہو جائیں؟ (اچھی طرح سمجھ لو کہ) اللہ کی  
بعد ہی مان لینے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ یونس علیہ السلام کی قوم کے سوا اس معاملے میں کوئی استثنا  
نہیں ہے۔ یہی ایک قوم تھی جس کے لوگ عذاب کی گھڑی ظاہر ہونے سے پہلے پہلے متنبہ ہو گئے  
تھے۔ چنانچہ اللہ نے انھیں ایمان کی توفیق بخشی اور وہ عذاب سے محفوظ رہے۔

یونس علیہ السلام وہی پیغمبر ہیں جن کا نام بائبل میں یوناہ آیا ہے۔ ان کا زمانہ ۸۶۰ اور ۷۸۴  
قبل مسیح کے درمیان بتایا جاتا ہے۔ یہ اشور (اسیریا) والوں کی ہدایت کے لیے عراق میں مبعوث ہوئے  
تھے۔ نینوی کا مشہور شہر انھی اشور والوں کا دار السلطنت تھا اور اُس زمانے میں تقریباً ۶۰ کلومیٹر کے  
دور میں پھیلا ہوا تھا۔ ان کی قوم کے ایمان کا واقعہ بائبل کے صحیفہ یوناہ میں اس طرح بیان ہوا ہے:

”...تب یوناہ خداوند کے کلام کے مطابق اُٹھ کر نینوی کو گیا اور نینوی بہت بڑا شہر تھا۔ اُس کی  
مسافت تین دن کی راہ تھی۔ اور یوناہ شہر میں داخل ہوا اور ایک دن کی راہ چلا۔ اُس نے منادی کی  
اور کہا: چالیس روز کے بعد نینوی برباد کیا جائے گا۔ تب نینوی کے باشندوں نے خدا پر ایمان لا کر  
روزہ کی منادی کی اور ادنیٰ و اعلیٰ، سب نے ٹاٹ اوڑھا۔ اور یہ خبر نینوی کے بادشاہ کو پہنچی اور وہ  
اپنے تخت پر سے اٹھا اور بادشاہی لباس کو اتار ڈالا اور ٹاٹ اوڑھ کر رکھ پر بیٹھ گیا۔ اور بادشاہ اور  
اُس کے ارکان دولت کے فرمان سے نینوی میں یہ اعلان کیا گیا اور اس بات کی منادی ہوئی کہ  
کوئی انسان یا حیوان، گلہ یا رملہ کچھ نہ چکھے اور نہ کھائے پیے۔ لیکن انسان اور حیوان ٹاٹ سے  
ملبس ہوں اور خدا کے حضور گریہ و زاری کریں، بلکہ ہر شخص اپنی بری روش اور اپنے ہاتھ کے ظلم  
سے باز آئے۔ شاید خدا رحم کرے اور اپنا ارادہ بدلے اور اپنے قہر شدید سے باز آئے اور ہم ہلاک  
نہ ہوں۔ جب خدا نے اُن کی یہ حالت دیکھی کہ وہ اپنی اپنی بری روش سے باز آئے تو وہ اُس



اللَّهُ وَيَجْعَلُ الرَّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ⑩

قُلْ أَنْظِرُوا مَا ذَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا تُغْنِي الْآيَاتُ وَالنُّذُرُ  
عَنْ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ ⑪ فَهَلْ يَنْتَظِرُونَ إِلَّا مِثْلَ أَيَّامِ الَّذِينَ خَلَوْا  
مِنْ قَبْلِهِمْ قُلْ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ⑫ ثُمَّ نُنَجِّي

اجازت کے بغیر کسی شخص کے لیے ممکن نہیں کہ وہ (پیغمبر پر) ایمان لائے۔ (یہ  
اجازت انھی کو ملتی ہے جو عقل سے کام لیں) اور جو عقل سے کام نہیں لیتے، اُن پر  
وہ گم راہی کی نجاست ڈال دیتا ہے۔ ۹۹-۱۰۰

(یہ نشانی مانگتے ہیں)۔ ان سے کہو، زمین اور آسمانوں میں کیا کچھ ہے، اُسے  
دیکھو۔ حقیقت یہ ہے کہ نشانیاں اور تنبیہات اُن لوگوں کو کچھ فائدہ نہیں پہنچاتیں جو  
ایمان لانا نہیں چاہتے۔ سو کیا یہ اُسی طرح کے کسی دن کا انتظار کر رہے ہیں، جس طرح

عذاب سے جو اُس نے اُن پر نازل کرنے کو کہا تھا، باز آیا اور اُسے نازل نہ کیا۔“ (۳: ۱۰-۱۱)

۱۱۵ مطلب یہ ہے کہ جب خدا نے اس معاملے میں جبر کو پسند نہیں کیا تو تمہیں بھی پریشان نہیں  
ہونا چاہیے۔ خدا اگر یہی چاہتا کہ زمین میں سب مومن و فرماں بردار ہی ہوں تو شجر و حجر کی طرح  
انسانوں کو بھی اس طرح پیدا کر دیتا کہ وہ ہمیشہ اُس کے حکم کے پابند رہتے۔ مگر اُس نے ایسا نہیں چاہا۔  
انسانوں کے معاملے میں اُس کی اسکیم یہ ہے کہ وہ آزادی اور اختیار کے ساتھ ایمان یا کفر میں سے کسی  
ایک کا انتخاب کریں۔ جنت کی ابدی نعمتیں اسی ایمان کا صلہ ہیں۔ تمہارا فرض وہی ہے جو تم نے پورا کر  
دیا ہے۔ خدا نے تم پر یہ ذمہ داری عائد نہیں کی ہے کہ لوگوں کو زبردستی راہ راست پر لے آؤ۔

۱۱۶ اصل میں فعل ”يُؤْمِنُونَ“ آیا ہے۔ آیت کے اسلوب سے واضح ہے کہ یہ یہاں ارادہ فعل

کے معنی میں ہے۔





یونس  
۱۰

رُسَلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا كَذَلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنَاجِ الْمُؤْمِنِينَ ۝۱۰۳  
قُلْ يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي شَكٍّ مِّن دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ  
تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَلَكِن أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَفَّكُمُ ۖ وَأُمِرْتُ  
أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝۱۰۴ وَأَنْ أَقِمَّ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۖ وَلَا  
تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝۱۰۵ وَلَا تَدْعُ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ  
وَلَا يَضُرُّكَ ۖ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذَا مِّنَ الظَّالِمِينَ ۝۱۰۶ وَإِنْ يَمْسَسْكَ

کے دن ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو پیش آئے تھے؟ کہو، پھر انتظار کرو، میں  
بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ (انہیں بتا دو کہ) پھر (جب وہ دن آ جاتا ہے تو)  
ہم اپنے رسولوں کو بچا لیتے ہیں اور ان کو بھی جو ان پر ایمان لائے ہوں۔ اسی طرح  
ہمارا ذمہ ہے، ہم ان کو بچا لیں گے جو ایمان لے آئے ہیں۔ ۱۰۱-۱۰۳

(اے پیغمبر)، کہہ دو کہ لوگو، میرے دین کے بارے میں اگر (اب بھی) شک میں  
ہو تو سن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کو پوجتے ہو، میں انہیں نہیں پوجتا، بلکہ اُس اللہ کو پوجتا  
ہوں جو تمہیں موت دیتا ہے (کہ جواب دہی کے لیے اُس کے سامنے حاضر ہو جاؤ)۔  
مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں اور حکم دیا گیا ہے کہ اپنا رخ  
یک سوئی کے ساتھ سیدھا اسی دین کی طرف کر لو اور ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو۔ اور  
یہ بھی کہ اللہ کے سوا ان کو نہ پکارو جو نہ تم کو نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ نقصان۔ پھر اگر یہی  
کرو گے تو اُس وقت تم بھی یقیناً ظالموں میں سے ہو گے۔ اگر اللہ تمہیں کسی تکلیف

۱۱ اور تمہارے معاملے میں وہی کریں گے جو پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد منکرین



اللَّهُ بِضُرِّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۚ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ ۚ  
يُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿١٠٧﴾  
قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدَىٰ  
فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَا أَنَا  
عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ﴿١٠٨﴾ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ  
اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿١٠٩﴾

میں پکڑ لے تو اُس کے سوا کوئی نہیں جو اُس کو دور کر سکے اور اگر تمہارے لیے کوئی بھلائی  
چاہے تو اُس کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا  
ہے، اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ بخشنے والا، بڑا رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۰۷-۱۰۸  
ان سے کہو کہ لوگو، تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس حق آ گیا  
ہے۔ اب جو ہدایت قبول کرے گا، وہ اپنے ہی لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا، اُس کا  
وبال بھی اُسی پر آئے گا اور میں تمہارے اوپر کوئی ذمہ دار نہیں ہوں۔ (اے پیغمبر)،  
تم اُس کی پیروی کرو جو تمہاری طرف وحی کی جاتی ہے اور صبر کرو، یہاں تک کہ  
اللہ فیصلہ کر دے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ ۱۰۸-۱۰۹

حق کے معاملے میں کرتے آئے ہیں۔

۱۱۸ یہ اعلان براءت ہے جو اتمام حجت کے بعد اور عذاب سے پہلے ہر پیغمبر کی طرف سے کیا  
جاتا ہے۔

۱۱۹ یہ اُسی فیصلے کا حوالہ ہے جس کا ذکر آیت ۴۷ اور اُس کے بعد آیت ۱۰۳ میں ہوا ہے۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
الرَّافِقُ كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ  
خَبِيرٍ ۝۱ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ إِنَّنِي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ ۝۲  
وَأَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا إِلَىٰ

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔  
یہ سورہ 'الر' ہے۔ یہ کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں، پھر خدائے حکیم و  
خبیر کی طرف سے اُن کی تفصیل کی گئی ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، میں اُس  
کی طرف سے تمہیں خبردار کرنے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔ اور یہ کہ تم اپنے  
پروردگار سے معافی چاہو، پھر اُس کی طرف رجوع کرو، وہ تمہیں ایک متعین مدت تک

۱۲۰ یہ سورہ کا نام ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کے متعلق ہم نے اپنا نقطہ نظر سورہ بقرہ (۲)  
کی آیت ۱ کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

۱۲۱ یعنی پہلے ایجاز، جامعیت اور اختصار کا طریقہ اختیار کیا گیا، پھر اُنھی گٹھے ہوئے، جامع  
اور مختصر گویا دریابہ کوزہ جملوں کی تفصیل کر دی گئی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس چیز کا حوالہ دینے سے مقصود اُس اہتمام خاص کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا ہے جو اُن  
کی تعلیم و تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں ملحوظ رکھا ہے... آخر میں 'حکیم و خبیر' کی  
صفات کا حوالہ ہے، اس لیے کہ خدائے حکیم ہی جان سکتا تھا کہ وہ حکمت کے خزانوں کو کس طرح  
مختصر لفظوں میں بند کرے اور پھر خدائے خبیر ہی کی یہ شان تھی کہ وہ کھول کر دکھائے کہ ایک



اَجَلٍ مُّسَمًّى وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنِّي ۖ  
 أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ ۝۳ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ  
 وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۴

اَلَا اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ۖ اَلَا حِيْنَ  
 يَسْتَفْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ

اچھی طرح بہرہ مند کرے گا اور ہر اُس شخص کو جو اُس کے فضل کا مستحق ہے، اپنے فضل  
 سے نوازے گا۔ لیکن اگر منہ پھیرو گے تو میں تمہارے اوپر ایک بڑے ہول ناک دن  
 کے عذاب سے ڈرتا ہوں<sup>۱۲۳</sup>۔ تم سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت  
 رکھتا ہے۔<sup>۱۲۴</sup> ۱-۴

انھیں دیکھتے ہو، یہ اپنے سینے موڑتے ہیں کہ خدا سے چھپ جائیں۔ خبردار، جب  
 (اس مقصد سے) اپنے اوپر چادریں لپیٹتے ہیں، (یہ اُس وقت بھی اُس کی نظر میں  
 ہوتے ہیں)<sup>۱۲۵</sup>۔ وہ جانتا ہے جو کچھ یہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اُن

کوزے میں کتنے دریا اور کتنے سمندر بند ہیں۔“ (تذبر قرآن ۴/۱۰۷)

۱۲۲ یہ قرآن کا بنیادی پیغام ہے جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں ہر جگہ کم و بیش انھی الفاظ  
 میں بیان ہوا ہے۔

۱۲۳ یہ اُس انذار و بشارت کی تفصیل کردی ہے جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ بڑے ہول ناک  
 دن کے عذاب سے مراد وہی عذاب ہے جو رسولوں کے منکرین پر اسی دنیا میں آجاتا ہے اور وہ  
 یک قلم ختم کر دیے جاتے ہیں۔

۱۲۴ اس ابہام کے اندر جو تخویف ہے، وہ اگر بغور کیجیے تو ہر صراحت سے بڑھ گئی ہے۔



عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ⑤ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ⑥ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ⑦  
وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَكَانَ

بھیدوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہوتے ہیں۔ زمین پر چلنے والا کوئی جان دار نہیں ہے، جس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو۔ اور وہ اُس کے ٹھکانے کو بھی جانتا ہے اور اُس جگہ کو بھی جہاں وہ (مرنے کے بعد زمین کے) سپرد کیا جائے گا۔ یہ سب ایک کھلی کتاب میں درج ہے۔ ۱۲۶-۵-۶

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا ہے اور (تمھاری

۱۲۵ سینہ موڑنا اور چادر لپیٹ کر چل دینا، یہ دونوں تعبیریں اُن کے گریز و فرار کی تصویر کے لیے ہیں، جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز سے بچنے کے لیے آپ کی بات کو نظر انداز کرتے اور جہاں آپ بیٹھے ہوتے، وہاں سے متکبرانہ نکل جانے کی کوشش کرتے تھے۔ فرمایا کہ انھیں دیکھو، یہ اُس سے چھپنا چاہتے ہیں جو ان کے سینوں میں چھپے ہوئے بھیدوں سے بھی واقف ہے۔ اس سے بڑھ کر حماقت کیا ہو سکتی ہے جس میں یہ تمھارے انداز کے بعد مبتلا ہو گئے ہیں۔

۱۲۶ اِن آیتوں میں انداز کے جو تہ در تہ پہلو ہیں، انھیں کھول دیجیے تو جو مضمون سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ خدا سے کیا چھپانا چاہتے ہو؟ اُس کا علم تو ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جو ہر جان دار کو جہاں کہیں بھی وہ ہو، اُس کی روزی پہنچا سکتا ہے، اُس سے تمھاری کوئی چیز کس طرح مخفی ہو سکتی ہے؟ تم بھی اُسی کے رزق پر پلتے، مگر اُس کی دعوت سے گریز کرتے ہو۔ یاد رکھو، خدا تمھارے ٹھکانوں سے بھی واقف ہے اور مرنے کے بعد جس زمین کے سپرد کیے جاؤ گے، اُسے بھی جانتا ہے۔ ایک دن آئے گا، جب زمین یہ امانت اپنے پروردگار کے حوالے کرے گی اور تم جواب دہی کے لیے پیش کر دیے جاؤ گے۔ اُس کے لیے ہر چیز ایک کھلی کتاب میں درج کر کے محفوظ کر لی گئی



عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۖ وَلَئِنْ قُلْتُمْ إِنَّكُمْ  
مَبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا  
إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ﴿٤﴾ وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمْ الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ

پیدائش سے پہلے) اُس کا عرش پانی پر تھا<sup>۱۲۸</sup>۔ اس لیے پیدا کیا ہے کہ تم کو آزمائے کر  
دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ اب، (اے پیغمبر)، اگر تم ان سے کہتے  
ہو کہ (لوگو)، مرنے کے بعد تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے تو یہ منکرین ضرور بول اٹھیں گے  
کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ اور اگر کچھ مدت کے لیے ہم ان سے دنیا کے اس عذاب کو  
ہے۔

۱۲۷۔ یہ اللہ کے ایام ہیں جن کے بارے میں قرآن نے صراحت فرمائی ہے کہ ہمارے حساب  
سے ہزار سال کے برابر بھی ہوتے ہیں اور پچاس ہزار سال کے برابر بھی۔ مدعا یہ ہے کہ دنیا کا  
ظہور کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے، بلکہ یہ خدا کے ارادے سے، اُس کی اسکیم کے مطابق اور ایک  
ترتیب و حکمت کے ساتھ وجود میں آئی ہے۔ چنانچہ یہ بے مقصد نہیں ہو سکتی، اس کے پیچھے لازماً  
ایک غایت ہے جو جلد یا بدیر ظہور میں آ کر رہے گی۔

۱۲۸۔ یعنی اس سے پہلے یہ کرہ ارض پانی ہی پانی تھا اور خدا کی حکومت بھی اسی پانی پر قائم تھی۔  
زمانہ رسالت میں لوگ قرآن کے اس بیان پر اظہار تعجب کر سکتے تھے، مگر دور حاضر کی تحقیقات  
نے ثابت کر دیا ہے کہ دنیا کے بارے میں یہی حقیقت ہے جو قرآن نے صدیوں پہلے بیان کر دی  
تھی۔

۱۲۹۔ یہ اُس غایت کا بیان ہے جس کے لیے دنیا اہتمام کے ساتھ اور چھ دن میں پیدا کی گئی  
ہے جو ہمارے حساب سے ہزاروں لاکھوں سال کے برابر ہو سکتے ہیں۔ انسان کو ارادے کی  
آزادی اور خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت اسی مقصد سے دی گئی ہے۔ اُس کا خالق دیکھ رہا ہے کہ وہ







لَيَقُولَنَّ مَا يَجِبُ سُهُ ٥ اَلَا يَوْمَ يَاتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ  
بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ٨ وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً  
ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ ٦ اِنَّهُ لَيَكْفُرُ ٩ وَلَئِنْ اَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ  
ضُرَاءٍ مَسَّتَهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاتُ عَنِّي ٧ اِنَّهُ لَفَرِحَ فُخُورًا ١٠  
اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ٥ اُولَئِكَ لَهُمْ

ٹال دیں گے تو ضرور پوچھیں گے کہ اسے کیا چیز روکے ہوئے ہے؟ سنو، جس دن وہ ان  
کے اوپر آ پڑے گا تو ان سے پھیرا نہ جاسکے گا اور وہی چیز ان کو آ گھیرے گی جس کا مذاق  
اڑا رہے ہیں۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ ہم اُس کو اگر اپنے کسی فضل سے نوازیں، پھر اُس  
سے اُسے محروم کر دیں تو لازماً شکایت کرے گا، اس لیے کہ وہ جلد مایوس ہو جانے والا  
اور نہایت ناشکرا ہے۔ اور اگر کسی تکلیف کے بعد جو اُس کو پہنچی ہو، ہم اُسے نعمت کا مزہ  
چکھائیں تو ضرور کہے گا کہ میری سب مصیبتیں مجھ سے دور ہوئیں (اور پھولا نہیں سمائے  
گا)، اس لیے کہ وہ بڑا اترانے والا اور شیخی بگھارنے والا ہے۔ ۱۳۲ اس سے وہی مستثنیٰ ہیں جو

خیر کا راستہ اختیار کرتا ہے یا شر کا۔ اُسے بتا دیا گیا ہے کہ اپنے اس انتخاب کے لیے وہ ایک دن  
جواب دہ ٹھہرایا جائے گا اور اس کی جزایا سزا پائے گا۔

۱۳۰ یعنی زبان و بیان کی جادوگری ہے، اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

۱۳۱ یعنی اُس عذاب کو جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں لازماً آتا ہے۔

۱۳۲ یہ بات اگرچہ لفظ 'انسان' کے ساتھ کہی گئی ہے، لیکن مراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اوپر

سے آ رہا ہے۔ اُن سے منہ پھیر کر ایک کلیے کے انداز میں بتایا ہے کہ یہ معاملہ انھی کے ساتھ خاص  
نہیں ہے۔ انسان کی بد قسمتی ہے کہ عام طور پر وہ یہی کرتا ہے۔



## مَغْفِرَةٌ وَاجْرٌ كَبِيرٌ ⑪

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ  
أَنْ يَقُولُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ كُتُبٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ ۖ إِنَّمَا أَنْتَ  
نَذِيرٌ ۖ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ⑫ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ  
فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوْرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرِيَةٍ وَادْعُوا مَنْ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ

صبر کرتے اور اچھے عمل کرتے ہیں۔ اُنھی کے لیے مغفرت بھی ہے اور بڑا اجر بھی۔ ۷-۱۱۔  
سو، (ان کے اس رویے کی وجہ سے، اے پیغمبر)، تم اُس میں سے شاید کچھ چھوڑنا  
چاہتے ہو جو تمہاری طرف وحی کیا جا رہا ہے اور اس بات پر تنگ دل ہو رہے ہو کہ یہ  
لوگ کہیں گے کہ اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں  
آیا؟ (حقیقت یہ ہے کہ) تم تو صرف خبردار کرنے والے ہو اور آگے ہر چیز اللہ کے  
حوالے ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ ۱۲۔ ان سے کہو، پھر تم بھی

۱۳۳۔ یعنی وہ چیزیں پیش کرنے سے گریز کرنا چاہتے ہو جو تمہارے مخاطبین کو پسند نہیں ہیں۔  
اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ فی الواقع ایسا کرنا چاہتے تھے۔ یہ درحقیقت پیش بندی کا جملہ اور  
حالات کی سنگینی، مخالفانہ رد عمل کی شدت اور طنز و استہزا کے طوفان میں پامردی اور استقامت کی  
تلقین ہے جو اس اسلوب میں کی گئی ہے تاکہ اس طرح کا کوئی خیال بھی آپ کے دل میں نہ  
گزرے۔ آیت میں لفظ "لَعَلَّ" اسی پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ خطاب میں جو تیزی محسوس ہوتی  
ہے، اُس کا رخ بھی، اگر غور کیجیے تو اُنھی معاندین کی طرف ہے جو اپنے رویے سے یہ صورت حال  
پیدا کر رہے تھے۔

۱۳۴۔ یہ استفہام اظہار تعجب کے لیے ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:





ہود  
۱۱

دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ ۱۳ فَاَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا  
أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَنَّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ ۱۴

اسی طرح کی گھڑی ہوئی دس سورتیں بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا جن کو بلا سکتے ہو، بلا  
لو، اگر تم سچے ہو۔<sup>۱۳۵</sup> لیکن اگر وہ تمہاری مدد کو نہ پہنچیں تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل  
ہوا ہے اور یہ بھی کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔<sup>۱۳۶</sup> پھر کیا تم مانتے ہو؟ ۱۲-۱۴

”... اوپر کے اعتراضات تو سادہ اسلوب میں نقل کر دیے ہیں، لیکن قرآن کو پیغمبر کی گھڑی  
ہوئی کتاب قرار دینا ایک نہایت عجیب بات تھی، بالخصوص اُن لوگوں کی زبان سے جو کلام کے  
حسن و فصیح کے نقاد اور اُس کے ایجاز و اعجاز کے قدردان بھی تھے اور موازنے اور مقابلے کے  
لیے اُن کے پاس اپنے چوٹی کے شاعروں اور خطیبوں کے کلام کا ایک دفتر بھی موجود تھا۔ اس وجہ  
سے اس کا ذکر تعجب کے اسلوب میں فرمایا۔“ (تدبر قرآن ۱۱۲/۴)

۱۳۵ یعنی اپنے اس گمان میں سچے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کتاب اپنی طرف سے گھڑ کر  
پیش کر رہے ہیں تو اس کا فیصلہ نہایت آسانی کے ساتھ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس شان کی دس  
سورتیں تم بھی بنا لاؤ۔ تمہارے گمان کے مطابق یہ کام اگر بغیر کسی علمی اور ادبی پس منظر کے تمہاری  
قوم کے ایک فرد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کر سکتے ہیں تو تمہیں بھی اس میں کوئی دقت نہیں ہونی  
چاہیے۔ سورہ طور (۵۲) کی آیات ۳۳-۳۴ میں یہی بات ’بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ‘ کے الفاظ میں فرمائی  
ہے۔ یہ سورہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلہ انذار عام کی ابتدائی سورتوں میں سے  
ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن نے یہ مطالبہ منکرین کے سامنے پہلے بالا جمال پیش کیا،  
پھر اسی اجمال کو حسب موقع مختلف الفاظ میں کھول دیا ہے۔ اس میں کوئی ترتیب و تدریج ماننے کی  
ضرورت نہیں ہے۔

۱۳۶ اس آیت میں خطاب براہ راست ہو گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ تمہارے معبود اگر اس  
موقع پر بھی تمہاری مدد کو نہ پہنچیں تو مان لو کہ یہ علم الہی کا فیضان ہے۔ چنانچہ تم سب مل کر بھی اس



مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ۝١٥ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبِطِلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝١٦

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ

(یہ اس لیے منکر ہو رہے ہیں کہ دنیا کی زندگی نے انھیں دھوکے میں ڈال دیا ہے، انھیں بتا دو کہ) جو دنیا کی زندگی اور اُس کی زینت چاہتے ہیں، ہم اُن کے اعمال کا بدلہ اُن کو یہیں چکا دیتے ہیں اور اُس میں اُن کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔<sup>۱۳۷</sup> دنیا میں جو کچھ اُنھوں نے بنایا، وہ سب ملیا میٹ ہوا اور اُن کا کیا دھرا اب باطل ہے۔ ۱۵-۱۶

سو کیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے ایک برہان<sup>۱۳۸</sup> پر ہے، پھر (اُس کی تائید

شان کی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتے اور اس کا یہ دعویٰ بھی بالکل سچا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔

<sup>۱۳۷</sup> یہ ایک سنت الہی کے حوالے سے اُن کے مغالطے پر تنبیہ فرمائی ہے کہ جو لوگ دنیا کے طالب ہوتے ہیں، اُسی کے لیے جیتے، اُسی کے لیے مرتے اور آخرت سے بالکل بے پروا ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، اُن کا حساب اللہ تعالیٰ جس کو جتنا دینا چاہتا ہے، دے کر اسی دنیا میں بے باق کر دیتا ہے اور اُن کی تمام کارگزاریوں کا پھل اُنھیں یہیں مل جاتا ہے۔ اس سے وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ آخرت اگر ہوئی بھی تو اُس میں بھی وہی خدا کے محبوب ہوں گے۔ فرمایا کہ اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ آخرت میں اُن کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔



قَبْلِهِ كَتَبَ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۖ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۖ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ

(میں) اُس کے بعد ایک گواہ بھی اُس کے پروردگار کی طرف سے آ جاتا ہے<sup>۱۳۹</sup> اور اُس سے پہلے موسیٰ کی کتاب بھی رہنما اور رحمت<sup>۱۴۰</sup> کے طور پر آئی ہوئی موجود ہے، اس قرآن کا انکار کر سکتا ہے؟ (ہرگز نہیں)۔ اس طرح کے لوگ تو اس پر ایمان ہی لائیں گے۔ اور (تمہارے مخاطبین کے) ان گروہوں میں جو شخص بھی اس کا منکر ہوگا، اُس کے

۱۳۸۔ اس سے مراد وہ نور فطرت ہے جو حق و باطل اور خیر و شر کے مبادی میں امتیاز کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود انسان کے اندر ودیعت کر دیا ہے۔

۱۳۹۔ یعنی وحی الہی جو نُورٌ عَلٰی نُورٍ (روشنی پر روشنی) ہو کر آتی اور انسانی فطرت کے اندر خدا کے ودیعت کردہ مبادی کی تصدیق کر دیتی ہے۔ لفظ 'يَتْلُوهُ' میں ضمیر مذکر آئی ہے۔ اس کا مرجع لفظ 'بَيِّنَةٌ' ہے، لیکن اُس کی تانیث چونکہ غیر حقیقی ہے، اس لیے یہ معنی کے لحاظ سے آگئی ہے۔

۱۴۰۔ یعنی دنیا میں رہنما اور آخرت میں خدا کی رحمت جو ایمان والوں کو لازماً اپنے دامن میں لے لے گی۔

۱۴۱۔ اس طرح کے استفہامیہ جملوں میں بعض اوقات کلام کا ایک حصہ حذف کر دیا جاتا ہے۔ ہم نے اُسے کھول دیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ قرآن کا انکار اس طرح کے دنیا پرست ہی کر سکتے ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، اس لیے کہ اُن کی غلط روی کی وجہ سے اُن کی فطرت کا نور بجھ چکا ہوتا ہے اور جن کی فطرت کا نور بجھ چکا ہو، وہ قرآن پر ایمان لانے والے نہیں بن سکتے۔ اس سے، اگر غور کیجیے تو اللہ تعالیٰ نے ایک لطیف اشارہ اُن اہل کتاب کی طرف بھی کر دیا ہے جو اگرچہ ابھی پوری طرح سامنے تو نہیں آئے تھے، لیکن اندر اندر مخالفت کے لیے تیار ہو رہے تھے۔



إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٤﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ وَيَقُولُ الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ

لیے وعدے کی جگہ دوزخ ہے۔ سو، (اے پیغمبر)، تم اس کے بارے میں کسی شک میں نہ پڑو، اس لیے کہ یہ حق ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے، مگر اکثر لوگ مانتے نہیں ہیں۔ (انہیں بتادو کہ) اُن سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑیں؟ وہ اپنے پروردگار کے حضور پیش کیے جائیں گے اور گواہی دینے والے گواہی دیں گے کہ یہی

۱۴۲ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ شامت زدہ لوگ قرآن کو جھٹلا رہے ہیں تو جھٹلائیں، ان کے اس رویے پر تمہیں کسی الجھن میں نہیں پڑنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ بات درحقیقت اُنھی بد بختوں کو سنائی گئی ہے جو قرآن کی مخالفت کے درپے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس طرح کے جملوں میں جو عتاب ہوتا ہے، اُس کا رخ... مخالفین کی طرف ہوتا ہے، لیکن وہ لائق التفات نہیں رہ جاتے، اس وجہ سے اُن کو خطاب کر کے بات براہ راست کہنے کی بجائے پیغمبر کو خطاب کر کے کہہ دی جاتی ہے۔ زجر و ملامت کا یہ اسلوب بسا اوقات براہ راست زجر و تنبیہ سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کی نہایت دلاویز مثالیں موجود ہیں۔“ (تدبر قرآن ۱۱۸/۴)

۱۴۳ یعنی اُس کے شریک ٹھہرائیں۔ قرآن میں یہ تعبیر شرک کے لیے بھی اختیار کی گئی ہے اور اپنی طرف سے تحلیل و تحریم کے لیے بھی، جو شرک ہی کی ایک صورت ہے۔ سیاق و سباق سے واضح ہے کہ یہاں شرک ہی مراد ہے۔

۱۴۴ یہ گواہی خدا کے پیغمبر بھی دیں گے جنہیں اتمام حجت کے لیے بھیجا گیا اور اُس کے فرشتے بھی جو لوگوں کے اعمال کا ریکارڈ رکھنے پر مامور ہیں۔







عَلَى الظَّالِمِينَ ۝۱۸ الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا  
عِوَجًا ۖ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَفِرُونَ ۝۱۹ أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ  
فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ۖ يُضَعِفُ لَهُمْ  
الْعَذَابُ ۖ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ۝۲۰  
أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝۲۱  
لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمْ الْآخَسَرُونَ ۝۲۲ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا  
وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآخَبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ ۖ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ

ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ گھڑا تھا۔ سنو، اللہ کی لعنت ہے اُن ظالموں  
پر جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اُس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور وہی آخرت  
کے منکر ہیں۔ وہ زمین میں خدا کی گرفت سے باہر نہیں تھے اور نہ خدا کے سوا اُن کا  
وہاں کوئی حمایتی تھا۔ (تاہم جو ڈھیل ہم نے اُنہیں دے رکھی تھی، اُس کی بنا پر وہ  
یہی سمجھتے رہے)۔ اُنہیں اب دہرا عذاب<sup>۱۴۶</sup> دیا جائے گا، اس لیے کہ نہ سن سکتے تھے اور  
نہ دیکھتے تھے<sup>۱۴۷</sup>۔ وہی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو گھائے میں ڈالا اور جو کچھ گھڑتے  
تھے، وہ سب اُن سے کھویا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ آخرت میں وہی سب سے زیادہ  
گھائے میں ہوں گے۔ اس کے برخلاف جو ایمان لائے اور اُنہوں نے اچھے عمل

۱۴۵ یعنی توحید کی صراط مستقیم سے ہٹا کر لوگوں کو مشرکانہ عقائد کی بھول بھلیاں میں الجھانا  
چاہتے ہیں۔

۱۴۶ دہرا اس لیے کہ یہ خود بھی خدا کی راہ سے ر کے اور دوسروں کو بھی روکتے رہے۔

۱۴۷ مطلب یہ ہے کہ نہ اللہ و رسول کی بات سننے کے لیے تیار تھے اور نہ نفس و آفاق میں خدا



فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٣﴾ مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَى وَالْأَصْمَى وَالْبَصِيرِ  
وَالسَّمِيعِ ۖ هَلْ يَسْتَوِينَ مَثَلًا ۖ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٢٤﴾  
وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ ۖ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٢٥﴾

کیے اور اپنے پروردگار کی طرف جھکے رہے، وہی جنت کے لوگ ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو اور ایک دیکھنے والا اور سننے والا۔ کیا دونوں کی حالت یکساں ہو سکتی ہے؟ پھر کیا سوچتے نہیں ہو؟ ۱۷-۲۴

اسی طرح نوح کو ہم نے اُس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا۔ (اُس نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا): میں تمہارے لیے ایک کھلا ہوا خبردار کرنے والا ہوں کہ تم

کی نشانیاں دیکھ کر اُن سے کوئی سبق حاصل کرتے تھے۔

۱۲۸۔ یہ اُنھی منکرین کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر اوپر مآ کَانُوا یَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا کَانُوا یُبْصِرُونَ کے الفاظ میں ہوا ہے۔

۱۲۹۔ اصل میں 'نَذِيرٌ مُّبِينٌ' کے الفاظ آئے ہیں، یعنی پوری قطعیت کے ساتھ اور صاف صاف خبردار کرنے والا۔ اس میں ایک لطیف تلمیح بھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...عرب میں دستور رہا ہے کہ ہر قوم کے لوگ کسی بلند ٹیلے یا پہاڑی پر دید بان بناتے، جہاں ہر وقت ایک نگران مقرر رہتا جس کا کام یہ ہوتا کہ جب وہ دیکھتا کہ کسی طرف سے حملہ آوروں کی کوئی جماعت اُس کی قوم پر حملہ کیا چاہتی ہے تو وہ اپنے کپڑے پھاڑ کر ننگا ہو جاتا اور ’وا صباحا‘ کا نعرہ لگاتا۔ یہ پوری قوم کے لیے الارم ہوتا اور سب تلواریں سونت سونت کر مدافعت کے لیے باہر نکل آتے۔ اس کو نذیر عریاں کہتے تھے۔ خدا کے رسول بھی اپنی قوم کو آنے والے عذاب سے آگاہ کرنے کے لیے آئے اور انھوں نے بالکل اس طرح لوگوں کو اُس سے آگاہ کیا





ہود  
۱۱

أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ إِلِيمٍ ﴿٢٦﴾  
فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا نَرِيكَ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا  
وَمَا نَرِيكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادُوا بُادِي الرَّأْيِ ۚ وَمَا نَرِي  
لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ ۖ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ ﴿٢٧﴾  
قَالَ يَقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّي وَآتَانِي  
رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهِ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمْوهَا وَأَنْتُمْ لَهَا

اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔<sup>۱۵۱</sup> (ایسا کرو گے تو) میں تم پر ایک دردناک دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اس پر اُس کی قوم کے سرداروں نے، جو منکر تھے، جواب دیا: ہم تو تمہیں اپنے جیسا ایک آدمی ہی دیکھتے ہیں اور ہمارے اندر جوار اذل ہیں، اُنھی کو دیکھتے ہیں کہ بے سمجھے بوجھے تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ ہم نہیں دیکھتے کہ ہمارے اوپر تمہیں کوئی بڑائی حاصل ہے، بلکہ ہم تو تمہیں بالکل جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔<sup>۱۵۱</sup> ۲۵-۲۷  
نوح نے جواب دیا: میری قوم کے لوگو، ذرا سوچو، اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشن دلیل<sup>۱۵۲</sup> پر ہوں، پھر اُس نے مجھے خاص اپنی جناب سے رحمت بھی عطا فرمائی اور

گویا وہ عقب سے نمودار ہی ہونے والا ہے۔ اس وجہ سے قرآن میں اُن کے لیے 'نَذِيرٌ مُّبِينٌ'،

کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔“ (تذبر قرآن ۴/۱۳۶)

۱۵۰۔ اس سورہ کی آیت ۲ کو دیکھیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی دعوت کی ابتدا اسی

بات سے کی تھی۔

۱۵۱۔ یہ تین معارضات ہیں جو نوح علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے اُن کی دعوت کے

جواب میں پیش کیے۔ آگے انھی کا جواب ہے۔



كَرِهُونَ ۲۸ ۝ وَلَيَقُومَنَّ ۲۹ ۝ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ  
اللَّهُ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّهُمْ مُلْقُوا رَبِّهِمْ وَلَكِنِّي أَرِكُمْ  
قَوْمًا تَجْهَلُونَ ۳۰ ۝ وَلَيَقُومَنَّ ۳۱ ۝ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ

وہ تمہیں نظر نہیں آئی تو کیا ہم (زبردستی) اُس کو تم پر چپکا دیں، جب کہ تم اُس سے بے زار ہو؟<sup>۱۵۲</sup> میری قوم کے لوگو، میں اس خدمت پر تم سے کوئی مال نہیں مانگ رہا ہوں (کہ تمہاری ہر بات ماننے کے لیے مجبور ہو جاؤں)۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے اور (تمہاری خوشنودی کے لیے) میں اُن لوگوں کو ہرگز نکال دینے والا نہیں ہوں جو ایمان لے آئے ہیں۔ وہ (اپنے اسی ایمان کے ساتھ) اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں۔ (اُن کی قدر و قیمت کا فیصلہ وہی کرے گا)، مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت میں مبتلا ہو۔ میری قوم کے لوگو، اگر میں اُن کو نکال دوں تو خدا سے بچانے کے لیے کون میری مدد کرے گا؟ پھر کیا سوچتے نہیں ہو؟ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس

۱۵۲ اصل میں لفظ 'بَيِّنَةٌ' آیا ہے۔ اس سے مراد وہی نور فطرت ہے جس کا ذکر اس سے پہلے

آیت ۱۷ میں ہو چکا ہے۔

۱۵۳ یعنی اپنی وحی میری طرف نازل کر دی۔

۱۵۴ مطلب یہ ہے کہ تمہارے کرتوتوں کی وجہ سے فطرت کا چراغ بھی تمہارے اندر گل ہو

چکا اور اس کے نتیجے میں وحی کے ذریعے سے آنے والی ہدایت بھی تاریکیوں میں کھو گئی، پھر اپنے فساد طبعیت کے باعث تم اس طرح کی چیزوں سے بے زار بھی ہو تو میں تمہارے اوپر ایک ایسی چیز کس طرح چپکا سکتا ہوں، جس کے چپکنے کے لیے تمہارے اندر سرے سے کوئی مادہ قبولیت ہی





ہود  
۱۱

الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ إِنِّي مَلَكٌ وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَزْدَرِي أَعْيُنُكُمْ  
لَنْ يُؤْتِيَهُمُ اللَّهُ خَيْرًا ۖ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا فِي أَنْفُسِهِمْ ۖ إِنِّي إِذَا لَمَسَ  
الظَّالِمِينَ ۖ (۳۱) قَالُوا يَنْوُحُ قَدْ جَدَلْنَا فَاكِتَرَتْ جِدَالُنَا فَاتِنَا  
بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِينَ ۖ (۳۲) قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيَكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ  
شَاءَ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ۖ (۳۳) وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِي إِنْ أَرَدْتُ أَنْ  
أَنْصَحَ لَكُمْ إِنْ كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يُغْوِيَكُمْ ۖ هُوَ رَبُّكُمْ ۖ وَقِفْ

خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، نہ یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں کوئی  
فرشتہ ہوں<sup>۱۵۵</sup> اور نہ اُن لوگوں کے بارے میں جنہیں تمہاری آنکھیں حقیر دیکھتی ہیں،  
(تمہاری طرح) یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ اللہ اُنہیں کوئی بھلائی دے ہی نہیں  
سکتا۔ اُن کے دلوں میں جو کچھ ہے، اُسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ میں اگر ایسا کروں تو  
پھر میں ظالم ہوں گا۔ (اس پر) اُن لوگوں نے کہا: اے نوح، تم نے ہم سے بحث کی  
ہے اور بہت کر لی ہے، اب اگر تم سچے ہو تو وہ چیز ہم پر لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی سنا  
رہے ہو۔ نوح نے جواب دیا: وہ تو اللہ ہی تم پر لائے گا، اگر چاہے گا اور اُس وقت تم  
اُس کی گرفت سے نکل نہیں سکو گے۔ میں اگر تمہاری کچھ خیر خواہی کرنا بھی چاہوں تو

باقی نہیں رہ گیا ہے؟

۱۵۵ یہ اُس بات کا جواب ہے جو مخاطبین نے کہی تھی کہ تم تو ہمیں اپنے جیسے ایک انسان ہی  
لگتے ہو، پھر تمہیں پیغمبر کس طرح مانیں؟

۱۵۶ وہ یہ بات اس بنیاد پر کہتے تھے کہ جب خدا نے دنیا کی رفاہیت کے لیے ان کا نہیں،  
بلکہ ہمارا انتخاب کیا ہے تو آخرت کی نعمتوں کے لیے یہ کس طرح منتخب کیے جاسکتے ہیں؟



وَالِيهِ تُرْجَعُونَ ۝۳۲

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَىٰ إِجْرَامِي وَأَنَا  
بِرِيٍّ مِّمَّا تَجْرِمُونَ ۝۳۳

وَأَوْحَىٰ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ  
فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝۳۴ وَأَصْنَعِ الْفُلَكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحِّينَا  
وَلَا تُخَاطِبُنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۖ إِنَّهُمْ مُّفْرَقُونَ ۝۳۵ وَيَصْنَعِ الْفُلَكَ

میری خیر خواہی تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی، اگر (تمہارے اس رویے کے نتیجے  
میں) اللہ نے تم کو بھٹکا دینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ وہی تمہارا پروردگار ہے اور تمہیں اُسی  
کی طرف پلٹنا ہے۔ ۲۸-۳۴

کیا یہ کہتے ہیں کہ (ہم پر چسپاں کرنے کے لیے) اس شخص نے یہ قصہ خود گھڑ لیا  
ہے؟ ان سے کہو، (اے پیغمبر)، اگر میں نے یہ خود گھڑا ہے تو میرے جرم کا وبال  
میرے ہی اوپر ہے، لیکن (جانتے بوجھتے حقائق کو جھٹلا دینے کا) جو جرم تم کر رہے ہو،  
اُس کی ذمہ داری تمھی پر ہے، میں اُس سے بری ہوں۔ ۳۵

(پھر) نوح کو وحی کی گئی کہ تمہاری قوم کے لوگوں میں سے جو ایمان لا چکے، اب اُن  
کے سوا کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔ سو ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑو اور ہماری  
نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق کشتی بناؤ۔ ان ظالموں کے حق میں مجھ سے

۱۵۷ سورہ کی تلاوت کے دوران میں یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات ہے جس میں  
سلسلہ کلام کو روک کر مخاطبین کے رد عمل پر برسر موقع تبصرہ کیا گیا ہے۔





ہود  
۱۱

وَكَلَّمَامَرَّعَلَيْهِمَلَائِكٌمِّنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ ۖ قَالَ إِن تَسْخَرُونَا مِنَّا  
فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ ۖ ۞۳۸ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ لَا مَن  
يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ۞۳۹ ۖ حَتَّىٰ  
إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُورُ ۖ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ

کوئی بات نہ کرنا، یہ اب غرق ہو کر رہیں گے۔ نوح (اس ہدایت کے مطابق) کشتی بنانے لگا اور اُس کی قوم کے سردار جب اُس کے پاس سے گزرتے تو اُس کی ہنسی اڑاتے۔ وہ اُنہیں جواب دیتا کہ اگر ہمارے اوپر ہنستے ہو تو جس طرح تم ہنستے ہو، اُسی طرح (ایک دن) ہم بھی تم پر ہنسیں گے۔ پھر عنقریب جان لو گے کہ وہ کون ہیں جن پر وہ عذاب آتا ہے جو اُنہیں رسوا کر کے رکھ دیتا ہے اور وہ قہر نازل ہوتا ہے جو اُن پر (نازل ہو کر) ٹھیر جاتا ہے۔ وہ یہی کرتے رہے، یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور طوفان ابل پڑا تو ہم

۱۵۸ اس لیے کہ عذاب کی دھمکی کو وہ سرے سے لاف زنی سمجھتے تھے۔ چنانچہ کشتی بننے لگی تو اُنہوں نے یہی خیال کیا ہو گا کہ یہ نوح اور اُس کے ساتھیوں کے خلل دماغ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

۱۵۹ یہ الفاظ مجانست کے اسلوب پر آئے ہیں اور اُس سرور و ابہتاج اور ازدیاد ایمان و اطمینان کی سرشاری کو بیان کرتے ہیں جو خدا کی نصرت کے ظہور پر اہل ایمان کو حاصل ہوگی۔ ان کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم بھی اُسی ابتداء پر اتر آئیں گے، جس پر تم اترے ہوئے ہو۔ استاذ امام لکھتے ہیں: ”... کسی کی مصیبت پر خوش ہونا عام حالات میں تو اچھی بات نہیں ہے، لیکن جن لوگوں پر اُس طرح حجت تمام ہو چکی ہو، جس طرح حضرت نوح اور اُن کے ساتھیوں نے اپنی قوم پر تمام کی، اُن پر عذاب الہی کا نزول حق کی فتح مندی اور باطل کی ہزیمت کا ایک یادگار واقعہ ہوتا ہے جس پر



اٰثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ وَمَا اٰمَنَ مَعَهُ  
اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿١٦٠﴾ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرِبَهَا وَمُرْسٰهَا اِنَّ

نے کہا: ہر قسم کے (جانوروں کے) جوڑے اس میں رکھ لو،<sup>۱۶۰</sup> (نرو مادہ) دودو اور اپنے گھر والوں کو بھی اس کشتی میں سوار کرالو، سوائے اُن کے جن کے بارے میں حکم صادر ہو چکا ہے،<sup>۱۶۱</sup> اور اُن کو بھی جو ایمان لائے ہیں — اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے۔<sup>۱۶۲</sup> نوح نے کہا: اس میں سوار ہو جاؤ، اس کا چلنا اور

اہل ایمان کا خوش ہونا عین مقتضای ایمان ہوتا ہے۔“ (تذبرقرآن ۱۴۱/۴)

۱۶۰ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد جو عذاب آتا ہے، اُس کی نوعیت یہی ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے تو اُسی وقت جاتا ہے، جب پوری قوم ایک داستان عبرت بن کر تاریخ کے عجائب خانوں کی نذر ہو جاتی ہے۔

۱۶۱ اصل میں 'فَارَ التَّنُوْرُ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ استعارے کے طور پر اُس طوفان کی تعبیر ہے جس میں تند سائیکلونی ہواؤں کے ساتھ بارش ہوئی اور پاس کے سمندر اور دریا بھی ابل پڑے۔

۱۶۲ آیت میں 'مِنْ كُلِّ' کے الفاظ معہود ذہنی کے لحاظ سے استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی اُن جانوروں کا ایک ایک جوڑا جو اُس وقت لوگوں کے تصرف میں تھے اور طوفان کے بعد کی زندگی کے لیے ضروری تھے۔

۱۶۳ یعنی جن کے بارے میں پہلے دن سے طے ہو چکا ہے کہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے دنیا میں بھی عذاب سے دوچار ہوں گے اور آگے بھی جہنم کا ایندھن بن جائیں گے۔

۱۶۴ یہ حسرت و افسوس کا جملہ ہے کہ لوگوں کی بڑی اکثریت نوح علیہ السلام کی طرف سے کئی سو سال تک دعوت و انداز کے باوجود حق سے گریزاں رہی اور بالآخر طوفان کی نذر ہو گئی۔ اس میں





رَبِّي لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣١﴾

وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ قَفَّ وَنَادَى نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ  
فِي مَعْزِلٍ يُبْنِي أَرْكَبَ مَعَنَا وَلَا تَكُنْ مَعَ الْكَافِرِينَ ﴿٣٢﴾ قَالَ  
سَاوِي إِلَى جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ ط قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ

ٹھہرنا اللہ ہی کے نام سے ہے۔<sup>۱۶۵</sup> میرا پروردگار، البتہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی  
ہے۔<sup>۱۶۶</sup> ۳۶-۴۱

وہ کشتی پہاڑوں کی طرح اٹھتی ہوئی موجوں کے درمیان اُن کو لے کر چلنے لگی اور  
نوح نے اپنے بیٹے کو آواز دی، جو (کچھ فاصلے پر اُس سے) الگ تھا۔ بیٹا، ہمارے  
ساتھ سوار ہو جاؤ اور ان منکروں کے ساتھ نہ رہو۔<sup>۱۶۸</sup> اُس نے پلٹ کر جواب دیا: میں

بالواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے تسلی کا پیغام بھی ہے کہ قریش کی  
مغرور اکثریت بھی انھی کے انجام کو پہنچتی ہے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ اس سے پہلے بہت سی  
قومیں اسی انجام کو پہنچ چکی ہیں۔

<sup>۱۶۵</sup> یہ تفویض کا کلمہ ہے جس سے بندہ مومن اسباب سے ماورا اپنے آپ کو مسبب الاسباب  
کے سپرد کر دیتا ہے۔

<sup>۱۶۶</sup> اللہ تعالیٰ کی صفات کا یہ حوالہ انتہائی عجز کو ظاہر کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اس قابل تو  
نہیں تھے کہ ہم پر یہ عنایت کی جاتی، لیکن وہ گناہوں کو معاف کرنے والا اور نہایت مہربان ہے کہ  
نزول عذاب کی اس گھڑی میں اُس نے ہمیں ہر تکلیف سے بچا لیا ہے۔

<sup>۱۶۷</sup> تورات میں نوح علیہ السلام کے اِس بیٹے کا نام کنعان آیا ہے۔

<sup>۱۶۸</sup> اِس جملے میں جذبہ دعوت اور شفقت پدري، دونوں کی روح جس طرح سموئی ہوئی  
ہے، اُسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔



أَمْرًا لِلَّهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ ۚ وَحَالٌ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ ﴿٤٣﴾  
 وَقِيلَ يَا رَجُلُ ائْتِنِي مَاءً كَاسِئًا أَوْ لِي مَاءً يَافِي ۖ وَغِيصَ الْمَاءُ وَفُضِيَ  
 الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدَ اللَّقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٤٤﴾  
 وَنَادَى نُوحٌ رَبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ

ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھے اس پانی سے بچالے گا۔ نوح نے کہا: آج اللہ کے حکم سے کوئی بچانے والا نہیں ہے، مگر جس پر وہ رحم فرمائے۔ اتنے میں ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہوئی اور وہ بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا۔ حکم ہوا: اے زمین، اپنا پانی نکل لے اور اے آسمان، بھٹم جا۔ چنانچہ پانی اتار دیا گیا، فیصلہ چکا دیا گیا، کشتی جو دُک پر ٹک گئی اور کہہ دیا گیا کہ اس ظالم قوم پر خدا کی پھٹکار ہے۔ نوح نے

۱۶۹ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خدا اور ہٹ دھرمی انسان کو کہاں تک لے جاسکتی ہے۔  
 ۱۷۰ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ منظر نوح علیہ السلام کو نہ دکھایا جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہی چاہا کہ وہ یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ حضرت نوح کی وفاداری کا آخری امتحان تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرات انبیا کیسے کیسے امتحانوں سے گزارے جاتے ہیں، لیکن اللہ کی توفیق سے وہ ہر امتحان میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ نیز اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ خدا کا قانون جب اتنا بے لاگ ہے کہ نوح کا بیٹا بھی نافرمان ہو تو وہ اُس کی گردن بھی عین باپ کے سامنے دبا دیتا ہے تو تابہ دیگر اں چہ رسد۔“ (تدبر قرآن ۱۴۴/۴)

۱۷۱ یعنی اُدھر وہ ڈوبا اور اُدھر یہ حکم صادر ہو گیا۔ استاذ امام کے الفاظ میں یہ اس ہول ناک ٹریجڈی کا آخری منظر تھا۔ اس کے سامنے آنے کے بعد فوراً آسمان وزمین، سب کو احکام صادر ہو گئے کہ بس اب کام پورا ہو چکا!



وَأَنْتَ أَحْكَمُ الْحَكَمِينَ ﴿٤٥﴾ قَالَ يُنوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنِّي أَعِظُكَ

اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ پروردگار، میرا بیٹا تو میرے گھر والوں میں سے ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ فرمایا: اے نوح، وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے، وہ نہایت نابکار ہے۔ سو

۱۷۲۔ یہ کوہستان اراراط کی ایک چوٹی کا نام ہے۔ آرمینیا کی سطح مرتفع سے شروع ہو کر یہ سلسلہ کوہستان جنوب میں کردستان تک چلتا ہے۔ بائبل میں اسی بنا پر صرف اراراط کا نام آیا ہے۔ قرآن نے خاص اُس چوٹی کا ذکر، جہاں کشتی جا کر رکی تھی، اس لیے کیا ہے کہ اس سے طوفان کی ہول ناک کا کچھ اندازہ کیا جاسکے کہ اُس میں پانی کہاں تک پہنچ گیا تھا۔

۱۷۳۔ اوپر بیان ہوا ہے کہ نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنے اہل و عیال کو بھی کشتی میں سوار کرا لو۔ یہ بات انھوں نے اسی بنا پر کہی ہے، اس لیے کہ اُس وقت تک تعین کے ساتھ اُن کے علم میں نہیں تھا کہ اُن کا یہ بیٹا بھی خدا کے فیصلے کی زد میں آچکا ہے۔

۱۷۴۔ یہ دعا اُس وقت کی ہے، جب نوح علیہ السلام نے بیٹے کو ڈوبتے دیکھا، لیکن اس کا ذکر یہاں ہوا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...خدا کی نگاہوں میں یہ شخص حضرت نوح کا بیٹا ہونے کے باوجود ایسا نابکار تھا کہ جب تک خدا نے اُس کو غرق نہیں کر لیا، اُس کے باب میں حضرت نوح کی دعا کو زیر بحث لانا بھی پسند نہیں فرمایا۔ اس غضب کی وجہ، ظاہر ہے کہ اس دنیا میں اگر کسی انسان کو سب سے بڑی سعادت اور خوش بختی حاصل ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کو کسی پیغمبر کے گھر میں جنم دے، لیکن یہی خوش بختی سب سے بڑی بد بختی بھی ہو سکتی ہے، اگر وہ اس کی قدر نہ کرے اور ولی کے گھر میں شیطان بن کر اٹھے۔ چنانچہ کلام کی ترتیب ہی سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ اس



أَنْ تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ  
 مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ ۖ وَالْأَتَغْفِرُ لِي وَتَرْحَمَنِي أَكُنَّ مِنَ الْخَسِرِينَ ۝  
 قِيلَ يٰنُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِّمَّنْ مَعَكَ  
 وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

مجھ سے اُس چیز کے بارے میں سوال نہ کرو جس کا تجھے کچھ علم نہیں ہے۔ میں تجھے  
 نصیحت کرتا ہوں کہ جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو۔ نوح نے فوراً  
 عرض کیا: پروردگار، میں تیری پناہ میں آتا ہوں کہ تجھ سے کوئی ایسی چیز مانگوں جس کا  
 مجھے علم نہیں ہے۔ اب اگر تو مجھے معاف نہ کرے گا اور مجھ پر رحم نہ فرمائے گا تو میں  
 نامراد ہو جاؤں گا۔ ارشاد ہوا: اے نوح، اتر جاؤ، ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ  
 اور برکتوں کے ساتھ، تم پر بھی اور اُن امتوں پر بھی جو اُن سے ظہور میں آئیں گی جو  
 تمہارے ساتھ ہیں۔ اور (ان کے بعد) کچھ ایسی امتیں بھی ہیں جنہیں ہم آگے بہرہ مند  
 کریں گے، پھر (اُن کے جرائم کی پاداش میں) اُن کو بھی ہماری طرف سے ایک  
 دردناک عذاب پکڑ لے گا۔ ۲۲-۲۸

شخص کو خدا نے سب سے زیادہ مبغوض قرار دیا۔ گویا سارے طوفان کا اصلی ہدف تھا ہی یہی کہ  
 جب یہ ڈوب گیا تو معاً طوفان کے خاتمے کا اعلان ہو گیا۔“ (تدبر قرآن ۱۳۵/۴)

۱۷۵۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ اِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (وہ نہایت نابکار ہے)۔ اس  
 سے واضح ہو گیا کہ پیغمبر کا گھرا نا محض نسب سے نہیں بنتا، بلکہ ایمان اور عمل صالح سے بنتا ہے۔  
 ۱۷۶۔ اس برکت اور سلامتی کا ظہور اس طرح ہوا کہ بعد میں انھی چند نفوس کی اولاد تمام  
 روے زمین پر چھا گئی۔





تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ  
مِنْ قَبْلِ هَذَا فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٣٩﴾  
وَالِى عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا قَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ  
إِلَهِ غَيْرِهِ إِنَّ أَنْتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ ﴿٤٠﴾ يَقَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا

یہ غیب کی خبریں ہیں جو، (اے پیغمبر)، ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں۔ اس  
سے پہلے نہ تم ان کو جانتے تھے، نہ تمہاری قوم کے لوگ ان سے واقف تھے۔ اس لیے  
ثابت قدم رہو، انجام کار کی کامیابی اُنھی کے لیے ہے جو خدا سے ڈرنے والے  
ہیں۔ ۳۹۔ ۴۰

اسی طرح عاد کی طرف ہم نے اُن کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اُس نے اُنھیں دعوت دی  
کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔  
(حقیقت یہ ہے کہ اُس کے مقابل میں) تم محض جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ میری قوم کے

۴۱۔ یعنی جو دینونت اس وقت برپا ہوئی ہے، وہ بعد میں بھی وقتاً فوقتاً برپا ہوتی رہے گی اور  
جن لوگوں کو نجات ہوئی ہے، اُن کی اولاد میں سے جو ظالم ہوں گے، پیغمبروں کی طرف سے  
اتمام حجت کے بعد وہ بھی اسی طرح کیفر کردار کو پہنچتے رہیں گے۔

۴۲۔ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ رسولوں سے متعلق سنت الہی یہی ہے کہ وہ اور اُن کے ساتھی  
کامیاب ہوتے اور اُن کے مخالفین لازماً ناکام ہوجاتے ہیں۔

۴۳۔ عاد عرب کی قدیم ترین قوم ہے۔ یہ سامی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا مسکن احقاف  
کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان الربع الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ عرب  
کے لڑپچر میں یہ اپنی قدامت کے لیے بھی ضرب المثل ہیں اور اپنی قوت و شوکت کے لیے بھی۔  
حضرت ہود اُنھی کے ایک فرد تھے جنھیں رسول کی حیثیت سے ان کی طرف مبعوث کیا گیا۔ قرآن



إِنَّ أَجْرِي إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝٥١ وَيَقَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ ۝٥٢ قَالُوا يَهُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ۝٥٣

لوگو، (میں یہ بات تمھاری خیر خواہی کے لیے کہتا ہوں)، میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو اُسی کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ پھر کیا سمجھتے نہیں ہو؟ میری قوم کے لوگو، اپنے رب سے معافی مانگو، پھر اُس کی طرف پلٹو، وہ تم پر چھا جوں مینہ برسائے گا اور تمھاری قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ تم مجرم ہو کر روگردانی نہ کرو۔ اُنھوں نے جواب دیا: اے ہود، تم ہمارے پاس کوئی کھلی نشانی لے کر تو آئے

نے امتنان و احسان کے لیے فرمایا ہے کہ عادی طرف ہم نے کسی اجنبی شخص کو نہیں، بلکہ اُنھی کے بھائی ہود کو بھیجا تا کہ اُن پر ہماری حجت ہر لحاظ سے پوری ہو جائے۔

۱۸۰۔ توبہ کے دوار کان ہیں: ایک یہ کہ آدمی غلطی سے دست بردار ہو جائے اور دوسرا یہ کہ صحیح بات کی طرف پلٹ آئے۔ پہلے رکن کے لیے قرآن میں استغفار اور دوسرے کے لیے توبہ کا لفظ آتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... ان میں سے پہلے کی بنیاد خشیت پر ہے اور دوسرے کی محبت پر۔ پھر شعور اور احساس ان

کا لازمی جزو ہے۔ جب تک یہ تمام عناصر جمع نہ ہوں، مجرد توبہ توبہ یا استغفر اللہ کے ورد سے وہ

توبہ وجود میں نہیں آتی جو خدا کے ہاں قبولیت کا درجہ پائے۔“ (تدبر قرآن ۱۲۸/۴)

۱۸۱۔ یہ رسولوں کی دعوت پر اجتماعی توبہ کی برکتیں ہیں جو قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی بیان ہوئی ہیں، یعنی رزق و فضل اور سیاسی قوت میں اضافہ جس کے لیے اللہ تعالیٰ آسمان کے دروازے کھول دیتے اور توبہ کرنے والوں کے لیے زمین پر اقتدار اور تمکن کے راستے ہموار کر







ہود  
۱۱

إِنْ نَقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوِّ<sup>ط</sup> قَالَ إِنِّي أَشْهَدُ اللَّهَ  
وَأَشْهَدُ وَأَنتَ بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ<sup>۵۴</sup> مِنْ دُونِهِ فَكِدُونِي  
جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنْظَرُونَ<sup>۵۵</sup> إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُمْ<sup>ط</sup> مَا مِنْ  
دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا<sup>ط</sup> إِنْ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ<sup>۵۶</sup> فَإِنْ

نہیں ہو اور ادھر ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ محض تمہارے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو  
چھوڑنے والے نہیں ہیں اور نہ تمہاری بات ماننے والے ہیں۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ  
تمہارے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑی ہے۔ ہود نے کہا: میں خدا کو  
گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ جنہیں تم خدا کے ساتھ شریک بناتے ہو، میں اُن  
سے بالکل بری ہوں<sup>۱۸۳</sup>۔ سو تم سب مل کر، (جس طرح چاہو)، میرے خلاف چالیں چلو،  
پھر مجھے ذرا مہلت نہ دو۔ میں نے اللہ پر بھروسہ کر لیا ہے، اپنے اور تمہارے پروردگار  
پر۔ ہر جان دار کی چوٹی اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ میرا پروردگار یقیناً سیدھی راہ پر ہے<sup>۱۸۴</sup>۔

دیتے ہیں۔

۱۸۲ یعنی کوئی ایسا حسی معجزہ جو فیصلہ کن ہو جائے۔

۱۸۳ اُن لوگوں کی بات چونکہ انتہائی بے ہودہ تھی، اس لیے ہود علیہ السلام کی غیرت تو حید  
بھڑک اٹھی ہے اور اُنھوں نے پورے جوش و جذبے کے ساتھ شرک سے براءت کا اعلان کر دیا  
ہے۔ پھر آگے دیکھیے تو اسی بنا پر اُنھیں چیلنج بھی کر دیا ہے کہ تم اور تمہارے معبود میرے خلاف جو کر  
سکتے ہو، کر کے دیکھ لو۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ خدا پر سچا ایمان کیا ہوتا ہے اور میں کس کے  
بھروسے پر تو حید کی یہ دعوت لے کر اٹھا ہوں۔

۱۸۴ یعنی اُس کی معرفت کے لیے کج پیچ کے راستوں سے گزرنے اور اُس کی بارگاہ تک



تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ<sup>ط</sup> وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا<sup>٥٤</sup> إِنَّ رَبِّي عَلَى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيفٌ<sup>٥٥</sup>  
وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا<sup>٥٦</sup>  
وَنَجَّيْنَاهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ<sup>٥٨</sup>

اس پر بھی اعراض کر رہے ہو تو میں نے وہ پیغام تمہیں پہنچا دیا ہے جو مجھے دے کر تمہاری طرف بھیجا گیا ہے۔ اب میرا رب تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو اقتدار کا مالک بنائے گا اور تم اُس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے۔<sup>٥٥</sup> یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔ (پھر ہوا یہ کہ) جب ہمارا فیصلہ صادر ہو گیا تو ہم نے ہود کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت سے نجات دی اور اس طرح ایک نہایت سخت عذاب سے انھیں بچا لیا۔<sup>٥٦</sup> ٥٨-٥٠

رسائی کے لیے واسطے اور وسیلے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عقل و فطرت اُسے براہ راست پہچانتی ہے اور آدمی دل کی سچائی کے ساتھ اُس کی طرف متوجہ ہو جائے تو وہ بالکل سیدھی راہ پر اُس کے سامنے موجود ہوتا ہے۔

١٨٥ مطلب یہ ہے کہ اب عذاب استیصال آئے گا، تمہاری جڑ کاٹ دی جائے گی اور کوئی دوسری قوم تمہاری جگہ لینے کے لیے اٹھے گی۔ اپنی تمام قوت و شوکت کے باوجود تم خدا کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔

١٨٦ یہ عذاب کس طرح نازل ہوا؟ قرآن میں اس کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ سرما کے بادل رعد و برق کے ساتھ نمودار ہوئے اور باد صرصر آندھی اور طوفان بن کر پوری بستی پر ٹوٹ پڑی، یہاں تک کہ ہر چیز فنا ہو گئی۔





وَتِلْكَ عَادٌ فَفَسَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا  
أَمْرُ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ⑤۹ وَاتَّبَعُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ  
أَلَا إِنَّ عَادًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ ⑥۰ أَلَا بَعْدَ الْعَادِ قَوْمٌ هُودٌ  
وَإِلَى ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ  
إِلَهِ غَيْرِهِ هُوَ أَنشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا فَاسْتَغْفِرُوا لَهُ

یہ تھے عاد، انھوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں کا انکار کیا، اُس کے رسولوں کی بات  
نہیں مانی اور ہر جبار اور سرکش دشمن حق کے معاملے کی پیروی کرتے رہے۔ آخر کار  
اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی۔ سن لو، عاد نے  
اپنے پروردگار سے کفر کیا، سن لو کہ عاد دھتکار دیے گئے، ہود کی قوم کے لوگ! ۵۹-۶۰  
اسی طرح ثمود کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالح کو رسول بنا کر بھیجا۔ اُس نے  
انھیں دعوت دی کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود  
نہیں ہے۔ اُسی نے تمھیں زمین سے اٹھا کھڑا کیا اور اُس کی آبادی میں لگا دیا ہے۔

۱۸۷ اُن کی طرف اگرچہ ایک ہی رسول کی بعثت ہوئی تھی، مگر کوئی رسول بھی یہ دعوت اُن کے  
سامنے پیش کرتا، اُس کے ساتھ وہ یہی کرتے، اس لیے ایک رسول کی نافرمانی کو تمام رسولوں کی  
نافرمانی قرار دیا ہے۔

۱۸۸ یہ عاد کے بقایا میں سے ہیں۔ اسی بنا پر انھیں عاد ثانی کہا جاتا ہے۔ عرب کی قدیم اقوام  
میں سے یہ دوسری قوم ہے جس نے عاد کے بعد غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ ان کا مسکن شمال  
مغربی عرب کا وہ علاقہ ہے جسے الحجر کہا جاتا ہے۔ ان کے اور عاد کے اوصاف قرآن میں بھی اور  
عرب کی روایات میں بھی تقریباً ایک ہی جیسے بیان ہوئے ہیں۔



ثُمَّ تَوْبُوا إِلَيْهِ ۖ إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ﴿٦١﴾ قَالُوا يَصْلِحْ قَدْ كُنْتَ  
فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَذَا أَتَنْهَانَا أَنْ نَعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّآ  
لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ﴿٦٢﴾ قَالَ لِقَوْمٍ أَرَأَيْتُمْ إِنْ  
كُنْتُمْ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّي وَآتَيْنِي مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ  
اللّهِ إِنْ عَصَيْتُهُ ۚ قَفَّ ۚ فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ ﴿٦٣﴾

اس لیے اُس سے معافی چاہو، پھر اُس کی طرف رجوع کرو۔ میرا پروردگار قریب بھی  
ہے اور (اپنے بندوں کی) دعائیں قبول کرنے والا بھی۔ اُنھوں نے جواب دیا: اے  
صالح، اس سے پہلے تو ہمارے اندر تم سے بڑی امیدیں کی جاتی تھیں۔ (لیکن تم اچھے  
نکلے) کیا اب ہمیں اُن معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتے ہو؟<sup>۱۸۹</sup> جنھیں ہمارے باپ  
دادا پوجتے آئے ہیں؟ ہم تو اُس چیز کے باعث جس کی طرف تم ہمیں بلارہے ہو،<sup>۱۹۰</sup> بڑے  
سخت شبہ میں ہیں جس نے خلیجان میں ڈال دیا ہے۔ اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو،  
ذرا غور کرو، اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور اُس نے  
مجھے اپنی طرف سے (خاص اپنی) رحمت سے بھی نواز دیا ہے تو مجھے خدا کی پکڑ سے کون  
بچائے گا، اگر میں اُس کی نافرمانی کروں۔ سو (جو کچھ تم چاہتے ہو،<sup>۱۹۱</sup> اُس سے تو) تم  
بچائے گا، اگر میں اُس کی نافرمانی کروں۔ سو (جو کچھ تم چاہتے ہو،<sup>۱۹۲</sup> اُس سے تو) تم

۱۸۹ اصل الفاظ ہیں: 'أَتَنْهَانَا أَنْ نَعْبُدَ'۔ 'إِنْ' میں 'عَنْ' محذوف ہو گیا ہے، یعنی 'أَتَنْهَانَا

عَنْ أَنْ نَعْبُدَ'۔

۱۹۰ یعنی تمام معبودوں کو چھوڑ کر ایک خدا کی پرستش جس سے ہر پیغمبر نے اپنی دعوت کی ابتدا

کی ہے۔

۱۹۱ یہی الفاظ پیچھے نوح علیہ السلام کی سرگذشت میں بھی آئے ہیں۔ وہاں ہم نے ان کی



وَلَيَقُومَ هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيبٌ ﴿٦٣﴾ فَعَقَرُوهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ۖ ذَٰلِكَ وَعَدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ ﴿٦٥﴾ فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَالِحًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَمِنَ

میری بربادی ہی میں اضافہ کرو گے۔ ۶۱-۶۳

میری قوم کے لوگو، یہ اللہ کی اونٹنی ہے، تمہارے لیے نشانی کے طور پر، لہذا اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی پھرے اور کسی برے ارادے سے اس کو ہاتھ نہ لگانا، ورنہ کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ تم پر عذاب آ جائے گا۔<sup>۱۹۳</sup> پھر ہوا یہ کہ انھوں نے اُس کی کوچیں کاٹ دیں۔<sup>۱۹۴</sup> اس پر صالح نے خبردار کر دیا کہ اب تین دن اپنی اس بستی میں اور رہ بس لو۔ یہ دھمکی جھوٹی ہونے والی نہیں ہے۔<sup>۱۹۵</sup> چنانچہ جب ہمارا حکم صادر ہو گیا تو ہم

وضاحت کر دی ہے۔

۱۹۲ اشارہ ہے اُن توقعات کی طرف جو اُن کی قوم کے لوگ اُن سے رکھتے تھے کہ اُن سے باپ دادا کا نام روشن ہوگا اور اُن کے آبائی دین اور قومی روایات کی عزت بڑھے گی۔

۱۹۳ مطلب یہ ہے کہ خدا کے حکم پر میں نے اپنی اونٹنیوں میں سے ایک اونٹنی نامزد کر دی ہے۔ یہ خدا کی نذر ہے، چنانچہ اس لحاظ سے اللہ کی اونٹنی ہے۔ تمہارے لیے یہ خدا کے عذاب کی نشانی ہے۔ اس کو گزند پہنچاؤ گے تو سمجھ لو کہ امان کی دیوار گر گئی۔ اس کے بعد قہر الہی کے سیلاب کو کوئی چیز تمہاری بستیوں میں داخل ہونے سے روک نہیں سکے گی۔

۱۹۴ اونٹنی کو مارنے کا جرم اگرچہ اُن کے ایک سرکش سردار نے کیا تھا، مگر قرآن نے اُسے پوری قوم کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باقی متمردين بھی اُس پر راضی تھے۔

۱۹۵ یہ اونٹنی قوم کی سرکشی کو جانچنے کا ایک پیمانہ تھی۔ اس کو مارنے سے واضح ہو گیا کہ یہ لوگ



خَزِي يَوْمِيذٍ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ﴿٦٦﴾ وَآخِذَ الَّذِينَ  
ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جِثَمِينَ ﴿٦٧﴾ كَانَتْ لَمْ يَغْنَوْا فِيهَا  
أَلَا إِنَّ تَمُودًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ أَلا بُعْدَ لَشَمُودَ ﴿٦٨﴾  
وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَى قَالُوا سَلَامًا قَالَ

نے خاص اپنی رحمت سے صالح کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے،  
(اُس عذاب سے) نجات دی اور اُس دن کی رسوائی سے بچا لیا۔<sup>۱۹۷</sup> اِس میں شبہ نہیں کہ تیرا  
پروردگار ہی قوی اور زبردست ہے۔<sup>۱۹۸</sup> اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا، اُن کو بڑے زور کی  
کڑک نے آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اِس طرح اوندھے پڑے رہ گئے کہ گویا وہاں  
کبھی بسے ہی نہیں تھے۔ سن لو، شمود نے اپنے پروردگار سے کفر کیا! سن لو کہ شمود دھتکار  
دیے گئے! ۶۴-۶۸

(اور لوط کے معاملے میں یہ ہوا کہ پہلے) ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس خوش خبری

اب مزید مہلت کے مستحق نہیں رہے۔ چنانچہ صالح علیہ السلام نے اپنے پروردگار کے ایما سے  
اُنھیں یہ نوٹس دے دیا۔

۱۹۶ یعنی عذاب کا حکم صادر ہو گیا۔ اِس کے لیے اصل میں لفظ 'أمر' آیا ہے۔ اِس میں بلاغت  
یہ ہے کہ جیسے ہی حکم صادر ہوا، اُس کے ساتھ ہی عذاب آ گیا۔ گویا عذاب اُسی ایک لفظ کے اندر  
چھپا ہوا تھا۔

۱۹۷ اِس جملے میں ایک جگہ فعل اور ایک جگہ اُس کا متعلق عربیت کے اسلوب پر محذوف ہے۔  
ہم نے ترجمے میں اُنھیں کھول دیا ہے۔

۱۹۸ اِس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے تسلی ہے کہ مطمئن رہو، اُس





ہود  
۱۱

سَلَّمَ فَمَا لَبِثَ أَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِيدٍ ۝۶۹ فَلَمَّا رَأَىٰ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ  
إِلَيْهِ نَكَرَ هُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۖ قَالُوا لَا تَخَفْ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ  
قَوْمِ لُوطٍ ۖ ۝۷۰ وَأَمْرَاتُهُ قَائِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَلَبَسَ نَهَابًا سِجْقًا ۖ وَمِنْ  
وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ ۖ ۝۷۱ قَالَتْ يَوِیْلَتِي ءَالِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ وَهَذَا

لے کر پہنچے تھے۔ اُنھوں نے کہا: سلامتی ہو۔ ابراہیم نے جواب دیا: تم پر بھی سلامتی  
ہو۔ پھر کچھ دیر نہ گزری کہ ابراہیم بھنا ہوا بچھڑا (اُن کی ضیافت کے لیے) لے آیا۔<sup>۱۹۹</sup> لیکن  
جب دیکھا کہ اُن کے ہاتھ اُس کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں تو اُن سے اجنبیت محسوس  
کی اور دل میں اُن سے کچھ ڈرنے لگا۔ اُنھوں نے کہا: ڈرو نہیں، ہم قوم لوط کی طرف  
بھیجے گئے ہیں۔ ابراہیم کی بیوی پاس ہی کھڑی تھی، سو (خوشی سے) ہنس پڑی۔ پھر ہم  
نے اُس کو اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی بشارت دی۔<sup>۲۰۰</sup> وہ بولی: ہاے شامت!

کی یہی قوت و عزت قریش کے معاملے میں بھی ظاہر ہوگی اور بالآخر وہی غالب رہے گا۔

۱۹۹ اس سے سیدنا ابراہیم کی فیاضی اور مہمان نوازی کا اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے  
مہمانوں کے لیے فوراً گلے کا ایک بچھڑا ذبح کر دیا۔ اُن کے سامنے، ظاہر ہے کہ اُس کا کچھ گوشت  
پیش کیا گیا ہوگا، مگر قرآن نے ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کے اس پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے  
گوشت کے بجائے بچھڑے کا ذکر کیا ہے۔

۲۰۰ ڈرنے کی وجہ غالباً یہ اندیشہ تھا کہ کھانا نہیں کھا رہے تو ہو سکتا ہے کہ فرشتے ہوں اور اگر  
فرشتے ہیں اور انسانی صورت میں آئے ہیں تو کہیں میری یا میرے گھر والوں کی کسی غلطی پر تنبیہ  
کے لیے تو نہیں آئے۔

۲۰۱ انسان اگر خوف کی حالت میں ہو اور خوف کا سبب اچانک دور ہو جائے تو اس طرح کی  
ہنسی بعض اوقات بے اختیار آ جاتی ہے۔



بَعْلِي شَيْخًا إِنَّ هَذَا الشَّيْءُ عَجِيبٌ ۝۴۲ قَالُوا اتَّعَجِبِينَ مِنْ أَمْرِ  
اللَّهِ رَحِمَتُ اللَّهِ وَبَرَكَتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ حَمِيدٌ مَجِيدٌ ۝۴۳  
فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبُشْرَى يُجَادِلُنَا  
فِي قَوْمٍ لُوطٍ ۝۴۴ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ ۝۴۵ يَا إِبْرَاهِيمُ

کیا میں بچہ جنوں گی، جب کہ میں خود بھی بڑھیا ہوں اور یہ میرے شوہر بھی بوڑھے ہو چکے ہیں؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ فرشتوں نے کہا: خدا کی بات پر تعجب کرتی ہو؟ ابراہیم کے گھر والو، تم پر تو اللہ کی رحمت اور اُس کی برکتیں ہیں۔ یقیناً اللہ ستودہ صفات ہے، وہ بڑی شان والا ہے۔ ۶۹-۷۳

پھر جب ابراہیم کا خوف دور ہوا اور اُسے بشارت مل گئی تو وہ قوم لوط کے بارے میں ہم سے بحث کرنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم بڑا بردبار، بڑا درد مند اور اپنے

۲۰۲ فرشتوں نے یہ خوش خبری خدا کی طرف سے دی تھی، اس لیے فرمایا ہے کہ ہم نے خوش خبری دی۔ استاذ امام کے الفاظ میں اس خوش خبری کے اندر عنایت خاص اور تکمیل مسرت کے جو گونا گوں پہلو ملحوظ ہیں، وہ محتاج بیان نہیں اور بیٹے کے ساتھ پوتے کی بشارت نے گویا یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ بیٹا زندہ رہے گا، اچھی عمر پائے گا اور اُس کے صلب سے نام ور پوتا بھی پیدا ہوگا۔

۲۰۳ یہ اظہار تعجب جن الفاظ میں ہوا، اُن کے پیچھے یہ خواہش صاف نظر آ رہی ہے کہ بشارت کے ظہور میں جو ظاہری رکاوٹیں ہیں، اُن کے بارے میں بھی اطمینان ہو جائے کہ اُن کے باوجود یہ بشارت پوری ہو جائے گی۔

۲۰۴ اصل الفاظ ہیں: رَحِمَتُ اللَّهِ وَبَرَكَتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ۔ ان میں عَلَیْكُمْ کی ضمیر جمع مذکر ہے۔ عربی زبان میں گھر کی عورتوں کے لیے یہی شایستہ انداز خطاب ہے۔ اس میں پردہ داری اور ادب و احترام کے جو تقاضے ملحوظ ہیں، اُن کا اندازہ ہر صاحب ذوق آسانی کے



اعْرِضْ عَنْ هَذَا إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَإِنَّهُمْ لَاتِلْمُهُمْ عَذَابُ  
غَيْرِ مُرْدُوْدٍ ۝۴۶

پروردگار کی طرف بڑا دھیان رکھنے والا تھا — ابراہیم، یہ بحث چھوڑو، تمہارے پروردگار کا حکم ہو چکا ہے اور اب ان لوگوں پر وہ عذاب آنے والا ہے جو لوٹایا نہیں جاتا۔ ۷۴-۷۶  
ساتھ کر سکتا ہے۔

۲۰۵ یہ بحث کیا تھی اور اپنے اندر ابراہیم علیہ السلام کی دردمندی، محبت، دل سوزی، غم خواری اور اپنے پروردگار سے ناز و اعتماد کے کیا کیا پہلو سمیٹے ہوئے تھی، انھیں دیکھنے کے لیے بائبل میں اس کی روداد پڑھنی چاہیے۔ پیدائش میں ہے:

”... پر ابراہام خداوند کے حضور کھڑا ہی رہا۔ تب ابراہام نے نزدیک جا کر کہا: کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ شاید اُس شہر میں پچاس راست باز ہوں۔ کیا تو اُسے ہلاک کرے گا اور اُن پچاس راست بازوں کی خاطر جو اُس میں ہوں، اُس مقام کو نہ چھوڑے گا؟ ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک بد کے برابر ہو جائیں۔ یہ تجھ سے بعید ہے۔ کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا؟ اور خداوند نے فرمایا کہ اگر مجھے سدوم میں شہر کے اندر پچاس راست باز ملیں تو میں اُن کی خاطر اُس مقام کو چھوڑ دوں گا۔ تب ابراہام نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھیے، میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی، اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں۔ شاید پچاس راست بازوں میں پانچ کم ہوں۔ کیا اُن پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست کرے گا؟ اُس نے کہا: اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اُسے نیست نہیں کروں گا۔ پھر اُس نے اُس سے کہا کہ شاید وہاں چالیس ملیں۔ تب اُس نے کہا کہ میں اُن چالیس کی خاطر بھی یہ نہیں کروں گا۔ پھر اُس نے کہا: خداوند ناراض نہ ہو تو میں کچھ اور عرض کروں۔ شاید وہاں تیس ملیں۔ اُس نے کہا: اگر مجھے وہاں تیس بھی ملیں تو بھی ایسا نہیں کروں گا۔ پھر اُس نے کہا، دیکھیے، میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی۔ شاید وہاں





وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سَيِّئًا بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا  
وَقَالَ هَذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ۖ وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ وَمِنْ  
قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ۖ قَالَ لَيَقُومَنَّ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ

(اس کے بعد) جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس پہنچے تو اُن کے آنے سے وہ بہت  
رنجیدہ اور دل تنگ ہوا اور کہنے لگا کہ یہ تو بڑی مصیبت کا دن ہے۔ اُس کی قوم کے  
لوگ (یہ دیکھ کر کہ خوب روڑے آئے ہیں)، بے اختیار دوڑتے ہوئے اُس کے پاس  
آپہنچے۔ پہلے سے وہ ایسی ہی بدکاریوں کے خوگر تھے۔ اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو،

میں ملیں۔ اُس نے کہا: میں میں کی خاطر بھی اُسے نیست نہیں کروں گا۔ تب اُس نے کہا:  
خداوند ناراض نہ ہوں تو میں ایک بار اور کچھ عرض کروں۔ شاید وہاں دس ملیں۔ اُس نے کہا: میں  
دس کی خاطر بھی اُسے نیست نہیں کروں گا۔“ (۱۸: ۲۲-۳۳)

۲۰۶ ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد جو عذاب آتا ہے،  
اُس کی نوعیت یہی ہوتی ہے۔ وہ جب ایک مرتبہ آ جاتا ہے تو اُسی وقت جاتا ہے، جب کچھ باقی  
نہیں رہتا۔

۲۰۷ حضرت لوط سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ اُن کی قوم اُس علاقے میں رہتی تھی  
جو شام کے جنوب میں عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے اور آج کل شرق اردن کہلاتا ہے۔  
بائبل میں اُن کے سب سے بڑے شہر کا نام سدوم بتایا گیا ہے۔ لوط علیہ السلام کا تعلق اُس قوم کے  
ساتھ وہی تھا جو حضرت موسیٰ کا قوم فرعون کے ساتھ تھا۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں اُن کی  
بیوی کا ذکر جس اسلوب میں ہوا ہے، اُس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اُن کی شادی اُسی قوم کے اندر  
ہوئی تھی اور اس لحاظ سے وہ اُنھی کے ایک فرد بن چکے تھے۔

۲۰۸ آگے کی آیتوں سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ فرشتے نہایت خوب رو اور نوخیز لڑکوں کی





ہود  
۱۱

أَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزَوْنَ فِي ضَيْفِي ۖ أَلَيْسَ مِنْكُمْ  
رَجُلٌ رَّشِيدٌ ۝۸۸ قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِي بَيْتِكَ مِنْ حَقٍّ  
وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ ۝۸۹ قَالَ لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِي إِلَىٰ رُكْنٍ

یہ میری بیٹیاں ہیں۔ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں۔ اس لیے خدا کا خوف کرو اور  
میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں ہے؟<sup>۲۰۹</sup>  
انہوں نے جواب دیا: تمہیں معلوم ہی ہے کہ تمہاری بیٹیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے  
اور تم اچھی طرح جانتے ہو جو کچھ ہم چاہتے ہیں۔ لوط نے کہا: اے کاش، میرے پاس

صورت میں آئے تھے۔ حضرت لوط جانتے تھے کہ اُن کی قوم اس معاملے میں کیسی بدکردار اور کتنی  
بے حیا ہو چکی ہے۔ یہی سبب تھا کہ اُن کو دیکھ کر وہ سخت پریشان ہو گئے۔

۲۰۹ لوط علیہ السلام کی طرف سے یہ اُن اوباشوں کے لیے کیا کوئی پیش کش تھی؟ استاذ امام  
لکھتے ہیں:

”... یہ پیش کش نہیں، بلکہ اپنی قوم کے ضمیر کو جگانے اور جھنجھوڑنے کے لیے گویا حضرت لوط کی  
آخری بے تابانہ فریاد تھی کہ وہ سوچیں کہ ایک اللہ کا بندہ یہ ہے جو اپنے مہمانوں کی عزت کے  
معاملے میں اتنا حساس ہے کہ اُس کے لیے اپنی عزیز سے عزیز شے کو قربان کرنے پر تیار ہے اور  
ایک ہم ہیں کہ اندھے ہو کر اُس کے مہمانوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اللہ کا  
خوف بھی یاد دلایا اور آخر میں اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيدٌ کہہ کر گویا پوری طرح اُن پر حجت  
تمام کر دی۔ اس لیے کہ کسی کے اندر اگر رائی برابر بھی حق کی حمیت و حمایت کا احساس ہوتا تو اس  
فقرے کے بعد تو اُس کو ضرور حرکت میں آ جانا تھا، لیکن جب اس کے بعد بھی کوئی ضمیر بیدار نہیں  
ہوا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ کسی کے اندر حس انسانیت و شرافت سرے سے باقی ہی نہیں رہ  
گئی تھی۔“ (تدبر قرآن ۱۵۸/۴)



شَدِيدٌ ۸۰ قَالُوا يَلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْا اِلَيْكَ فَاَسْرِ  
 بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدًا اِلَّا اَمْرًا تَكُ تُاِنَّهُ  
 مُصِيبُهُمَا مَا اَصَابَهُمْ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ۸۱  
 فَلَمَّا جَاءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَلِيْهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلِيْهَا حِجَابًا  
 مِّنْ سَجِّيلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ۸۲ مُّسَوِّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا هِيَ مِنْ

تم سے مقابلے کی طاقت ہوتی یا میں کسی مضبوط سہارے کی پناہ لے سکتا۔ فرشتوں نے  
 کہا: اے لوط، ہم تمہارے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔ (مطمئن رہو)، یہ تمہارے  
 قریب بھی نہیں آسکیں گے۔ سواپنے اہل و عیال کو لے کر کچھ رات رہے نکل جاؤ اور تم  
 میں سے کوئی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے۔ تمہاری بیوی نہیں، اس لیے کہ اُس پر وہی کچھ  
 گزرنے والا ہے جو ان لوگوں پر گزرنا ہے۔ ان (پر عذاب) کے لیے صبح کا وقت  
 مقرر ہے۔ (تم پریشان کیوں ہوتے ہو)؟ کیا صبح قریب نہیں ہے؟ ۷۷-۸۱

پھر جب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے اُس بستی کو تلیٹ کر کے رکھ دیا اور اُس پر پکی ہوئی  
 مٹی کے پتھر برسائے، تہ برتہ، جو تمہارے پروردگار کے ہاں نشان لگائے ہوئے تھے ۲۱۳

۲۱۰ مطلب یہ ہے کہ بات کو الجھانے کی کوشش نہ کرو۔ ہم یہاں تمہاری بیٹیوں کو بیاہ کر لے  
 جانے کے لیے نہیں آئے اور تم جانتے ہو کہ اُس کے بغیر ہمارا کوئی حق اُن پر قائم نہیں ہوتا۔ اس  
 لیے جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں، کرنے دو، اُس کی راہ میں رکاوٹ نہ بنو۔

۲۱۱ یہ انتہائی اضطراب، مایوسی اور بے بسی کا جملہ ہے جس نے گویا آخری حجت تمام کر دی۔  
 چنانچہ فرشتوں نے بھی اس کے بعد حقیقت سے پردہ اٹھا دیا۔

۲۱۲ پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کی قومیں بالعموم پتھر برسائے والی آندھی



## الظَّالِمِينَ بِبَعِيدٍ ۝۸۳

وَالِی مَدِیْنِ اَخَاهُمْ شُعَبًا ط قَالَ یَقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ  
اِلٰهٍ غَیْرِهِ ط وَلَا تَنْقُصُوا الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ اِنِّیْ اَرٰیْکُمْ بِخَیْرٍ وَّ اِنِّیْ  
اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ ۝۸۴ وَ یَقَوْمِ اَوْفُوا الْمِکْیَالَ

اور وہ ان ظالموں سے کچھ زیادہ دور نہیں تھے ۸۲-۸۳

اور مدین کی طرف اُن کے بھائی شعیب کو رسول بنا کر بھیجا۔ اُس نے دعوت دی  
کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے اور ناپ  
اور تول میں کمی نہ کرو۔ میں تمہیں خوش حال دیکھ رہا ہوں، مگر مجھے تم پر ایک ایسے دن

سے تباہ کی گئی ہیں۔ قرآن نے دوسری جگہ اسے 'حَاصِب' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اُسی کا بیان ہے۔

۲۱۳ یعنی پہلے سے مقدر کر دیے گئے تھے کہ یہ پتھر قوم لوط کی بستی پر برسانے کے لیے ہیں۔

۲۱۴ مطلب یہ ہے کہ ہماری بھیجی ہوئی باد تند نے اُنھی کے پاؤں میں سے اٹھا کر اُن کے

سروں پر برسا دیے۔ اُن کے لانے کے لیے ہمیں کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑا۔

۲۱۵ یہ بستی ابراہیم علیہ السلام کے صاحب زادے مدیان کے نام پر مدین یا مدیان کہلاتی تھی،

جو اُن کی تیسری بیوی قطورا کے بطن سے تھے۔ اس میں زیادہ تر اُنھی کی نسل آباد تھی۔ اس کا اصل

علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا، مگر

اس کا کچھ سلسلہ جزیرہ نماے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی پھیلا ہوا تھا۔ اُس زمانے کی دو بڑی تجارتی

شاہ راہیں اسی علاقے سے گزرتی تھیں، اس وجہ سے مدین کے لوگوں نے بھی تجارت میں بہت

ترقی کر لی تھی۔

۲۱۶ اس سے معلوم ہوا کہ شرک کے بعد جو سب سے بڑی برائی سیدنا شعیب کی قوم میں پیدا

ہو چکی تھی، وہ یہی ناپ تول میں کمی تھی جسے اُن ظالموں نے اپنے لیے ہنر بنالیا تھا۔



وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْتُوا فِي  
الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝۸۵ بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝  
وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ۝۸۶ قَالُوا يَشْعِيبُ أَصْلُوكَ تَأْمُرُكَ أَنْ  
تَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَأَنْ نَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ إِنَّكَ

کے عذاب کا اندیشہ ہے جو گھیرنے والا ہے۔ میری قوم کے لوگو، ناپ اور تول کو ٹھیک  
انصاف کے ساتھ پورا رکھو اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں فساد نہ  
پھیلانے پھرو۔ اللہ کا دیا ہوا نفع ہی تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم سچے مومن ہو۔ (مجھے  
سمجھانا ہی ہے) اور میں تم پر نگران مقرر نہیں کیا گیا ہوں۔ انہوں نے جواب دیا: اے  
شعیب، کیا تمہاری نماز تمہیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے  
باپ دادا پوجتے رہے یا اپنے مال میں ہم اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں؟

۲۱۷ یہ انہوں نے اس لیے فرمایا کہ وہ خدا کے رسول تھے اور رسولوں کے باب میں یہی  
سنت الہی ہے جو ہمیشہ جاری رہی۔

۲۱۸ یعنی میرا کام تبلیغ و دعوت اور انداز و بشارت ہے۔ اس سے زیادہ میری کوئی ذمہ داری  
نہیں ہے۔ مجھے تم پر داروغہ نہیں بنایا گیا کہ میں ضرور ہی تمہیں راہ راست پر لے آؤں۔

۲۱۹ یہ درحقیقت ایک طنزیہ فقرہ ہے اور نماز کا ذکر اس میں دین داری کی علامت کے طور پر  
ہوا ہے، اس لیے کہ اس کا سب سے نمایاں ظہور نماز ہی کی صورت میں ہوتا ہے۔ استاذ امام لکھتے  
ہیں:

”...مطلب یہ کہ تم نماز وغیرہ پڑھتے تھے تو اس سے خیال تو یہ ہوتا تھا کہ تم سے باپ دادا کا  
نام بھی روشن ہوگا اور قوم کے لیے بھی کچھ کامیابی کی راہیں کھلیں گی، مگر خوب نکلی تمہاری یہ نماز کہ  
وہ ماضی و حاضر، سب کی بساط لپیٹ کر رکھ دینا چاہتی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت





ہود  
۱۱

لَا نَتَّ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ ⑤ قَالَ يَقُومُ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَى  
بَيْنَةٍ مِّن رَّبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۖ وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ  
إِلَىٰ مَا أَنهَكُم عَنْهُ ۖ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۖ وَمَا تَوْفِيقِي  
إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ⑥ وَيَقُومُ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ

(تمھاری نگاہ میں سب اگلے پچھلے بے وقوف اور گم راہ تھے اور ہمارے اندر) بس تمھی  
ایک دانش مند اور راست باز آدمی رہ گئے ہو! اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو، ذرا غور تو  
کرو، اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشن دلیل<sup>۲۲۰</sup> پر ہوں، پھر اُس نے (وحی  
کی صورت میں) مجھے ایک رزق حسن<sup>۲۲۱</sup> بھی اپنی طرف سے عطا فرما دیا تو اس کے سوا  
کس چیز کی دعوت دوں؟ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تمھاری مخالفت کر کے وہی کام خود  
کروں جس سے تمھیں روک رہا ہوں۔<sup>۲۲۲</sup> میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں، جس حد تک  
کر سکوں۔ اس کی توفیق مجھے اللہ ہی سے ملے گی۔ میں نے اُسی پر بھروسہ کیا ہے اور

شعیب کی نیک اور پاکیزہ زندگی سے چونکہ مفسدین کو اندیشہ تھا کہ وہ لوگ متاثر ہوں گے جو  
بالطبع نیک ہیں، اس وجہ سے اُنھوں نے اُن کی نیکیوں ہی کو اپنے طنز کا ہدف بنالیا، گویا سارے  
فساد کی جڑ وہی ہیں۔“ (تدبر قرآن ۱۶۱/۴)

۲۲۰ یعنی نور فطرت جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔

۲۲۱ وحی کو رزق حسن سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی روحانی زندگی کی بقا اسی پر منحصر

ہے۔

۲۲۲ یہ جواب شرط ہے جو اصل میں محذوف ہے۔

۲۲۳ یعنی تمھارے خریداروں کو تم سے بدگمان کر کے بستی میں فساد پیدا کر دوں، دراں حالیکہ



شَقَاقِي أَنْ يُصِيبَكُمْ مِثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ  
صَالِحٍ ۖ وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِنْكُمْ بِبَعِيدٍ ۝۸۹ ۖ وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ  
تَوْبُوا إِلَيْهِ ۖ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ ۝۹۰ ۖ قَالُوا لَشُعَيْبٌ مَانِقَةٌ  
كَثِيرًا مِمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ

اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ میری قوم کے لوگو، میرے خلاف تمھاری ہٹ دھرمی  
کہیں یہ نوبت نہ پہنچا دے کہ تم پر بھی وہی آفت آ پڑے جو نوح کی قوم یا ہود کی  
قوم یا صالح کی قوم پر آ پڑی تھی اور لوط کی قوم تو تم سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ اور  
دیکھو، (خیریت چاہتے ہو تو) اپنے پروردگار سے معافی چاہو، پھر اُس کی طرف پلٹ  
آؤ۔ ۲۲۴ حقیقت یہ ہے کہ میرا پروردگار نہایت مہربان اور بڑی محبت کرنے والا ہے۔ ۲۲۵  
اُنھوں نے جواب دیا: اے شعیب، تمھاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ۲۲۶  
ہم تو دیکھتے ہیں کہ ہمارے درمیان تم ایک کمزور آدمی ہو، تمھاری برادری نہ ہوتی تو

تم سے کہہ رہا ہوں کہ لَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ۔

۲۲۴ ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ توبہ کے لیے استغفار اور اصلاح، دونوں ضروری ہیں۔ یہ  
اُنھی کی ہدایت فرمائی ہے۔

۲۲۵ یہ ترغیب و تشویق بھی ہے اور قبولیت توبہ کی بشارت بھی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مدعا یہ ہے کہ تمھارے جرائم کتنے ہی سنگین ہوں، لیکن جب تم صدق دل سے اُس کی  
طرف رجوع کرو گے تو وہ تمھیں ٹھکرائے گا نہیں، بلکہ معاف کر کے اپنی رحمتوں سے نوازے گا۔

وہ نہایت مہربان اور محبت کرنے والا ہے۔“ (تدبر قرآن ۱۶۳/۴)

۲۲۶ لوگوں کو اُن کے مالوفات کے خلاف کوئی دعوت دی جائے تو وہ بالعموم اسی طرح کا تبصرہ  
کرتے ہیں۔ اس میں ایک نوعیت کی تعریض بھی ہوتی ہے کہ تمھاری باتیں سمجھنے کی کہاں ہیں کہ







وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ۙ ۙ اِلٰى فِرْعَوْنَ  
وَمَلَاِئِهٖ فَاتَّبَعُوْا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَا اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ۙ ۙ يَقْدُمُ  
قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ فَاورَدَهُمُ النَّارَ ۚ وَبِئْسَ الْوَرْدُ الْمُوْرُوْدُ ۙ ۙ  
وَاتَّبَعُوْا فِيْ هٰذِهِ لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ ۙ بِئْسَ الرَّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ۙ ۙ

اسی طرح موسیٰ کو ہم نے اپنی نشانیوں کے ساتھ اور ایک کھلی ہوئی سند<sup>۲۲۷</sup> کے ساتھ فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا تو اُنھوں نے فرعون کی بات مانی، دراصل حالیکہ فرعون کی بات راست نہیں تھی۔ قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور اُنھیں دوزخ میں لے جاتا رہے گا۔ کیا ہی برا گھاٹ ہے جس پر وہ اتریں گے! اُن کے پیچھے دنیا میں بھی لعنت لگا دی گئی اور آخرت کے دن بھی۔ کیا ہی برا صلہ ہے جو اُنھیں دیا گیا! <sup>۲۲۸</sup> ۹۶-۹۹

کوئی معقول آدمی اُن کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ ایسی مہمل اور دور از کار باتیں کب کسی کی سمجھ میں آتی ہیں۔

۲۲۷ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے اور اس سے عصا کا معجزہ مراد ہے۔ اس لیے کہ یہی وہ سند ماموریت تھی جس نے ساحروں کے مقابلے میں ایک حجت قاہرہ بن کر موسیٰ علیہ السلام کے دعوے نبوت کو بالکل آخری درجے میں ثابت کر دیا تھا۔ آیت میں اسی لحاظ سے اس کو سُلْطٰنٌ مُّبِينٌ سے تعبیر فرمایا ہے۔

۲۲۸ موسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت سورہ یونس میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے اور دوسرے پیغمبروں کا حوالہ بالا جملہ آیا ہے۔ اس سورہ میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں سورتیں ایک دوسرے کی تکمیل کر رہی ہیں۔ قرآن مجید کی سورتوں میں اسی طرح کی چیزیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ دونوں سورتیں توام ہیں۔





ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْقُرٰى نَقُصُّهُ عَلَيْكَ مِنْهَا قَائِمٌ وَحَصِيْدٌ ۝۱۰۰  
وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ فَمَا اَغْنَتْ عَنْهُمْ اِلٰهَتُهُمْ  
الَّتٰى يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَاءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَمَا  
زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ۝۱۰۱ وَكَذٰلِكَ اَخَذُ رَبُّكَ اِذَا اَخَذَ الْقُرٰى  
وَهِيَ ظَالِمَةٌ اِنْ اَخَذَهَا اِلَيْمٌ شَدِيْدٌ ۝۱۰۲ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ

یہ ان بستیوں کی سرگزشتیں ہیں جو ہم تمہیں سنارہے ہیں۔ ان میں سے بعض کھڑی  
ہیں اور بعض کی فصل کٹ چکی ہے۔ ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ انہوں نے خود  
اپنے اوپر ظلم کیا تھا۔ پھر تیرے پروردگار کا حکم صادر ہوا تو ان کے وہ معبود ان کے کچھ بھی  
کام نہ آئے جنہیں خدا کے سوا پکارتے تھے۔ ان کی بربادی کے سوا انہوں نے ان لوگوں  
کے حق میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا۔ تیرا پروردگار جب بستیوں کو پکڑتا ہے اور وہ ظلم کر  
رہی ہوتی ہیں تو اُس کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ کہ اُس کی پکڑ بڑی دردناک اور

۲۲۹ یہاں سے آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین کو اُس سبق کی طرف توجہ دلائی جا  
رہی ہے جو ان سرگزشتوں سے انہیں حاصل کرنا چاہیے جو پیچھے بیان ہوئی ہیں۔

۲۳۰ اصل میں 'قَائِمٌ' اور 'حَصِيْدٌ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان سے کیا مراد ہے؟  
استاذ امام لکھتے ہیں:

”... 'قَائِمٌ' کی ایک مثال مصر ہے جس کے اندر سے فرعون اور اُس کی قوم کو خدا نے نکالا اور  
لے جا کر سمندر میں غرق کر دیا۔ مکان قائم رہ گئے، مکیں ناپید ہو گئے۔ 'حَصِيْدٌ' سے مراد قوم  
ہود اور قوم لوط وغیرہ کی بستیاں ہیں جن کے مکان و مکیں سب ناپید ہو گئے۔ صرف کسی کسی کے  
کچھ آثار اپنے مکیں کی بدبختی کی داستان عبرت سنانے کے لیے رہ گئے۔“

(تدبر قرآن ۴/۱۷۰)



خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ ۖ ذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذَٰلِكَ يَوْمٌ  
مَّشْهُودٌ ۝ (۱۰۳) وَمَا نُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ مُّعَدُّودٍ ۝ (۱۰۴) يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ  
نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ ۝ (۱۰۵) فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا  
فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ۝ (۱۰۶) خُلِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ

سخت ہے۔ اس میں یقیناً اُن لوگوں کے لیے بڑی نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈریں۔ وہ ایک ایسا دن ہے جس کے لیے سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے اور وہ حاضری کا دن ہوگا۔ ہم اُس کو بس ایک گنتی کی مدت کے لیے ٹال رہے ہیں۔ جب وہ دن آجائے گا تو کوئی شخص خدا کی اجازت کے بغیر کلام نہ کر سکے گا۔ پھر لوگوں میں سے کچھ بد بخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت۔ سو جو بد بخت ہوں گے، وہ دوزخ میں جائیں گے۔ اُنھیں وہاں چیخنا اور چلانا ہے۔ وہ اُسی میں پڑے رہیں گے، جب تک

۲۳۱ یعنی سب کی حاضری کا دن تاکہ معاملے کے تمام فریق سامنے موجود ہوں اور جو کچھ فیصلہ سنایا جائے، پورے انصاف کے ساتھ سنایا جائے۔

۲۳۲ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ پر نبوت کا خاتمہ بجائے خود اس بات کی علامت ہے کہ قیامت اب زیادہ دور نہیں ہے اور یہ فی الواقع ایک گنتی کی مدت ہی ہے جس کے لیے اُسے موخر کیا گیا ہے۔

۲۳۳ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ اُن بے بنیاد توقعات کا خاتمہ ہو جائے جو لوگ اُن ہستیوں سے وابستہ کر لیتے ہیں جنہیں وہ اپنے زعم کے مطابق خدا کے حضور میں شفاعت کرنے والا سمجھتے ہیں۔

۲۳۴ زَفِيرٌ اور شَهِيقٌ کے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، دونوں گدھے کی چیخ کے لیے آتے ہیں۔ ایک اُس چیخ کے لیے جو سانس کو باہر نکالتے وقت اور دوسرا اُس کے لیے جو سانس کو





السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ①۷  
وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ  
وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۚ عَطَاءٌ غَيْرَ مَجْدُوذٍ ①۸ فَلَا تَكُ فِي

(اُس عالم کے) زمین و آسمان قائم ہیں، <sup>۲۳۵</sup> الا یہ کہ تیرا پروردگار کچھ اور چاہے۔ اس میں شک نہیں کہ تیرا پروردگار جو چاہے، کر گزرنے والا ہے۔ <sup>۲۳۶</sup> رہے وہ جو نیک بخت ہیں تو وہ جنت میں ہوں گے۔ وہ اُسی میں رہیں گے، جب تک (اُس عالم کے) زمین و آسمان قائم ہیں، <sup>۲۳۷</sup> الا یہ کہ تیرا پروردگار کچھ اور چاہے، اُس کی طرف سے ایسی عطا کے طور پر جو اندر کی طرف لے جاتے وقت پیدا ہوتی ہے۔

<sup>۲۳۵</sup> یعنی وہ عالم جو قیام قیامت کے وقت وجود میں آئے گا۔ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اُس دن ہمارے یہ زمین و آسمان ایک نئے زمین و آسمان میں تبدیل کر دیے جائیں گے۔ دوام اور ہمیشگی کے معنی میں یہ تعبیر ہماری زبان میں بھی اسی طرح اختیار کی جاتی ہے۔

<sup>۲۳۶</sup> قرآن کی یہی آیت ہے جس کی بنا پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ایک دن دوزخ کی بساط لپیٹ دی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کا عذاب وعدہ نہیں، بلکہ وعید ہے اور عالم کا پروردگار یہ حق یقیناً رکھتا ہے کہ اپنی رحمت سے مجرموں کی سزا میں تخفیف کرے یا خاک اور راکھ بنا کر انہیں ہمیشہ کے لیے اسی دوزخ کی مٹی میں دفن کر دے۔ آیت کے آخر میں 'إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ' کے الفاظ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

<sup>۲۳۷</sup> یہ استثنائاً رہا ہے کہ اہل جنت کے احوال و مراتب میں بھی تبدیلیاں ہوں گی، لیکن یہ خوب سے خوب تر کی نوعیت کی ہوں گی۔ چنانچہ آگے وضاحت کر دی ہے کہ خدا کی اس بخشش میں کبھی انقطاع نہ ہوگا۔ پچھلی آیت کا خاتمہ 'إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ' کے الفاظ پر ہوا ہے۔ یہاں اُن کی جگہ 'عَطَاءٌ غَيْرَ مَجْدُوذٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ تبدیلی جنت اور دوزخ کے دوام



مَرِيَّةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هَؤُلَاءِ ۖ مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا كَمَا يَعْبُدُ آبَاؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۖ وَإِنَّا لَمُوفُونَ ۚ نَصِيبُهُمْ غَيْرَ مَنقُوصٍ ۝۱۰۹  
وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتَلَفَ فِيهِ ۖ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۖ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ ۝۱۱۰

کبھی منقطع نہ ہوگی۔ سو، (اے پیغمبر)، تم اُن چیزوں کے معاملے میں کسی تردد میں نہ پڑو جنہیں یہ پوجتے ہیں۔<sup>۲۳۸</sup> یہ اُسی طرح پوج رہے ہیں، جس طرح ان سے پہلے ان کے باپ دادا پوجتے رہے۔ ہمارا فیصلہ ہے کہ ان کا حصہ ہم بھی بغیر کسی کمی کے انہیں پورا پورا ادا کر دیں گے۔<sup>۲۳۹</sup> ۱۰۹-۱۰۰

ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی تو اُس کے بارے میں بھی (اسی طرح) اختلاف کیا گیا تھا۔<sup>۲۴۰</sup> تیرے پروردگار کی طرف سے اگر ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو میں اسی فرق کی بنا پر کی گئی ہے۔

<sup>۲۳۸</sup> یعنی تمہیں یہ تردد نہ ہو کہ اچھے بھلے لوگ ہیں، آخر کسی دلیل کی بنیاد پر ہی ان چیزوں کو پوجتے ہوں گے۔ اس میں، ظاہر ہے کہ عتاب کا رخ اُنھی لوگوں کی طرف ہے جو یہ حماقت کر رہے تھے۔

<sup>۲۳۹</sup> یعنی جس انجام کے مستحق ہیں، ٹھیک اُسی کو پہنچ جائیں گے۔ ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ ہر ایک کے لیے اُس کے اعمال کی پاداش میں جو صلہ مقرر کیا گیا ہے، وہ اُسے پورا مل جائے گا۔

<sup>۲۴۰</sup> یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تمہاری قوم کے لوگ جو معاملہ قرآن کے ساتھ کر رہے ہیں، اس سے پہلے یہی معاملہ تورات کے ساتھ ہو چکا ہے۔ چنانچہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ





ہود  
۱۱

وَإِنْ كُنَّا لَمَّا لِيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ إِنَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝  
فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ  
بَصِيرٌ ۝ لَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمُ  
مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ۝ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي

ان کے درمیان (اس اختلاف کا) فیصلہ چکا دیا جاتا۔<sup>۲۴۱</sup> حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ تم پیش کر رہے ہو، اُس کی طرف سے یہ لوگ ایسے شک میں پڑے ہوئے ہیں جو الجھا دینے والا ہے۔ (تم مطمئن رہو)، تمہارا پروردگار ان میں سے ہر ایک کو اُس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا۔<sup>۲۴۲</sup> یہ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ اُس سے یقیناً باخبر ہے۔ سو تم ثابت قدم رہو، جیسا کہ تم کو حکم دیا گیا ہے، اور وہ بھی جنہوں نے تمہارے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف رجوع کیا ہے اور تم لوگ کبھی اختیار نہ کرو۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اُسے وہ دیکھ رہا ہے۔ (ان کی ترغیب و ترہیب کے باوجود) ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا، ورنہ تمہیں بھی آگ پکڑ لے گی اور خدا کے

پریشانی کا باعث بن جائے۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے ساتھ اُن کی قوموں کا رویہ بالعموم یہی رہا ہے۔

<sup>۲۴۱</sup> مطلب یہ ہے کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اُس کی بنا پر کسی رعایت کے مستحق تو نہیں رہے، مگر اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اُس نے ہر قوم کے لیے مہلت کی ایک مدت مقرر کر رکھی ہے۔ لہذا انتظار کرو، ان کا فیصلہ بھی اُسی وقت ہوگا، جب وہ مدت پوری ہو جائے گی۔

<sup>۲۴۲</sup> اصل الفاظ ہیں: 'إِنْ كُنَّا لَمَّا لِيُوَفِّيَنَّهُمْ'۔ ان میں 'ل' تاکید اور قسم کا ہے اور 'مَّا' محض صوت و آہنگ کی ضرورت سے آگیا ہے۔ اس کی مثالیں قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی ہیں۔



النَّهَارَ وَزُفَاءً مِّنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ذَلِكَ  
ذِكْرَىٰ لِلَّذِينَ ۞ وَأَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَصِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝۱۱۵

سوا تمھارا کوئی حامی نہ ہوگا، پھر کہیں سے مدد بھی نہیں پاؤ گے۔<sup>۲۴۳</sup> اور دیکھو، (اے پیغمبر،  
اس راہ میں ثابت قدمی کے لیے) دن کے دونوں حصوں میں نماز کا اہتمام کرو اور رات  
کے اوائل میں بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ ایک یاد دہانی  
ہے اُن کے لیے جو یاد دہانی حاصل کرنے والے ہوں۔ اور صبر کرو، اس لیے کہ اللہ اُن  
لوگوں کا اجر ضائع نہ کرے گا جو خوبی سے عمل کرنے والے ہیں۔<sup>۲۴۴</sup> ۱۱۰-۱۱۵

۲۴۳ اس لیے کہ معاملہ اُس پروردگار سے ہوگا جس کے مقابل میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر  
سکتا۔

۲۴۴ راہ حق کی مشکلات میں قرآن نے ہر جگہ دو ہی چیزوں کی تلقین کی ہے: ایک نماز اور  
دوسرے صبر و استقامت۔ یہاں یہ مضمون جس طریقے سے آیا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی  
نے اُس کے بعض پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”... نماز سے پہلے استقامت اور نماز کے بعد صبر کے ذکر میں ایک اشارہ اس حقیقت کی  
طرف بھی ہے کہ پامردی اور استقلال محمود اُسی صورت میں ہے، جب آدمی کا رخ صحیح سمت  
میں ہو۔ علاوہ ازیں ایک اور نکتہ بھی اس آیت میں ہے۔ وہ یہ کہ یوں نہیں فرمایا کہ ’صبر کرو،  
اس لیے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا‘، بلکہ یوں فرمایا کہ ’صبر کرو، اس  
لیے کہ اللہ خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا‘۔ اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ  
کرنا مقصود ہے کہ صبر بھی خدا کے ہاں عزیز و محبوب اور سزاوار اجر اُنھی لوگوں کا ہے جو اُس طرح  
صبر کریں، جس طرح صبر کرنے کا حق ہے۔ رو دھو کر اور گلے شکوے کر کے تو سب ہی صبر کر لیتے  
ہیں۔ خوب کاروں کا صبر یہ ہے کہ سروں پر آ رہے چل جائیں، لیکن نہ دل گلہ مند ہو نہ پیشانی  
پر بل آنے پائے۔ جو لوگ اس شان و وقار سے صبر کرتے ہیں، اُن کا اجر کبھی ضائع نہیں





فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةَ يَنَّهُوْنَ  
عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ  
ظَلَمُوا مَا أَتَرَفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿١١٦﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ  
الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْطَحُونَ ﴿١١٧﴾  
وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً ۚ وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ﴿١١٨﴾

پھر (اس پر بھی غور کرو کہ) ایسا کیوں نہ ہوا کہ تم سے پہلے کی امتوں میں <sup>۲۳۵</sup> ایسے اہل خیر ہوتے جو (لوگوں کو) زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت تھوڑے جنھیں ہم نے اُن میں سے نجات دی اور ظالم جس عیش میں تھے، اُسی کے پیچھے پڑے رہے، اور وہ تھے ہی مجرم لوگ۔ (اے پیغمبر)، تیرا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو (اُن کے) کسی ظلم کی پاداش میں ہلاک کر دے، جب کہ اُن کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں۔ <sup>۲۳۶</sup> ۱۱۶-۱۱۷

تیرا پروردگار چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی گروہ بنا دیتا، (مگر اُس نے ایسا نہیں

جاتا۔) (تدبر قرآن ۴/۱۷۶)

۲۳۵ یعنی اُن امتوں میں جن کی سرگذشتیں پیچھے بیان ہوئی ہیں۔

۲۳۶ یہ نہایت سبق آموز طریقے سے اُن کی تباہی کے اصل سبب کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد وہ اس لیے ہلاک کر دیے گئے کہ اُن کی اکثریت آمادہ فساد تھی اور اصلاح کرنے والے بہت تھوڑے رہ گئے تھے۔ فرمایا کہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ قوم میں اکثریت اصلاح کرنے والوں کی ہو اور وہ چند لوگوں کے کسی ظلم کی پاداش میں پوری قوم کو تباہ کر دے۔ اس طرح کی تباہی اُسی وقت آتی ہے، جب قوم بحیثیت مجموعی فساد میں مبتلا ہو



إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمْ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝۱۱۹

وَكُلًّا نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ وَجَاءَكَ فِي هَذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ ۝۱۲۰ وَقُلْ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ أَعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَمِلُونَ ۝۱۲۱ وَانْتَظِرُوا

کیا، بلکہ انھیں ارادہ و اختیار عطا فرمایا ہے تو اب یہی ہوگا کہ وہ ہمیشہ اختلاف میں رہیں گے، سوائے اُن کے جن پر تیرا پروردگار رحم فرمائے۔ اُس نے اسی لیے اُن کو پیدا کیا ہے (کہ وہ اپنے اختیار سے فیصلہ کریں)۔ سو تیرے پروردگار کی بات پوری ہوگئی (جو اُس نے کہی تھی) کہ کیا جن اور کیا انسان، میں سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔ ۱۱۸-۱۱۹

اور، (اے پیغمبر)، رسولوں کی سرگزشتوں میں سے ہر ایک ہم تمھیں سنارہے ہیں، جس سے ہم تمھارے دل کو مضبوط کریں۔ ان کے اندر تمھارے پاس حق آیا ہے اور ماننے والوں کے لیے ان میں نصیحت اور یاد دہانی ہے۔ اُن سے کہہ دو، (اے پیغمبر)، جو نہیں مان رہے کہ تم اپنے طریقے پر کرو جو چاہتے ہو، ہم اپنے طریقے پر کریں جاتی ہے۔

۲۴۷ یعنی اپنے اُس قانون کے مطابق رحم فرمائے جو اُس نے لوگوں کی ہدایت و ضلالت کے لیے مقرر کر رکھا ہے اور وہ بدی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کر لیں۔

۲۴۸ یہ اُس بات کا حوالہ ہے جو ابلیس کے جواب میں ارشاد ہوئی تھی، جب اُس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں ذریت آدم کو اس طرح گھیروں گا کہ اُن کی



إِنَّا مُنْتَظِرُونَ ﴿١٢٢﴾ وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ  
الْأَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٢٣﴾

گے۔ تم بھی انتظار کرو (کہ خدا کا فیصلہ کب صادر ہوتا ہے)، ہم بھی منتظر ہیں۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ چھپا ہوا ہے، سب خدا کے پاس ہے اور تمام معاملات اُسی کی طرف رجوع کیے جاتے ہیں۔ سو، (اے پیغمبر)، اُسی کی بندگی کرو اور اُسی پر بھروسہ رکھو۔ تم لوگ جو کچھ کر رہے ہو، تیرا پروردگار اُس سے بے خبر نہیں ہے۔ ۱۲۰-۱۲۳

اکثریت تیری شکر گزار نہیں رہے گی۔

۲۴۹ یعنی یہ حقیقت بیان ہوئی ہے کہ اہل حق کو غلبہ حاصل ہوا اور منکرین تباہ کر دیے گئے۔

کو الالہ پور

۳ مارچ ۲۰۱۲ء







# يوسف - الرعد

١٢ — ١٣





## یوسف - الرعد

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع اُن نتائج کے حوالے سے انداز و بشارت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد آپ کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے لیے اسی دنیا میں نکلنے والے تھے۔ استدلال کا طریقہ، البتہ الگ الگ ہے۔ پہلی سورہ جن حقائق کو یوسف علیہ السلام کی سرگذشت کے حوالے سے مبرہن کرتی ہے، دوسری میں وہی حقائق عقل و فطرت کے دلائل سے مبرہن کیے گئے ہیں۔ دونوں میں خطاب قریش سے ہے اور ان کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القرئی مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلہ اتمام حجت میں نازل ہوئی ہیں۔



## سورة يوسف

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الرَّاقِفِ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ① إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا  
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ②

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنُ  
وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ ③ إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ

— ۱ —

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورہ 'الر' ہے۔ یہ اُس کتاب کی آیتیں ہیں جو اپنا مدعا پوری وضاحت کے ساتھ  
بیان کرتی ہے۔ ہم نے اس کو عربی زبان میں قرآن بنا کر اتارا ہے تاکہ (اے قریش مکہ)،  
تم اس کو اچھی طرح سمجھ سکو۔ ۱-۲

(اے پیغمبر)، اس قرآن کی بدولت جو ہم نے تمہاری طرف وحی کیا ہے، ہم  
تمہیں ایک بہترین سرگذشت سناتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ (اس طرح کی چیزوں

۱۔ سورہ یونس اور سورہ ہود کی طرح اس سورہ کا نام بھی 'الر' ہے۔ اس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ  
اس کا مضمون بھی اصلاً وہی ہے جو پچھلی سورتوں میں زیر بحث رہا ہے۔ اس نام کے معنی کیا ہیں؟  
اس کے متعلق اپنا نقطہ نظر ہم سورہ بقرہ (۲) کی آیت کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔  
۲۔ سورہ کے مخاطب قریش ہیں۔ یہ انہی پر امتنان و احسان کا اظہار ہے جس میں یہ تنبیہ بھی  
چھپی ہوئی ہے کہ نہیں سمجھو گے تو یاد رکھو، اس کے بعد تمہارے پاس کوئی عذر نہیں ہوگا جسے خدا کے  
حضور میں پیش کر سکو۔





یوسف  
۱۲

۳۔ یہ کس لحاظ سے بہترین سرگذشت ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کے جن پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے، اُن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ اس میں حسن و عشق کی چاشنی ہے، مگر یوسف علیہ السلام جو اس قصے کا مرکزی کردار ہیں، اُن کی شخصیت اسے پاکیزگی سیرت و کردار کا ایک ایسا مرقع بنا دیتی ہے کہ پڑھنے والا اس کے اندر اپنے ایمان کے لیے غذا اور اپنی روح کے لیے لذت و حلاوت محسوس کرتا ہے۔

۲۔ یوسف علیہ السلام کی فطرت کے جو جوہر اس قصے میں نمایاں ہوتے ہیں، وہ ایسے شان دار ہیں کہ ہر پڑھنے والے کے اندر اُن کی تقلید کا جذبہ ابھرتا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ یہ تقلید ناممکن نہیں، بلکہ ممکن محسوس ہوتی ہے۔

۳۔ یہ سرگذشت بتاتی ہے کہ انسان کا ظاہری حسن تو زنان مصر کی آنکھیں بھی دیکھ لیتی ہیں، لیکن اُس کے باطن کا حسن اُس وقت نمایاں ہوتا ہے، جب وہ زندگی کے مختلف مراحل میں اُس کی آزمائشوں سے گزرتا ہے۔ سیدنا یوسف کی شخصیت کا یہ حسن بھی اسی طرح نمایاں ہوا ہے اور اس سرگذشت میں وہ ذہانت، صداقت، پاکیزگی، پاک دامن اور انتقام کی قدرت کے باوجود عفو و درگزر کی ایک زندہ جاوید مثال بن کر ابھرے ہیں۔

۴۔ اس میں جو حالات و واقعات پیش آئے ہیں، وہ نہایت حیرت انگیز ہیں، مگر کسی جگہ محسوس نہیں ہوتا کہ اُن میں کوئی چیز بے جوڑ اور بے ربط ہو گئی ہے یا حالات کی فطری رفتار کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔

۵۔ اس کے اولین مخاطبین قریش تھے۔ اُن کے لیے تو گویا اسے ایک آئینہ بنا دیا گیا ہے، جس میں وہ اپنی عاقبت بھی دیکھ سکتے تھے اور اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل بھی۔ اس لحاظ سے یہ ایک صریح پیشین گوئی تھی جسے آئندہ دس سال کے واقعات نے حرف بہ حرف صحیح ثابت کر کے دکھا دیا۔ چنانچہ اس کے نزول پر ڈیڑھ دو سال ہی گزرے تھے کہ قریش نے برادران یوسف کی طرح دارالندوہ میں رسول اللہ کے قتل کی سازش کی، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اُن کے شر سے محفوظ



إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ﴿٥٠﴾

سے) تم اس سے پہلے بالکل بے خبر تھے۔ یہ اُس وقت کا قصہ ہے، جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا: ابا جان، میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج

رکھا۔ آپ مکہ سے نکلے اور غار ثور میں جا چھپے۔ اس کے بعد وہاں سے نکل کر مدینہ پہنچ گئے۔ پھر قریش کی توقعات کے بالکل خلاف آپ کو وہاں ایسا وقار اور اقتدار حاصل ہوا کہ چشم فلک نے اُس کی نظیر نہیں دیکھی۔ اہل مکہ کو طوعاً و کرہاً آپ کی اطاعت میں داخل ہونا پڑا، یہاں تک کہ فتح مکہ کے موقع پر ٹھیک وہی صورت پیدا ہو گئی جو مصر کے پایہ تخت میں یوسف علیہ السلام کے سامنے اُن کے بھائیوں کی حاضری کے موقع پر پیدا ہوئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کے لوگوں سے پوچھا: بتاؤ، میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ اُنھوں نے عرض کیا: 'اُخ کریم و ابن اُخ کریم'، آپ ایک عالی ظرف بھائی اور عالی ظرف بھائی کے بیٹے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا: میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: 'لا تشریب علیکم الیوم، اذہبوا فأنتم الطلقاء' جاؤ، تم آزاد ہو، آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ قرآن کے مخاطبین اس قصے پر اس پہلو سے بھی غور کریں کہ اگر آپ وحی الہی سے مشرف نہیں ہوئے تو آپ کے لیے یہ کس طرح ممکن ہوا کہ اس استقصا اور اس صحت و صداقت کے ساتھ یہ قصہ سنا سکیں؟ آخر اس قرآن کے نزول سے پہلے بھی آپ کم و بیش چالیس سال اپنی قوم میں گزار چکے تھے۔ آپ کو اس سرگذشت سے کچھ بھی واقفیت ہوتی تو اس طرح کی کوئی بات اس مدت میں بھی کبھی تو آپ کی زبان پر آتی۔ آپ کے مخاطبین جانتے تھے کہ جس وضاحت اور جس یقین و اذعان کے ساتھ آپ یہ قصہ سنارہے ہیں، اُس کے کوئی آثار اس سے پہلے کبھی آپ کی کسی گفتگو میں نہیں دیکھے گئے۔ چنانچہ قرآن نے توجہ دلائی ہے کہ سننے والے اس پر بھی غور کریں۔





یوسف  
۱۲

قَالَ يَبْنَىٰ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ⑤ وَكَذَلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ

اور چاند ہیں۔ میں نے اُن کو دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ جواب میں اُس کے باپ نے کہا: بیٹا، اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے خلاف کوئی سازش کرنے لگیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ (تمہارا

۵ یعنی یعقوب علیہ السلام سے۔ حضرت یوسف اُن کے بیٹے، حضرت اسحاق کے پوتے اور حضرت ابراہیم کے پر پوتے تھے۔ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب کے بارہ بیٹے اُن کی چار بیویوں سے تھے۔ اُن میں سے حضرت یوسف اور اُن کے چھوٹے بھائی بن یمن ایک بیوی سے تھے اور باقی دس دوسری بیویوں سے۔ یہ لوگ فلسطین کے علاقے حبرون کی وادی میں رہتے تھے۔ اسے اب النخیل کہا جاتا ہے۔ یہاں جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے، بائبل کے علما کی تحقیق کے مطابق وہ ۱۸۹۰ قبل مسیح کے قریب زمانے میں کسی وقت پیش آیا تھا۔ حضرت یوسف کی عمر اُس وقت سترہ برس کی تھی۔

۶ یوسف علیہ السلام نے یہ خواب جس طرح سنایا ہے، اُس سے اُن کی طبیعت کے اندر جو تواضع تھی، وہ پوری طرح نمایاں ہو گئی ہے۔ اُنھوں نے پہلے صرف اتنی بات کہی کہ میں نے گیارہ ستارے اور سورج اور چاند دیکھے ہیں۔ پھر آگے کی بات سے چونکہ اُن کی بڑائی سامنے آرہی تھی، اس لیے کسی قدر رک کر جھجکتے ہوئے بیان کیا ہے کہ میں نے دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ آیت میں فعل 'رَأَيْتُ' کے اعادے نے یہ جھجک پوری طرح ظاہر کر دی ہے۔

۷ اس سے معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی پر خاش اُن کے ساتھ واضح تھی۔ اُن کی اعلیٰ صلاحیتوں کو دیکھ کر حضرت یعقوب اُن سے غیر معمولی طور پر محبت کرنے لگے تھے اور یہی چیز اُن کے بھائیوں کے لیے اُن کے ساتھ حسد کا باعث بن گئی تھی۔



مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا  
آتَمَّهَا عَلَىٰ آبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ ۖ إِنَّ  
رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ⑥

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٍ لِّلسَّائِلِينَ ④ إِذْ قَالُوا

یہ خواب بتا رہا ہے کہ (تمہارا پروردگار تمہیں اسی طرح برگزیدہ کرے گا اور تمہیں  
باتوں کی حقیقت تک پہنچنا سکھائے گا اور تم پر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت تمام کرے گا،  
جس طرح وہ اس سے پہلے تمہارے بزرگوں ابراہیم اور اسحاق پر کر چکا ہے۔ یقیناً تیرا  
پروردگار علیم و حکیم ہے۔ ۶-۳

حقیقت یہ ہے کہ یوسف اور اُس کے بھائیوں (کی اس سرگزشت) میں پوچھنے

۸ یعنی نبوت عطا کرے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت یعقوب نے خواب سنتے ہی اندازہ  
فرمالیا کہ یہ منصب نبوت پر سرفرازی کا اشارہ ہے۔

۹ یعنی اس روایا کی حقیقت بھی تم پر واضح ہو جائے گی اور اس نوعیت کی دوسری چیزوں کو سمجھنے کا  
علم بھی عطا ہوگا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...رویا چونکہ علم نبوت کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے اور روایا میں حقائق مجاز کی شکل میں ظاہر

ہوتے ہیں جن کو سمجھنا ایک خاص ذہنی مناسبت کا مقتضی ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ حضرات انبیا

علیہم السلام کو تعبیر روایا کا ایک خاص ذوق اور ایک خاص علم بھی عطا فرماتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۱۹۲/۴)

۱۰ یہ خاص تعبیر ہے جو دین و شریعت کی نعمت کے لیے قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی

اختیار کی گئی ہے۔ انسان کی فطرت میں یہ دین بالا جمال و دیعت ہے۔ انبیا علیہم السلام چونکہ اس

کی تمام فروع اور تفصیلات کے ساتھ اس کو بالکل واضح اور متعین کر دیتے ہیں، اس لیے قرآن

اسے اتمام نعمت سے تعبیر کرتا ہے۔







یوسف  
۱۲

لِيُؤْسِفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ⑧ اقْتُلُوا يُوسُفَ وَأَطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ⑨ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا

والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ جب اُس کے بھائیوں نے آپس میں کہا کہ یوسف اور اُس کا بھائی<sup>۱۲</sup> ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں، حالاں کہ ہم ایک پورا جتھا ہیں۔ یقیناً ہمارا باپ ایک کھلی ہوئی غلطی میں مبتلا ہے۔ (اس کا علاج یہی ہے کہ) یوسف کو قتل کر دو یا اُس کو کہیں پھینک دو، تمہارے باپ کی توجہ اس سے صرف تمہاری طرف ہو جائے گی اور اس کے بعد تم لوگ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔<sup>۱۳</sup>

۱۱ یعنی اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جن کے ذہنوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت سے متعلق اس طرح کے سوالات پیدا ہو رہے ہیں کہ آگے کیا ہوگا اور کس طرح ہوگا؟ اس دعوت کے جن شان دار نتائج کی طرف اشارے کیے جا رہے ہیں، وہ کیسے نمودار ہوں گے، جب کہ اس وقت تو اس کے علم بردار وقت کے متمردين کے ہاتھوں ہر قسم کے آلام و مصائب کا ہدف بنے ہوئے ہیں اور ہر طرف اُنھی عقائد و افکار کا غلبہ نظر آتا ہے جنہیں یہ لوگ ہدف تنقید بنا رہے ہیں؟

۱۲ اس سے یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بن یمن مراد ہیں۔ یہ اُن سے کئی سال چھوٹے تھے۔

۱۳ بدویانہ زندگی میں آدمی کی قوت کا انحصار جوان بیٹوں ہی پر ہوتا تھا۔ وہی دشمنوں کے مقابلے میں اُس کے کام آتے تھے۔ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اسی کے پیش نظر کہا ہے کہ والد، معاذ اللہ، ایسے ناعاقبت اندیش ہو گئے ہیں کہ بیٹوں کا جو جتھا مشکل وقت میں اُن کے کام آ سکتا تھا، اُسے تو نظر انداز کر رہے ہیں اور اپنی محبت اُن چھوٹے بچوں پر نچھاور کرتے ہیں جو اُن



يُوسُفَ وَالْقُوَّةَ فِي غَيْبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطُهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِنْ  
كُنْتُمْ فَعِيلِينَ ⑩

قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلَى يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنَصِحُونَ ⑪  
أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَع وَيَلْعَبْ وَإِنَّا لَهُ لَحَفِظُونَ ⑫ قَالَ إِنِّي

اس پر اُن میں سے ایک کہنے والے نے کہا: یوسف کو قتل نہ کرو، اگر کچھ کرنا ہی ہے تو  
اُس کو کسی اندھے کنویں کی تہ میں پھینک دو، کوئی راہ چلتا قافلہ اُسے نکال لے جائے  
گا۔ ۷-۱۰

(اس کے بعد وہ گئے اور) اُنھوں نے اپنے باپ سے کہا: ابا جان، کیا بات ہے  
کہ یوسف کے معاملے میں آپ ہم پر بھروسہ نہیں کرتے، دریاں حالیکہ ہم اُس کے  
سچے خیر خواہ ہیں۔ اُسے کل ہمارے ساتھ جانے دیجیے، ذرا کچھ چر چگ لے اور

کے کسی کام نہیں آسکتے، بلکہ خود ہی حفاظت کے محتاج ہیں۔

۱۲ اصل الفاظ ہیں: تَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ۔ یہ فقرہ سابق جواب امر پر  
معطوف ہے، اس لیے اس کا حکم اُس سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ لفظ 'صَالِح' یہاں نیک کے  
معنی میں نہیں، بلکہ ٹھیک اپنے لغوی مفہوم میں آیا ہے۔ یعنی اس کے بعد ہم ایسے لوگ ہوں گے  
جن کا حال بالکل ٹھیک ہوگا، تمام پریشانیاں دور ہو جائیں گی اور یہ کانٹا جو اس وقت چبھ رہا ہے، نکل  
جائے گا۔ ہم نے ترجمے میں یہی مدعا ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۵ یہ مشورہ بتا رہا ہے کہ دس بھائیوں میں سے کسی ایک کے دل میں یوسف علیہ السلام کے  
لیے نرم گوشہ تھا۔ وہ یہ تو ضرور چاہتا تھا کہ پہلو کا یہ کانٹا نکل جائے، مگر اس حد تک جانے کے لیے  
تیار نہیں تھا کہ اس کے لیے اُن کی جان لے لے۔







لِيَحْزُنُنِي أَنْ تَذْهَبُوا بِهِ وَآخَافُ أَنْ يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ  
وَأَنْتُمْ عَنْهُ غَافِلُونَ ﴿١٣﴾ قَالُوا لَيْنَ أَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ  
عُصْبَةٌ إِنَّا إِذًا لَّخَسِرُونَ ﴿١٤﴾

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَاجْتَمَعُوا أَنْ يُجْعَلُوهُ فِي غَيْبَتِ الْجُبِّ وَأَوْحَيْنَا  
إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿١٥﴾ وَجَاءُوا

کھیلے کودے، ہم اُس کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ باپ نے کہا: مجھے یہ چیز  
افسردہ کر دیتی ہے کہ تم اُسے لے جاؤ اور ڈرتا ہوں کہ تم اُس سے غافل ہو اور اُسے  
بھیڑ یا کھا جائے۔ اُنھوں نے جواب دیا: اگر اُسے بھیڑیے نے کھا لیا، جب کہ ہم  
ایک جتھا ہیں، تب تو ہم بڑے ہی نامراد ہوئے۔ ۱۱-۱۲

اس طرح (اصرار کر کے) جب وہ یوسف کو لے گئے اور بالآخر طے کر لیا کہ اُس کو  
کنویں کی تہ میں پھینک دیں اور ادھر ہم نے اُس کو وحی کر دی کہ تم (ایک دن) ان کی  
اس حرکت سے انھیں ضرور آگاہ کرو گے، جب انھیں کچھ خیال بھی نہ ہو گا۔ اور (اُس کو

۱۶ بدویانہ زندگی میں دل بہلانے کا یہ طریقہ نہایت مقبول رہا ہے کہ بستی سے باہر جا کر  
دشت و صحرا یا کسی نخلستان میں کچھ وقت اس طرح گزارا جائے کہ سب مل کر کھائیں پکائیں اور  
کھیلیں کودیں۔ یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے ہاں پنک سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۱۷ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گرد و پیش کے علاقے میں بھیڑیوں کی کثرت تھی اور وہ باہر  
جانے والوں پر وقتاً فوقتاً حملے کرتے رہتے تھے۔

۱۸ یعنی لانے کے بعد اگرچہ پھر کچھ اختلاف ہوا، لیکن بالآخر یہی بات طے ہوئی کہ کنویں  
میں ڈال دینا ہی بہتر ہے۔ بائبل اور تالمود کی روایات کے مطابق یہ کنواں سکم کے شمال میں دو تن



أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ ۝١٦ قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا  
يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَالْكَاهِنُ الذِّبُّ ۚ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا  
وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ ۝١٧ وَجَاءُوا عَلَى قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ ۝١٨  
قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ  
الْمُسْتَعَانُ عَلَى مَا تَصِفُونَ ۝١٩

کنویں میں گرا کر) وہ روتے پڑتے کچھ رات گئے اپنے باپ کے پاس پہنچ گئے۔<sup>۱۶</sup> انھوں نے (آ کر) کہا: ابا جان، ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا (آ یا اور) اُس کو کھا گیا۔ مگر آپ تو ہماری بات کا یقین نہ کریں گے، اگرچہ ہم بالکل سچے ہوں۔<sup>۱۷</sup> وہ (اس بات کو ثابت کرنے کے لیے) یوسف کے قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا کر لے آئے تھے۔ باپ نے کہا: نہیں، بلکہ یہ تو تمہارے دل نے تمہارے لیے ایک بات گھڑ لی ہے۔ سوا ب صبر جمیل کی توفیق ملے اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو، اُس پر خدا ہی سہارا ہے۔<sup>۱۸</sup> ۱۵-۱۸

(موجودہ دثان) کے قریب واقع تھا۔

۱۹ یعنی اُس وقت آگاہ کرو گے، جب ان کے تصور میں بھی نہیں ہوگا کہ جس بھائی کو ہم نے اندھے کنویں میں ڈال دیا تھا، وہ اس مقام بلند پر فائز ہے اور ہم سے بات کر رہا ہے۔

۲۰ رات گئے واپس آنے میں غالباً یہ مصلحت رہی ہوگی کہ باپ اگر کسی کو تلاش کے لیے بھیجنا چاہے تو اس کا بھی امکان باقی نہ رہے۔

۲۱ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب نے جو کچھ کہا تھا، انھوں نے اُسی سے بات بنا لی کہ باپ کے ذہن میں بھیڑیے کا اندیشہ پہلے سے موجود ہے، اس لیے جلد باور کر لیں گے۔





وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَى دَلْوَهُ قَالَ يَبُشْرَى  
هَذَا غُلْمٌ وَاسْرِوْهُ بُضَاعَةً ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝ ١٩ وَشَرَّوْهُ  
بِثَمَنِ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ ۖ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ۝ ٢٠

اُدھر ایک قافلہ آیا اور اُنھوں نے اپنا پانی بھرنے والا بھیجا اور اُس نے اپنا ڈول  
(کنویں میں) ڈالا، (پھر یوسف کو دیکھا تو) پکار اٹھا: خوش خبری ہو، یہ تو ایک لڑکا  
ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے (اُس کو نکالا اور) اُس کو پونجی سمجھ کر چھپا لیا اور جو کچھ وہ کر  
رہے تھے، اللہ اُس سے خوب واقف تھا۔ (پھر لے کر مصر پہنچ گئے) اور اُس کو تھوڑی سی  
قیمت، چند درہموں کے عوض بیچ دیا اور وہ اُس کے معاملے میں کوئی رغبت نہیں رکھتے  
تھے۔ ۱۹-۲۰

۲۲ یہ دل کا چور ہے جو زبان پر آ گیا ہے۔

۲۳ آیت میں 'صَبْرٌ جَمِيلٌ' کا ترجمہ اچھا صبر ہو سکتا ہے، یعنی وہ صبر جس میں فریاد نہ ہو،  
گلہ شکوہ نہ ہو، جزع فزع اور نوحہ و ماتم نہ ہو۔ یہ اصل میں مبتدا کے طور پر آیا ہے جس کی خبر محذوف  
ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۲۴ مطلب یہ ہے کہ اب یہ عقدہ اُسی کی مدد سے کھل سکتا ہے کہ تم نے کیا کیا ہے اور کیا بات  
بنا کر لے آئے ہو۔

۲۵ اصل میں لفظ 'وَارِدٌ' آیا ہے۔ اس کے اصل معنی تو کسی گھاٹ یا چشمے پر اترنے والے  
کے ہیں، لیکن یہاں یہ اُس شخص کے لیے استعمال ہوا ہے جو قافلے والوں کی طرف سے پانی کے  
انتظام کے لیے مقرر کیے جاتے تھے۔ بائبل اور تالمود، دونوں کی روایت ہے کہ یہ قافلہ جلعاد  
(شرق اردن) سے مصر جا رہا تھا جس کا دار السلطنت اُس زمانے میں ممفس تھا جس کے کھنڈر قاہرہ  
کے جنوب میں ۲۱ کلومیٹر کے فاصلے پر پائے جاتے ہیں۔



وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِّصْرَ لِمَرْأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَلَيَّ  
 أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا ۖ وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ  
 وَلِنُعَلِّمَهُ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۖ وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَى أَمْرِهِ وَلَكِنَّ

مصر کے لوگوں میں سے جس نے اُسے خریدا<sup>۲۸</sup>، اُس نے اپنی بیوی<sup>۲۹</sup> سے کہا: اس کو  
 خاطر سے رکھنا، امید ہے کہ ہم کو نفع پہنچائے یا ہم اسے بیٹا ہی بنا لیں۔ اس طرح  
 یوسف کو ہم نے اُس ملک میں جگہ دی، اس لیے کہ اُسے برگزیدہ کریں اور اس لیے کہ  
 اُسے باتوں کی حقیقت تک پہنچنا سکھائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ اپنے ارادے کو نافذ

۲۶ اس لیے چھپالیا کہ گرد و پیش سے آ کر کوئی شخص اُس پر اپنا دعویٰ پیش نہ کر دے۔

۲۷ اس لیے بے رغبت تھے کہ جو کچھ ملا تھا، بغیر کسی قیمت کے ملا تھا، لہذا جو خریدار بھی سب  
 سے پہلے سامنے آیا اور اُس نے جو کچھ بھی پیش کر دیا، اُسی پر بیچ کر فارغ ہو گئے۔

۲۸ بائبل میں اُس شخص کا نام فوطیفا رکھا ہے۔ یہ شاہی جلوداروں کا کوئی بڑا افسر تھا۔ آگے  
 قرآن نے اسے 'عزیز' کے لقب سے یاد کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے مصر میں  
 یہ کوئی خاص منصب تھا جو سلطنت کے امرا کو دیا جاتا تھا۔

۲۹ اس کا نام تالمود میں زلیخا (Zelicha) لکھا ہے۔

۳۰ اس سے واضح ہے کہ حضرت یوسف کو دیکھتے ہی اُس نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی غلام نہیں ہے،  
 بلکہ شریف خاندان کا لڑکا ہے جو کسی وجہ سے ان بیچنے والوں کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ مزید یہ کہ اُس  
 وقت تک وہ غالباً بے اولاد تھا، اس لیے اُس نے سوچا کہ یہ لڑکا اُس کی امیدوں پر پورا اترے تو وہ  
 اسے متبنی کر لے گا۔

۳۱ یہ جملہ معللہ کا معطوف علیہ ہے جسے غایت وضاحت کی بنا پر اصل میں حذف کر دیا ہے۔







یوسف  
۱۲

أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ②۱ وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۖ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ②۲

وَرَأَوْنَاهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۖ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ

کر کے رہتا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ (چنانچہ اسی طرح ہوا) اور جب وہ پختگی کو پہنچ گیا تو ہم نے اُس کو حکم اور علم عطا فرمایا۔ اُن کو جو خوبی والے ہوں، ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔ ۲۱-۲۲

اور یوسف جس عورت کے گھر میں تھا، وہ اُس پر ڈورے ڈالنے لگی۔ اُس نے (ایک دن) دروازے بند کر لیے اور بولی: آ جاؤ۔ یوسف نے کہا: خدا کی پناہ، وہ میرا آقا ہے، اُس نے مجھے خاطر سے رکھا ہے، میں یہ خیانت نہیں کر سکتا، اس لیے کہ ایسے ظالم کبھی

۳۲ یعنی بدویت سے نکال کر مصر جیسے متمدن اور ترقی یافتہ ملک میں جگہ دی تاکہ باتوں کی تہ تک پہنچ جانے کی جو غیر معمولی صلاحیت اُس کے اندر ودیعت ہے، وہ نمایاں ہو کر مصر کی بادشاہی کے لیے بھی زمین ہموار کر دے اور اُسے ایک متمدن علاقے میں کار نبوت کے لیے بھی پوری طرح تیار کر دے۔

۳۳ یعنی وہ علم جو انسان کی رہنمائی کے لیے آسمان سے نازل ہوتا ہے۔

۳۴ یعنی تمہارا شوہر میرا آقا ہے۔ اس کے لیے اصل میں لفظ رَبِّي استعمال ہوا ہے۔ یہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے لیے آتا ہے، اُسی طرح مالک اور آقا کے لیے بھی آتا ہے۔ عربی زبان میں رَبُّ الْمَالِ، رَبُّ الْبَيْتِ اور رَبُّ الدَّارِ وغیرہ کی ترکیبیں عام استعمال ہوتی ہیں۔ اس زبان میں ایسے الفاظ کی مثالیں کم نہیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں اور



لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٣﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ<sup>٢٤</sup> وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنَّ رَأْبُرَهَانَ رَبِّهِ<sup>٢٥</sup> كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ<sup>٢٦</sup>

فلاح نہیں پایا کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس عورت نے تو یوسف کا ارادہ کر ہی لیا تھا، وہ بھی اگر اپنے پروردگار کی برہان<sup>۳۵</sup> نہ دیکھ لیتا تو اُس کا ارادہ کر لیتا۔ اسی طرح ہوا

بندوں کے لیے بھی، لیکن دونوں صورتوں میں اُن کے مفہوم بالکل الگ الگ ہوتے ہیں۔ تاہم یہ سوال ضرور کیا جاسکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر خدا کا حوالہ دینے کے بجائے زلیخا کو اُس کے شوہر کا حوالہ کیوں دیا؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...حضرت یوسف کے اس فقرے پر غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بڑی نفسیاتی بلاغت ہے۔ جذبات سے اندھی اور خدا اور آخرت سے ایک بے خبر عورت کے سامنے خدا اور آخرت کا وعظ، ظاہر ہے کہ بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا۔ اُس کے ہیجان کو اگر کچھ ٹھنڈا کیا جاسکتا تھا تو اسی فقرے سے کیا جاسکتا تھا جو حضرت یوسف نے فرمایا۔ اُس میں اگر شرافت کی رمت بھی ہوتی تو وہ ضرور سوچتی کہ ایک یہ نوجوان ہے جو اپنے آقا کی معمولی سی مہربانی سے اتنا متاثر اور اُس کی آقائی کا اس کو اتنا اہتمام و لحاظ ہے کہ میری بے محابا دعوت کے باوجود اُس کے ساتھ کوئی بے وفائی کرنا اپنی دنیا اور عاقبت، دونوں کی بربادی تصور کرتا ہے اور ایک میں ہوں کہ اُس کی بیوی ہوں، میں نے اپنے آپ کو اُس کی زوجیت میں دیا ہے، اپنی عصمت کا اُس کو مالک بنایا ہے، اُس کے گھر کی ملکہ بنی بیٹھی ہوں، اُس کے مال پر مالکانہ متصرف ہوں، لیکن اُس کے ساتھ وفاداری کا یہ حال ہے کہ اُس کے زرخیز غلام کو اس طرح ہوس سے اندھی ہو کر دعوت عشق دے رہی ہوں۔“ (تدبر قرآن ۴/۲۰۵)

۳۵ اس سے وہ نور یزدانی مراد ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہے، لیکن اس طرح کے موقعوں پر نمودار اُنھی کے لیے ہوتا ہے جو اُس کی قدر کرتے اور زندگی کے ہر موڑ پر اُس کی







إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ ﴿٢٣﴾

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَیْصَهُ مِنْ دُبُرٍ ۖ وَالْفَيَّا سَيِّدَهَا  
لَدَا الْبَابِ ۖ قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ  
عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢٤﴾ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَفْسِي وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ

تاکہ ہم اُس سے برائی اور بے حیائی کو دور رکھیں، اس میں شبہ نہیں کہ وہ ہمارے برگزیدہ  
بندوں میں سے تھا۔ ۲۳-۲۴

وہ دونوں آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے اور (یوسف کو روکنے کی کوشش  
میں) عورت نے اُس کا کرتا پیچھے سے (کھینچ کر) پھاڑ دیا۔ دروازے پر دونوں نے  
اُس کے شوہر کو موجود پایا۔ (اُسے دیکھتے ہی) عورت نے کہا: جو تیری بیوی کے ساتھ  
برائی کا ارادہ کرے، اُس کی سزا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ قید کیا جائے یا اُسے کوئی  
رہنمائی قبول کرتے ہیں۔ اُن کے لیے یہ اس قدر قوی ہو جاتا ہے کہ اس طرح کی صورت حال  
میں اُنھیں نفس اور شیطان کے حملوں سے بچا لیتا ہے جو زلیخا کی ترغیب کے نتیجے میں ایک اٹھارہ،  
بیس سال کے غیر شادی شدہ نوجوان کے لیے پیدا ہو گئی۔

۳۶ اس لیے کہ یوسف علیہ السلام بھی انسان ہی تھے اور اگرچہ نبوت کے لیے منتخب ہو چکے  
تھے، مگر اس کے نتیجے میں انسانی خواہشات، جذبات اور احساسات اُن سے سلب نہیں کر لیے گئے  
تھے۔

۳۷ یعنی یوسف اپنے آپ کو فتنے سے بچانے کے لیے بھاگے تو عورت بھی پیچھے دوڑی تاکہ  
اُنھیں روک لے۔

۳۸ دوڑتے ہوئے کسی شخص کا کرتا پکڑ کر اُسے روکنے کی کوشش کی جائے گی تو پورا امکان ہے  
کہ یہی صورت پیش آجائے۔



أَهْلَهَا إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ  
 الْكَذِبِينَ ②⑥ وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ  
 الصَّادِقِينَ ②⑦ فَلَمَّا رَأَى قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِ كُنْ  
 إِنَّ كَيْدَ كُنٍّ عَظِيمٌ ②⑧ يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا سَكَّةَ وَاسْتَغْفِرِي  
 لِذَنْبِكِ ۖ إِنَّكَ كُنْتَ مِنَ الْخَاطِئِينَ ②⑨

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَفْسِهِ

اور دردناک سزا دی جائے؟ یوسف نے کہا: اسی نے مجھے پھانسنے کی کوشش کی تھی۔  
 (معاملہ آگے بڑھا تو) عورت کے اپنے خاندان کے لوگوں میں سے ایک شخص نے  
 (قرینے کی) شہادت پیش کی کہ اگر یوسف کا کرتا آگے سے پھٹا ہو تو عورت سچی ہے  
 اور وہ جھوٹا ہے، اور اگر اُس کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہو تو عورت جھوٹی ہے اور وہ سچا ہے۔  
 پھر جب شوہر نے دیکھا کہ یوسف کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہے تو (غصے میں) بول اٹھا کہ  
 یہ تم عورتوں کے فریب ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ تمہارے فریب بڑے غضب کے ہوتے  
 ہیں۔ ③⑨ یوسف، اس بات کو جانے دو اور اے عورت، تو اپنے گناہ کی معافی مانگ، اس  
 لیے کہ اصل میں تو ہی خطا کار ہے۔ ②⑤-②⑨

شہر میں کچھ عورتیں (آپس میں) چرچا کرنے لگیں کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام پر

③⑨ یہ واضح طور پر اس بات کا ثبوت تھا کہ اقدام یوسف علیہ السلام کی طرف سے نہیں، بلکہ  
 زلیخا کی طرف سے ہوا ہے۔ اس پر شوہر کو جیسا کچھ غصہ آیا ہوگا، اُس کا اظہار اُس نے اس آخری  
 جملے میں کیا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں گویا زلیخا کے اس فعل نے تنہا اُس کو نہیں، بلکہ اُس کی  
 پوری جنس کو اُس کے شوہر کی نگاہوں میں کیا د اور مبغوض بنا دیا۔







یوسف  
۱۲

قَدْ شَفَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرِيهَا فِي ضُلُلٍ مُّبِينٍ ۝۳۰ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ  
أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ  
سِكِّينًا وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ

ڈورے ڈال رہی ہے۔ وہ اُس کی محبت میں فریفتہ ہو گئی ہے۔ ہمارے نزدیک تو وہ کھلی  
حماقت میں مبتلا ہے، (شاید نہیں جانتی کہ ایسے لوگ کس طرح رام کیے جاتے ہیں)۔  
سو اُن کے فریب کا حال جب اُس عورت نے سنا تو اُس نے اُنھیں بلا بھیجا (کہ وہ بھی  
اپنا ہنر آزمالیں) اور اُن کے لیے ایک مجلس آراستہ کی اور اُن میں سے ہر ایک کو ایک

۴۰ اس فقرے میں ملامت، ثنات اور ادعا کے جو پہلو مضمون ہیں، وہ ہم نے اس کے بعد  
توسیع کی عبارت سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے ان کی  
تفصیل فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”... اُن کا مطلب یہ تھا کہ اول تو یہی بات بڑی عجیب ہے کہ ایک اعلیٰ عہدہ دار کی بیگم ہو کر  
اپنے غلام کے پیچھے اپنے کو خوار کرے۔ پھر اس سے بھی عجیب تر ماجرا یہ کہ اُس کو بھی رام نہ کر  
سکے۔ یہیں سے اس ملامت کے اندر یہ مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ عورت احمق ہے کہ  
بدنام بھی ہوئی اور نامراد بھی رہی، اگر کہیں ہم ہوتے تو ایک ہی غمزے میں یوسف کو ایسی پٹنٹی  
دیتے کہ اُن کی پارسائی کی ساری دھوم ختم ہو جاتی۔“ (تدبر قرآن ۲۰۸/۴)

۴۱ اور اُنھیں اندازہ ہو جائے کہ جس شخص کے مقابل میں وہ ناکام رہی ہے، اُس کے لیے  
اُن کے عشوے، غمزے، چرتر اور فریب کیا حیثیت رکھتے ہیں۔

۴۲ اصل میں لفظ مُتَّكَأً آیا ہے۔ یہ اُس مجلس کے لیے آتا ہے جو گاہِ تکیوں سے آراستہ کی  
جائے۔ اُس زمانے کے مصر میں امرا کی مجلسیں بالعموم اسی طریقے سے آراستہ کی جاتی تھیں۔



وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هَذَا بَشَرًا اِنْ هَذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝۳۱ قَالَتْ  
فَذٰلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنِنِيْ فِيْهِ وَلَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ نَّفْسِهٖ

ایک چھری دی اور یوسف سے کہا کہ ان کے سامنے آ جاؤ۔ پھر جب عورتوں نے اُس کو دیکھا تو اُس کی عظمت سے مبہوت ہو گئیں اور (اپنی بات اُس سے منوانے کے لیے) اپنے ہاتھ جگہ جگہ سے زخمی کر لیے؛ لیکن (نا کام رہیں اور بالآخر) پکار اٹھیں کہ حاشا للہ؛ یہ آدمی نہیں ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔ اُس نے کہا: دیکھ لیا، یہی ہے جس کے

۴۳ آگے کے مضمون سے واضح ہے کہ یہ چھری انھی عورتوں کی فرمائش پر اور اُس چتر کے لیے دی گئی جس سے وہ یوسف علیہ السلام کو رام کرنا چاہتی تھیں۔

۴۴ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت یوسف کیسے جوان رعنا تھے اور سیرت و اخلاق کی پاکیزگی نے اُن کی رعنائی شخصیت کو دل ربائی کے کس مقام تک پہنچا دیا تھا۔

۴۵ اصل میں فعل 'قَطَّعْنَ' آیا ہے۔ یہ 'قطع' سے تفعیل ہے جو تکثیر کے لیے آ گیا ہے۔ ہم نے ترجمہ اسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۴۶ یہ تنزیہ کا کلمہ ہے اور اُس وقت بولا جاتا ہے، جب کسی الزام سے براءت مقصود ہو۔

۴۷ یہ قرآن نے اپنے اسلوب کے مطابق چند فقروں میں ایک پوری داستان سمیٹ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام سامنے آئے تو حسن و جمال اور پاکیزگی و تقدس کے ایک پیکر کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر پہلے تو دنگ رہ گئیں، پھر ذرا سنبھلیں اور چونکہ بڑے دعوے اور طنطنے کے ساتھ آئی تھیں، اس لیے اپنے چلتر آزمانا شروع کیے۔ جب اندازہ ہو گیا کہ اُن کی سب ادائیں، غمزے اور عشوے نا کام ہو رہے ہیں تو دھمکی دی کہ نہیں مانو گے تو ہم یہیں جان دے دیں گی۔ چنانچہ اپنی اس دھمکی کو سچ ثابت کرنے کے لیے اُن میں سے بعض نے اپنے ہاتھ جگہ جگہ سے زخمی کر لیے۔ لیکن جب یہ حربہ بھی کامیاب نہیں ہوا تو پکار اٹھیں کہ یہ آدمی نہیں ہے، یہ تو کوئی





فَاسْتَعَصِمَ ۖ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَا أُمِرَ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُونًا مِّنَ الصُّغَرَىٰ ۖ ۝۳۲ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ

بارے میں تم مجھے ملامت کر رہی تھیں۔ بے شک، میں نے اسے رجھانے کی کوشش کی تھی، مگر یہ بچ نکلا۔ تاہم میں جو کرنے کے لیے اسے کہہ رہی ہوں، اس نے اگر نہیں کیا تو ضرور قید کیا جائے گا اور ضرور ذلیل ہوگا۔ اس پر یوسف نے دعا کی کہ پروردگار،

فرشتہ یزدانی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”ان بیگمات کا یہ اعتراف حضرت یوسف کی کمال درجہ تعریف بھی ہے اور اپنی شکست کے لیے ایک عذر بھی۔ اس کے اندر یہ مضمون بھی مضمر ہے کہ اگر ہم اُن کو جیت نہ سکے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے فن یا ہمارے حسن و جمال میں کوئی نقص تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں مقابلہ ایک معزز فرشتہ سے کرنا پڑا، جب کہ ہمارے سارے اسلحے صرف انسانوں ہی پر کارگر ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔“ (تذبر قرآن ۲/۲۱۰)

یہ سرگذشت اس درجہ ایجاز و اختصار کے ساتھ کیوں نقل کی گئی ہے؟ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ قرآن نے اسے اپنے شایان شان نہیں سمجھا کہ اُن خرافات کی تفصیل کرے جو حضرت یوسف کا دل جیتنے کے لیے وہاں ہوئی ہوں گی۔

۲۸ یہ ایک مزید دھمکی ہے۔ زلیخانے پہلے بڑے تیکھے انداز میں عورتوں کے ادعا کا جواب دیا ہے، پھر صاف کہہ دیا ہے کہ میں اس کی جان چھوڑنے والی نہیں ہوں۔ اس لیے یہ اپنی روش پر قائم رہا تو لازماً جیل کی ہوا کھائے گا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ہوس کی محبت دھمکی بھی دے رہی ہے اور اپنے سب حربوں میں ناکام ہو جانے کے بعد اپنی ناکامی کا انتقام لینے کا فیصلہ بھی کر رہی ہے۔ حضرت یوسف کے لیے یہ ایک نئی آزمائش تھی جس سے وہ اب دوچار ہونے والے تھے۔ زنان مصر کی اس مجلس سے اُس زمانے کے مصر کی اخلاقی حالت کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس طرح کے





وَالَّذِي كَفَرُوا بِآيَاتِهِ لَئِنْ لَمْ يَأْتِهِمْ بِدَلِيلٍ قَدْ كَانُوا فِي كَيْدٍ مُّبِينٍ ۝  
 فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُمْ كَيْدَهُمْ ۖ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝  
 ثُمَّ بَدَأَ إِلَهُهم مِّنْ بَعْدِ مَا رَأَوْا الْآيَاتِ لَيْسَ جُنْدَهُ حَتَّىٰ حِينٍ ۝  
 وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيْنِ ۖ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَانِي أَعْرُضُ خَرَاءَ ۖ

قید خانہ مجھے اُس چیز سے زیادہ پسند ہے جس کی یہ مجھے دعوت دے رہی ہیں۔ اب اگر ان کے فریب کو تو نے مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور ان لوگوں میں شامل ہو رہوں گا جو جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ سو اُس کے پروردگار نے اُس کی یہ دعا قبول کر لی اور ان کا فریب اُس سے دفع کر دیا۔ بے شک، وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۳۰-۳۴

پھر (اُس کی بے گناہی کی) یہ نشانیاں دیکھ لینے کے بعد بھی اُن لوگوں نے مصلحت یہی سمجھی کہ یوسف کو کچھ مدت کے لیے لازماً قید کر دیں۔ اُس کے ساتھ دو اور نوجوان بھی قید خانے میں داخل ہوئے۔ اُن میں سے ایک نے (ایک دن) اُس سے کہا: میں

معاملات میں وہ دور حاضر کی تہذیب سے کسی طرح کم ”ترقی یافتہ“ نہیں تھے۔

۴۹ یہ بڑے عجز کے ساتھ خدا سے مدد کی التجا ہے جو اپنے ایمان و اخلاق کو بچانے کے لیے پوری طاقت نہچوڑ دینے کے بعد اُن کی زبان پر آگئی ہے۔ آگے وضاحت ہے کہ یہ دعا فوراً قبول ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بندہ شیطان کے مقابلے میں اس حد تک استقامت دکھانے کے بعد اپنے آپ کو اپنے پروردگار کے آگے ڈال دیتا ہے تو اُس کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے اور فوراً قبول ہوتی ہے۔

۵۰ یوسف علیہ السلام چونکہ غلام تھے، اس لیے قدیم رواج کے مطابق آپ کو جیل بھیجنے کے





وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرِنِي أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْرًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ  
نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِ ۚ إِنَّا نَارِيكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٣٦﴾ قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ

خواب میں دیکھتا ہوں کہ شراب نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا: میں دیکھتا ہوں کہ  
اپنے سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے چڑیاں کھا رہی ہیں۔ ہمیں اس کی  
تعبیر بتائیے، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ اُن لوگوں میں سے ہیں جو خوبی اختیار کرتے ہیں۔

لیے کسی عدالتی کارروائی کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس زمانے کے آقاؤں کو اپنے غلاموں پر غیر محدود  
اختیارات حاصل تھے۔ چنانچہ آپ کے آقا نے بھی اپنے اسی اختیار کے تحت آپ کو اس خیال  
سے جیل بھجوا دیا کہ زلیخا کے دماغ سے ان کا خبط بھی نکل جائے گا اور لوگ بھی یہی سمجھیں گے کہ  
جس کو سزا ملی ہے، قصور بھی اُسی کا ہوگا۔ قرآن کے الفاظ سے واضح ہے کہ دوسرے اعزہ واقربا بھی  
اس فیصلے میں شریک تھے، اس لیے کہ اپنی ناک بچانے کے لیے وہ بھی مصلحت اسی میں دیکھ رہے  
تھے۔

۵۱ بائبل کی روایت ہے کہ ان میں سے ایک بادشاہ کا ساتی اور دوسرا نان پز تھا۔ تلمود میں  
مزید وضاحت ہے کہ شاہ مصر نے ان نوجوانوں کو اس قصور پر جیل بھیجا تھا کہ ایک دعوت کے موقع  
پر روٹیوں میں کچھ کرکراہٹ پائی گئی تھی اور شراب کے پیالے میں ایک مکھی نکل آئی تھی۔ ہمارے  
ہاں کی روایتوں میں اس کے برخلاف یہ بیان کیا گیا ہے کہ دونوں پر الزام تھا کہ اُنھوں نے بادشاہ  
کے کھانے میں زہر ملانے کی کوشش کی ہے۔

۵۲ اصل الفاظ ہیں: إِنِّي أَرِنِي أَعْصِرُ خَمْرًا۔ شراب بنانے کے لیے انگور نچوڑے جاتے  
ہیں، لیکن قرآن نے یہاں شے کو اُس کی غایت کے لحاظ سے تعبیر کرنے کا اسلوب اختیار کیا ہے۔  
۵۳ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قید خانے میں یوسف علیہ السلام کس نگاہ سے دیکھے  
جاتے تھے۔ ان نوجوانوں نے جس طرح اُنھیں مخاطب کیا ہے، اُس سے واضح ہے کہ جیل کے



تَرْزُقْنِي إِلَّا نَبَاتُكُمَا بَتَاوِيلَهُ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ذَلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي  
رَبِّي إِنَّنِي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿٣٤﴾

یوسف نے کہا: یہاں جو کھانا تمہیں ملتا ہے، وہ آئے گا نہیں کہ اُس کے آنے سے پہلے  
میں تمہیں اس کی تعبیر بتا دوں گا۔<sup>۵۴</sup> یہ اُس علم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھایا  
ہے۔<sup>۵۵</sup> واقعہ یہ ہے کہ میں نے اُن لوگوں کے مذہب کو چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں

لوگ اُنھیں کوئی مجرم نہیں، بلکہ ایک نہایت نیک نفس انسان سمجھتے تھے اور اُنھیں معلوم تھا کہ اپنے  
اخلاق و کردار کی پاکیزگی وہ کیسی سخت آزمائشوں میں ثابت کر چکے ہیں۔ چنانچہ بائبل کا بیان ہے  
کہ صرف قیدی ہی نہیں، قید خانے کے حکام اور اہل کار بھی اُن کے معتقد ہو چکے تھے۔ پیدائش  
میں ہے:

”قید خانے کے داروغہ نے سب قیدیوں کو جو قید میں تھے، یوسف کے ہاتھ میں سونپا اور جو  
کچھ وہ کرتے، اُسی کے حکم سے کرتے تھے۔ اور قید خانے کا داروغہ سب کاموں کی طرف سے  
جو اُس کے ہاتھ میں تھے، بے فکر تھا۔“ (۲۳-۲۲:۳۹)

۵۴ قید خانے کی زندگی میں کھانے کی تقسیم وغیرہ کے مواقع ہی شب و روز کی یکسانی میں کچھ  
تغیر پیدا کرتے ہوں گے۔ حضرت یوسف نے غالباً اسی بنا پر اس کا حوالہ دیا ہے۔ آگے کی آیتوں  
سے واضح ہے کہ تعبیر بتانے کے لیے یہ مہلت آپ نے صرف اس لیے حاصل کی تھی کہ اس سے  
فائدہ اٹھا کر آپ اپنی دعوت اُن کے سامنے پیش کر سکیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس کا اثر تعبیر پوچھنے والوں پر تو یہ پڑا ہوگا کہ حضرت یوسف نے اُن کے خوابوں کو اہمیت  
دی ہے۔ وہ سرسری طور پر الٹی سیدھی کوئی بات بتا کر اُن کو ٹالنا نہیں چاہتے، بلکہ سوچ کر یا اپنے  
رب سے رجوع کرنے کے بعد اُن کی تعبیر بتائیں گے اور اُدھر خود حضرت یوسف نے اس التوا  
سے اُس حق کی تبلیغ کے لیے ایک نہایت اچھا موقع پیدا کر لیا جو اُن کی زندگی کا سب سے زیادہ  
محبوب مقصد بن چکا تھا۔ اُنھوں نے جب دو دلوں کو اپنی طرف مائل دیکھا تو صرف اُن کی





وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِيْ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ مَا كَانَ لَنَا اَنْ  
نُشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ

رکھتے اور وہی آخرت کے منکر ہیں اور میں نے اپنے بزرگوں، ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا مذہب اختیار کر لیا ہے۔ ہم کو حق نہیں کہ ہم کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھیرائیں۔ یہ ہم پر

اندھی بہری عقیدت ہی پر قانع نہیں ہو گئے، بلکہ چاہا کہ اُن کو اللہ کی بندگی کی وہ دعوت پہنچا دیں جو اگر وہ قبول کر لیں تو اُن کی دنیا اور آخرت، دونوں سنور جائیں۔“ (تذبر قرآن ۲۱۸/۴)

۵۵ یہ نہایت عمدہ تمہید ہے جس سے یوسف علیہ السلام نے اُن نو جوانوں کی ضرورت کو اپنی ذات سے اٹھا کر نہایت خوبی کے ساتھ اپنے پروردگار سے متعلق کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس چیز کے لیے میرے پاس آئے ہو، اُس کا منبع اور سرچشمہ میں نہیں، بلکہ میرا پروردگار ہے۔ چنانچہ خواب کی تعبیر جاننا چاہتے ہو تو تھوڑی دیر کے لیے ٹھیر کر تعبیر کا علم دینے والے کی معرفت بھی حاصل کر لو۔

۵۶ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ میں نے جو کچھ چھوڑا اور جو کچھ اختیار کیا ہے، اپنے باطن میں اچھی طرح اُس کا تجزیہ کر کے اور علم و عقل کی میزان میں اُس کو تول کر چھوڑا اور اختیار کیا ہے۔ اس سے، اگر غور کیجیے تو اُنھوں نے یہ اشارہ بھی کر دیا ہے کہ خدا پر ایمان کے ساتھ مشرکانہ عقائد کے پیوند کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسے اختیار کیا جائے تو اُن لوگوں کے طریقے کو لازماً چھوڑنا پڑتا ہے جو خدا کے شریک ٹھیراتے یا خدا اور آخرت پر سچا ایمان نہیں رکھتے۔

۵۷ یہ حوالہ جس انداز سے دیا گیا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کے نام اُن لوگوں کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام نے ان کا نام لے کر ایک ہی جملے میں پوری دعوت کا تعارف بھی کر دیا اور یہ بات بھی واضح کر دی کہ میں کوئی نئی بات لے کر نہیں آیا، بلکہ وہی پیغام تمھیں پہنچا رہا ہوں جو یہ اکابر و مشاہیر اس سے پہلے پہنچاتے رہے ہیں۔ اُن کے



یوسف  
۱۲



وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٣٨﴾ يُصَاحِبِي السَّجْنَاءَ أَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرًا مِّنَ اللَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿٣٩﴾ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَّا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ ۚ إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا آيَاهُ ۚ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٠﴾

اور تمام انسانوں پر اللہ کا فضل ہے (کہ اُس نے یہ حقیقت اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے واضح کر دی ہے)، لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔ میرے زنداں کے ساتھیو، کیا الگ الگ بہت سے خدا بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔ تم اُس کے سوا چند ناموں ہی کی بندگی کر رہے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے اُن کی کوئی سند نہیں اتاری ہے۔ اقتدار صرف اللہ کا ہے۔ اُس نے حکم دیا ہے کہ خود اُس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی دین قیم ہے، مگر بہت سے لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔ ۳۵-۴۰

مخاطبین نے اس پر کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ اس سے یہ بات مزید واضح ہوئی کہ اُس وقت تک جیل کے لوگ جان چکے تھے کہ وہ کس خانوادے کے چشم و چراغ ہیں۔

۵۸ یوسف علیہ السلام کی یہ تقریر قرآن میں توحید کی بہترین تقریروں میں سے ہے، اور ٹھیک اُس موقع پر کی گئی، جب مخاطبین اس کو سننے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔ اس میں انہوں نے پہلے اُن کی توجہ علم و حکمت کے اصل سرچشمے کی طرف مبذول کرائی ہے۔ پھر اُس سفر کا حوالہ دیا ہے جو خود انہوں نے باطل کو چھوڑ کر حق تک پہنچنے کے لیے کیا ہے۔ اس کے بعد ملت توحید کی تاریخی عظمت اور اہمیت واضح کی ہے۔ پھر بندگی کا یہ تقاضا واضح کیا ہے کہ بندہ ہو کر کسی کو خدا کا







یوسف  
۱۲

يَصَاحِبِيَ السَّجْنِ أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِي رَبَّهُ خَمْرًا ۚ وَأَمَّا الْآخَرُ  
فَيُصَلِّبُ فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَأْسِهِ ۚ قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِينَ ﴿٣١﴾

میرے زنداں کے ساتھیو، (تمہارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ) تم میں سے ایک تو  
(اپنے منصب پر بحال ہو جائے گا اور) اپنے آقا کو شراب پلائے گا۔ رہا دوسرا تو اُسے  
سولی دی جائے گی، پھر پرندے اُس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ اُس بات کا فیصلہ  
ہوا جس کے بارے میں تم دونوں پوچھ رہے تھے۔ ۴۱

شریک ٹھیرایا جائے، اس کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اس کے بعد خدا کے اُس امتنان و  
احسان کی طرف توجہ دلائی ہے جو اُس نے پیغمبروں کی بعثت سے انسانیت پر کیا ہے۔ پھر اُن  
نوجوانوں کو مخاطب کیا ہے اور دیکھیے کہ کس دل نواز انداز سے مخاطب کیا ہے۔ ہم دردی اور محبت  
کے جذبات جو مصیبت کے اشتراک سے ایک دوسرے کے لیے پیدا ہو جاتے ہیں، یہ خطاب اُن  
کو بڑی بلاغت کے ساتھ ابھارتا ہے تاکہ مخاطبین اس کو پوری توجہ کے ساتھ سنیں اور اس کے ہر لفظ  
کو باہمی خیر خواہی اور اخلاص پر محمول کریں۔ اس کے بعد اصل دعوت پیش کی گئی ہے جس کا خلاصہ  
یہ ہے کہ جہاں تک خدا کا تعلق ہے، وہ تو ایک بدیہی حقیقت، بلکہ ابدہ البدیہیات ہے اور اُس کے  
بندے مجبور ہیں کہ اُس کی آقائی کو تسلیم کریں، لیکن اُس کے ساتھ کچھ دوسروں کو بھی آقا تسلیم کر لیا  
جائے، یہ کہاں کی دانش مندی ہے؟ کون یہ پسند کرے گا کہ بغیر کسی ضرورت کے کسی کی غلامی کا پٹا  
اپنی گردن میں ڈال لے؟ پھر مزید یہ کہ ایک ایسی بات کیوں مانی جائے جس کی کوئی ادنیٰ شہادت  
نہ ہماری عقل میں ہے، نہ فطرت میں اور نہ نفس و آفاق میں؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا تھا کہ  
خدا نے بتایا ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کے حق میں بھی کوئی چیز پیش نہیں کی جاسکتی۔ جو کچھ مانا  
جا رہا ہے، وہ محض نام ہیں جو بغیر کسی دلیل کے لوگوں نے رکھ لیے ہیں۔ تمام اقتدار خدا کا ہے  
اور جو دین اُس نے اپنے پیغمبروں کی وساطت سے اتارا ہے، اُس میں بھی ہمیشہ یہی ہدایت کی گئی



وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ فَأَنَسَهُ  
الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ ۖ ﴿٣٢﴾  
وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ  
عِجَافٌ وَسَبْعٌ سُذُبَاتٍ حُضِرَ وَأُخْرِي سِتٌ يَأْتِيهَا الْمَلَائِكَةُ ۖ

اُن میں سے جس کی نسبت یوسف نے خیال کیا کہ وہ رہا ہو جائے گا، اُس نے  
اُس سے کہا کہ اپنے آقا سے میرا ذکر کرنا۔ مگر شیطان نے اُس کو اپنے آقا سے یہ ذکر  
کرنا بھلا دیا اور یوسف کئی سال تک (اُسی طرح) قید خانے میں پڑا رہا۔ ۴۲

(پھر ایک دن) بادشاہ نے (اپنے دربار کے لوگوں سے) کہا: میں خواب میں  
دیکھتا ہوں کہ سات موٹی گائیں ہیں جنہیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں، اور سات بالیں  
ہری اور دوسری سات سوکھی ہیں (اور وہ بھی ہری بالیوں کو کھا رہی ہیں)۔ دربار کے

ہے کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے، اس لیے اُسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھا دین ہے، مگر افسوس کہ  
لوگوں کی اکثریت اس سے بے خبر ہے۔

۵۹ اوپر گزر چکا ہے کہ یہ بادشاہ کا ساتی تھا، اس لیے آقا سے مراد شاہ مصر ہے۔ یوسف  
علیہ السلام نے یہ خواہش اس توقع کی بنا پر کی کہ یہ اپنے مشاہدات، خاص طور پر خواب کی تعبیر  
بتانے کا واقعہ بادشاہ کو بتائے گا تو ہو سکتا ہے کہ ایسی کوئی ضرورت وہاں بھی پیش آجائے اور اس  
طرح اس مظلومانہ قید سے رہائی کی صورت پیدا ہو۔

۶۰ اصل الفاظ ہیں: 'فَأَنسَهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ'۔ اس میں 'ذِكْرَ رَبِّهِ' کی اضافت اُسی  
نوعیت کی ہے جو 'مَكْرُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ' وغیرہ میں ہے۔ انسان کو نیکی کے کاموں سے شیطان ہی  
غافل کرتا ہے، مگر اس کی مہلت اُسے خدا کے اذن سے ملتی ہے۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی







یوسف  
۱۲

فِي رُءْيَايَ إِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُونَ ﴿٣٣﴾ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ  
وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعِلْمِينَ ﴿٣٤﴾ وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا  
وَاذْكُرْ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ﴿٣٥﴾

لوگو، مجھے میرے خواب کی تعبیر بتاؤ، اگر تم خواب کی تعبیر دیتے ہو۔<sup>۶۲</sup> لوگوں نے کہا: یہ پریشان خواب ہیں اور ہم اس طرح کے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے۔<sup>۶۳</sup> اُن دو قیدیوں میں سے جو چھوٹ گیا تھا اور اُسے ایک مدت کے بعد یاد پڑا،<sup>۶۴</sup> اُس نے کہا: میں آپ لوگوں کو اس کی تعبیر بتاؤں گا، (جاننا چاہتے ہوں) تو مجھے ذرا (قید خانے میں یوسف کے پاس) بھیج دیجیئے۔<sup>۶۵</sup> ۲۳-۲۵

حکمت و مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ حضرت یوسف کچھ سال اور اسی طرح قید خانے میں گزاریں۔ چنانچہ وہ شخص جیل سے باہر آیا تو اُسے بالکل یاد نہیں رہا کہ زنداں کے ساتھی نے اُس سے کیا بات کہی تھی۔

۶۱ یہ حصہ آیت میں محذوف ہے۔ آگے آیت ۲۸ میں اس کی وضاحت ہوگئی ہے۔  
۶۲ اس آخری فقرے سے مترشح ہے کہ بادشاہ اگرچہ اپنے اس خواب سے بہت زیادہ متاثر تھا، مگر یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی تعبیر بتانا اتنا آسان نہیں ہے۔  
۶۳ یہ فقرہ اُنھوں نے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کا خواب بامعنی ہوتا تو ضرور ہم اُس کی تعبیر بتاتے، لیکن یہ تو بالکل پریشان خواب ہے، اس لیے مطمئن ہو جائیے، اس طرح کے خوابوں کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔

۶۴ یہ بھی خدا کے اذن سے ہوا، اس لیے کہ اب وہ وقت آ گیا تھا کہ یوسف قید سے باہر آئیں اور مصر کے سیاہ و سفید کے مالک بن جائیں۔

۶۵ قرآن نے یہاں بھی اپنے اسلوب کے مطابق تفصیلات حذف کر دی ہیں۔ بائبل اور



يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ  
 سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَبْسُتٌ لَّعَلِّي أَرْجِعُ  
 إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٣٧﴾ قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ  
 دَابَّاءَ فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرَوْهُ فِي سُنُبٍ أَيْ لَا قَلِيلًا مِّمَّا تَأْكُلُونَ ﴿٣٨﴾  
 ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا  
 قَلِيلًا مِّمَّا تَحْصِنُونَ ﴿٣٩﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَامٌ فِيهِ

(اُس نے جا کر کہا): یوسف، اے سراپا راستی، ہمیں سات موٹی گایوں کے  
 بارے میں بتاؤ جنہیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات ہری اور دوسری سات  
 سوکھی بالیوں کے بارے میں، اس لیے کہ میں لوٹ کر اُن لوگوں کے پاس جاؤں تاکہ  
 (اٹکل کے تیر چلانے کے بجائے) وہ بھی جان لیں (کہ اس خواب کی حقیقت کیا  
 ہے)۔ یوسف نے کہا: سات برس تک تم برابر کھیتی کرو گے، لہذا جو فصل تم کاٹو، اُس  
 میں سے تھوڑا سا نکال کر جو تم کھاؤ گے، باقی سب اُس کی بالیوں میں چھوڑ دو (تاکہ  
 خراب نہ ہو)۔ اس کے بعد پھر سات برس بہت سخت آئیں گے جو تھوڑی مقدار کے  
 سوا جسے تم محفوظ کر لو گے، وہ غلہ کھا جائیں گے جو اُن برسوں کے لیے تم نے فراہم کیا  
 تالمود سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس شخص نے پہلے یوسف علیہ السلام اور جیل میں اُن سے اپنی ملاقات  
 اور خوابوں کی تعبیر پوچھنے کا پورا قصہ بادشاہ اور اُس کے درباریوں کو تفصیل کے ساتھ سنایا، اس کے  
 بعد اُن سے کہا کہ مجھے جانے دیجیے، میں اس خواب کی تعبیر بھی اُنھی سے پوچھ کر آتا ہوں۔

۶۶ یہ خطاب بتا رہا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو وہ محض خوابوں کی تعبیر بتانے والا ایک شخص نہیں  
 سمجھتا تھا، بلکہ جیل میں اپنے تجربات کی بنا پر جان چکا تھا کہ آپ فی الواقع ایک پیکر صداقت اور





یوسف  
۱۲

يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ﴿٢٩﴾

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ  
إِلَى رَبِّكَ فَسَلَّهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الَّتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ إِنَّ رَبِّي

ہوگا۔ اس کے بعد پھر ایک سال ایسا آئے گا کہ جس میں (بارانِ رحمت سے) لوگوں  
کی فریادری کی جائے گی اور وہ اُس میں انگوڑی پھوڑیں گے۔ ۲۶-۲۹

(یہ تعبیر دربار میں سنائی گئی تو) بادشاہ نے کہا: اُسے میرے پاس لاؤ۔ مگر جب  
قاصد یوسف کے پاس (اُسے لینے کے لیے) پہنچا تو اُس نے کہا: اپنے آقا کے پاس  
واپس جاؤ اور اُس سے پوچھو کہ اُن عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ

صدق مجسم شخصیت ہیں جو خوابوں کی تعبیر بھی بتا دیتے ہیں۔

۲۷ یوسف علیہ السلام نے صرف تعبیر نہیں بتائی، اُس کے ساتھ اُس تدبیر کی طرف بھی رہنمائی  
فرمادی ہے جو قحط کے ان سات برسوں کی مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لیے اختیار کرنی چاہیے۔  
اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مستقبل کی منصوبہ بندی کے بارے میں قرآن کا نقطہ نظر صوفیانہ  
مذہب سے کس قدر مختلف ہے۔

۲۸ اصل میں لفظ 'يُغَاثُ' آیا ہے۔ یہ 'غوث' سے ہے۔ تاہم اس کے لازم کی حیثیت سے  
اس کا ترجمہ بارش بھی کیا جاسکتا ہے، لیکن ہم نے اسے لغوی مفہوم میں لیا ہے تاکہ قحط سے جو ہمہ گیر  
اثرات لوگوں پر ہوں گے، اُن کی پوری تصویر سامنے آجائے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ایسا غیر معمولی  
ہوگا کہ لوگ چیخ اُٹھیں گے اور اپنے پروردگار کے آگے رونے اور گڑ گڑانے پر مجبور ہو جائیں گے،  
یہاں تک کہ بالآخر اُن کی فریاد سن لی جائے گی۔

۲۹ اصل میں لفظ 'يَعْصِرُونَ' آیا ہے۔ اس کی جگہ کوئی دوسری تعبیر بھی اختیار کی جاسکتی تھی،  
لیکن پوچھنے والا چونکہ بادشاہ کا ساتھی تھا، اس لیے اس لفظ کا انتخاب کیا گیا جس سے ایک خاص



بِكَيْدٍ هُنَّ عَلَيْهِمْ ۝ قَالَ مَا خَطْبُكُمْ إِذْ رَاوَدْتُنَّ يُوسُفَ عَنْ  
نَفْسِهِ ۖ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ ۖ قَالَتِ امْرَأَتُ  
الْعَزِيزِ لَنْ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۖ أَنَا رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ

لیے تھے؟ میرا پروردگار تو اُن کے فریب سے خوب واقف ہے۔ بادشاہ نے اُنھیں  
(بلا کر) پوچھا: تمھارا کیا ماجرا ہے، جب تم نے یوسف کو پھسلانے کی کوشش کی تھی؟ سب  
نے گواہی دی کہ حاشا للہ، ہم نے اُس میں برائی کا کوئی شائبہ تک نہیں پایا۔ عزیز کی  
بیوی بھی بول اٹھی: اب حق کھل چکا ہے۔ یہ میں ہی تھی جس نے اُس کو پھسلانے کی  
لطف کلام میں پیدا ہو گیا ہے۔

۰ یوسف علیہ السلام کی جگہ کوئی اور ہوتا تو رہائی کا مژدہ پا کر فوراً ساتھ ہو لیتا، مگر اُنھوں نے  
اصرار کیا کہ پہلے اُس معاملے کی تحقیق کی جائے جس کو بہانہ بنا کر مجھے جیل بھیجا گیا تھا۔ استاذ امام  
لکھتے ہیں:

”...حضرت یوسف کے اس ارشاد کی تہ میں اتر کر غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اُنھوں  
نے مجرد بادشاہ کے وقتی حسن ظن سے فائدہ اٹھا کر اپنی رہائی اور بادشاہ کے تقرب کو پسند نہیں  
فرمایا، بلکہ سب سے زیادہ اہمیت الزام سے براءت کو دی اور اپنی سچائی اور اپنے رب پر اُنھیں  
اس درجہ اعتماد تھا کہ اس بات کی ذرا پروا نہ ہوئی کہ فریق ثانی اُنھیں ملزم بنانے کے لیے کیا  
دروغ بافیاں کر سکتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۴/۲۲۳)

اے یہ جملہ بتا رہا ہے کہ اُس وقت تک یہ حقیقت بادشاہ پر بھی بڑی حد تک واضح ہو چکی تھی کہ  
سارا چھل فریب عورتوں ہی کا تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اصل یہ ہے کہ سچائی اپنے ظہور کے لیے صبر کا مطالبہ کرتی ہے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اُس کو  
اختیار کر لے اور جو صبر اُس کے لیے مطلوب ہے، اُس کا حق ادا کر دے تو وہ وقت لازماً آتا ہے،  
جب اُس کی صداقت کی صداے بازگشت درود یوار سے سنائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ دشمن







یوسف  
۱۲

## الصُّدِيقُ ۵۱

ذَلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ  
الْخَائِنِينَ ۵۲ وَمَا أَبْرَأُ نَفْسِي ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا  
مَا رَحِمَ رَبِّي ۚ إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ ۵۳  
وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصُهُ لِنَفْسِي فَلَمَّا كَلَّمَهُ

کوشش کی تھی، اس میں شبہ نہیں کہ وہ بالکل سچا ہے۔ ۵۰-۵۱

(یوسف نے کہا): اس سے میری غرض یہ تھی کہ عزیز یہ جان لے کہ میں نے  
در پردہ اُس کی خیانت نہیں کی تھی اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں، اُن کی چال کو اللہ چلنے  
نہیں دیتا<sup>۲</sup>۔ میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں، نفس تو برائی پر اکساتا ہی ہے،  
الا یہ کہ جب میرا پروردگار رحم فرمائے<sup>۳</sup>۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا پروردگار بڑا بخشنے والا ہے،  
اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۵۲-۵۳

بادشاہ نے کہا: اُس کو میرے پاس لاؤ، میں اُسے اپنے لیے خاص رکھوں گا<sup>۴</sup>۔

بھی... اُس کی گواہی دیتے ہیں۔“ (تذکر قرآن ۴/۲۲۳)

۲؎ یہ حضرت یوسف نے معاملے کی تحقیق پر اپنے اصرار کی وجہ بتائی ہے۔ اس کا موقع غالباً  
اُس وقت آیا ہوگا، جب قید خانے میں اُنہیں تحقیقات کے نتائج بتائے گئے ہوں گے۔

۳؎ اصل الفاظ ہیں: 'إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي'۔ ان میں 'مَا' ہمارے نزدیک زمان کے معنی میں  
ہے۔ ترجمے میں اُسی کی رعایت ملحوظ ہے۔

۴؎ اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ بادشاہ کے خواب کی نہایت دل نشیں تعبیر اور اُس کے ساتھ  
جس ہول ناک قحط کے ظہور کی خبر خواب میں دی گئی تھی، اُس کے مقابلے کی تدبیر، الزامات کی تحقیق



قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ﴿٥٤﴾ قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلَيْهَا ﴿٥٥﴾

پھر جب اُس سے بات چیت کی تو (اس قدر متاثر ہوا کہ) اُس نے کہا: اب تم ہمارے ہاں صاحب اقتدار ہو اور تم پر بھروسہ کیا جائے گا۔ یوسفؑ نے کہا: اس ملک کے خزانے میرے سپرد کر دیجیے، اس لیے کہ میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں۔ ۵۴-۵۵

کے بغیر رہائی کی پیش کش قبول کرنے سے انکار اور اس کے نتیجے میں عزیز کی بیوی اور دوسری عورتوں کا اعتراف حق، استاذ امام کے الفاظ میں، ان تینوں میں سے کوئی ایک بات بھی بادشاہ کو حضرت یوسف کا گرویدہ بنانے کے لیے کافی ہو سکتی تھی، لیکن جس شخص کے باب میں یہ تینوں باتیں اکٹھی بادشاہ کے علم میں آئیں، آخر وہ اُس کا نادیدہ عاشق نہ ہو جاتا تو اور کیا کرتا۔ چنانچہ اُس نے اعلان کر دیا کہ میں یوسف کو اپنا معتمد خاص بنا رہا ہوں۔

۵۷ یہ بادشاہ کی طرف سے نظم حکومت میں بڑے سے بڑے منصب کی پیش کش ہے جو اُس نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ گفتگو کے نتیجے میں آپ کے علم، آپ کی لیاقت اور صلاحیت و استعداد کو دیکھ کر کی ہے، لیکن آپ اس پیش کش کو کس صورت میں قبول فرماتے ہیں، اسے آپ کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے۔

۶۷ یوسف علیہ السلام جس قحط کی پیشین گوئی کر چکے تھے، اس وقت سب سے بڑی مہم اُسی میں ملک کو سنبھالنے کی تھی۔ بادشاہ کی سب سے بڑی خواہش بھی اس صورت حال میں یہی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے اسی کے مطابق اپنی رائے بادشاہ کے سامنے رکھ دی۔ یہ کم و بیش اُسی اختیار و اقتدار کا مطالبہ ہے جو پارلیمانی نظام حکومت میں کسی ملک کے وزیر اعظم کو حاصل ہوتا ہے۔ بائبل میں ہے:







یوسف  
۱۲

وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَّبِعُوا مِنْهَا حَيْثُ شَاءَ  
نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾

یوسف کو اس طرح ہم نے اُس ملک میں اقتدار عطا فرمایا، وہ اُس میں جہاں چاہے، اپنی جگہ بنائے۔ ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں، نوازتے ہیں اور خوبی

”اور فرعون نے یوسف سے کہا: چونکہ خدا نے تجھے یہ سب کچھ سمجھا دیا ہے، اس لیے تیری مانند دانش ور اور عقل مند کوئی نہیں۔ سو تو میرے گھر کا مختار ہوگا اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی۔ فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب سے میں بزرگ تر ہوں گا۔ اور فرعون نے یوسف سے کہا کہ دیکھ میں تجھے سارے ملک مصر کا حاکم بناتا ہوں۔ اور فرعون نے اپنی انگشتی اپنے ہاتھ سے نکال کر یوسف کے ہاتھ میں پہنادی اور اُسے باریک کتان کے لباس میں آراستہ کروا کر سونے کا طوق اُس کے گلے میں پہنایا۔ اور اُس نے اُسے اپنے دوسرے رتھ میں سوار کرا کر اُس کے آگے آگے یہ منادی کروادی کہ گھٹنے ٹیکو اور اُس نے اُسے سارے ملک مصر کا حاکم بنا دیا اور فرعون نے یوسف سے کہا: میں فرعون ہوں اور تیرے حکم کے بغیر کوئی آدمی اس سارے ملک مصر میں اپنا ہاتھ پاؤں ہلانے نہ پائے گا۔“ (پیدائش ۴۱: ۳۹-۴۴)

یہاں یہ بات واضح رہے کہ یوسف علیہ السلام کے ہم عصر اس بادشاہ کے لیے لفظ ’فرعون‘ کا استعمال بائبل کے مرتبین کی غلطی ہے۔ یہ بادشاہ مصری حکمرانوں کے پندرہویں خاندان سے تھا جو تاریخ میں چرواہے بادشاہوں (Hyksos Kings) کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ یہ لوگ عربی النسل تھے اور شام و فلسطین سے مصر جا کر ۲ ہزار قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں مصر کی حکومت پر قابض ہو گئے تھے۔ عرب مورخین انھیں عمالیق کہتے ہیں۔ دور حاضر کے محققین کی عام رائے ہے کہ چرواہے بادشاہوں میں سے جس حکمران کا نام مصری تاریخ میں اپوفیس (Apophis) ملتا ہے، وہی حضرت یوسف کا ہم عصر تھا۔ فرعون مصر کی مذہبی اصطلاح تھی اور یہ لوگ مصری مذہب کو نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ یہ نام اُن قبیلے النسل بادشاہوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ان کی حکومت



وَلَا جُرْأِخِرَةَ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٥٤﴾  
وَجَاءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ  
مُنْكَرُونَ ﴿٥٥﴾ وَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِآخِ لَكُمْ

اختیار کرنے والوں کا اجر ہم کبھی ضائع نہیں کرتے۔ آخرت کا اجر، البتہ اُن لوگوں کے لیے اس سے کہیں بڑھ کر ہے جو ایمان لائے اور (خدا سے) برابر ڈرتے رہے۔ ۵۶-۵۷  
(اس کے کئی برس بعد) یوسف کے بھائی مصر آئے اور اُس کے ہاں بھی حاضر ہوئے تو اُس نے انہیں پہچان لیا، مگر انہوں نے یوسف کو نہیں پہچانا۔ (پھر اُن کی واپسی کے وقت)، جب اُس نے اُن کا سامان تیار کرایا تو اُن سے کہا: (اب آؤ گے

ختم کر کے ان کے بعد پندرہویں صدی قبل مسیح کے اواخر میں کسی وقت برسرِ اقتدار آئے۔

۷۔ یعنی جہاں چاہے، فروکش ہو، جس حصہ ملک کا چاہے، دورہ کرے، مصر اُس کا ہے، اُس میں جو نظم و نسق جس جگہ اور جس کے لیے ضروری سمجھے، اُس کا حکم جاری کر دے۔ یہ اُس ہمہ گیر اقتدار و اختیار کا بیان ہے جو بادشاہ کے فرمان سے یوسف علیہ السلام کو اُس ملک میں حاصل ہو گیا۔  
۸۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کی خوبی عمل کا اجر اُن کو دنیا میں بھی کسی نہ کسی صورت میں لازماً دیتے ہیں۔

۹۔ آگے کی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بھی غلہ خریدنے کی غرض سے مصر آئے تھے۔ حضرت یوسف نے جس قحط کی پیشین گوئی کی تھی، وہ شروع ہو چکا تھا اور اُس نے مصر اور اُس کے ملحقہ ممالک شام و فلسطین وغیرہ، سب کو اپنی پلیٹ میں لے لیا تھا۔ تاہم یوسف علیہ السلام کی پیش بندی اور حسن انتظام کی وجہ سے مصر نہ صرف یہ کہ اپنے جمع شدہ غلے سے اپنی ضروریات پوری کر رہا تھا، بلکہ پاس پڑوس کے ملکوں سے دوسرے ضرورت مندوں کو بھی اجازت دی گئی تھی کہ وہ اگر چاہیں تو وہاں آ کر ایک معین مقدار میں غلہ خرید سکتے ہیں۔



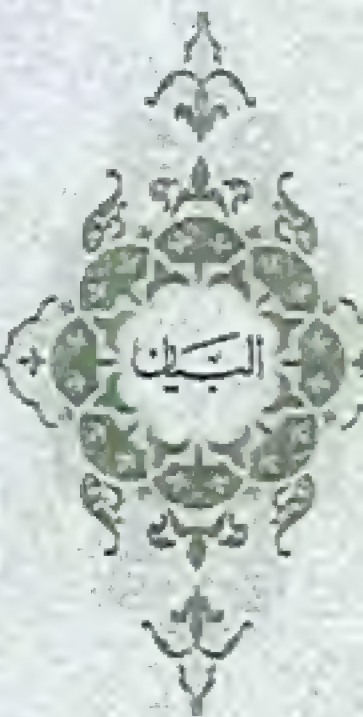


مِّنْ أَبِيكُمْ ؕ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوْفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ ۝۵۹  
فَإِنْ لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِي وَلَا تَقْرَبُونِ ۝۶۰ قَالُوا  
سَنُرَاوُدَعْنَاهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ۝۶۱

تو) اپنے سوتیلے بھائی کو بھی میرے پاس لانا، دیکھتے نہیں ہو کہ میں غلہ بھی پورے  
پیمانے سے دیتا ہوں اور بہت اچھی میزبانی کرنے والا بھی ہوں۔ لیکن اگر تم اُس کو  
میرے پاس نہیں لاؤ گے تو نہ میرے پاس تمہارے لیے غلہ ہے اور نہ تم میرے قریب  
پھٹکنٹا<sup>۸۲</sup>۔ اُنھوں نے کہا: ہم اُس کے بارے میں اُس کے باپ کو راضی کرنے کی کوشش  
کریں گے اور ہم یہ ضرور کر لیں گے<sup>۸۳</sup>۔ ۵۸-۶۱

۸۰ یوسف علیہ السلام کے بھائی چونکہ بیرونی تھے، اس لیے غلہ خریدنے کے لیے اُنھیں خاص  
اجازت نامہ حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ یہ حاضری غالباً اسی مقصد سے ہوئی۔  
۸۱ یہ نہ پہچاننا کچھ بعید از قیاس نہیں ہے۔ جس وقت اُنھوں نے آپ کو کنویں میں پھینکا تھا،  
اُس وقت آپ صرف ۷ سال کے تھے اور اب آپ کی عمر ۳۸ سال ہو چکی تھی۔ یہ کم و بیش ۲۰ سال  
کا عرصہ ہے۔ اتنی مدت آدمی کو بہت کچھ بدل دیتی ہے۔ آگے آیت ۹۰ سے اشارہ نکلتا ہے کہ  
آپ کی شکل و صورت میں اُنھیں اپنے بھائی کی جھلک ضرور نظر آئی، مگر جلد ہی اس خیال کو اُنھوں  
نے اپنے دل سے نکال دیا، اس لیے کہ وہ یہ گمان کسی طرح نہیں کر سکتے تھے کہ جس شخص کو اُنھوں  
نے اندھے کنویں میں ڈال دیا تھا، وہ آج مصر کے تخت حکومت پر متمکن ہے۔

۸۲ غلے کی ضابطہ بندی کی جائے تو بالعموم یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر ضرورت مند کو اُس  
کے افراد خاندان کے حساب سے غلہ دیا جائے۔ ان لوگوں نے اپنے بھائی بن یمین کے نام پر بھی  
غلہ حاصل کیا ہوگا۔ اس سے حضرت یوسف کو موقع مل گیا کہ وہ اصرار کریں کہ اس وقت تو میں نے  
تمہاری بات مان لی ہے کہ پیچھے تمہارا ایک بھائی اور بھی ہے، لیکن آئندہ اُس کو لے کر آنا ہوگا۔





وَقَالَ لِفَتَيْنِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا  
إِذَا انْقَلَبُوا إِلَى أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٦١﴾ فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَى أَبِيهِمْ  
قَالُوا يَا أَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَأَرْسِلْ مَعَنَا آخَانَا نَكْتَلُ وَإِنَّا  
لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿٦٢﴾ قَالَ هَلْ أَمْنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمْنُتُكُمْ عَلَىٰ أَخِيهِ  
مِّن قَبْلُ ۖ فَاللَّهُ خَيْرٌ حَافِظًا ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّحِيمِينَ ﴿٦٣﴾

یوسف نے اپنے خدام سے کہا کہ ان لوگوں نے غلے کے عوض جو مال دیا ہے، وہ  
(چپکے سے) ان کے کجاووں ہی میں رکھ دو۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ جب وہ اپنے  
اہل و عیال میں پہنچیں تو اُسے پہچان لیں (کہ اُنھی کا مال ہے جو اُنھیں واپس کر دیا گیا  
ہے) تاکہ وہ پھر آئیں۔ سو جب وہ اپنے باپ کے پاس لوٹے تو کہا: ابا جان،  
(آئندہ) ہم سے غلہ روک دیا گیا ہے، لہذا ہمارے بھائی، (بن یمین) کو بھی ہمارے  
ساتھ جانے دیجیے کہ ہم (اپنی سچائی ثابت کر سکیں اور) غلہ لائیں، ہم اُس کی حفاظت کا  
عہد کرتے ہیں۔ باپ نے جواب دیا: کیا میں اُس کے معاملے میں بھی تم پر ویسا ہی  
بھروسہ کروں، جیسا اس سے پہلے اُس کے بھائی کے معاملے میں تم پر بھروسہ کر چکا

نہیں لاؤ گے تو تمہیں جھوٹا سمجھا جائے گا، لہذا اس کے بعد تم میرے قریب بھی پھٹکنے کی کوشش نہ  
کرنا۔

۸۳ یعنی اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھانہ رکھیں گے۔ اس فقرے میں اُن کے دل کا چور نمایاں  
ہے کہ نہ لاسکے تو اس کی وجہ صرف یہ ہوگی کہ باپ نے اجازت نہیں دی۔ اس لیے کہ جو کچھ وہ  
یوسف علیہ السلام کے ساتھ کر چکے تھے، اُس کے بعد اس کا پورا امکان تھا۔

۸۴ یہ اس لیے فرمایا کہ مال کی کمی اُن کے دوبارہ آنے میں رکاوٹ نہ بن جائے۔





وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ ط قَالُوا  
يَا أَبَانَا مَا نَبْغِي ط هَذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ  
أَخَانَا وَنَزِدُكَ كَيْلَ بَعِيرٍ ط ذَلِكَ كَيْلٌ يَسِيرٌ ۝۶۵ قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ  
مَعَكُمْ حَتَّى تُؤْتُونِ مَوْثِقًا مِّنَ اللَّهِ لَتَأْتُنِنِي بِهِ إِلَّا أَنْ يُحَاطَبَ بِكُمْ ۚ

ہوں؟ سو اللہ بہترین محافظ ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔<sup>۸۵</sup> ۶۲-۶۳  
(اس کے بعد) جب اُنھوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ اُن کی پونجی بھی اُنھیں  
لوٹا دی گئی ہے۔ (یہ دیکھ کر) وہ پکار اُٹھے: ابا جان، ہمیں اور کیا چاہیے! (دیکھیے)، یہ  
ہماری پونجی ہمیں لوٹا دی گئی ہے۔ اب ہم جائیں گے، اپنے اہل و عیال کے لیے رسد  
لائیں گے، اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے، ایک بار شتر غلہ زیادہ حاصل کریں گے،<sup>۸۶</sup> یہ  
غلہ (جو اس وقت ہم لائے ہیں، یہ) تھوڑا ہے۔ باپ نے جواب دیا: میں اُس کو ہرگز  
تمھارے ساتھ نہ بھیجوں گا، جب تک تم خدا کے نام پر مجھ سے عہد نہ کرو کہ تم اُس کو

۸۵ مدعا یہ ہے کہ تمھارے بھروسے کا تجربہ تو اس سے پہلے کر چکا ہوں، لہذا بھیجنا پڑا تو خدا ہی  
کے بھروسے پر بھیجوں گا، تمھارے بھروسے پر نہیں بھیجوں گا۔

۸۶ اصل الفاظ ہیں: وَنَمِيرُ أَهْلَنَا۔ اِن کا معطوف علیہ وضاحت قرینہ کی بنا پر محذوف ہے۔  
ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۸۷ اس سے معلوم ہوا کہ غلے کی ضابطہ بندی اس طرح کی گئی تھی کہ اُس میں بیرونی  
ضرورت مند ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر غلہ حاصل کر سکتے تھے۔

۸۸ اِن جملوں کی بلاغت دیکھیے، قرآن نے اُن کی بات اس طرح نقل کی ہے کہ استاذ امام  
کے الفاظ میں اُن کی خوشی اُن کے فقرے فقرے سے ابلی پڑ رہی ہے۔



فَلَمَّا اتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللَّهُ عَلَى مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ﴿٦٦﴾

وَقَالَ يَبْنِي لَاتَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ ۖ وَمَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿٦٧﴾ وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ ۖ مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةٌ فِي نَفْسٍ يَعْقُوبَ قَضَاهَا ۚ وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِمَا

ضرور میرے پاس واپس لاؤ گے، الا یہ کہ تم کہیں گھر جاؤ۔ سو (اُس کے اصرار پر) جب اُنھوں نے اُس کو اپنا پکا قول دے دیا تو اُس نے کہا: یہ قول و قرار جو ہم کر رہے ہیں، اس پر اللہ نگہبان ہے۔ ۶۵-۶۶

(پھر روانہ ہونے لگے تو) اُس نے اُن کو ہدایت کی کہ میرے بیٹو، تم سب ایک ہی دروازے سے (مصر کے دار السلطنت میں) داخل نہ ہونا، بلکہ الگ الگ دروازوں سے جانا۔<sup>۸۹</sup> (مجھے معلوم ہے کہ یہ محض ایک تدبیر ہے) اور اللہ کے مقابل میں میں تمھارے کچھ بھی کام آنے والا نہیں ہوں۔ تمام اختیار تو اللہ ہی کا ہے۔ میں نے اُسی پر بھروسہ کیا ہے اور بھروسہ کرنے والوں کو اُسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ جس وقت وہ شہر میں داخل ہوئے، جہاں سے اُن کے باپ نے اُن کو ہدایت کی تھی تو ایسا ہی تھا کہ (اگر اللہ کی طرف سے اُن کے لیے کچھ لکھا ہوتا تو) اللہ کے

<sup>۸۹</sup> یہ اس لیے فرمایا کہ ایک ہی وقت میں گیارہ قبائلی جوان جب ایک جگہ کی صورت میں شہر میں داخل ہوں گے تو ہو سکتا ہے کہ اُنھیں مشتبہ سمجھا جائے اور شہر کے لوگ یہ گمان کریں کہ اس قحط کے زمانے میں یہ لوٹ مار کی غرض سے یہاں آئے ہیں۔







عَلَّمْنَاهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾  
وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ أَوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ  
فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٩﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ  
جَعَلَ السَّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ

مقابل میں وہ اُن کے کچھ بھی کام آنے والا نہیں تھا۔ ہاں، بس یعقوب کے دل میں  
ایک خواہش تھی جو اُس نے پوری کر لی۔<sup>۹۰</sup> اس میں شبہ نہیں کہ وہ اُس علم سے بہرہ مند  
تھا جو ہم نے اُسے سکھایا تھا، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔<sup>۹۱</sup> ۶۷-۶۸

اور یہ لوگ جب یوسف کے حضور پہنچے تو اُس نے اپنے بھائی کو خاص اپنے پاس  
جگہ دی۔ (پھر تنہائی کے کسی وقت میں) اُس نے اُسے بتایا کہ میں تمہارا بھائی،  
(یوسف) ہوں۔ سو جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں، اب اُس کا غم نہ کرو۔<sup>۹۲</sup> پھر (اُن کی  
واپسی کے وقت)، جب اُن کا سامان تیار کرایا تو اپنا پیالہ (ازراہ محبت) اپنے بھائی

۹۰ یہ تدبیر اور تقدیر کے باہمی تعلق کو واضح کر دیا ہے کہ تقدیر بہر حال اٹل ہے، کوئی تدبیر بھی  
اُس کو بدل نہیں سکتی۔ انسان صرف یہ کر سکتا ہے کہ حالات و مصالح کے لحاظ سے جو خیال اُس کے  
دل میں آئے، اُسے پورا کر لے۔ اس سے زیادہ کوئی چیز اُس کے اختیار میں نہیں ہے۔ اپنی ہر  
تدبیر کے بارے میں بندہ مومن کو یہی حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے۔

۹۱ یعنی اُس علم سے بہرہ مند تھا جو انسان کو بتاتا ہے کہ خدا کی مشیت ہر چیز پر حاوی ہے، لیکن  
اس کے باوجود انسان کا فرض ہے کہ وہ ضروری تدبیر کرے، اس لیے کہ خدا کی تقدیر بعض اوقات  
اُسی تدبیر سے وابستہ ہوتی ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۹۲ مطلب یہ ہے کہ تمہارے آزرده خاطر رہنے کے دن ختم ہوئے۔ خدا کی مدد شامل حال



لَسْرِقُونَ ۙ قَالُوا وَقَبِلُوا عَلَيْهِمْ مَا ذَاتَ فَقْدُ وَنَ ۙ قَالُوا  
نَفَقْدُ صَوَاعِ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ۙ  
قَالُوا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا جِئْتُمْ بِهِ الْفُسَادَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَرِقِينَ ۙ  
قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِنْ كُنْتُمْ كَذِبِينَ ۙ قَالُوا جَزَاؤُهُ مَنْ  
وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ ۙ كَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ۙ فَبَدَأَ

۹۳ کے سامان میں رکھ دیا۔ اس کے بعد (خدا کی قدرت سے ایسا ہوا کہ عین اُسی وقت) ایک پکارنے والے نے پکارا کہ قافلے والو، تم یقیناً چور ہو۔ اُنھوں نے اُن کی طرف پلٹ کر پوچھا: تمھاری کیا چیز کھوئی گئی ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا: ہم بادشاہ کا پیانہ نہیں پا رہے ہیں۔ (اُن کے جمعدار نے کہا): اور جو اُس کو لائے گا، اُس کے لیے ایک بار شتر غلہ ہے، میں اس کا ذمہ لیتا ہوں۔ یوسف کے بھائیوں نے کہا: خدا کی قسم، تمھیں معلوم ہے کہ ہم اس لیے نہیں آئے کہ اس ملک میں فساد کریں اور ہم چوری کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ اُنھوں نے کہا: اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو چور کی کیا سزا ہے؟ اُنھوں نے کہا: اُس کی سزا؟ جس کے سامان سے کھوئی ہوئی چیز نکلے، وہ رہی تو اب راحت ہی راحت ہے، اس لیے غم نہ کرو۔ یہ اب تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔

۹۳ یوسف علیہ السلام نے جس طرح کچھلی ملاقات کے موقع پر اپنے بھائیوں کا دیا ہوا مال اُن کے کجاووں میں رکھوا دیا تھا، اُسی طرح یہ پیالہ بھی بن یمین کو کچھ بتائے بغیر اُس کے سامان میں رکھ دیا تا کہ واپس جا کر اپنا سامان کھولے تو اُن کا یہ تحفہ پا کر خود بھی مسرور ہو اور بھائی کے اختیار و اقتدار کی یہ نشانی اپنے باپ کو بھی دکھائے۔







یوسف  
۱۲

بِأَوْعِيَّتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ أَخِيهِ  
كَذَلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ ۖ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا  
أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۖ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ ۖ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ﴿٦٩﴾

آپ ہی اپنی سزا میں رکھ لیا جائے۔<sup>۹۴</sup> اس طرح کے ظالموں کو ہم یہی سزا دیا کرتے  
ہیں۔<sup>۹۵</sup> اس پر اُس شخص نے یوسف کے بھائی کی خرجی سے پہلے اُن کی خرچیوں کی تلاشی  
لینا شروع کی، پھر (بادشاہ کا پیانہ تو نہیں ملا، لیکن) اُس کے بھائی کی خرجی سے اُس  
نے وہ پیالہ برآمد کر لیا (جو یوسف نے رکھا تھا)۔ ہم نے اس طرح یوسف کے لیے  
(اُس کے بھائی کے روکنے کی) تدبیر کی، (اس لیے کہ) بادشاہ کے قانون کی رو  
سے وہ اپنے بھائی کو روکنے کا مجاز نہ تھا،<sup>۹۶</sup> الا یہ کہ خدا ہی چاہے۔<sup>۹۸</sup> ہم جس کے درجے  
چاہتے ہیں، بلند کر دیتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ایک علم والا ہر صاحب علم سے بالاتر  
ہے۔<sup>۹۹</sup> ۷۶-۷۹

۹۴ یعنی غلام بنا کر روک لیا جائے۔

۹۵ یہ اُن کے علاقے کا کوئی رواج بھی ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ اسے دین ابراہیمی کا  
حکم سمجھا جائے۔ ابراہیم علیہ السلام کو کسی خطہ ارض میں کبھی سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہوا، اس لیے  
یہ ماننا قرین قیاس نہیں ہے کہ انھیں جو شریعت دی گئی تھی، اُس میں جرم و سزا سے متعلق بھی احکام  
موجود تھے۔

۹۶ اس کی دلیل یہ ہے کہ بن یمین کے سامان میں 'السَّقَايَةُ' (پیالہ) رکھا گیا تھا جس کے  
لیے مونث کی ضمیر استعمال ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف شاہی کارندے 'صَوَاعِ الْمَلِكِ' (بادشاہ  
کا پیانہ) تلاش کر رہے تھے۔ چنانچہ آیت میں دیکھ لیجیے، اس کے لیے مذکر اور جو چیز برآمد کی گئی



ہے، اُس کے لیے مونث کی ضمیر آئی ہے۔

۹۷ یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بن یمین کو پا جانے کے بعد اب یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے کہ اُس کو واپسی کے سفر میں بھی اُنھی ظالموں کے حوالے کر دیں جو اُس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اُسے ساتھ جانے سے روکا جائے۔ اس مرحلے میں وہ اپنے آپ کو ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اور ملکی قانون کی رو سے بھائی کو بغیر کسی وجہ کے روک لینا بھی ممکن نہیں تھا، اس لیے کہ تمام اختیارات کے باوجود اُن کے شایان شان یہی تھا کہ جو قدم بھی اٹھائیں، قانون کے مطابق اٹھائیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ اس موقع پر خدا نے مدد فرمائی اور عین اُسی وقت جب وہ اپنا پیالہ بن یمین کے سامان میں رکھ چکے تھے اور اُن کے بھائی رخصت ہونے کو تھے، بادشاہ کا پیالہ کہیں ادھر ادھر ہو گیا اور تلاش کے باوجود نہیں ملا۔ اس پر دربار کے کارندوں کا شبہ اُنھی بھائیوں کی طرف گیا جو وہاں سے جانے کے لیے نکل رہے تھے اور اس طرح وہ صورت پیدا ہو گئی جس کے نتیجے میں یوسف علیہ السلام کے بھائی بن یمین کو اُن کے پاس چھوڑ دینے کے لیے مجبور ہو گئے۔ یہ خدائی تدبیر تھی جو بالکل اُسی طرح سامنے آئی، جس طرح اس نوعیت کے غیر معمولی اتفاقات کبھی کبھی ہمارے مشاہدے میں بھی آ جاتے ہیں اور ہم اُن کی کوئی توجیہ نہیں کر پاتے۔ حضرت یوسف اور اُن کے بھائی نے اس موقع پر اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ جو کچھ ہوتا رہا، اُسے خاموشی سے دیکھتے رہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بن یمین پر اس کے نتیجے میں وقتی طور پر ایک الزام کا دھبہ لگا، لیکن اُسے معلوم تھا کہ اسے بہت جلد دھل جانا ہے۔ لہذا وہ بھی مطمئن رہا اور کسی اضطراب کا اظہار نہیں کیا۔

۹۸ اور اپنی قدرت سے کوئی ایسی صورت پیدا کر دے کہ قانون کی خلاف ورزی بھی نہ ہو اور بن یمین کو روک بھی لیا جائے۔

۹۹ یوسف علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کو ایسے مقام بلند پر پہنچا دیتے ہیں کہ کائنات کا پروردگار اُس کے لیے تدبیریں فرماتا ہے۔

۱۰۰ یعنی خداے لایزال جس کا علم ہی علم حقیقی ہے۔ چنانچہ وہی جانتا ہے کہ کیا چیز پردہ غیب







قَالُوا إِنْ يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ لَهُ مِنْ قَبْلُ فَأَسْرَهَايُوسُفُ  
فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ قَالَ أَنْتُمْ شَرُّ مَكَانًا ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا  
تَصِفُونَ ۝ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ  
أَحَدَنَا مَكَانَهُ ۖ إِنَّا نَنْزِلُكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ۝ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ  
إِنْ نَأْخُذَ إِلَّا مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهُ ۖ إِنَّا إِذًا لَظَالِمُونَ ۝ فَلَمَّا

بھائیوں نے (یہ دیکھا تو) کہا: اگر یہ چوری کرے تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے،  
اس سے پہلے اس کا ایک بھائی بھی چوری کر چکا ہے۔ (یہ سراسر تہمت تھی)، مگر یوسف  
نے اس کو اپنے دل ہی میں رکھا، اُن پر اسے ظاہر نہیں کیا، بس (اپنے جی میں) اتنی  
بات کہہ کر رہ گیا کہ تم لوگ بڑے ہی برے ہو اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو، اللہ اُس کو  
خوب جانتا ہے۔ اُنھوں نے کہا: اے عزیز، اس کا ایک بہت بوڑھا باپ ہے، سو اس  
کی جگہ آپ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجیے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ بڑے نیک نفس  
انسان ہیں۔ یوسف نے کہا: خدا کی پناہ کہ جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے، ہم

سے کس وقت اور کس صورت میں نمودار ہو جائے گی اور جو کچھ بظاہر ناممکن نظر آ رہا ہے، اُسے ممکن  
بنادے گی۔

۱۰۱۔ یہ اُنھوں نے اپنی خفت مٹانے کے لیے کہا۔ پہلے کہہ چکے تھے کہ ہم چور نہیں ہیں۔ اب جو  
دیکھا کہ بھائی کی خرچی سے مال برآمد ہو گیا ہے تو فوراً ایک جھوٹی بات بنا کر اپنے آپ کو بھائی سے  
الگ کر لیا اور دوسرے بھائی کو بھی اُسی الزام میں لپیٹ لیا۔ اس سے، ظاہر ہے کہ یہ تاثر دینا مقصود  
تھا کہ یہ ہمارا حقیقی بھائی نہیں ہے، بلکہ سوتیلا بھائی ہے اور چوری کی خصلت اپنی ماں کی طرف سے  
لایا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یوسف اور اُن کے بھائی بن یمین کے لیے اُن کے دلوں میں



اَسْتَيْسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا ۖ قَالَ كَبِيرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ  
اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْتِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ  
اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِّىْٓ اَبِىْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِىْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝۸  
اِرْجِعُوْا اِلٰى اٰبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يَاۤ اَبَانَا اِنَّ اِبْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَا اِلَّا

اُس کے سوا کسی اور کو پکڑیں۔ اس صورت میں تو ہم بڑے ہی ظالم ٹھہریں گے۔ اُس کا یہ جواب سن کر جب وہ اُس سے مایوس ہو گئے تو آپس میں مشورے کی غرض سے الگ بیٹھ گئے۔ اُن کے بڑے نے کہا: کیا تم جانتے نہیں ہو کہ تمہارے باپ نے خدا کے نام پر تم سے پکا قول و قرار لیا ہے اور اس سے پہلے یوسف کے معاملے میں جو تقصیر تم سے ہو چکی ہے، اُسے بھی جانتے ہو؟ لہذا میں تو اس سر زمین سے ٹلنے کا نہیں، جب تک میرا باپ مجھے اجازت نہ دے یا اللہ میرے لیے کوئی فیصلہ فرما دے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ تم اپنے باپ کے پاس جاؤ اور اُن سے کہو کہ ابا جان،

کس قدر بغض اور کینہ چھپا ہوا تھا۔

۱۰۲ یوسف علیہ السلام کی احتیاط ملحوظ رہے کہ جب اُنھیں مجبوراً بولنا پڑا تو اُنھوں نے یہ نہیں کہا کہ جس نے ہماری چیز چرائی ہے، بلکہ صرف یہ فرمایا کہ جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے۔ یہ اُس تورے کی نہایت عمدہ مثال ہے جس پر اخلاقی لحاظ سے کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

۱۰۳ آیت میں اس کے لیے اُکبرہم، کانہیں، بلکہ کَبِيرُهُمْ کا لفظ آیا ہے۔ عربیت کی رو سے یہ علم و دانش اور عقل و رائے میں بڑے کے لیے بھی آ سکتا ہے۔ لہذا اس سے اگر یہود ا کو مراد لیا جائے تو زیادہ اقرب ہوگا۔ بائبل میں صراحت ہے کہ یہ مشورہ اُسی نے دیا تھا۔

۱۰۴ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھائی دوسروں سے مختلف تھا۔ یوسف کو قتل نہ کرنے کا







یوسف  
۱۲

بِمَا عَلَّمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حَفِظِينَ ﴿٨١﴾ وَسَأَلَ الْقَرْيَةَ الَّتِي  
كُنَّا فِيهَا وَالْعِيرَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿٨٢﴾ قَالَ بَلْ  
سَوَّلْتُ لَكُمْ أَنْفُسَكُمْ أَمَرَ ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي  
بِهِمْ جَمِيعًا ۖ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿٨٣﴾

آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے اور ہم نے وہی بات کہی ہے جو ہمارے علم میں آئی  
ہے، ہم غیب کے نگہبان نہیں ہیں۔ آپ اُس بستی کے لوگوں سے پوچھ لیجیے، جہاں ہم  
رہے ہیں اور اُس قافلے سے پوچھ لیجیے جس کے ساتھ ہم آئے ہیں، ہم بالکل سچے  
ہیں۔ اُن کے باپ نے (یہ داستان سنی تو) کہا: نہیں، بلکہ تمہارے دل نے تمہارے لیے  
ایک بات بنالی ہے، اس لیے صبر جمیل ہی بہتر ہے۔ امید ہے کہ اللہ ان سب کو میرے  
پاس لے آئے گا۔ یقیناً وہی علیم و حکیم ہے۔ ۷۷-۸۳

مشورہ بھی غالباً اسی نے دیا تھا۔ چنانچہ اُس کی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ ایک کے بعد اب وہ  
دوسرے بھائی کو بھی کھونے کا مجرم بن کر باپ کے سامنے حاضر ہو۔

۱۰۵ یعنی یہ بات کہ بن یمین نے فی الواقع چوری کی ہے، دراصل حالیکہ یہ لوگ وہاں بھی کہہ  
سکتے تھے کہ ہم اپنے بھائی کو جانتے ہیں، وہ کبھی چوری نہیں کر سکتا۔ یہ پیالہ شاید کسی اور نے رکھ دیا  
ہو یا کسی غلطی سے وہ اُس کے اسباب میں بندھ گیا ہو۔ پھر باپ کے پاس آ کر بھی اُنھوں نے یہ  
نہیں کہا کہ بن یمین پر چوری کا الزام لگا دیا گیا ہے، بلکہ پورے یقین کے ساتھ کہہ دیا کہ آپ کے  
بیٹے نے چوری کی ہے۔

۱۰۶ یوسف علیہ السلام نے جو خواب ابتدائی زمانے میں دیکھا تھا، حضرت یعقوب اُسے  
خدائی بشارت سمجھتے تھے، لہذا اُنھیں یقین تھا کہ یوسف زندہ ہے، وہ اُسے ملیں گے اور اُس کا



وَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَا سَفَى عَلَى يَوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنُهُ  
مِنَ الْحُزَنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٨٣﴾ قَالُوا تَاللَّهِ تَفْتَوَاتٌ ذَكَرُ يَوْسُفَ  
حَتَّى تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ مِنَ الْهَالِكِينَ ﴿٨٤﴾ قَالَ إِنَّمَا أَشْكُو  
بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٥﴾ يَلْبِسُ أَزْهَابًا

اُس نے (یہ کہہ کر) اُن سے منہ پھیر لیا اور کہا: ہاے یوسفؑ — اور غم سے اُس کی آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں اور وہ گھٹا جا رہا تھا — بیٹوں نے کہا: خدا کی قسم، آپ یوسف ہی کو یاد کیے جائیں گے، یہاں تک کہ اپنے آپ کو گھلا دیں گے یا ہلاک ہو جائیں گے۔ اُس نے کہا: میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کا شکوہ اللہ ہی سے کرتا ہوں اور اللہ کی

خواب پورا ہو کر رہے گا۔ یہ اُسی یقین کا اظہار ہے۔

۱۰۷۔ اِس وقت اگرچہ بن یمین کا معاملہ تھا، مگر یعقوب علیہ السلام نے یوسف ہی کو یاد کیا۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”یہ بات کچھ عجیب نہیں کہ اِس تازہ حادثے نے بھی حضرت یعقوب کے دل میں حضرت یوسف ہی کے غم کو ہرا کیا۔ اول تو بن یمین کے حادثے کی نوعیت وہ نہیں تھی جو حضرت یوسف کے حادثے کی تھی، ثانیاً حضرت یعقوب کو حضرت یوسف سے جو دل بستگی تھی، وہ صرف بیٹے ہونے کے سبب سے نہیں تھی، بلکہ اُس میں اصلی دخل اُن کی اُن اعلیٰ صلاحیتوں کو تھا جن کی بنا پر حضرت یعقوب اُن سے اِس درجہ محبت کرتے تھے کہ وہ اپنے تمام بھائیوں کے محسود بن گئے اور بالآخر اُسی کے نتیجے میں بھائیوں کے ہاتھوں انھیں نہایت زہرہ گداز آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔“

(تدبر قرآن ۴/۲۴۸)

۱۰۸۔ عام مشاہدہ ہے کہ غم و الم کی شدت اور بہت روتے رہنے سے پتلیوں اور پلکوں کی سیاہی متاثر ہو جاتی ہے اور آنکھوں کے سرخ ڈورے بھی آہستہ آہستہ غائب ہو جاتے ہیں، یہ اُسی







فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُوسُفَ وَأَخِيهِ وَلَا تَأْيِسُوا مِنْ رَوْحِ اللَّهِ إِنَّهُ لَا يَأْيِسُ مِنْ رَوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ ﴿٨٤﴾  
فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَّا الضُّرَّ  
وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُزْجَاةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا

طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ میرے بیٹو، جاؤ یوسف اور اُس کے  
بھائی کی ٹوہ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ کی رحمت سے تو صرف منکر لوگ  
ہی مایوس ہوتے ہیں۔ ۸۴-۸۷

پھر جب وہ (اگلی مرتبہ) یوسف کی پیشی میں داخل ہوئے تو اُنھوں نے (گڑ گڑا  
کر) عرض کیا: اے عزیز، ہم اور ہمارے اہل و عیال بڑی مصیبت میں مبتلا ہیں اور ہم  
حالت کا بیان ہے۔

۱۰۹۔ یہ بظاہر ہم دردی کا جملہ ہے، مگر غور کیجیے تو اس میں بھی وہی جذبہ حسد کا فرما ہے جو اُن  
کے تمام اقدامات کا باعث ہوا۔ اُن کا خیال تھا کہ یوسف کو ٹھکانے لگا کر وہ باپ کی تمام توجہ حاصل  
کر لیں گے، لیکن اُنھوں نے دیکھا کہ اس کے نتیجے میں جو کچھ اُنھیں حاصل تھا، وہ بھی اُن سے  
چھین گیا ہے اور باپ کا اس کے سوا کوئی کام ہی نہیں رہ گیا کہ جب تنہا ہوں، یوسف کی یاد میں نالہ و  
فریاد کرتے رہیں۔

۱۱۰۔ یہی ایک بندہ مومن کے شایان شان ہے۔ وہ اپنے غم و الم کا اظہار اپنے رب ہی سے کرتا  
ہے، اس لیے کہ اُس کی تمام امیدیں اُسی سے وابستہ ہوتی ہیں اور وہ جانتا ہے کہ اُس کا یہ گریہ اور  
یہ زاری بالآخر اُس کی رحمت کو جوش میں لے آئے گی۔

۱۱۱۔ اس سے واضح ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو جس طرح حضرت یوسف کے معاملے میں اُن  
کے بیان کا یقین نہیں ہوا تھا، اُسی طرح بن یمین کے معاملے میں بھی نہیں ہوا۔



إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ ﴿٨٨﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ  
بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ ﴿٨٩﴾ قَالُوا إِنَّكَ لَآتَىٰ يُوسُفَ  
قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَذَا أَخِي قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ  
وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٩٠﴾ قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ أَثَرَكَ  
اللَّهُ عَلَيْنَا وَإِنْ كُنَّا لَخَطِيئِينَ ﴿٩١﴾ قَالَ لَا تَثْرِبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ

کچھ حقیر سی پونجی لے کر حاضر ہو گئے ہیں<sup>۱۱۲</sup>، سو (عنایت فرمائیے اور) ہمیں پورا غلہ  
دیجیے اور ہم پر خیرات بھی کیجیے، اس میں شبہ نہیں کہ اللہ خیرات کرنے والوں کو اچھا بدلہ  
دیتا ہے۔ (اُن کی یہ التجاسن کر یوسف سے رہا نہ گیا)، اُس نے کہا: تمہیں کچھ پتا ہے  
کہ جب تم جہالت میں مبتلا تھے تو یوسف اور اُس کے بھائی کے ساتھ تم کیا کر گزرے؟  
وہ (چونک کر) بولے: کیا واقع میں تمھی یوسف ہو؟ اُس نے کہا: ہاں، میں یوسف  
ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر عنایت فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو خدا  
سے ڈرتے اور ثابت قدم رہتے ہیں، اُن کا اجر اُنھیں لازماً ملتا ہے، اس لیے کہ  
اللہ اُن لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا جو خوبی سے عمل کرنے والے ہیں۔ اُنھوں نے  
کہا: بخدا، کچھ شک نہیں کہ اللہ نے تم کو ہمارے اوپر برتری عطا فرمائی ہے اور کچھ

۱۱۲ اصل الفاظ ہیں: بِضَاعَةٍ مُّزْجَاةٍ۔ یعنی ایسی حقیر پونجی جس کو کوئی قبول نہ کرے۔ اس  
سے خیال ہوتا ہے کہ نقد کے بجائے وہ کوئی ایسی جنس لے کر گئے تھے جس کی وہاں کوئی خاص مانگ  
نہیں تھی۔

۱۱۳ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ضرورت کس شان اور طنطنے کے لوگوں کو کہاں سے کہاں  
پہنچا دیتی ہے۔





یوسف  
۱۲

يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ زَوْهًا رَحِمَ الرَّحِيمِينَ ۙ اِذْ هَبُوا بَقِيصِي هَذَا  
فَالْقُوَّةُ عَلَى وَجْهِ ابْنِي يَاتٍ بَصِيرًا ۚ وَاتُّوْنِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ ۙ  
وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ اِنِّي لَا أَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا اَنْ  
تُفِيدُوْنَ ۙ قَالُوا تَاللَّهِ اِنَّكَ لَفِي ضَلٰلِكَ الْقَدِيمِ ۙ فَلَمَّا اَنَّ

شک نہیں کہ ہم ہی قصور وار تھے۔ یوسف نے کہا: اب تم پر کوئی الزام نہیں، اللہ تمہیں  
معاف کرے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔ (جاؤ)،  
میرا یہ کرتا لے جاؤ اور اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، اُس کی بینائی لوٹ  
آئے گی اور اپنے سب اہل و عیال کو لے کر میرے پاس آ جاؤ۔ ۸۸-۹۳

جب یہ قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو اُن کے باپ نے (کنعان میں اپنے  
گھر کے لوگوں سے) کہا: اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں تو میں یوسف  
کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں<sup>۱۱۶</sup>۔ لوگوں نے کہا: خدا کی قسم، آپ ابھی تک اپنے اُسی

<sup>۱۱۴</sup> یہی وہ حقیقت ہے جس کی وضاحت کے لیے یہ تمام سرگزشت قریش مکہ کو سنائی گئی ہے۔

<sup>۱۱۵</sup> یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے جس کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”حضرت یوسف نے اپنے جسم سے لمس کیا ہوا کرتا ہی اپنی نشانی کے طور پر کیوں بھیجا؟ اور  
کرتے میں یہ اثر کہاں سے آیا کہ اس سے بصارت عود کر آئے؟ یہ سوالات نہ ہر شخص کے حل  
کرنے کے ہیں اور نہ اس کا حل ہر شخص کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ان چیزوں کا تعلق جذبات سے  
ہے اور جذبات بھی ایسے عالی مقام لوگوں کے کہ ایک طرف حضرت یعقوب ہیں، دوسری  
طرف حضرت یوسف۔ ہم عامی اس طرح کے معاملات میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ  
سچے جذبات کی تاثیر و تاثر کے کرشمے ایسی حیرت انگیز صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں کہ عقل اُن  
کی توجیہ سے بالکل قاصر رہ جاتی ہے۔“ (تذبر قرآن ۲۵۱/۴)



جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَى وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا ۚ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ ۖ  
 إِنِّيٓ أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٩٦﴾ قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا  
 إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ ﴿٩٧﴾ قَالَ سَوْفَ اسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي إِنَّهُ  
 هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿٩٨﴾

پرانے خطب میں مبتلا ہیں۔ پھر جب یہ ہوا کہ خوش خبری دینے والا پہنچ گیا، اُس نے  
 کرتا یعقوب کے چہرے پر ڈال دیا تو یکا یک اُس کی بینائی لوٹ آئی۔ تب اُس  
 نے کہا: میں نے تمہیں بتایا نہ تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو  
 تم نہیں جانتے۔ یوسف کے بھائی بول اٹھے: ابا جان، آپ ہمارے گناہوں کی  
 معافی کے لیے دعا کریں، واقعی ہم خطا کار تھے۔ اُس نے کہا: میں اپنے رب سے جلد<sup>۱۱۸</sup>  
 تمہارے لیے مغفرت کی دعا کروں گا، بے شک وہی بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت  
 ابدی ہے۔ ۹۴-۹۸

۱۱۶ یعقوب علیہ السلام خدا کے پیغمبر تھے۔ اللہ تعالیٰ جن ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے  
 منتخب کرتا ہے، اُن کے قویٰ اور حواس کو اپنے قویٰ اور حواس پر قیاس نہ کرنا چاہیے۔ اُنھیں اللہ تعالیٰ  
 جب چاہتے ہیں اور جس طریقے سے چاہتے ہیں، کسی معاملے سے آگاہ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ  
 یہاں بھی دیکھ لیجیے، یوسف علیہ السلام ۲۰ سال سے زیادہ مدت تک مصر میں رہے اور حضرت  
 یعقوب کو کبھی اُن کی خوشبو نہ آئی، مگر اس وقت اُن کی قوت ادراک یکا یک ایسی تیز ہو گئی کہ یوسف  
 کا پیر ہن مصر سے چلا اور وہ اُس کی خوشبو محسوس کرنے لگے۔

۱۱۷ اصل الفاظ ہیں: فَلَمَّا أُنْجِيَ الْبَشِيرُ۔ اُن میں اُن سے پہلے ایک فعل محذوف ہے۔  
 ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔







فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ أَوَىٰ إِلَيْهِ أَبَوِيهِ وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ  
إِن شَاءَ اللَّهُ أَمِينٌ ۖ ۙ وَرَفَعَ أَبَوِيهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهُ  
سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يَا أَبَتِ هَذَا تَأْوِيلُ رُءْيَايَ مِن قَبْلُ ۖ قَدْ جَعَلَهَا

پھر جب یہ لوگ یوسف کے پاس پہنچے، اُس نے اپنے والدین کو خاص اپنے پاس  
جگہ دی اور کہا: مصر میں، اللہ چاہے تو امن چین سے رہیے۔ (اپنے گھر پہنچ کر) اُس  
نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب بے اختیار اُس کے لیے سجدے میں جھک گئے۔  
یوسف نے کہا: ابا جان، یہ میرے اُس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔

۱۱۸ اصل میں لفظ 'سَوْفَ' آیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ حضرت یعقوب  
نے اُن سے خاص اہتمام کے ساتھ اور خاص وقت میں دعا کا وعدہ فرمایا، یہ کہہ کر ٹال نہیں دیا کہ  
جاؤ، اللہ تمہیں معاف فرمائے۔

۱۱۹ یعنی اپنے والد اور اپنی سوتیلی والدہ کو جو اُن کی حقیقی خالہ بھی تھیں۔ بائبل میں صراحت  
ہے کہ اُن کی والدہ وفات پا چکی تھیں۔

۱۲۰ یہ خیر مقدم کا جملہ ہے۔ بائبل کا بیان ہے کہ یہ لوگ پہنچے تو حضرت یوسف نے شہر سے باہر  
نکل کر ان کا خیر مقدم کیا اور انھیں اس شان سے شہر میں لائے کہ ایک جشن کی صورت پیدا ہوگئی۔

۱۲۱ اس سے مراد یہاں تخت شاہی نہیں، بلکہ وہ تخت ہے جس پر حضرت یوسف اپنے منصب  
کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے بیٹھتے تھے۔

۱۲۲ سجدے سے مراد یہاں وہ سجدہ نہیں ہے جو ہم خدا کے آگے کرتے ہیں، بلکہ رکوع کے  
طریقے پر جھکنا ہے۔ بڑوں کی تعظیم کے لیے اس انداز میں جھکنا قدیم زمانے کا معروف طریقہ  
تھا۔ عربی زبان میں لفظ 'سجد' اس معنی کے لیے بھی عام استعمال کیا جاتا ہے۔ بائبل اور تلمود،  
دونوں میں تصریح ہے کہ جس چیز کو اصطلاحی سجدہ کہا جاتا ہے، وہ بنی اسرائیل کی شریعت میں بھی



رَبِّي حَقًّا وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ مِن بَعْدِ أَنْ نَزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي ۚ إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝۱۰۱ رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ أَنْتَ وَلِيِّ الْإِنْسَانِ فِي الْأُولَىٰ ۚ وَأَلْحَقْنِي بِالصَّالِحِينَ ۝۱۰۲

میرے پروردگار نے اُس کو حقیقت بنا دیا۔ اُس نے مجھ پر بڑا کرم فرمایا، جب مجھے قید خانے سے نکالا اور آپ سب لوگوں کو دیہات سے یہاں لے آیا، اس کے باوجود کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈلوادیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا پروردگار جو کچھ چاہتا ہے، اُس کے لیے نہایت مخفی راہیں نکال لینے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی علیم و حکیم ہے۔ پروردگار، تو نے مجھے اقتدار میں حصہ عطا فرمایا اور باتوں کی تعبیر کر لینے کے علم میں سے بھی سکھا دیا۔ زمین اور آسمانوں کے بنانے والے، دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا کارساز ہے۔ مجھے اسلام پر موت دے اور اپنے نیک بندوں کے زمرے میں شامل فرما۔ ۱۰۱-۱۰۲

غیر اللہ کے لیے اُسی طرح ممنوع تھا، جس طرح ہماری شریعت میں ممنوع ہے۔ یہاں جس واقعے کا ذکر ہے، وہ کس طرح پیش آیا؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”حضرت یوسف نے اپنے والدین کو تعظیماً تخت پر جگہ دی۔ بقیہ لوگ حسب دستور عام لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ پر بیٹھے ہوں گے۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف نمودار ہوئے اور قاعدے کے مطابق اُن کے خدام و حشم اُن کی تعظیم کے لیے جھکے تو ماحول سے متاثر







یوسف  
۱۲

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدِيْهِمْ اِذْ  
اَجْمَعُوْا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝۱۰۲

وَمَا اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰۳ وَمَا تَسْلُمُ  
عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۴ وَكَآيِنٌ مِّنْ اٰيَةٍ

یہ سرگزشت غیب کی خبروں میں سے ہے، اسے ہم تمھاری طرف وحی کر رہے ہیں،  
(اے پیغمبر)۔ تم اُس وقت اُن کے پاس موجود نہ تھے، جب یوسف کے بھائیوں نے  
اپنا ارادہ پختہ کر لیا تھا اور وہ (اُس کے خلاف) سازش کر رہے تھے۔ ۱۰۲

اس کے باوجود ان لوگوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ تم، خواہ کتنا ہی چاہو، وہ  
ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ۱۰۳ تم اس خدمت پر اُن سے کوئی اجر نہیں مانگ رہے ہو

ہو کر یہ لوگ بھی بے اختیارانہ اُن کی تعظیم کے لیے جھک پڑے۔“ (تذبرقرآن ۲۵۴/۴)  
۱۲۳ سبحان اللہ، کیا حسن سیرت ہے! نہ گلہ نہ شکوہ، نہ طعن و تشنیع اور ملامت، نہ فخر جتانے اور  
بڑائی ظاہر کرنے کی کوشش، بلکہ اپنے پروردگار کی شکرگزاری اور اُس کے احسانات کا اعتراف اور  
بھائیوں کی تسلی کے لیے اپنی طرف سے یہ صفائی کہ درحقیقت یہ شیطان تھا جس نے میرے اور اُن  
کے درمیان برائی ڈال دی تھی۔ پھر خدا سے اُس کی بندگی پر استقامت اور صالحین کے زمرے میں  
شامل کیے جانے کی دعا جس پر بات ختم ہوئی ہے۔ قرآن اپنے ماننے والوں میں جو سیرت و کردار  
پیدا کرنا چاہتا ہے، یوسف علیہ السلام کی یہ گفتگو اُس کا بہترین نمونہ ہے۔

۱۲۴ یعنی اس کے باوجود ایمان لانے والے نہیں کہ اس وقت تم ایک ایسی سرگزشت اُنھیں  
سنا رہے ہو جو بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ تم خدا کے پیغمبر ہو، اس لیے کہ تمھارے لیے یہ  
غیب کی ایک خبر ہے۔ تم اُس وقت موجود نہیں تھے، جب یہ واقعہ پیش آیا، لیکن تم نے اس صحت کے  
ساتھ اسے سنایا ہے کہ لوگوں میں انصاف ہو تو اس سے وہ بائبل کے بیانات کی تصحیح کر سکتے ہیں



فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمْشُونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ﴿١٠٥﴾  
وَمَا يُوْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ ﴿١٠٦﴾ أَفَأَمِنُوا أَن تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً  
وَّهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿١٠٧﴾

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللّٰهِ قَفَّ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۖ وَسُبْحَنَ اللّٰهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٠٨﴾

(کہ وہ گریز و فرار کی راہیں تلاش کریں)۔ یہ تو صرف ایک یاد دہانی ہے دنیا والوں کے لیے۔ (وہ تم سے نشانی مانگتے ہیں، دراصل حالیکہ زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے وہ گزرتے ہیں اور ان کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ ان میں سے اکثر خدا کو اسی طرح مانتے ہیں کہ ساتھ ہی اُس کے شریک ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ پھر کیا وہ (اپنے ان شریکوں پر بھروسہ کر کے) مطمئن ہو گئے ہیں کہ ان پر خدا کے عذاب کی کوئی آفت آ پڑے یا ان پر اچانک قیامت آ جائے اور وہ اُس سے بالکل بے خبر ہوں؟ ۱۰۳-۱۰۷

ان سے صاف صاف کہہ دو، یہ میری راہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں،

جن میں تاریخی غلطیاں بھی ہیں اور قصے کے بعض قیمتی اجزاء حذف بھی کر دیے گئے ہیں جنہیں بجا طور پر اس قصے کی جان کہا جاسکتا ہے۔ تمھاری زبان پر جو کچھ جاری ہوا ہے، اُس کا ایک ایک لفظ حضرت یعقوب اور حضرت یوسف جیسے جلیل القدر پیغمبروں کی سیرت کے شایان شان اور عقل و فطرت کے مطابق ہے۔ تمھارے مخاطبین اگر بائبل اور تالمود کے متقابل رکھ کر اسے دیکھیں تو خود پکار اٹھیں گے کہ یقیناً یہ تمھاری طرف وحی کیا گیا ہے، یہ بائبل یا تالمود کا چر بہ نہیں ہے۔







یوسف  
۱۲

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِيَ إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ  
الْقُرَىٰ ۖ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ  
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا ۖ أَفَلَا  
تَعْقِلُونَ ﴿١٠٩﴾ حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا  
جَاءَهُمْ نَصْرُنَا ۖ فَنُجِّيَ مَنْ نَشَاءُ ۖ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ

پوری بصیرت کے ساتھ، میں بھی اور وہ بھی جو میری پیروی اختیار کیے ہوئے ہیں۔  
اور (سن لو کہ) اللہ (شرک کی تمام آلائشوں سے) پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے  
نہیں ہوں۔ ۱۰۸۔

(انہیں تعجب ہے کہ ایک آدمی رسول بن کر آ گیا ہے)۔ تم سے پہلے بھی،  
(اے پیغمبر)، ہم نے جتنے رسول بھیجے، سب انہی بستیوں کے رہنے والے آدمی  
ہی تھے، ہم اُن کی طرف وحی کرتے تھے۔ پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے  
نہیں ہیں کہ (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیتے کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جو ان سے  
پہلے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا گھر اُن لوگوں کے لیے کہیں بہتر ہے جنہوں  
نے تقویٰ اختیار کر لیا ہے۔ پھر کیا سمجھتے نہیں ہو؟ (یہ عذاب کے لیے جس طرح جلدی  
مچارہے ہیں، ان کے اگلے بھی اسی طرح مچاتے رہے)، یہاں تک کہ جب اُن  
کے رسول اُن سے مایوس ہو گئے اور وہ لوگ بھی خیال کرنے لگے کہ اُن سے جھوٹ

۱۲۵۔ اس سے وہ آلائشیں مراد ہیں جو مشرکانہ عقیدے کا لازمی تقاضا اور شرک کا منطقی

نتیجہ ہیں۔



الْمُجْرِمِينَ ۝ لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۚ  
مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ  
وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝

### سورة الرعد

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْمَرْفَقِ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ ۚ وَالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ

کہا گیا تھا (کہ اُن پر کوئی عذاب آنے والا ہے) تو ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی۔  
پھر اُن کو بچا لیا گیا جنہیں ہم چاہتے تھے (کہ بچالیں) اور مجرم لوگوں سے ہمارا عذاب  
ٹالا نہیں جاسکتا۔ اُن کی سرگزشتوں میں عقل والوں کے لیے، بلاشبہ بہت کچھ سامانِ عبرت  
ہے۔ یہ قرآن کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں ہے، بلکہ جو اس سے پہلے موجود ہے، اُس  
کی تصدیق ہے اور ہر چیز کی تفصیل (جو ہدایت کے لیے ضروری ہے) اور اُن لوگوں  
کے لیے ہدایت اور رحمت جو ماننے والے ہیں۔ ۱۲۶-۱۰۹-۱۱۱

— ۲ —

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔  
یہ سورہ 'الرعد' ہے۔ یہ کتاب الہی کی آیتیں ہیں اور تمہارے پروردگار کی طرف سے

۱۲۶ یعنی آغاز کے لحاظ سے ہدایت اور انجام کے لحاظ سے رحمت۔  
۱۲۷ اس نام کے معنی کیا ہیں؟ اس کے متعلق ہم اپنا نقطہ نظر سورہ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے  
تحت بیان کر چکے ہیں۔





الرعد  
۱۳

الْحَقُّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ①

اللَّهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوَىٰ  
عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ط

جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے، وہ (سراسر) حق ہے، مگر (تمہاری قوم کے) اکثر لوگ مان نہیں رہے ہیں۔ ا

اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر اونچا بنا کھڑا کیا ہے جو تم کو نظر آتے ہوں، پھر وہ اپنے تخت سلطنت پر متمکن ہوا اور اُس نے سورج اور چاند کو

۱۲۸ اصل الفاظ ہیں: 'تِلْكَ آيَةُ الْكِتَابِ'۔ 'ان میں تِلْكَ' کا اشارہ 'الْمَر' کی طرف ہے اور 'الْكِتَاب' کے معنی کتاب الہی کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ جگہ جگہ اس معنی کے لیے استعمال ہوا ہے اور اُسی طریقے پر استعمال ہوا ہے، جس پر کوئی لفظ اپنے مختلف مفاہیم میں سے کسی اعلیٰ اور برتر مفہوم کے لیے خاص ہو جایا کرتا ہے۔ یہ فقرہ کس لیے ارشاد ہوا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس فقرے میں بہ یک وقت اظہار احسان بھی ہے اور دھمکی بھی۔ احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ عظیم نعمت، جس کا اُس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے وعدہ فرمایا تھا، اتار دی ہے۔ اب یہ لوگوں کا فرض ہے کہ اس کی صدق دل سے قدر کریں اور اس کی برکتوں سے متمتع ہوں۔ دھمکی کا پہلو یہ ہے کہ یہ کتاب الہی کی آیات ہیں تو جو لوگ ان کی قدر کرنے کے بجائے ان کا مذاق اڑائیں گے اور ان کی مخالفت میں اپنا زور صرف کریں گے، وہ خود سوچ لیں کہ وہ اپنے لیے کس شامت کو دعوت دے رہے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۲/۲۷۰)

۱۲۹ یعنی قطعی حقیقت ہے، اُس میں کسی ریب و گمان کی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ ہر چیز جس طرح بیان ہوئی ہے، اُسی طرح واقع ہو کر رہے گی۔

۱۳۰ یعنی محسوس اور مرئی ہوں۔ دور حاضر کے انسانی علم نے اسی چیز کو کشش ثقل کا نام دیا ہے۔ یہاں اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی طرف توجہ دلانا ہے۔



يُذَبِّرُ الْأَمْرَ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ ②  
وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا وَمِنْ  
كُلِّ الشَّجَرِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشَى اللَّيْلُ النَّهَارَ إِنَّ

ایک قانون کا پابند بنایا۔ ان میں سے ہر ایک ایک مقرر وقت کے لیے گردش کر رہا ہے۔<sup>۱۳۲</sup> وہی نظم عالم کی تدبیر فرماتا ہے۔ وہ اپنی ان نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے، اس لیے کہ تم اپنے پروردگار کی ملاقات کا یقین کرو۔<sup>۱۳۳</sup>

اور وہی ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اُس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑے اور ندیاں بہا دیں اور اُس میں ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے۔<sup>۱۳۴</sup> وہ رات کو (چادر

<sup>۱۳۱</sup> مطلب یہ ہے کہ ان بے کراں آسمانوں کو پیدا کر کے وہ کسی گوشے میں نہیں جا بیٹھا ہے، جیسا کہ مشرکین گمان کرتے ہیں، بلکہ اپنے تخت سلطنت پر متمکن ہے اور زمین و آسمان کی تدبیر امور فرما رہا ہے۔ آگے ”يُذَبِّرُ الْأَمْرَ“ کے الفاظ میں اس کو کھول دیا ہے۔

<sup>۱۳۲</sup> یہ دو بڑی نشانیوں کی مثال سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ہر چیز ہر وقت خدا کے قبضہ قدرت میں ہے اور اُس وقت تک کے لیے گردش کر رہی ہے جو اُس کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس عالم میں کوئی چیز بھی ابدی و سرمدی نہیں ہے، بلکہ کشاں کشاں ایک معین اجل کی طرف بڑھ رہی ہے۔

<sup>۱۳۳</sup> یعنی اپنی کتاب میں ان کی تفصیل کرتا ہے تاکہ جن حقائق پر یہ دلالت کر رہی ہیں، تم اُن کو سمجھو اور اس کے نتیجے میں کائنات کی اس عظیم حقیقت کا یقین حاصل کر لو کہ جس نے اپنی بے پایاں قدرت اور کمال حکمت کے ساتھ یہ دنیا بنائی ہے، وہ اسے اتمام و تکمیل تک پہنچائے بغیر یوں ہی ختم نہیں ہونے دے گا، بلکہ لازماً اُس منزل تک لے جائے گا جو اس کے لیے مقرر ہے۔

<sup>۱۳۴</sup> یعنی جس طرح حیوانات کے جوڑے ہیں، اُسی طرح درختوں کے بھی نر و مادہ ہیں جن





الرعد  
۱۳

فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝  
وَفِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مُّتَجَوِّرَاتٌ وَجَنَّتْ مِنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ  
وَنَخِيلٌ صِنَوَانٌ وَغَيْرُ صِنَوَانٍ يُسْقَى بِمَاءٍ وَاحِدٍ قَفٌّ وَنُفْضِلٌ  
بَعْضُهَا عَلَى بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ ۖ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝

کی طرح) دن پر اڑھا دیتا ہے۔ یقیناً ان سب چیزوں میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں  
ہیں جو غور کریں۔ ۱۳۵

اور زمین میں پاس پاس کے قطعے ہیں، انگوروں کے باغ ہیں، کھیتی ہے، کھجور کے  
درخت ہیں، جن میں جڑواں بھی ہیں اور اکھرے بھی۔ ۱۳۶ سب ایک ہی پانی سے سیراب  
کیے جاتے ہیں، لیکن اُن کے پھلوں میں ہم ایک کو دوسرے پر برتری دے دیتے  
سے طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔

۱۳۵ اوپر آسمان کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی تھی، اُس کے بعد اب یہ زمین کی نشانیوں کی  
طرف متوجہ کیا ہے کہ انھیں بھی دیکھو۔ دریا، پہاڑ، زمین سے پیدا ہونے والے قسم قسم کے پھل اور  
لیل و نہار کی گردش، یہ سب کس قدر مختلف چیزیں ہیں، مگر کس بے پایاں حکمت، بے مثال نظم و  
ترتیب اور کتنی اتھاہ معنویت کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ متعلق ہیں۔ یہ اس بات کا صریح  
ثبوت ہے کہ نہ یہ زمین و آسمان آپ سے آپ وجود میں آئے ہیں اور نہ ان پر الگ الگ  
دیوتاؤں کی حکمرانی ہے، بلکہ ایک ہی قادر و حکیم ہے جس نے ان کی ہر چیز میں یہ حیرت انگیز توافقی،  
ہم آہنگی اور سازگاری پیدا کر دی ہے۔ اس کو دیکھنے اور اس پر غور کرنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ  
کہتا ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے اور ایک دن یہ سب خاک میں گم ہو جائے گا تو یہ عقل و  
دانش کی نہیں، بلکہ حماقت و بلاغت کی دلیل ہے۔

۱۳۶ درختوں کی نشوونما میں جو فرق پیدا ہو جاتا ہے، یہ اُس کا ذکر ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں



وَإِنْ تَعَجَّبَ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ إِذْ اُكْتَبَتْ رُبَّاءُ إِنَّا لَفِي خَلْقٍ  
جَدِيدٍ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ الْأَغْلَىٰ فِي  
أَعْنَاقِهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ⑤

ہیں۔ یقیناً ان سب چیزوں میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام  
لیں۔ ۴

اب اگر تعجب کرو تو تعجب کے قابل تو ان کی یہ بات ہے کہ جب ہم مٹی ہو جائیں  
گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟<sup>۱۳۸</sup> یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے  
پروردگار کا انکار کر دیا ہے۔<sup>۱۳۹</sup> یہی ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں۔<sup>۱۴۰</sup> یہی  
دوزخ کے لوگ ہیں، یہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۵

کہ کہیں ایک ہی جڑ سے کئی کئی تنے پھوٹ نکلتے ہیں اور کہیں ایک ہی تنا نکلتا ہے۔  
۱۳۷ یعنی اس بات کی نشانیاں کہ کائنات کا خالق زمین کی پیداوار میں کس قدر تنوع، رنگارنگی،  
جدت اور بقلمونی کے ساتھ اپنی ہمہ گیر قدرت اور اپنے بے خطا علم و حکمت کو نمایاں کرتا ہے۔  
۱۳۸ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی بات پر تعجب کرنا ہے تو زمین و آسمان کی اُن نشانیوں کو دیکھ کر،  
جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، اُن لوگوں کی بات پر تعجب کرنا چاہیے جو مرنے کے بعد جی اٹھنے پر تعجب کا  
اظہار کرتے ہیں۔ یہ نشانیاں تو پکار پکار کر شہادت دے رہی ہیں کہ جس خدا نے اپنی مخلوقات میں  
کمال حکمت کے یہ نمونے دکھائے ہیں، اُس کا کوئی کام بھی عبث نہیں ہو سکتا۔ لہذا ممکن نہیں ہے کہ  
وہ انسان جیسی مخلوق کو پیدا کر کے اُسے یوں ہی خاک میں گم کر دے گا اور اُس کے لیے کوئی ایسی  
دنیا نہیں بنائے گا، جہاں اُس کا باطن ہر لحاظ سے اُس کے ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔

۱۳۹ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ آخرت کا انکار درحقیقت خدا کا انکار ہے، کیونکہ آخرت کے انکار  
کے بعد خدا کے اقرار کے بھی کوئی معنی نہیں ہیں۔ یہ، اگر غور کیجیے تو خدا کی تمام اعلیٰ صفات —







الرعد  
۱۳

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ  
مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثَلُطُ ۚ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِلنَّاسِ عَلَى ظُلْمِهِمْ  
وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ ④  
وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۚ إِنَّمَا  
أَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ⑤ اللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنْثَىٰ

یہ بھلائی سے پہلے تم سے برائی کے لیے جلدی مچا رہے ہیں، دراصل حالیکہ (اس رویے پر) عبرت ناک عذاب کی مثالیں ان سے پہلے گزر چکی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا پروردگار لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود ان سے درگزر فرمانے والا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ تیرا پروردگار سخت سزا دینے والا ہے۔ ۶۔

یہ منکرین کہتے ہیں کہ اس شخص پر اس کے پروردگار کی طرف سے (عذاب کی) کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی؟ (انھیں بتاؤ کہ یہ تمہارا کام نہیں ہے، اس لیے کہ) تم تو صرف خبردار کرنے والے ہو اور ہر قوم کے لیے اسی طرح ایک راہ بتانے والا آتا رہا ہے۔ (ان پر عذاب کے لیے کوئی نشانی کب ظاہر ہوگی؟ اسے اللہ جانتا ہے، جس

قدرت، ربوبیت، علم اور حکمت — کا انکار ہے۔ جو شخص ان صفات کے بغیر خدا کو مانتا ہے، اُس کا ماننا اور نہ ماننا، دونوں برابر ہیں۔

۱۴۰۔ یعنی جہالت، ہٹ دھرمی، انانیت، تعصب اور اندھی تقلید کے طوق جو استاذ امام کے الفاظ میں ان کی گردنیں نہ اوپر اٹھنے دیتے ہیں کہ آسمان کی نشانیوں پر غور کریں اور نہ زمین کی طرف جھکنے دیتے ہیں کہ اُس کی نشانیوں پر تدبر کی نگاہ ڈالیں۔ چنانچہ جو زاویہ نظر اپنے لیے مقرر کیے ہوئے ہیں، اُسی پر جم کر رہ گئے ہیں۔ اُس سے ہٹ کر کسی اور طرف نظر دوڑانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔



وَمَا تَغِيْضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ ۝۸ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ ۝۹ سَوَاءٌ مِنْكُمْ مَنْ أَسْرَ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ ۝۱۰ لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ ۝۱۱ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۝۱۲ وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ

(طرح) ہر مادہ کے حمل کو اللہ جانتا ہے اور جو کچھ رحموں میں گھٹتا اور بڑھتا ہے، اُس کو بھی جانتا ہے۔ ہر چیز اُس کے ہاں ایک اندازے کے مطابق ہے۔ وہ غائب و حاضر کا جاننے والا ہے، سب سے بڑا ہے، سب سے برتر ہے۔ اُس کے علم میں یکساں ہیں جو تم میں سے چپکے سے بات کریں اور جو پکار کر کریں اور جو رات (کی تاریکی) میں چھپے ہوئے ہوں اور جو دن میں چل رہے ہوں۔ اُن کے آگے اور پیچھے سے اُن پر امر الہی کے موکل لگے رہتے ہیں جو اُن کی نگرانی کرتے ہیں۔ (یہ جلدی نہ مچائیں)، اللہ کسی قوم کے ساتھ اپنا معاملہ اُس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک

۱۴۱ مطلب یہ ہے کہ انہیں تو تم سے خدا کی رحمت و عنایت اور اپنے لیے خیر و صلاح کی طلب کرنی چاہیے تھی، مگر یہ اُس سے پہلے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔

۱۴۲ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہر حاملہ کے وضع حمل کا ٹھیک ٹھیک وقت صرف اللہ کے علم میں ہوتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ اُس میں درپردہ کیا کمی بیشی ہو رہی ہے، اُسی طرح عذاب کا وقت بھی اُسی کے علم میں ہے اور وہی جانتا ہے کہ تمہارے حالات کے لحاظ سے اُس میں کیا کمی بیشی کرنی ہے۔ میں تو جو کچھ بتا سکتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اپنے عقیدہ و عمل کے فساد کا حمل تم لوگ بھی قبول کر چکے ہو اور اپنی مدت کو پہنچ کر وہ بھی لازماً ظہور میں آ جائے گا۔ میں اُسی سے تمہیں خبردار کر رہا ہوں،





الرعد  
۱۳

سُوْءًا فَلَامَرَدَّلَهُ ۚ وَمَالَهُمْ مِّنْ دُونِهِ مَنۢ وَقَالَ ۝۱۱  
هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنَشِّئُ السَّحَابَ  
الثِّقَالَ ۝۱۲ وَيَسْبِغُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ ۚ  
وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنۢ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُونَ

وہ خود اپنے رویے میں تبدیلی نہ کر لے اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی اور نہ اللہ کے مقابل میں اُن کا کوئی مددگار ہو سکتا ہے۔ ۱۳-۱۱-۱۲

وہی ہے جو تمہیں بجلی دکھاتا ہے جس سے خوف بھی پیدا ہوتا ہے اور امید بھی اور وہی (پانی سے) لدی ہوئی بدلیاں اٹھاتا ہے۔ اُن کی گرج اُس کی پاکی بیان کرتی ہے، اُس کی حمد کے ساتھ، اُس کے ڈر سے اور فرشتے بھی اسی طرح اُس کے ڈر سے اُس کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرتے ہیں۔ ۱۴ وہ کڑکتی ہوئی بجلیاں بھیجتا ہے، پھر جس پر چاہتا

جس طرح پہلی قوموں کے رسول کرتے رہے ہیں۔

۱۴ یہ اُس سنت الہی کا حوالہ ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ جس طرح افراد کو صبر یا شکر کے امتحان کے لیے منتخب کرتا ہے، اُسی طرح قوموں کو بھی منتخب کرتا ہے۔ اس انتخاب کے نتیجے میں جب کوئی قوم ایک مرتبہ سرفرازی حاصل کر لیتی ہے تو اللہ اُس کے ساتھ اپنا معاملہ اُس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ علم و اخلاق کے لحاظ سے اپنے آپ کو پستی میں نہیں گرا دیتی۔ یہ خدا کی غیر متبدل سنت ہے اور اپنی اس سنت کے مطابق جب کسی قوم کے لیے بار بار کی تنبیہات کے بعد وہ ذلت و عکبت کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اُس کا یہ فیصلہ کسی کے ٹالے نہیں ٹلتا اور دنیا کی کوئی قوت بھی خدا کے مقابلے میں اُس قوم کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ انسان کی پوری تاریخ قوموں کے عزل و نصب



فِي اللَّهِ ۚ وَهُوَ شَدِيدُ الْمَحَالِ ۝۱۳

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۖ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ  
لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا كَبَاسِطٌ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ  
وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۝۱۴

ہے، اُنھیں (بسا اوقات عین اُس حالت میں) گرا دیتا ہے، جب کہ وہ خدا کے  
بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑی زبردست قوت والا  
ہے۔ ۱۳-۱۲

اُسی کو پکارنا برحق ہے۔ اُس کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں، وہ اس سے زیادہ ان کی  
داد رسی نہیں کر سکتے کہ کوئی اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف بڑھائے کہ وہ اُس کے منہ  
تک پہنچ جائے، دریاں حالیکہ وہ کسی طرح اُس کے منہ تک پہنچنے والا نہ ہو۔ حقیقت یہ  
ہے کہ ان منکروں کی فریاد محض صدا بہ صحرا ہے۔ ۱۴

میں اس سنت کے ظہور کی گواہی دیتی ہے۔

۱۴۴ آیت میں ایک دوسرے کے مقابل الفاظ وضاحت قرینہ کی بنا پر حذف کر دیے گئے  
ہیں۔ ہم نے ترجمے میں اُنھیں کھول دیا ہے۔

۱۴۵ جو لوگ عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے، یہ اُنھیں آفاق کی بعض نشانیوں کی طرف توجہ دلائی  
ہے کہ امید و بیم کا پیغام لے کر بجلیاں تو ہر روز تمہارے سروں پر چمکتی ہیں۔ ان کے بعد اب کس  
نشانی کے منتظر ہو؟ تم عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو اور اُدھر جو چیزیں عذاب بن کر نازل ہو سکتی ہیں  
اور جو عذاب کا فیصلہ لے کر آتے ہیں، سب خدا کے خوف سے لرزتے اور ہر وقت اُس کی حمد اور تسبیح  
میں مصروف رہتے ہیں کہ معلوم نہیں، کس وقت کیا حکم صادر ہو جائے۔







الرعد  
۱۳

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظَلَمُ  
بِالْغُدُوِّ وَالْاَصَالِ ۝۱۵ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ  
قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِنْ دُونِهِ اَوْلِيَاءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِنَفْسِهِمْ نَفْعًا وَلَا  
ضَرًّا قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي  
الْظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوْا الْخَلْقَ فَتَشَابَهَ

زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں، سب طوعاً و کرہاً خدا ہی کو سجدہ کر رہے ہیں اور  
صبح و شام اُن کے سایے بھی۔<sup>۱۳۶</sup> اِن سے پوچھو، زمین اور آسمانوں کا مالک کون ہے؟  
کہہ دو، اللہ۔ اِن سے پوچھو، کیا پھر بھی تم نے اُس کے سوا ایسے کارساز بنا رکھے ہیں  
جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے؟ اِن سے پوچھو، کیا اندھے  
اور آنکھوں والے، دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ یا اندھیرے اور روشنی، دونوں برابر  
ہوں گے؟<sup>۱۳۷</sup> یا پھر اُنھوں نے خدا کے ایسے شریک ٹھیرائے ہیں جنھوں نے اُسی طرح

<sup>۱۳۶</sup> یہ استدلال کی ایک خاص قسم ہے جسے اشارات سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اس میں ذہن کو  
علامت سے حقیقت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی مخاطب کو ہر چیز کے مطیع و منقاد اور  
قانون سے مسخر ہونے کی طرف متوجہ کرنے کے لیے یہ تعبیر اختیار فرمائی ہے کہ دیکھ لو، چیزوں کے  
سایے بھی رات بھر سجدے میں پڑے رہتے ہیں، صبح کو آہستہ آہستہ سراٹھاتے اور زوال آفتاب  
کے بعد ایک مرتبہ پھر اُسی پروردگار کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

<sup>۱۳۷</sup> یعنی خدا کی نگاہ میں برابر ہوں گے اور تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کی بات مان کر  
وہ عقلی اور اخلاقی لحاظ سے اندھوں اور بیناؤں کو ایک ہی انجام سے دوچار کر دے گا؟ آیت میں یہ  
چیز بھی قابل توجہ ہے کہ اندھیرے کے لیے 'ظلمات' کا لفظ جمع لائے ہیں، جب کہ اُس کے مقابل لفظ



الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ①٦  
 أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ  
 السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا ۖ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ  
 حُلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهٗ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ  
 فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي  
 الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ①٧ لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا

پیدا کیا ہے، جس طرح خدا نے پیدا کیا ہے، سو اُن پر تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا ہے؟  
 انہیں بتادو کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے اور وہ یکتا ہے، سب پر غالب ہے۔ ۱۵-۱۶  
 اُس نے آسمان سے پانی برسایا تو وادیاں اپنے اپنے طرف کے مطابق بہ نکلیں اور  
 سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھا لیا، اور اسی طرح کا جھاگ اُن چیزوں کے اندر  
 سے بھی ابھرتا ہے جنہیں زیور یا (اسی قسم کا) دوسرا ساز و سامان بنانے کے لیے آگ  
 میں پگھلاتے ہیں۔ اللہ اسی طرح حق اور باطل کو ٹکراتا ہے۔ سو جھاگ تو رائگاں جاتا  
 ہے اور جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہے، وہ زمین میں ٹھیر جاتی ہے۔ ۱۷۔ اللہ اسی طرح

نُورِ واحد استعمال ہوا ہے۔ اس سے یہ لطیف اشارہ مقصود ہے کہ تاریکیاں ہزار راستوں سے  
 ظہور میں آتی ہیں، مگر روشنی اور اجالے کا منبع ایک ہی ہے اور وہ اس کائنات کا پروردگار ہے۔  
 ۱۸۔ چنانچہ مجبور ہیں کہ کسی نہ کسی درجے میں دوسروں کو بھی خالق مان کر خدائی میں شریک  
 ٹھیرائیں۔

۱۹۔ مطلب یہ ہے کہ وحی الہی کی صورت میں جو بارش اس وقت ہو رہی ہے، اُس نے  
 بھی منکرین کے ہنگامہ و شورش کی صورت میں کچھ جھاگ اٹھا دیا ہے جو اس طرح چرخ کھارہا





الرعد  
۱۳

لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ ۖ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِבוْا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَّا فِي  
الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ ۖ أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ  
الْحِسَابِ ۚ وَمَا أُولَٰئِكَ بِهِمْ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْبِهَادُ ۝۱۸  
أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَىٰ ۖ

مثالیں بیان کرتا ہے، (جن سے تم اس حقیقت کو بھی سمجھ سکتے ہو کہ) جن لوگوں  
نے اپنے رب کی دعوت کو لبیک کہا، اُن کے لیے اچھا انجام ہے اور جنہوں نے  
اُس کی دعوت قبول نہیں کی، (اُن کا حال یہ ہوگا کہ) اُنہیں اگر وہ سب کچھ حاصل  
ہو جائے جو زمین میں ہے اور اُسی کے برابر اور بھی تو سب اپنی رہائی کے لیے دے  
ڈالیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا حساب برا اور جن کا ٹھکانا جہنم ہوگا، اور وہ کیا ہی برا  
ٹھکانا ہے! ۱۷-۱۸

سو کیا جو شخص یہ جانتا ہے کہ جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری طرف

ہے کہ شاید کچھ دیر تک سطح پر وہی نظر آئے گا، لیکن تم دیکھو گے کہ بہت جلد یہ سارا جھاگ فنا ہو  
جائے گا اور جو کچھ باقی رہے گا، وہ قرآن اور اُس کے حاملین ہوں گے۔ خدا کی سنت یہی ہے  
جس کا ظہور اس کائنات میں ہر جگہ ہوتا ہے، جس طرح کہ مثال سے واضح ہے اور رسولوں کی  
بعثت کے بعد جب حق و باطل میں کشمکش برپا ہوتی ہے تو انسانوں کے لیے بھی لازماً ہو جاتا  
ہے۔

۱۵۰۔ یعنی ایسا سخت ہوگا کہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بری طرح گرفت میں آئے گی، کسی  
لغزش سے چشم پوشی نہیں ہوگی اور اُن کے اعمال نامے میں رائی کے برابر برائی بھی اُن کے لیے  
پھاڑ بن کر سامنے آجائے گی۔



إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝<sup>١٩</sup> الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ ۝<sup>٢٠</sup> وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ ۝<sup>٢١</sup> وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَانْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى

اتارا گیا ہے، وہ حق ہے، اُس شخص کے مانند ہو جائے گا جو اندھا ہے؟<sup>۱۵۱</sup> (یہ ایک یاد دہانی ہے اور) یاد دہانی تو وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں — جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے اس پیمان کو توڑتے نہیں<sup>۱۵۲</sup> اور جو اُس چیز کو جوڑتے ہیں جسے اللہ نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے<sup>۱۵۳</sup> اور اپنے رب سے ڈرتے اور برے حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں۔ اور جو اپنے رب کی رضا طلبی میں ثابت قدم رہے اور نماز کا اہتمام کیا اور جو کچھ ہم نے انھیں عطا فرمایا، اُس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کیا اور جو برائی کو<sup>۱۵۱</sup> یعنی عقل کا اندھا ہے اور حقیقت کو سامنے پا کر بھی دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے۔

۱۵۲۔ اس سے مراد وہ ازلی عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابتداءے آفرینش میں تمام انسانوں سے لیا تھا۔ سورۃ اعراف (۷) کی آیت ۱۷۲ میں اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔

۱۵۳۔ یہ رشتہ رحم کی تعبیر ہے۔ قرآن نے یہ اسلوب جہاں بھی اختیار کیا ہے، موقع کلام کی دلالت سے واضح ہے کہ رشتہ رحم و قرابت کے لیے اختیار کیا ہے۔ اس میں جو ابہام ہے، اُس سے رشتہ رحم کی عظمت واضح ہوتی ہے۔ گویا یہ ایسی معروف اور بدیہی حقیقت ہے کہ اس کا نام لیے بغیر ہی ہر شخص سمجھ لیتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جسے خدا نے کاٹنے کا نہیں، بلکہ جوڑنے کا





الرعد  
۱۳

الدَّارِ ۲۲) جَنَّتٌ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ  
وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّتِهِمْ وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ ۲۳)  
سَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۲۴)

بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ ۱۵۴۔ اگلے گھر کا انجام اُنھی کے لیے ہے، ابد کے باغ جن میں  
وہ داخل ہوں گے اور وہ بھی جو اُن کے آبا و اجداد اور اُن کی بیویوں اور اُن کی اولاد  
میں سے اِس کے اہل بنیں گے۔ ۱۵۵۔ فرشتے ہر دروازے سے اُن کے پاس آئیں گے  
اور کہیں گے: تم لوگوں پر سلامتی ہو، اِس لیے کہ تم ثابت قدم رہے۔ سو کیا ہی خوب  
ہے یہ اگلے گھر کا اچھا انجام! ۱۵۶۔ ۱۹-۲۴

حکم دیا ہے۔

۱۵۴۔ یعنی بدی کے مقابلے میں بدی نہیں، بلکہ نیکی کرتے ہیں۔ چنانچہ اُن پر بھی خرچ  
کیے جاتے ہیں جن کا سلوک اُن کے ساتھ اچھا نہیں ہوتا۔ وہ اِس بات کو سمجھتے ہیں کہ اُن کا  
پروردگار اِسی رویے کو پسند کرتا ہے کہ شر کا مقابلہ شر سے نہیں، بلکہ خیر سے کیا جائے اور ظلم کے  
جواب میں ظلم نہیں، بلکہ انصاف کا علم اٹھائے رکھا جائے، خواہ اِس کے لیے کتنا ہی نقصان  
اٹھانا پڑے۔

یہ تمام تفصیل اِس لیے کی گئی ہے کہ منکرین کو متنبہ کر دیا جائے کہ تم جس اندھے پن کا مظاہرہ کر  
رہے ہو، اُس کے ساتھ تم اُن لوگوں کے مانند نہیں ہو سکتے جنہیں اللہ تعالیٰ نے دل و دماغ کی روشنی  
عطا فرمائی ہے۔ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جائے کہ آپ پریشان نہ ہوں، آپ جو چیز پیش  
کر رہے ہیں، اُس کے بارے میں ہر شخص کا رویہ یکساں نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مطمئن رہیے، اُس  
سے وہی لوگ یاد دہانی حاصل کریں گے جو ہوش گوش رکھتے اور عقل سے کام لیتے ہیں اور جن کی  
سیرت و کردار کا رنگ وہ ہے جو بیان کیا جا رہا ہے۔



وَالَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ  
مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمُ  
الْعَنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ۖ ۲۵ ۝ اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ  
وَفَرِحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ ۚ ۲۶ ۝  
وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ

اس کے برخلاف جو اللہ کے عہد کو اُس کے باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اُسے کاٹتے ہیں اور اس طرح زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، وہی ہیں جن کے لیے لعنت ہے اور جن کے لیے اُس کا گھر نہایت بُرا انجام بھی ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے، رزق کی فراخی عطا فرماتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے، اُسے تنگ کر دیتا ہے۔ یہ (اس حقیقت کو نہیں سمجھے اور) اسی دنیا کی زندگی پر رتجھے ہوئے ہیں، دریاں حالیکہ دنیا کی یہ زندگی آخرت میں محض ایک متاع حقیر ہی نکلے گی۔ ۲۵-۲۶

یہ منکرین کہتے ہیں کہ اس کے پروردگار کی طرف سے اس شخص پر کوئی نشانی

۱۵۵ یہ اچھے انجام کی مزید تفصیل ہے کہ اُن کے اعزہ واقربا بھی اہل ہوئے تو جنت میں اُن کے ساتھ ہوں گے تاکہ اُن کی مسرت میں کوئی کمی نہ رہے۔

۱۵۶ یہ فقرہ فرشتوں کے قول تہنیت کا جزو نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس مرتبہ بلندی تحسین ہے جو انجام کار انھیں حاصل ہو جائے گا۔

۱۵۷ یہ الفاظ وضاحت قرینہ کی بنا پر اصل میں محذوف ہیں۔

۱۵۸ اصل میں لفظ 'متاع' آیا ہے۔ یہ نکرہ ہے۔ اسی تنکیر کو ہم نے متاع حقیر کے الفاظ میں





الرعد  
۱۳

إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَىٰ إِلَهِهِ مَنْ أَنَابَ ۖ ﴿٢٤﴾ الَّذِينَ آمَنُوا  
وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ ۚ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ۖ ﴿٢٥﴾  
الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحَسَنُ مَا بِهِمْ  
كَذَلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا أُمَمٌ لِّتَتْلُوَ

کیوں نہیں اتاری گئی؟ ان سے کہہ دو، اللہ جس کو چاہتا ہے (اپنے قانون کے مطابق<sup>۱۵۹</sup> اسی طرح) گم راہ کر دیتا ہے اور اپنا راستہ اُنھی کو دکھاتا ہے جو اُس کی طرف متوجہ ہوں<sup>۱۶۰</sup>، جو ایمان لائے اور جن کے دل اللہ کی اس یاد دہانی سے مطمئن ہوتے ہیں۔ سنو، اللہ کی اس یاد دہانی ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے عمل کیے، اُن کے لیے خوش خبری ہے اور اچھا ٹھکانا ہے۔ ۲۹-۲۷  
ہم نے اسی طرح، (اے پیغمبر، ایسی کسی نشانی کے بغیر ہی) تم کو ایک ایسی قوم میں

ادا کیا ہے، اس لیے کہ آیت میں یہ تقلیل کے مفہوم میں ہے۔

۱۵۹ یعنی اپنے اس قانون کے مطابق کہ جو لوگ نفس و آفاق کی نشانیوں سے آنکھیں بند کر کے قبول حق کے لیے معجزوں اور کرشموں کا مطالبہ کریں، وہ اسی کے مستحق ہیں کہ گم راہ کر دیے جائیں۔

۱۶۰ ہدایت پانے کے لیے یہ لازمی شرط ہے۔ آدمی اگر ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر خدا کی طرف متوجہ ہو جائے تو اس نعمت سے لازماً بہرہ یاب ہو جاتا ہے۔

۱۶۱ یعنی معجزوں اور کرشموں سے نہیں، بلکہ قرآن سے جب وہ اللہ تعالیٰ کی صفات، اُس کے سنن اور اُس کی معرفت کے دلائل و حجج سے حق کو پوری طرح مبرا بن کر دیتا ہے۔ تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی حق کو مجرد حق کی حیثیت سے پہچاننے کے لیے تیار ہو جائے۔



عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَنِ قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ ۝ وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ بَلْ لِلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا ۝ أَفَلَمْ يَأْتِ الْبَشَرُ إِلَّا نَذِيرًا لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا تَصِيبُهُمُ الْمَاصِعَةُ ۝ لَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تَصِيبُهُمُ الْمَاصِعَةُ ۝

رسول بنا کر بھیجا ہے، جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں، اس لیے کہ تم انھیں وہ پیغام سنا دو جو ہم نے تم پر وحی کیا ہے، ہر چند وہ خداے رحمن کا انکار کر رہے ہیں۔<sup>۱۶۲</sup> ان سے کہو کہ وہی میرا پروردگار ہے، اُس کے سوا کوئی الہ نہیں، میں نے اُسی پر بھروسہ کیا ہے اور (جانتا ہوں کہ ایک دن) اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا قرآن بھی ہوتا جس سے پہاڑ چلنے لگتے یا زمین ٹکڑے ہو جاتی یا اُس سے مردے بولنے لگتے تو کیا یہ ایمان لے آتے؟<sup>۱۶۳</sup> نہیں، یہ تمہارا کام نہیں ہے (کہ انھیں نشانیاں دکھاؤ)، بلکہ تمام اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ پھر کیا ایمان والے (یہ جان کر بھی ان سے) مایوس نہیں ہوئے کہ اگر اللہ چاہتا تو سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا؟<sup>۱۶۴</sup> (تم دیکھتے رہو)، ان منکروں پر برابر کوئی نہ کوئی آفت ان کے اعمال کی پاداش

۱۶۲ یعنی اُس کی بندگی سے گریزاں ہیں اور اُس کے صفات و حقوق میں دوسروں کو اُس کا شریک بنا رہے ہیں۔ قرآن نے جگہ جگہ اس رویے کو خدا کے انکار سے تعبیر کیا ہے۔

۱۶۳ یہ جواب شرط ہے جو اصل میں محذوف ہے۔ اسی طرح ”بل“ سے پہلے بھی نفی کا جملہ اسی طریقے پر حذف کر دیا گیا ہے۔ ہم نے دونوں کو کھول دیا ہے۔

۱۶۴ یعنی ان لوگوں کی طرف سے مایوس نہیں ہوئے، بلکہ ابھی تک امید لگائے بیٹھے ہیں کہ





الرعد  
۱۳

أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ  
الْعَهْدَ ۝ (۳۱) وَلَقَدْ اسْتَهْزَيْ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَمَلَيْتُ لِلَّذِينَ  
كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝ (۳۲)  
أَفَمَن هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۖ وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ ۖ  
قُلْ سَمُّوهُمْ ۚ أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ ۚ أَمْ بِظَاهِرٍ مِّنْ

میں آتی رہے گی یا ان کی بستی کے قریب کہیں نازل ہوتی رہے گی، یہاں تک کہ اللہ کا  
وعدہ آن پورا ہو۔ یقیناً اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔ تم سے پہلے بھی  
رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو میں نے انکار کرنے والوں کو ڈھیل دی، پھر میں نے اُن کو  
پکڑا تو (دیکھو کہ) کیسی تھی میری سزا! ۳۰-۳۲

پھر کیا وہ جو ایک ایک شخص کے عمل کی خبر رکھنے والا ہے اور جو کسی بات پر قدرت  
نہیں رکھتے، یکساں ہیں اور انہوں نے (اسی بنا پر) اللہ کے شریک بنا لیے ہیں؟ ان

ان کے مطالبات پورے کر دیے جائیں تو یہ ایمان لے آئیں گے، جب کہ اُن پر واضح کر دیا گیا ہے کہ  
اگر اس طرح کا ایمان مطلوب ہوتا تو اس کے لیے معجزے اور کرشمے دکھانے کے تکلف کی کیا ضرورت  
تھی۔ یہ کام تو اس طرح بھی ہو سکتا تھا کہ اللہ آن کی آن میں سب کو اپنی قدرت سے مومن بنا دیتا۔ مگر  
اُس نے ایسا نہیں کیا، اس لیے کہ وہ چاہتا ہے کہ لوگ عقل و بصیرت سے کام لیں اور اپنے اختیار و ارادہ کی  
آزادی کے ساتھ پورے شعور سے ایمان لائیں۔ یہی امتحان ہے جس میں انسانوں کو مبتلا کیا گیا ہے۔

۱۶۵ مطلب یہ ہے کہ ان کی طلب کے مطابق معجزے اور کرشمے تو نہیں، مگر تنبیہات نازل  
ہوتی رہتی ہیں اور ان کے کرتوتوں کی پاداش میں خود ان پر یا ان کے قرب و جوار کے لوگوں پر اسی  
طرح نازل ہوتی رہیں گی تاکہ یہ بیدار ہوں اور پیغمبر کی دعوت پر غور کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔



الْقَوْلِ ط بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ ط  
وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۝۳۳ لَّهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا  
وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ ۝۳۴  
مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ط تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا

سے کہو، اُن کے نام تو بتاؤ، کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر دے رہے ہو جس سے وہ خود  
اپنی زمین میں بے خبر ہے یا پھر اوپری باتیں کر رہے ہو؟ نہیں، بلکہ ان منکروں  
کے لیے ان کا فریب خوش نما بنا دیا گیا ہے اور یہ راہ حق سے روک دیے گئے ہیں۔  
حقیقت یہ ہے کہ جنہیں اللہ (اپنے قانون کے مطابق) گم راہی میں ڈال دے،  
انہیں کوئی راہ دکھانے والا نہیں ہے۔ اُن کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی عذاب  
ہے اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں سخت ہے اور انہیں کوئی اللہ سے بچانے والا  
نہ ہوگا۔ ۳۳-۳۴

اس کے برخلاف اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے،

اب یہ ان پر ہے کہ انہی تنبیہات سے متنبہ ہو جائیں یا انتظار کرتے رہیں، یہاں تک کہ وہ آخری  
عذاب آجائے جس کی وعید انہیں سنائی جا رہی ہے۔

۱۶۶ جملے کا یہ حصہ اصل میں محذوف ہے۔ اس سے متکلم کی نفرت و کراہت کا اظہار ہو رہا  
ہے۔ گویا اس طرح کی بات کا ذکر بھی اُسے گوارا نہیں ہے۔

۱۶۷ یعنی بغیر سوچے سمجھے جو منہ میں آئے، کہہ رہے ہو۔ اس جملے میں جو غصہ اور تحقیر چھپی  
ہوئی ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

۱۶۸ شرک کے لیے یہ لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ اس سے مذہبی پیشوا اپنے آپ کو بھی







الرعد  
۱۳

الْأَنهَرُ أُكُلُهُا دَائِمٌ وَظِلُّهَا ۖ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوْا ۖ  
وَعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّارُ ۝۳۵

وَالَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابُ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمِنَ  
الْأَحْزَابِ مَنْ يُنْكِرُ بَعْضَهُ ۖ قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ  
وَلَا أُشْرِكَ بِهِ ۖ إِلَيْهِ أَدْعُوا وَإِلَيْهِ مَابِ ۝۳۶ وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ

اُس کی تصویر یہ ہے کہ اُس کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، اُس کے پھل دائمی اور اُس  
کا سایہ لازوال ہوگا۔ یہ اُن لوگوں کا انجام ہے جو خدا سے ڈرنے والے ہیں  
اور منکروں کا انجام یہ ہے کہ اُن کے لیے دوزخ کی آگ ہے۔ ۳۵

ہم نے جن کو کتاب عطا فرمائی ہے، وہ اُس چیز سے خوش ہیں جو تمہاری طرف  
نازل کی گئی ہے اور تمہارے منکرین کے گروہوں میں ایسے بھی ہیں جو اُس کی بعض  
چیزوں کو نہیں مانتے۔ تم اُن کو صاف کہہ دو کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ خدا ہی کی بندگی  
کروں اور کسی کو اُس کا شریک نہ ٹھیراؤں۔ میں اُسی کی طرف بلاتا ہوں اور اُسی کی

دھوکا دیتے ہیں اور اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے لوگوں کو بھی دھوکے میں مبتلا کیے رکھتے ہیں۔  
۱۶۹ اصل الفاظ ہیں: 'اُكُلُهَا دَائِمٌ وَظِلُّهَا'۔ ان میں 'ظِلُّهَا' کی خبر وضاحت قرینہ کی بنا  
پر حذف کر دی گئی ہے۔

۱۷۰ یہ صالحین اہل کتاب کا ذکر ہے، اس لیے 'اُوتُوا الْكِتَابَ' کے بجائے 'اُتَيْنَهُمُ الْكِتَابُ'  
کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ قرآن کا خیر  
مقدم کیا۔

۱۷۱ آگے کے مضمون سے واضح ہے کہ ان بعض چیزوں میں سب سے نمایاں قرآن کی



حُكْمًا عَرَبِيًّا وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ  
مَا لَكَ مِنْ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا وَاقٍ ۝۳۴  
وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً

طرف میرا لوٹنا ہے۔ ہم نے یہ کتاب اسی لیے ایک فرمان کی حیثیت سے <sup>۱۷۳</sup>عربی میں اتاری ہے۔ اب اگر تم اُس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے، اُن کی خواہشوں کی پیروی کرو گے تو اللہ کے مقابل میں نہ تمہارا کوئی مددگار ہوگا نہ بچانے والا۔ <sup>۱۷۶</sup>۳۶-۳۷ (انہیں اعتراض ہے کہ تم کوئی نشانی کیوں نہیں دکھاتے اور دنیوی علائق کیوں رکھتے ہو)؟ ہم نے، (اے پیغمبر)، تم سے پہلے بھی رسول بھیجے تھے اور (چونکہ انسان

دعوت تو حید تھی جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین میں سے بعض گروہ کسی حال میں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

۱۷۲ اصل میں لفظ 'كَذَلِكَ' ہے۔ یہ عربی زبان میں اُس معنی کے لیے بھی آتا ہے جسے ہم 'چنانچہ' یا 'اسی لیے' جیسے الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔

۱۷۳ یعنی ایک فرمان واجب الاذعان کی حیثیت سے جسے جھٹلایا گیا تو خدا کی عدالت اسی زمین پر اپنا فیصلہ سنا دے گی۔

۱۷۴ یعنی وہ علم قطعی جس میں کسی ریب و گمان کی گنجائش نہیں ہے۔

۱۷۵ اصل میں لفظ 'أَهْوَاءُ' آیا ہے۔ اس سے یہاں ان گروہوں کی بدعتیں مراد ہیں، اس لیے کہ ان کی بنیاد علم پر نہیں، بلکہ خواہشوں ہی پر ہوتی ہے۔

۱۷۶ یہاں بھی خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر روئے سخن منکرین ہی کی طرف ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، اس میں یہ بلاغت ہے کہ سننے والے اچھی طرح متنبہ ہو جائیں کہ اس حکم کی خلاف ورزی کر کے جب پیغمبر بھی خدا کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے تو تابہ





الرعد  
۱۳

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ۝  
يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ ۖ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ ۝  
وَإِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا  
عَلَيْكَ الْبَلَّغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝  
أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ  
نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۖ وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ ۖ وَهُوَ سَرِيعٌ

ہی تھے، اس لیے) اُن کو بیویاں بھی دی تھیں اور اولاد بھی۔ اور کسی رسول کے اختیار میں نہیں تھا کہ وہ اذن الہی کے بغیر کوئی نشانی لا دکھائے۔ (ہر چیز کے لیے ایک وقت ہے اور) ہر وقت کے لیے ایک نوشتہ ہے۔ اللہ جو کچھ چاہتا ہے، اُس میں سے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے، باقی رکھتا ہے اور اس نوشتے کی اصل اُسی کے پاس ہے۔ ۳۸-۳۹

ہم جو وعید انھیں سنارہے ہیں، اُس کا کچھ حصہ ہم تمھیں دکھائیں یا تم کو وفات دیں اور اس کے بعد ان سے نمٹیں، بہر کیف تمھاری ذمہ داری صرف پہنچانا ہے اور ان کا حساب لینا ہمارا کام ہے۔ کیا یہ نہیں دیکھ رہے کہ اس سرزمین کو ہم اس کے کناروں سے کم کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اللہ فیصلہ کرتا ہے، کوئی اُس کے دیگر اُپ چہ رسد!

۷۷ مطلب یہ ہے کہ خدا کے فیصلے مبرم بھی ہوتے ہیں اور معلق بھی۔ پھر جو معلق ہیں، اُن میں وہ اپنی حکمت و مشیت کے تحت تبدیلی بھی کرتا ہے۔ لیکن جو کچھ کرتا ہے، وہی کرتا ہے، اس لیے کہ اصل نوشتہ اُسی کے پاس ہے اور کسی دوسرے کے لیے اُس تک رسائی کا کوئی موقع نہیں ہے کہ وہاں جائے اور کسی نشانی کے ظہور کا وقت اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کر لے۔



الْحِسَابِ ۝ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا ۝  
يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ وَسَيَعْلَمُ الْكُفْرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ۝  
وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسَتْ مُرْسَلًا ۝ قُلْ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا  
بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۝ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ۝

فیصلے کو ہٹانے والا نہیں ہے اور وہ بہت جلد حساب چکا دینے والا ہے۔ جو ان سے پہلے  
گزرے ہیں، انہوں نے بھی چالیں چلی تھیں، مگر چالیں سب اللہ کے اختیار میں  
ہیں۔ ہر ایک جو کچھ کر رہا ہے، وہ اُس کو جانتا ہے۔ اور یہ منکرین بھی عنقریب جان  
لیں گے کہ اگلے گھر کا اچھا انجام کس کے لیے ہے۔ ۴۰-۴۲

(یہ سب سننے کے بعد بھی تمہارے) منکرین کہتے ہیں کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے  
نہیں ہو۔ کہہ دو، میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے اور ان لوگوں کی  
گواہی جن کے پاس کتاب کا علم ہے۔ ۴۳

۸۷۔ یہ ان فتوحات کی طرف اشارہ ہے جو اسلام کی دعوت کو مکہ کے اطراف میں حاصل ہو  
رہی تھیں۔ خدا نے اسے اپنے اقدام سے تعبیر فرمایا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اگر کوئی نشانی ہی دیکھنا  
چاہتے ہیں تو اس نشانی کو کیوں نہیں دیکھتے کہ ہماری دعوت کے اثرات گرد و پیش کے قبائل میں  
پھیلتے جا رہے ہیں، ان کا دائرہ تنگ ہو رہا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ ان کا یہ شہر بھی ایک دن اس  
دعوت کی یلغار سے مفتوح ہو جائے گا؟

۸۹۔ رسولوں کی بعثت کے بعد ان کے مخاطبین کے ساتھ کب کیا ہوگا؟ اس کا فیصلہ اللہ کرتا  
ہے۔ یہ اُسی فیصلے کا حوالہ ہے۔ اس کی حیثیت ایک قضاے مبرم کی ہوتی ہے، اسے کوئی ٹال نہیں  
سکتا اور جس طرح کہ اوپر فرمایا ہے، رسول کی زندگی میں یا اس کی وفات کے بعد یہ فیصلہ پورے



انصاف کے ساتھ سنادیا جاتا ہے۔

۱۸۰ یعنی صالحین اہل کتاب جن کا ذکر اوپر آیت ۳۶ میں ہو چکا ہے۔

کوالالمپور

۱۶ مئی ۲۰۱۲ء



الرعد  
۱۳







# ابرهيم - الحجر

١٢ — ١٥





## ابراہیم - الحجر

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں جس چیز کے لیے قریش کو تنبیہ و تہدید ہے، دوسری میں اُسی کے حوالے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ مطمئن رہو، یہ قرآن بجائے خود ایک واضح حجت ہے، یہ نہیں مانتے تو انھیں ان کے حال پر چھوڑو، وہ وقت اب جلد آنے والا ہے، جب یہ آرزوئیں کریں گے کہ اے کاش، ہم نے یہ رویہ اختیار نہ کیا ہوتا۔

دونوں کا موضوع وہی انداز و بشارت ہے جو پچھلی سورتوں سے چلا آ رہا ہے۔ اتنا فرق، البتہ ہوا ہے کہ نتائج کا بیان زیادہ صریح ہو گیا ہے اور فہمائش تنبیہ، ملامت اور زجر و توبیخ میں تبدیل ہو گئی ہے۔

دونوں سورتوں میں خطاب اصلاً قریش ہی سے ہے اور ان کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلہ اتمام حجت میں نازل ہوئی ہیں۔



## سورة ابراهيم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الرَّاقِفِ كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ① اللّٰهُ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۖ وَوَيْلٌ لِلْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابٍ

— ۱ —

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورہ 'الر' ہے۔ یہ کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے، اس لیے کہ تم لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آؤ، اُن کے پروردگار کے اذن سے، اُس خدا کے راستے کی طرف جو زبردست ہے، اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔ وہی اللہ کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اُسی کا ہے۔ (تم اس کا انکار کرو گے؟ یاد

۱۔ اس نام کے معنی کیا ہیں؟ اس کے متعلق ہم نے اپنا نقطہ نظر سورہ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

۲۔ اصل میں 'ظُلُمَتْ' اور 'نُور' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'نُور' واحد اور 'ظُلُمَتْ' جمع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گم راہی ہزار راستوں سے آتی ہے، مگر ہدایت کا راستہ ایک ہی ہے جسے قرآن صراطِ مستقیم سے تعبیر کرتا ہے۔

۳۔ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ ہدایت کی توفیق خدا کے اذن سے ملتی ہے اور یہ اذن اُنھی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دیتے ہیں۔

۴۔ چنانچہ وہی سزاوار ہے کہ اُس سے ڈرا جائے اور وہی حق دار ہے کہ اُس کی حمد کی جائے اور





ابراہیم  
۱۳

شَدِيدٍ ۲) الَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ  
وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا ۖ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ  
بَعِيدٍ ۳) وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ  
فِيضِلَّ اللَّهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِيَ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۴)  
وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ  
الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۖ وَذَكَرَهُمْ بِآيِهِ ۖ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ

رکھو)، اُن کے لیے جو اس کتاب کے منکر ہیں، ایک شدید عذاب کی تباہی ہے۔ اُن کے لیے جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور خدا کے راستے سے روکتے ہیں اور اُس میں ٹیڑھ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ بہت دور کی گم راہی میں ہیں۔ (ان کے لیے یہ کتاب ان کی زبان میں اتاری گئی ہے) اور (ہمارا طریقہ یہی ہے کہ) ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، اُس کی قوم کی زبان میں بھیجا ہے، اس لیے کہ وہ انھیں اچھی طرح کھول کر سمجھا دے۔ پھر اللہ جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق) گم راہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے۔ وہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔ ۱-۴  
ہم نے اسی طرح موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا تھا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لاؤ اور انھیں خدا کے دنوں کی یاد دلاؤ، (جن میں اُس کی دینونت اُس سے امیدیں باندھی جائیں۔

۵ یعنی اُس کو خدا کے بجائے اپنے ٹھیراے ہوئے معبودوں کی طرف موڑ دینا چاہتے ہیں۔  
۶ یعنی اپنے اس قانون کے مطابق کہ جو ہدایت کے مستحق ہیں، انھیں ہدایت دی جائے اور جو گم راہی چاہتے ہیں، انھیں اُسی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔



لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ⑤

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَنْجَاكُمْ  
مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ  
وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ⑥ وَإِذْ

کا ظہور ہوا ہے)۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں ہر اُس شخص کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو (خدا کی آزمائشوں میں) صبر اور (اُس کے افضال و عنایات پر) شکر کرنے والا ہو۔ ۵۔

یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اپنے اوپر اللہ کی اُس نعمت کو یاد رکھو، جب اُس نے تمہیں فرعون کے لوگوں سے چھڑایا جو تمہیں نہایت برے عذاب دیتے تھے، وہ تمہارے بیٹوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ذبح کر دیتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے۔ تمہارے پروردگار کی طرف سے اس میں (تمہارے لیے) بڑی عنایت تھی۔

۷۔ یہ اُن نشانیوں کا ذکر ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو فرعون پر اتمام حجت کے لیے دی گئی تھیں، جیسے عصا اور ید بیضا وغیرہ۔

۸۔ یعنی جزا و سزا کے فیصلے ہوئے ہیں اور خدا نے رسولوں کے منکرین پر اسی دنیا میں اپنا عذاب نازل کر دیا ہے، جیسے قوم نوح، قوم لوط اور قوم شعیب وغیرہ۔ قرآن میں یہ تعبیر انھی ایام کے لیے اختیار کی گئی ہے۔

۹۔ یہی دو صفات ہیں جو آدمی کے اندر موجود ہوں تو وہ آیات الہی کی طرف متوجہ ہوتا اور اُن سے عبرت حاصل کرتا ہے۔

۱۰۔ یعنی اس مصیبت سے چھڑانے میں۔





ابراہیم  
۱۳

تَأَذِّنْ رَبُّكُمْ لِيْنَ شَكَرْتُمْ لَا زَيْدَ نَّكُمْ وَلِيْنَ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ  
لَشَدِيْدٌ ۝۴ وَقَالَ مُوسٰى اِنْ تَكْفُرُوْا اَنْتُمْ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا  
فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۵

اَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُوْدُ  
وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ط جَاۤءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ  
بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوا۟ اَيْدِيَهُمْ فِىۡۤ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْۤا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ

اور یاد کرو، جب تمہارے پروردگار نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر تم شکر کرو گے تو ضرور میں  
تم کو اور زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میری سزا بھی بڑی سخت ہے۔ اور موسیٰ  
نے (اس کے ساتھ) تنبیہ بھی کر دی کہ اگر تم ناشکری کرو اور زمین کے سارے لوگ بھی  
اسی طرح ناشکرے ہو جائیں تو خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے، اس لیے کہ اللہ بے نیاز اور  
اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔ ۱۲-۶-۸

تمہیں اُن لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں؟ قوم نوح، عاد و ثمود  
اور جو اُن کے بعد ہوئے ہیں، جنہیں خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اُن کے رسول اُن  
کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو اُنہوں نے اپنے ہاتھ اُن کے منہ میں دے

۱۱۔ اس وقت چونکہ یہود بھی در پردہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لیے سرگرم ہو چکے تھے،  
اس لیے یہ بات اللہ تعالیٰ نے انہیں براہ راست خطاب کر کے کہہ دی ہے۔

۱۲۔ یہ غالباً اُسی تقریر کا خلاصہ ہے جو بائبل کی کتاب استثنائیں بڑے شرح و بسط کے ساتھ نقل  
کی گئی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ تقریر اپنی وفات سے کچھ پہلے صحراے سینا میں بنی اسرائیل کے  
سامنے فرمائی تھی۔ اسے کتاب استثنائے ابواب ۴، ۶، ۸، ۱۰، ۱۱ اور ۲۸ تا ۳۰ میں دیکھا جاسکتا ہے۔



بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكِّ مِمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٌ ⑨ قَالَتْ رَسُولُهُمْ  
إِنِّي اللَّهُ شَكُّ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ  
ذُنُوبِكُمْ وَيُخْرِجَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ قَالُوا إِنَّ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا  
تُرِيدُونَ أَن تَصُدُّونَا عَمَّا كَانُ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَآتُونَا بِسُلْطٰنٍ

دیئے (کہ خاموش ہو جاؤ) اور کہہ دیا کہ جو تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے، ہم اُس کو  
نہیں مانتے اور جس چیز کی طرف تم ہم کو بلارہے ہو، اُس کے بارے میں ہم ایسے شک  
میں پڑ گئے ہیں جو سخت الجھن میں ڈال دینے والا ہے۔ اُن کے رسولوں نے کہا: کیا خدا  
کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا وجود میں لانے والا ہے؟ وہ تمہیں  
بلارہا ہے کہ تمہارے گناہوں میں سے معاف فرمائے (جو اس سے پہلے تم سے ہوئے  
ہیں) اور تم کو ایک مقرر مدت تک مہلت دے۔ اُنھوں نے جواب دیا: تم ہماری طرح  
کے ایک آدمی ہی ہو۔ تم چاہتے ہو کہ ہمیں اُن چیزوں کی بندگی سے روک دو جنہیں

۱۳ اصل الفاظ ہیں: 'فَرَدُّوْا اٰیْدِيْهِمْ فِیْٓ اَفْوَٰهِيْهِمْ'۔ جب کوئی شخص غصے اور نفرت سے  
کسی کو بات کرنے سے روکنا چاہتا ہے تو اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے کہ زبان بند کرو، اس کے  
بعد ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالو۔ یہ اسی صورت حال کی تعبیر ہے۔ لفظ 'رَدُّوْا' یہاں 'جعلوا' کے  
معنی میں ہے اور یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

۱۴ یہ سوال استعجاب کی نوعیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کو تو تم مانتے ہو۔ ہم جس چیز کی  
طرف تمہیں بلارہے ہیں، وہ اس کے سوا کیا ہے کہ بندگی کا مستحق بھی صرف وہی ہے۔ یہ تو خدا  
کو ماننے کا لازمی نتیجہ ہے۔ تم اسے نہیں مان رہے تو پھر کیا خدا کے بارے میں کسی شک میں پڑ  
گئے ہو؟





ابراہیم  
۱۳

مُبِينٌ ⑩ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ  
يَمُنُّ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ إِلَّا  
بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَعَلَىٰ اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ⑪ وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ  
عَلَىٰ اللَّهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا ۚ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَا آذَيْتُمُونَا ۖ وَعَلَىٰ  
اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ⑫ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّسُلُ هُمْ تَخْرِجُكُمْ  
مِّنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۚ فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ

ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں۔ (یہی بات ہے) تو ہمارے سامنے کوئی صریح سند  
لاؤ۔ اُن کے رسولوں نے اُن سے کہا: بے شک، ہم تمہاری ہی طرح کے آدمی ہیں،  
مگر اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے، فضل فرماتا ہے۔ یہ ہمارے اختیار میں  
نہیں ہے کہ اذن الہی کے بغیر ہم تمہیں کوئی سند لا دکھائیں۔ (سو تمہارا یہ مطالبہ اللہ  
کے حوالے ہے) اور ایمان والوں کو چاہیے کہ (اس طرح کے معاملات میں) اللہ ہی  
پر بھروسہ رکھیں۔ اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ رکھیں، جب کہ ہمارے ان راستوں کی ہدایت  
اُسی نے ہمیں بخشی ہے؟ تم جو اذیت بھی ہمیں دے رہے ہو، ہم اُس پر ہر حال میں صبر  
کریں گے اور (اللہ پر بھروسہ کریں گے، اس لیے کہ) بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر  
بھروسہ کرنا چاہیے۔ اس پر منکروں نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ ہم تم کو اپنی اس سرزمین  
سے لازماً نکال دیں گے یا تمہیں بالآخر ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔ تب اُن کے

۱۵ مطلب یہ ہے کہ اپنے معبودوں کے بارے میں ایسی سنگین بات ہم اپنے ہی جیسے ایک  
آدمی کی کس طرح مان سکتے ہیں؟ ہمیں کوئی معجزہ دکھاؤ جس کو دیکھ کر یقین آ جائے کہ تم فی الواقع  
خدا کے بھیجے ہوئے ہو۔



الظَّالِمِينَ ۝۱۳ وَلَنُصِيبَنَّكُمْ مِنَ الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ ۖ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ ۝۱۴

وَأَسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ۝۱۵ مِّنْ وَرَآئِهِ جَهَنَّمُ وَيُسْقَىٰ مِنْ مَّاءٍ صَدِيدٍ ۝۱۶ يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِغُهُ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۖ وَمِنْ وَرَآئِهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ ۝۱۷ مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ

پروردگار نے اُن کی طرف وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں اس ملک میں آباد کریں گے۔ یہ بشارت ہے اُن کے لیے جو میرے حضور (جواب دہی کے لیے) کھڑے ہونے سے ڈرے اور جو میری وعید سے ڈرے۔ ۹-۱۲

اُنھوں نے فیصلہ چاہا تھا، سو فیصلہ ہو گیا اور ہر سرکش ضدی نامراد ہوا۔ اب اُس کے آگے دوزخ ہے۔ وہاں اُس کو پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔ وہ اُس کو گھونٹ گھونٹ پیے گا اور گلے سے اتار نہ سکے گا۔ موت ہر طرف سے اُس پر پٹی پڑ رہی ہوگی، لیکن مرنے نہ پائے گا اور آگے ایک اور سخت عذاب اُس کا منتظر ہو گا۔ ۱۵-۱۷

جن لوگوں نے اپنے پروردگار سے کفر کیا ہے، اُن کے اعمال کی مثال اُس راکھ کی

۱۶ یہ اُنھوں نے اپنے گمان کے مطابق کہا ہے، اس لیے کہ دعوت سے پہلے وہ یہی سمجھتے تھے کہ رسول بھی اُسی مذہب پر ہیں جو اُنھوں نے اپنے لیے اختیار کر رکھا ہے۔

۱۷ رسولوں کے باب میں یہی خدا کی سنت ہے۔ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔





ابراہیم  
۱۳

الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ ۖ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَى شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ  
هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ۝ ۱۸ ۚ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ  
بِالْحَقِّ ۖ إِنَّ يَشَاءُ يُدْهِبُكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ۝ ۱۹ ۚ وَمَا  
ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ۝ ۲۰

وَبَرَزُوا لِلَّهِ جَمِيعًا فَقَالَ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا

سی ہے جس پر آندھی کے دن تند و تیز ہوا چل جائے۔ اُنھوں نے جو کچھ کیا ہوگا، اُس  
میں سے کچھ بھی نہ پاسکیں گے۔ یہی دور کی گم راہی ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے  
آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے؟ (یہ اُس کی دی ہوئی مہلت ہے کہ وہ  
تمھارے اس کفر و شرک کو گوارا کر رہا ہے)۔ وہ چاہے تو تمھیں لے جائے اور ایک نئی  
مخلوق (تمھاری جگہ) لے آئے۔ یہ اللہ پر کچھ بھی دشوار نہیں ہے۔ ۱۸-۲۰

(یہ مہلت بہت جلد ختم ہو جائے گی) اور سب خدا کے روبرو نکل کھڑے ہوں

۱۸ یعنی جانتے بوجھتے اُس کے شریک ٹھیرائے ہیں۔ شرک اپنی حقیقت کے لحاظ سے کفر ہی  
ہے، اس لیے کہ دین میں خدا کا صرف وہی ماننا تسلیم کیا جاتا ہے جو توحید پر پورے ایمان کے  
ساتھ ہو۔ چنانچہ آیت میں 'الَّذِينَ كَفَرُوا' سے مراد مشرکین قریش ہی ہیں جو سورہ کے مخاطب  
ہیں۔

۱۹ اس سے، ظاہر ہے کہ اُن کے وہ اعمال مراد ہیں جو اُنھوں نے اپنی طرف سے نیکی کے  
اعمال سمجھ کر کیے ہوں گے۔ قرآن نے یہ بات جگہ جگہ واضح کر دی ہے کہ شرک کے ساتھ کوئی عمل  
بھی خدا کے ہاں مقبول نہیں ہے۔

۲۰ یعنی ایسی گم راہی ہے جس سے لوٹ کر آنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا۔



لَكُمْ تَبَعًا فَمَا لَكُمْ تَبَعًا فَمَا لَكُمْ تَبَعًا فَمَا لَكُمْ تَبَعًا فَمَا لَكُمْ تَبَعًا  
لَوْ هَدَىَٰنَا اللَّهُ لَهَدَيْنَاكُمْ سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجْرُنَا أَمْ صَبْرُنَا  
مَا لَنَا مِنْ مَّحِيصٍ ۝۲۱

وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ  
وَوَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ  
دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنْفُسَكُمْ مَا  
أَنَا بِصَرِيحٍ وَمَا أَنْتُمْ بِمُصْرِحِينَ ۝۲۲

گے۔ پھر جو کمزور تھے وہ اُن سے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کہیں گے: ہم تمہارے  
پیچھے چلنے والے تھے تو کیا اللہ کے عذاب سے ہمیں کچھ بچا لو گے؟ وہ جواب دیں گے کہ  
اگر اللہ نے ہمیں راہ دکھائی ہوتی تو ہم بھی تمہیں راہ دکھاتے۔ اب ہمارے تمہارے  
لیے یکساں ہے کہ چنیں چلائیں یا صبر کریں، ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ ۲۱  
اور جب فیصلہ چکا دیا جائے گا تو شیطان کہے گا: حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے تم سے  
سچا وعدہ کیا تھا، (سو اُس نے وہ پورا کر دیا) اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا، مگر  
میں نے تمہارے ساتھ وعدہ خلافی کی اور میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں، میں نے اس  
کے سوا کچھ نہیں کیا کہ تمہیں دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اس لیے  
مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔ اب نہ میں تمہاری فریاد کو پہنچ سکتا

۲۱ مطلب یہ ہے کہ کسی کے لیے کوئی پردہ یا اوٹ باقی نہیں رہے گی، تمام سہارے ختم ہو جائیں  
گے اور لوگ تنہا اور بے یار و مددگار خدا کے حضور پیش ہو جائیں گے۔

۲۲ یعنی اس بات کی توفیق دی ہوتی کہ عقل سے کام لیتے اور دنیا ہی میں صحیح راستہ دیکھ لیتے۔





ابراہیم  
۱۳

مِنْ قَبْلُ إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۲۲  
وَادْخُلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرَى مِنْ  
تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۝۲۳  
أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ  
أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۝۲۴ تُوْتِي أُكْلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ  
رَبِّهَا ۝ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝۲۵

ہوں، نہ تم میری فریاد کو پہنچ سکتے ہو۔ تم نے جو مجھے شریک ٹھہرایا تھا، میں نے اُس  
کا پہلے ہی انکار کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی طرح کے ظالم ہیں جن کے لیے  
دردناک عذاب ہے۔ ۲۲۔

اس کے برخلاف جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ہیں، وہ ایسے  
باغوں میں داخل کیے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ اپنے پروردگار  
کے اذن سے وہاں ہمیشہ رہیں گے۔ اُن کا تحیہ اُن باغوں میں ایک دوسرے کے لیے  
سلام ہوگا۔ ۲۳۔

(یہ اس لیے کہ اُن کے علم و عمل کی بنیاد ایک کلمہ طیبہ<sup>۲۳</sup> ہے)۔ کیا تم نے دیکھا  
نہیں کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کی مثال کس طرح بیان فرمائی ہے؟ وہ ایک شجرہ طیبہ کے  
مانند ہے جس کی جڑیں زمین میں اتری ہوئی اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی  
ہیں۔ وہ اپنے پروردگار کے اذن سے اپنا پھل ہر فصل میں دیتا رہتا ہے۔<sup>۲۴</sup> (یہ کلمہ طیبہ

۲۳ یعنی کلمہ توحید اور اُس پر مبنی عقائد و نظریات۔



وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ  
فَوْقِ الْأَرْضِ مَالَهَا مِنْ قَرَارٍ ۝۲۶

کی مثال ہے) اور اللہ لوگوں کے لیے تمثیلیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ ۲۴-۲۵

اور اس کے مقابل میں کلمہ خبیثہ کی مثال ایک شجرہ خبیثہ کی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے، اُس کو کوئی ثبات نہ ہو۔ ۲۶

۲۴ اصل الفاظ ہیں: أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ۔ اس میں مقابل کے الفاظ عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گئے ہیں۔ انھیں کھول دیجیے تو گویا پورا جملہ یہ ہے: أَصْلُهَا ثَابِتٌ فِي الْأَرْضِ وَفَرْعُهَا عَالٍ فِي السَّمَاءِ۔

۲۵ یعنی سدا بہار ہے، اُس پر کبھی خزاں نہیں آتی۔

۲۶ یہ قریش کو متنبہ فرمایا ہے کہ وہ چیتیں اور سوچیں کہ اللہ تعالیٰ اس تمثیل کے ذریعے سے انھیں جن حقائق کی یاد دہانی کر رہا ہے، وہ کیا ہیں؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”کلمہ توحید کی تمثیل ایک ایسے درخت سے دے کر قرآن نے ایک حقیقت تو یہ واضح فرمائی کہ اس کی جڑیں انسانی فطرت کے اندر بھی گہری اتری ہوئی ہیں اور عند اللہ بھی یہ سب سے زیادہ قدر و قیمت رکھنے والی حقیقت ہے۔ گویا زمین و آسمان، میں جو مقام اس کو حاصل ہے، وہ کسی اور چیز کو حاصل نہیں۔

دوسری حقیقت یہ واضح فرمائی کہ اس کو انسانی فطرت کے اندر سے بھی برابر غذا اور قوت حاصل ہوتی رہتی ہے اور اوپر سے بھی برابر ترشحات اس پر نازل ہوتے رہتے ہیں جو اس کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھتے ہیں۔

تیسری حقیقت یہ واضح فرمائی کہ اس کی برکات ابدی اور دائمی ہیں۔ اس کا فیض ہمیشہ جاری



يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي  
الْآخِرَةِ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۖ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ۖ ﴿٢٤﴾

ایمان والوں کو اللہ اسی محکم بات سے دنیا اور آخرت، (دونوں) کی زندگی میں  
ثبات عطا فرمائے گا اور جو (اپنی جان پر) ظلم کرنے والے ہیں، اُن کو اللہ (منزل  
سے) بھٹکا دے گا۔ اللہ (اپنے علم و حکمت کے مطابق) جو چاہے، کر گزرتا ہے۔ ۲۷

رہتا ہے۔ جس کے سینے میں یہ نور موجود ہے، وہ ہمیشہ آسودہ اور شاد کام رہتا ہے۔“

(تدبر قرآن ۴/۳۲۵)

۲۷ یعنی کلمہ شرک اور اُس پر مبنی عقائد و نظریات۔

۲۸ یعنی ایسے درخت کی جو جھاڑ جھنکاڑ کی قسم کا ہے۔ اُس میں نہ پھل آتا ہے نہ پھول نکلتے  
ہیں۔ نہ اُس کے سایے میں بیٹھ سکتے ہیں نہ اپنے لیے کوئی غذا حاصل کر سکتے ہیں۔ استاذ امام کے  
الفاظ میں گویا ایک خود رو، خاردار، بدبودار، بے فیض و بے ثمر جھاڑی ہے جس کو ہاتھ لگائیے تو اُس  
کے کانٹے ہاتھوں کو زخمی کریں، چکھیے تو اُس کی تلخی سے زبان اینٹھ جائے، پاس بیٹھیے تو اُس کی بو سے  
قوت شامہ ماؤف ہو کے رہ جائے۔

۲۹ مطلب یہ ہے کہ کلمہ شرک کی کوئی بنیاد نہ عقل و فطرت کے اندر ہے نہ انبیاء علیہم السلام کی  
تعلیمات میں۔ یہ گویا ایک خود رو جھاڑی ہے جو زمین کے اوپر ہی اوپر ہے، نہ اس کی کوئی گہری جڑ  
ہے، نہ فضا کی بلندی نے اس کو قبول کیا ہے۔ اسے کوئی اکھاڑنا چاہے تو اوپر ہی سے اکھاڑ کر پھینک  
سکتا ہے۔

۳۰ یعنی کلمہ توحید سے۔

۳۱ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں وہ فکر و عمل کی ہر پریشانی اور سرگردانی سے محفوظ رہیں گے اور  
آخرت میں بغیر کسی حیرانی اور سراسیمگی کے ٹھیک اُس منزل پر پہنچ جائیں گے جس کے لیے سرگرم سفر



أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَآحَلُّوا قَوْمَهُمْ  
دَارَ الْبَوَارِ ۖ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۖ ۚ (۲۸) وَجَعَلُوا لِلَّهِ  
أَنْدَادًا لِّيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِهِ ۖ قُلْ تَتَّبِعُوا فَإِنْ مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ ۖ (۳۰)

تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جنہوں نے اللہ کی نعمت کے بدلے میں ناشکری کی  
اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر — جہنم — میں لا اتارا ہے؟ وہ اُس میں داخل  
ہوں گے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے! اُنہوں نے اللہ کے شریک ٹھیرائے تاکہ (لوگوں  
کو) اُس کے راستے سے بھٹکا دیں۔ اُن سے کہو، مزے کر لو، تمہارا ٹھکانا بالآخر دوزخ  
ہی کی طرف ہے۔ ۲۸-۳۰

رہے۔ اُن کے پائے استقلال میں یہاں اور وہاں کوئی لغزش نہیں آئے گی۔

۳۲ یعنی اُن کے کسی عمل کو نتیجہ خیز نہیں ہونے دے گا۔ اُن کی ہر سعی رائگاں جائے گی اور وہ  
بالکل نامراد ہو کر رہ جائیں گے۔ آیت میں لفظ 'ظَالِم' 'ظالم لنفسہ' کے معنی میں ہے۔ قرآن  
میں شرک کو اسی بنا پر 'ظُلْمٌ عَظِيمٌ' کہا گیا ہے۔ یہاں بھی 'ظَلَمِین' سے مراد وہی مشرکین قریش  
ہیں جو سورہ کے مخاطب ہیں۔

۳۳ یہ اسلوب خطاب یہاں اظہارِ تعجب اور ملامت کے لیے ہے اور مخاطبین قریش اور اُن  
کے لیڈر ہیں جو اپنی قوم کو دھکیل کر کفر و شرک کے گڑھے تک لے آئے تھے، جیسا کہ آگے بیان ہوا  
ہے۔

۳۴ اشارہ ہے اُس نعمت عظمیٰ کی طرف جو قریش کو اللہ کی عنایت اور ابراہیم علیہ السلام کی دعا  
کی برکت سے حاصل ہوئی اور وہ پورے عالم کے لیے توحید کے مرکز اور خدا کے حرم کی پاسبانی کے  
لیے چن لیے گئے۔





ابراہیم  
۱۳

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ  
سِرًّا وَعَلَانِيَةً مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعَ فِيهِ وَلَا خِلَالٍ ۝۳۱  
اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً  
فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفَلَكَ لِتَجْرِيَ  
فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ ۝۳۲ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ  
وَالْقَمَرَ دَائِبِينَ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝۳۳ وَأَتَكُم مِّن كُلِّ  
مَا سَأَلْتُمُوهُ ۖ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا ۗ إِنَّ الْإِنْسَانَ

(اے پیغمبر)، میرے جو بندے ایمان لے آئے ہیں، اُن سے کہہ دو کہ نماز کا  
اہتمام رکھیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو عطا فرمایا ہے، اُس میں سے کھلے اور چھپے (اللہ کی  
راہ میں) خرچ کریں، اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی  
اور نہ کوئی دوستی کام آئے گی۔ ۳۱۔

(یہ مشرکین دیکھتے نہیں کہ) اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور  
آسمان سے پانی اتارا، پھر اُس سے تمہاری روزی کے لیے طرح طرح کے پھل  
نکالے اور کشتی کو تمہارے کام میں لگا دیا کہ اُس کے حکم سے سمندر میں چلے اور اُس نے  
دریاؤں کو تمہارے کام میں لگایا اور سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگایا، دونوں برابر  
چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح دن اور رات کو بھی اُس نے تمہارے کام میں لگایا اور  
تمہیں ہر چیز میں سے، جو تم نے مانگی، عطا فرمایا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو نہیں

۳۵ مطلب یہ ہے کہ اپنی قوم کے لوگوں کا رویہ اختیار کرنے کے بجائے وہ نماز اور انفاق کا  
اہتمام کریں تاکہ وہی امانت اب اُن کے سپرد کر دی جائے جس میں اُن کے یہ بھائی خیانت کر



## لَظْلُومٌ كَفَّارٌ ﴿٣٢﴾

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ ﴿٣٥﴾ رَبِّ إِنَّهُمْ أَضَلُّونَ كَثِيرًا مِّنْ

گن سکتے۔ (اس پر بھی خدا کے شریک ٹھہراتے ہو)؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور بڑا ناشکرا ہے۔ ۳۲-۳۴

(یہ ابراہیم کی اولاد ہیں)۔ انھیں وہ واقعہ سناؤ، جب ابراہیم نے دعا کی تھی کہ میرے پروردگار، اس شہر کو امن کا شہر بنا اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے دور رکھ کہ ہم چکے ہیں۔

۳۶ یعنی ہر وہ چیز عطا فرمائی جس کا تقاضا تمھاری خلقت نے کیا اور جس چیز کی احتیاج تمھارے اندر رکھی، اُس کا جواب پوری مطابقت کے ساتھ فراہم کر دیا۔ اس سے یہ حقیقت بالکل مبرہن ہو گئی کہ جس نے بنایا ہے، وہی پروردگار بھی ہے اور تمھاری سب ضرورتوں کا اہتمام بھی اُسی نے فرمایا ہے۔ اس میں کوئی دوسرا کسی بھی درجے میں اُس کا شریک نہیں ہے۔

۳۷ آگے کی آیتوں سے واضح ہے کہ یہ دعا اُس وقت کی گئی، جب حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام اور اُن کی والدہ کو سرزمین مکہ میں لا کر بسایا ہے۔

۳۸ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی ذریت کو مکہ میں آباد کیا تو اُس وقت یہ شہر نہ صرف یہ کہ تہذیب و تمدن اور آبادی و زرخیزی سے بالکل محروم تھا، بلکہ وحشی اور خانہ بدوش قبیلوں کی لوٹ مار سے بھی محفوظ نہ تھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے اسی بنا پر یہ دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اُسے اس طرح قبول فرمایا کہ اولاً، اس سرزمین میں لڑنا بھڑنا اور جنگ و جدال یک قلم ممنوع قرار دیا۔ ثانیاً، اس کی طرف سفر کے لیے چار مہینے حرام قرار دیے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے گرد و پیش میں خطرناک سے خطرناک علاقے بھی ان مہینوں میں بالکل پر امن ہو گئے۔ ثالثاً، اس میں اپنے گھر کو ایسی





ابراہیم  
۱۳

النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۚ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝۳۶  
رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بُوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ  
رَبَّنَا لِيقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ  
وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ۝۳۷ رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ

بتوں کو پوجنے لگیں۔ پروردگار، ان بتوں نے بہت لوگوں کو گم راہی میں ڈال دیا ہے۔  
(یہ میری اولاد کو بھی گم راہ کر سکتے ہیں)، اس لیے جو (اُن میں سے) میری پیروی کرے،  
وہ تو میرا ہے اور جس نے میری بات نہیں مانی، اُس کا معاملہ تیرے حوالے ہے، پھر تو  
بخشنے والا ہے، تیری شفقت ابدی ہے۔ اے ہمارے پروردگار، میں نے اپنی کچھ اولاد  
کو تیرے حرمت والے گھر کے پاس ایک بن کھیتی کی وادی میں لا بسایا ہے۔ پروردگار،  
اس لیے کہ وہ اس گھر میں نماز کا اہتمام کریں۔ سو تو لوگوں کے دل اُن کی طرف مائل  
کردے اور انھیں پھلوں کی روزی عطا فرما، اس لیے کہ وہ (تیرا) شکر ادا کریں۔

ہیبت عطا فرمائی کہ اس پر باہر سے اول تو کسی نے حملہ آور ہونے کی جرأت ہی نہیں کی، لیکن اگر کبھی  
ایسا ہوا تو اس کے باشندوں کی اس طرح مدد کی کہ اُن کی معمولی مزاحمت پر آسمان سے اُن کے لیے  
اپنے جنود قاہرہ بھیج کر اُس کے دشمنوں کو بالکل پامال کر دیا۔

۳۹ اصل میں لفظ 'بَنِي' آیا ہے جس کے معنی بیٹوں کے ہیں، لیکن یہ علی سبیل التغلیب یہاں  
اولاد کے معنی میں آ گیا ہے۔

۴۰ اصل الفاظ ہیں: 'إِنَّهِنَّ أَضَلَّلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ'۔ اس میں چونکہ بتوں کی شدت تاثیر و  
تسخیر کا اظہار مقصود ہے، اس لیے ضمیریں اور افعال وہ آ گئے ہیں جو ذوی العقول کے لیے استعمال  
ہوتے ہیں۔



مَا تُخْفِي وَمَا تُعْلِنُ ۖ وَمَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۖ ۝۳۸ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ

پروردگار، تو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے، نہ زمین میں، نہ آسمان میں۔ خدا کا شکر ہے

۳۱ نماز خدا کے ساتھ ہمارے تعلق کا اولین ظہور ہے، باقی تمام چیزیں اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے یہاں اسی کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس حقیقت کو خوب جانتے تھے کہ اگر نماز اپنی صحیح روح کے ساتھ قائم رہے گی تو دین کی کوئی چیز بھی ضائع نہیں ہوگی، بلکہ یہی نماز ہر چیز کو قائم رکھنے کا ذریعہ بن جائے گی۔

۳۲ یہ دعا بھی اس طرح پوری ہوئی کہ حج و عمرہ کی وجہ سے لوگوں کا رجوع اس سرزمین کی طرف بہت بڑھ گیا۔ اس سے تجارت اور کاروبار کو فروغ ہوا۔ باہر سے ہر قسم کی چیزیں اس شہر کے بازاروں میں پہنچنے لگیں۔ پھر حرم کی تولیت کے باعث قریش کو ایسی عزت حاصل ہوئی کہ ان کے قافلے بغیر کسی تعرض کے دوسرے ملکوں کو جانے لگے۔ اس سے گلہ بانی اور شکار ہی پر گزر بسر کرنے والوں کی معیشت میں غیر معمولی تبدیلی آئی۔ چنانچہ ہر طرح کی اجناس اور پھل وغیرہ اس شہر میں فراوانی کے ساتھ میسر ہو گئے۔

۳۳ یہ فقرہ نہایت بلیغ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... اس فقرے کی بلاغت احاطہ بیان میں نہیں آسکتی۔ بندہ جب اپنے رب سے کسی اہم معاملے میں دعا کرتا ہے تو اس کو ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ بعض باتیں وہ کہنا تو چاہتا ہے، لیکن وہ بیان میں نہیں آتیں، اسی طرح بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو دل میں تو ہوتی ہیں، لیکن وہ ان کے کہنے میں کسی مبہم سبب سے کچھ حجاب سا محسوس کرتا ہے۔ اس فقرے نے اس طرح کی ساری باتوں کو سمیٹ لیا، اس لیے کہ خدا کا علم ظاہر و مخفی، سب کو محیط ہے۔“

(تذکرہ قرآن ۴/۳۳۴)





ابراہیم  
۱۲

وَاسْحَقْ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ ۝۳۹ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ ۝۴۰ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ۝۴۱

جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسمعیل اور اسحق عطا فرمائے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ میرا پروردگار دعا کا سننے والا ہے۔ پروردگار، مجھے نماز کا اہتمام کرنے والا بنا اور میری اولاد سے بھی، (جنہیں میں یہاں بسا رہا ہوں)۔ پروردگار، اور میری یہ دعا قبول فرما۔ پروردگار، تو مجھ کو بخش دے اور میرے والدین کو اور سب ایمان والوں کو بخش دے، اُس دن جب کہ حساب قائم ہوگا۔ ۳۵-۴۱

۳۴ یہ دعا کے حق میں اُن احسانات کا حوالہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے اُن پر کیے تھے۔ اس سے ضمناً یہ بات بھی پوری قطعیت کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیم نے اسمعیل علیہ السلام اور اُن کی والدہ کو اُن کی پیدائش کے بعد نہیں، بلکہ اُس وقت مکہ کی وادی غیر ذی زرع میں لا کر بسایا، جب اسمعیل علیہ السلام کے واقعہ قربانی کے بعد اسحق علیہ السلام بھی پیدا ہو چکے تھے اور اسمعیل اس قابل تھے کہ بیت اللہ کے خادم اور متولی کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکیں۔

۳۵ لفظ وَالدَّيْنِ بتا رہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس دعا میں اپنے والد — آزر — کو بھی شامل کیا ہے۔ یہ اُس وعدے کی بنا پر ہے جو انھوں نے ہجرت کے وقت باپ سے کیا تھا کہ سَأَسْتَغْفِرُكَ رَبِّي\*۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے روک دیا۔ یہ دعا ظاہر ہے کہ اس ممانعت سے پہلے کی ہے۔

\* مریم ۱۹: ۴۷۔ ”میں آپ کے لیے اب اپنے پروردگار سے بخشش کی دعا کروں گا۔“



وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ ۚ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ  
لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ ۚ مَهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ  
إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَأَفِدتُهُمْ هَوَاءً ۚ

وَأَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ ۚ فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا رَبَّنَا  
آخِرْنَا إِلَىٰ آجَلٍ قَرِيبٍ ۚ نَجِبْ دَعْوَتَكَ وَتَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۚ أَوَلَمْ تَكُونُوا

یہ ظالم جو کچھ کر رہے ہیں، تم خدا کو اُس سے ہرگز غافل نہ سمجھو، (اے پیغمبر)۔  
وہ انھیں صرف اُس دن کے لیے ٹال رہا ہے جس میں نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں  
گی۔ یہ سراٹھائے ہوئے بھاگ رہے ہوں گے، ان کی نظر (اٹھے گی تو) ان کی طرف  
پلٹ کر نہ آئے گی اور ان کے دل اڑے ہوئے ہوں گے۔ ۴۲-۴۳

تم ان لوگوں کو اُس دن سے خبردار کر دو، جس دن انھیں عذاب آ لے گا۔ اُس  
وقت یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے کہیں گے کہ اے ہمارے رب، ہمیں تھوڑی سی

۴۶۔ اس دعا میں لفظ رَبِّ 'یا رَبَّنَا' بار بار دہرایا گیا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یوں بظاہر تو یہ ایک تکراری محسوس ہوتی ہے، لیکن درحقیقت یہ چیز دعا کی خصوصیات، بلکہ

اُس کے لوازم میں سے ہے۔ دعا کا اصل مزاج تضرع، استمالت، استغاثہ اور التجا و فریاد ہے۔

یہ چیز مقتضی ہوتی ہے کہ جس سے دعا کی جارہی ہے، اُس کو بار بار متوجہ کیا جائے۔ جب بندہ

خدا کو رَبِّی سے خطاب کرتا ہے تو وہ گویا اُس لطف خاص کو اپنی دعا کے حق میں سفارشی بناتا

ہے جس کا تجربہ اُسے خود ہے اور جب اُس کو رَبَّنَا سے خطاب کرتا ہے تو وہ اُس کے اُس کرم عام

کو اپنی دعا کے حق میں سفارشی بناتا ہے جس کا مشاہدہ تمام خلق میں ہو رہا ہے۔“

(تذبرقرآن ۴/۳۳۴)



أَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلِ مَا لَكُم مِّنْ زَوَالٍ ۖ ۝۳۳ وَ سَكَنْتُمْ فِي مَسْكِنِ  
الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ وَ تَبَيَّنَ لَكُم كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ  
الْأَمْثَالَ ۝۳۴ وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ ۖ وَإِنْ  
كَانَ مَكْرُهُمْ لِيَتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ ۝۳۵

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفَ وَعْدِهِ رُسُلَهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ  
ذُو انْتِقَامٍ ۝۳۶ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَ السَّمَوَاتُ وَ بَرَزُوا  
لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝۳۷ وَ تَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي

مہلت اور دے دے، ہم تیری دعوت قبول کر لیں گے اور تیرے رسولوں کی پیروی کریں  
گے۔ کیا تم اس سے پہلے قسمیں نہیں کھاتے رہے تھے کہ تم (اپنی جگہ سے) ہٹنے  
والے نہیں ہو؟ تم انہی لوگوں کی بستیوں میں آباد تھے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم  
ڈھائے تھے اور تم پر کھل چکا تھا کہ ہم نے اُن کے ساتھ کیا معاملہ کیا اور ہم نے تمہارے  
لیے اُن کی مثالیں بیان کر دی تھیں۔ اُنہوں نے اپنی سب چالیں چل دیکھیں۔ اُن کی  
یہ چالیں اب اللہ کے پاس دھری ہیں، اگرچہ اُن کی چالیں ایسی تھیں کہ اُن سے پہاڑ  
بھی ٹل جائیں۔ ۴۴-۴۶

سو ہرگز خیال نہ کرو کہ اللہ اپنے رسولوں سے کیے ہوئے وعدوں کے خلاف کرے گا۔  
یقیناً اللہ زبردست ہے، وہ انتقام لینے والا ہے۔ اُس دن کو یاد رکھو، جب یہ زمین  
دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی اور سب (تنہا، بے یار و مددگار)  
اللہ واحد و قہار کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔ اُس دن تم مجرموں کو دیکھو گے کہ



الْأَصْفَادِ ۝ سَرَابِيلُهُمْ مِنْ قَطْرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهُهُمُ النَّارُ ۝  
 لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۖ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝  
 هَذَا بَلَاغٌ لِلنَّاسِ وَلِيُنذِرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَهُ وَاحِدٌ  
 وَلِيُنذَرَ كَرُّ أُولَئِكَ الْبَابِ ۝

### سورة الحجر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الرَّافِقِ ۚ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَقُرْآنٍ مُبِينٍ ① رَبِّمَا يُوذُّ الَّذِينَ

زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، اُن کے لباس تارکول کے ہیں اور اُن کے چہروں پر آگ چھائی ہوئی ہے۔ یہ اس لیے کہ اللہ ہر شخص کو اُس کی کمائی کا بدلہ دے۔ بے شک، اللہ جلد حساب چکا دینے والا ہے۔ یہ لوگوں کے لیے ایک اعلان ہے، اس لیے کہ اُن پر حجت پوری ہو جائے اور اس لیے کہ وہ اس کے ذریعے سے خبردار کر دیے جائیں اور اس لیے کہ وہ جان لیں کہ وہی ایک معبود ہے اور اس لیے کہ دانش مند (اس سے) یاد دہانی حاصل کر لیں۔ ۵۲-۴۷

— ۲ —

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔  
 یہ سورہ الرافق ہے۔ یہ کتاب الہی اور قرآن مبین کی آیتیں ہیں۔ وہ دن بھی آئیں

۴۷ اس نام کے معنی کیا ہیں؟ اس کے متعلق ہم اپنا نقطہ نظر سورہ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر چکے ہیں۔







الحجر  
۱۵

كَفَرُوا وَلَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ ۚ ذَرَهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِمُ الْأَمَلُ  
فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝ وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ  
مَعْلُومٌ ۝ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ۝  
وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ۝ لَوْ مَا  
تَأْتِينَا بِالْمَلَكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ مَا نُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ  
إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُنْظَرِينَ ۝ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ

گے، جب یہ منکرین تمنا کریں گے کہ کاش، ہم مسلمان ہوتے۔ انھیں چھوڑو، یہ کھائیں  
پیئیں، مزے کریں اور ان کی آرزوئیں انھیں بھلاوے میں ڈالے رکھیں۔ پھر یہ عنقریب  
جان لیں گے۔ (اس وقت ہم ان کو اس لیے نہیں پکڑ رہے کہ) ہم نے جس بستی کے  
لوگوں کو بھی ہلاک کیا ہے، اُس کے لیے ایک مقرر نوشتہ رہا ہے۔ کوئی قوم نہ اپنے مقرر  
وقت سے آگے بڑھتی ہے نہ پیچھے ہٹتی ہے۔ (انھیں بھی یہ مہلت اسی بنا پر دی گئی تو)  
اب یہ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس (کا خیال ہے کہ اُس) پر یہ ذکر اتارا گیا ہے، تم  
یقیناً دیوانے ہو۔ اگر تم سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے آتے؟ ہم

۳۸ اصل الفاظ ہیں: تِلْكَ آيَةُ الْكِتَابِ وَقُرْآنٍ مُبِينٍ۔ ان میں 'و' تفسیر کی ہے اور  
قرآن کی تنکیر تفعیم شان کے لیے ہے۔ لفظ 'مُبِين' استدلال کے محل میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ  
یہ کلام جو ان کو سنایا جا رہا ہے، یہ حقائق کو اس طرح مبرہن کر دینے والا ہے کہ اس کے بعد مزید کسی  
دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کا بیان ہی اس کی صداقت کی دلیل بن جاتا ہے۔

۳۹ یہ بات وہ طنز یہ انداز میں اور اس معنی میں کہتے تھے کہ تم ہمیں عذاب کی وعیدیں سناتے  
اور اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے فوز و فلاح کے دعوے کرتے ہو، یہ سب تمہارا خبط ہے اور اسی



لَحْفَظُونَ ⑨ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شَيْعِ الْأَوَّلِينَ ⑩ وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ⑪ كَذَلِكَ نَسْلُكُهُ

فرشتوں کو صرف فیصلے کے ساتھ اتارتے ہیں اور (جب وہ اتارے جائیں گے تو) اُس وقت انھیں مہلت نہیں دی جائے گی۔ (یہ قرآن کا مذاق اڑاتے ہیں۔ تم مطمئن رہو، اے پیغمبر)، اس میں شبہ نہیں کہ یہ ذکر خود ہم نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔ ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سے گزرے ہوئے گروہوں میں اپنے رسول بھیجے تھے۔ اُن

خطبہ میں تم اس طرح کی باتیں بھی کرنے لگے ہو کہ تم پر وحی آتی ہے اور فرشتے اترتے ہیں۔

۵۰۔ یعنی اُس وقت اتارتے ہیں، جب کسی قوم کا فیصلہ چکا دینے کا ارادہ کر لیا جاتا ہے۔ اُس وقت صرف فیصلہ چکایا جاتا ہے، یہ مہلت نہیں دی جاتی کہ فرشتوں کو دیکھ رہے ہو تو اب ایمان لے آؤ۔

۵۱۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی یاد دہانی کے لیے یہ قرآن تم اپنی طرف سے تصنیف کر کے نہیں لائے ہو۔ یہ ہم نے اتارا ہے اور تمھاری طرف سے بغیر کسی تمنا اور طلب کے اتارا ہے، اس لیے اس کی حفاظت بھی ہم ہی کریں گے۔ یہ اس کو یا اس کی دعوت کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ قرآن کے بارے میں یہ اُسی طرح کا وعدہ ہے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا ہے کہ "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ"۔ یہ وعدہ حرف بہ حرف پورا ہوا اور قرآن کے خلاف اُس کے دشمنوں کی تمام تدبیریں ناکام ہو گئیں۔ وہ نہ کسی کے مٹائے مٹ سکا، نہ دبائے دب سکا، نہ اُس کی قدر و منزلت میں کوئی کمی آئی، نہ اُس کی دعوت میں کوئی رکاوٹ ڈالی جاسکی اور نہ اُس میں تحریف اور رد و بدل کرنے کی کوئی کوشش کبھی کامیاب ہو سکی۔ وہ جس طرح دیا گیا، ٹھیک اُسی طرح دنیا کو منتقل ہو گیا۔ یہاں تک کہ اب اُس کے خلاف کچھ کرنا کسی کے لیے ممکن ہی نہیں رہا۔

\* المائدہ ۵: ۶۷۔ "اللّٰهُ اِنْ لَوْكُلُوْنَ سَعَتِمْ حَفَظْتَ كَرَّهَ"۔





الحجر  
۱۵

فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ۝ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ ۝  
وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ۝ لَقَالُوا إِنَّمَا  
سُكْرَتِ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ ۝  
وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ۝  
وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ۝ إِلَّا مَن اسْتَرَقَ السَّمْعَ  
فَاتَّبَعَهُ شَهَابٌ مُّبِينٌ ۝

کے پاس بھی جو رسول آیا، وہ اُس کا مذاق ہی اڑاتے رہے۔ ہم اپنی اس یاد دہانی کو  
اس طرح کے مجرموں کے دل میں اسی طرح (تیر و نشتر بنا کر) اتارتے ہیں۔ یہ اس پر  
ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ان کے اگلوں سے یہی طریقہ چلا آ رہا ہے۔ ہم ان پر  
آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے جس میں یہ چڑھنے لگتے، تب بھی یہی کہتے کہ یہ تو  
ہماری آنکھیں خیرہ کر دی گئی ہیں، بلکہ ہم سب لوگوں پر جادو کر دیا گیا ہے۔ ۱-۱۵

(یہ دیکھیں تو سہی)، ہم نے آسمان میں مضبوط قلعے بنائے ہیں اور اُس کو دیکھنے  
والوں کے لیے رونق دی ہے اور ہر شیطان مردود<sup>۵۳</sup> (کی دراندازی) سے اُس کو محفوظ کر  
دیا ہے، الا یہ کہ کوئی چوری چھپے کان لگا کر سننے کی کوشش کرے۔ سو اس پر ایک روشن

۵۲ اس سے مراد وہ آسمانی قلعے ہیں جن میں خدا کے ملائکہ اور کروبیوں کی فوجیں اُن  
سرحدوں کی حفاظت کے لیے ہمہ وقت مامور رہتی ہیں جن سے آگے کسی جن یا انسان کو بڑھنے کی  
اجازت نہیں ہے۔

۵۳ اصل میں لفظ رَجِيم آیا ہے۔ شیطان کے لیے یہ صفت اُس سنگ باری کا ہدف بن  
جانے کی رعایت سے آئی ہے جس کا ذکر آگے ہوا ہے۔



وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ ۝۱۹ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرِزْقَيْنَ ۝۲۰ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنْزِلُ لَهُ

شعلہ اُس کا تعاقب کرتا ہے۔ ۱۶-۱۸

ہم نے زمین کو پھیلایا، (اُس کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے) اُس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے، ہر قسم کی چیزیں ایک تناسب کے ساتھ اُس میں اگا دیں اور اُس میں تمہاری معیشت کے اسباب بھی فراہم کر دیے اور اُن کی معیشت کے بھی جنہیں تم روزی دینے والے نہیں ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے خزانے ہمارے

۵۴ اس سے غالباً وہی شعلے مراد ہیں جنہیں ہم اپنی اصطلاح میں شہاب ثاقب کہتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ تم پیغمبر سے معجزے مانگتے ہو۔ رات کو کبھی کھلے میدان میں کھڑے ہو کر آسمان پر نظر ڈالو، اُس کی وسعتوں میں چمکتے ہوئے تارے اور اُن سے ٹوٹتے ہوئے شہاب تمہارے سامنے خدا کی عظمت اور اُس کے جلال و جمال کا ایسا منظر پیش کریں گے کہ حیران و ششدر ہو کر رہ جاؤ گے اور بے اختیار پکاراٹھو گے کہ رَبَّنَا، مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا\*۔ اس سے ضمناً یہ بات بھی واضح ہوئی کہ خدا کی بات صرف اُس کے ملائکہ لاسکتے ہیں، اُسے کوئی جن یا انسان زمین سے صعود کر کے اور ملاء اعلیٰ کے حدود میں داخل ہو کر اپنے طور پر حاصل نہیں کر سکتا۔ جو کاہن، جوگی، عامل اور صوفی اس کے دعوے کرتے ہیں، وہ سب فریب نفس میں مبتلا ہیں۔ اُن کے علوم اور ذرائع، سب زمینی ہیں اور اُن کی مدد سے وہ اتنا ہی جان سکتے ہیں، جتنا زمین کے حدود میں پہنچا دیا گیا ہے۔

۵۵ اصل الفاظ ہیں: 'وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرِزْقَيْنَ'۔ ان میں حرف جر کو عربیت کے قاعدے سے ایک جگہ حذف کر دیا ہے۔ چنانچہ 'مَنْ لَسْتُمْ' درحقیقت 'وَلَمَنْ لَسْتُمْ' ہے۔ ہم نے ترجمہ

\* آل عمران ۱۹۱:۳۔ ”پروردگار، تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا ہے۔“





إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ۝۲۱

وَأَرْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ  
وَمَا أَنْتُمْ لَهُ بِخَزِينِينَ ۝۲۲

وَأَنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ ۝۲۳ وَلَقَدْ عَلِمْنَا  
الْمُتَّقِدِ مِيزَانَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ۝۲۴ وَإِنَّ

پاس نہ ہوں، لیکن اُس کو ہم ایک معین اندازے ہی سے اتارتے ہیں۔ ۱۹-۲۱

ہم ہی ہواؤں کو بار آور بنا کر چلاتے ہیں۔ پھر آسمان سے پانی برساتے ہیں اور  
تمہیں اُس سے سیراب کر دیتے ہیں۔ تم اُس کے یہ ذخیرے جمع کر کے نہیں رکھ سکتے  
تھے۔ ۲۲

(چنانچہ) کچھ شک نہیں کہ ہم ہی زندہ کرتے اور ہم ہی مارتے ہیں اور سب کے  
وارث بھی ہم ہی ہیں۔ ہم اُن کو بھی جانتے ہیں جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور اُن کو  
اسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۵۶ یہاں اور اس سے پہلے اندازے اور تناسب کے ذکر سے جس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود  
ہے، وہ یہ ہے کہ خدا کے خزانوں میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے، لیکن وہ اُن میں سے اتنا ہی اتارتا ہے،  
جتنا زمین پر انسان کے قیام و بقا اور آرام و راحت کے لیے ضروری ہے۔ وہ علیم و حکیم ہے اور  
خوب جانتا ہے کہ اگر کوئی ایک چیز بھی حد مطلوب سے تجاوز کر جائے تو پورا نظام عالم درہم برہم  
ہو جائے گا۔

۷۷ یعنی ہم ہی باقی رہ جائیں گے اور سب کو آنا بھی ہمارے پاس ہی ہے۔ اگر کسی نے کسی  
اور سے کوئی امید باندھ رکھی تو اس وہم سے نکل آئے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔



رَبُّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥﴾

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ ﴿٢٦﴾  
وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُومِ ﴿٢٧﴾ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ  
لِلْمَلَكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ ﴿٢٨﴾

بھی جانتے ہیں جو بعد میں آنے والے ہیں۔ یقیناً تمہارا پروردگار ہی ہے جو (ایک دن) ان سب کو اکٹھا کر لے گا۔ اس لیے کہ وہ حکیم و علیم ہے۔ ۲۵-۲۳

(یہ ابلیس کے فریب میں آئے ہوئے لوگ ہیں۔ انہیں یاد دلاؤ)، ہم نے انسان کو سڑے ہوئے گارے کی کھنکھاتی مٹی سے بنایا تھا اور اس سے پہلے جنوں کو لو کی لپٹ سے پیدا کیا تھا۔ اور یاد دلاؤ، جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں

۵۸ مطلب یہ ہے کہ حکیم ہے، اس لیے لازماً ایک روز جزا لائے گا اور علیم بھی ہے، اس لیے نہ اُس سے کوئی چھپ سکتا ہے اور نہ وہ کسی کے عمل سے بے خبر ہے۔

۵۹ یہ آگے کی بات کے لیے تمہید ہے اور ابلیس و آدم کی بنائے مخاصمت کو واضح کرنے کے لیے بیان کی گئی ہے۔ اس سے ان مخلوقات کے عناصر خلقت کا سراغ دینا مقصود نہیں ہے۔ تاہم اتنی بات اس سے یقیناً واضح ہو جاتی ہے کہ انسانوں سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جنوں کو لو کی لپٹ سے پیدا کیا۔ پھر انسان کو مٹی سے بنانے کا فیصلہ کیا تو اُس کا حیوانی وجود بالکل اُسی طرح زمین کے پیٹ میں تخلیق فرمایا، جس طرح وہ اب ماں کے پیٹ میں تخلیق کیا جاتا ہے۔ قرآن کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی صورت غالباً یہ ہوئی کہ دریاؤں اور سمندروں کے کنارے کی کچھڑ میں کسی جگہ نطفہ کے قسم کی کوئی چیز پیدا ہوئی جس کے اوپر کی کچھڑ خشک ہو کر بیضے کی شکل اختیار کر گئی۔ قرآن نے اسی کو کھنکھاتی مٹی سے تعبیر کیا ہے۔ تخلیق کے مختلف مراحل سے گزر کر انسان اُس بیضے سے اُسی طرح نمودار ہو گیا، جس طرح انڈوں سے بچے نکلتے ہیں۔ تمام جان دار پہلے





فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ﴿٢٩﴾  
فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ ﴿٣٠﴾ إِلَّا إِبْلِيسَ طُ أَبَى أَنْ يَكُونَ

سڑے ہوئے گارے کی کھنکھاتی مٹی سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔ سو جب میں اُس کو ہر لحاظ سے درست کر لوں اور اُس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو تم سب اُس کے آگے سجدہ ریز ہو جانا۔ پھر (ہوا یہ کہ) تمام فرشتے سجدے میں گر پڑے (اور

مرحلے میں غالباً اسی طریقے سے پیدا کیے گئے۔ پھر اُن کا تسویہ ہوا اور اُن میں اپنی نسل آپ پیدا کر لینے کی صلاحیت ودیعت کر دی گئی۔ قرآن مجید میں اُنْشَأَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ\* اور اُنْبَتَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا\*\* کی تعبیرات اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

۶۰ یہ امور متشابہات میں سے ہے جن کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تاہم اتنی بات واضح ہے کہ یہی وہ لطیف پھونک ہے جس سے انسان کے حیوانی وجود میں وہ چیز داخل ہوئی جسے انسان کہا جاتا ہے۔ ماں کے پیٹ میں بھی یہ اسی مرحلے میں پھونکی جاتی ہے۔ اس سے پہلے انسان، انسان نہیں ہوتا، صرف ایک حیوان ہوتا ہے جو تخلیق کے مختلف مراحل سے گزر کر انسانی شخصیت کے لیے ایک ایسا قالب بن جاتا ہے کہ اب اُس میں یہ روح پھونک دی جائے۔

۶۱ یہ حکم امتحان کے لیے دیا گیا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ آدم پر واضح ہو جائے کہ اصلی سرفرازی نور یا نار سے پیدا ہونے میں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں ہے۔ ۶۲ آگے اِلَّا اِبْلِيسَ کے الفاظ ہیں۔ قرآن میں صراحت ہے کہ ابلیس جنات میں سے تھا۔ اس سے آپ سے آپ واضح ہوا کہ جنات چونکہ اپنی خلقت کے لحاظ سے فرشتوں سے زیادہ دور نہیں ہیں، اس لیے انھیں جب سجدے کا حکم دیا گیا تو علیٰ سبیل التغلیب جنات بھی اس حکم میں

\* ہود ۱۱:۶۱۔ النجم ۵۳:۳۲۔ ”اُس نے تمھیں زمین سے پیدا کیا۔“

\*\* نوح ۷:۱۷۔ ”اللہ ہی نے تمھیں خاص اہتمام کے ساتھ زمین سے اگایا۔“



مَعَ السَّجِدِينَ ۝۳۱ قَالَ يَا ابْلِيسُ مَا لَكَ لَا تَكُونُ مَعَ السَّجِدِينَ ۝۳۲  
 قَالَ لَمْ أَكُنْ لَأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمِإٍ مَسْنُونٍ ۝۳۳  
 قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ۝۳۴ وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَى يَوْمِ  
 الدِّينِ ۝۳۵ قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمٍ يُبْعَثُونَ ۝۳۶ قَالَ فَإِنَّكَ  
 مِنَ الْمُنْظَرِينَ ۝۳۷ إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ۝۳۸ قَالَ رَبِّ بِمَا

جنات بھی ۶۲)، ابلیس کے سوا۔ اُس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔  
 خدا نے پوچھا: اے ابلیس، تیرا کیا معاملہ ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوا؟  
 اُس نے جواب دیا: میں وہ نہیں ہوں کہ ایک ایسے بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑے  
 ہوئے گارے کی کھنکھاتی مٹی سے پیدا کیا ہے۔ فرمایا: (یہ بات ہے) تو یہاں سے ۶۳  
 نکل جا، اس لیے کہ تو راندہ درگاہ ہے اور تجھ پر روز جزا تک لعنت ہے۔ اُس نے عرض  
 کیا: پروردگار، پھر مجھے اُس دن تک کے لیے مہلت دے دے، جب لوگ اٹھائے  
 جائیں گے۔ فرمایا: اچھا، تو بھی اُنھی میں سے ہے جنہیں اُس مقرر وقت کے دن تک کے

شامل تھے۔ یہ بات چونکہ 'إِلَّا ابْلِيسَ' کے استثناء سے واضح ہو جاتی ہے، اس لیے قرآن نے اسے  
 الفاظ میں بیان نہیں کیا۔

۶۳ انسان جب علم، دولت، حسن یا اقتدار میں اپنے آپ کو دوسروں سے برتر دیکھتا ہے تو  
 ابلیس کا یہی استدلال ہے جو اُسے حق کے مقابل میں اکڑنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اپنی خلقت کے  
 لحاظ سے فرشتے جنات سے بھی برتر تھے، مگر انھوں نے یہ احمقانہ استدلال نہیں کیا، بلکہ سجدے کے  
 حکم کو خدا کا امتحان سمجھا اور بغیر کسی تردد کے امتثال امر کے لیے تیار ہو گئے۔

۶۴ یعنی آسمان سے، جہاں ابلیس بھی فرشتوں کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں حاضر تھا۔ عربی







أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَا أُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝<sup>۳۹</sup>  
الْأَعْبَادَ كَمَنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ ۝<sup>۴۰</sup> قَالَ هَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ ۝<sup>۴۱</sup>  
إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ ۝<sup>۴۲</sup>

لیے مہلت دی گئی ہے۔ اُس نے کہا: پروردگار، جیسا تو نے مجھے گم راہ کیا ہے، اُسی طرح اب میں بھی ان کے لیے زمین میں دل فریاں پیدا کروں گا اور ان میں سے تیرے منتخب بندوں کے سوا سب کو گم راہ کر کے چھوڑوں گا۔ فرمایا: یہ (بندگی کا راستہ) ایک سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والا ہے۔ میرے بندوں پر تیرا ہرگز کوئی زور نہیں

زبان میں آسمان کے لیے السَّمَاءُ کا لفظ ہے۔ آیت میں 'ہا' کی ضمیر اسی کے لیے آئی ہے۔  
۶۵ آیت میں اس کے لیے بِمَآءُ غَوَيْتَنِي کے الفاظ آئے ہیں۔ ابلیس نے یہ بات کیوں کہی؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”إِغْوَا“ کے معنی گم راہ کرنے کے ہیں۔ چونکہ ابلیس آدم کو سجدہ نہ کرنے کے معاملے میں اپنے آپ کو بجانب حق خیال کرتا تھا، اس وجہ سے اُس نے نہایت گستاخانہ انداز میں فعل 'إِغْوَا' کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کیا۔ مطلب یہ کہ اگر میں اس حکم کی عدم تعمیل کے باعث سے گم راہ ٹھیرا تو اس میں میرا قصور نہیں ہے، بلکہ یہ حکم ہی ایسا تھا کہ میں اس کی تعمیل نہیں کر سکتا تھا۔ اس وجہ سے اگر میں اس کے سبب سے گم راہ ہوا تو اس پر تو نے ہی مجھے مجبور کیا۔“  
(تذبر قرآن ۳۵۹/۴)

۶۶ اصل الفاظ ہیں: 'هَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ'۔ ان میں 'صِرَاطٌ' کے بعد 'عَلَيَّ' عربیت کے خاص اسلوب کے مطابق آیا ہے۔ قرآن اور کلام عرب، دونوں کے شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں یہ اسلوب اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب کسی راستے کے بارے میں یہ بتانا مقصود ہو کہ وہ ایسا سیدھا ہے کہ اپنے رہروں کو خود منزل پر لا ڈالتا ہے۔



وَأَنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٢٣﴾ لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِّكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُومٌ ﴿٢٤﴾ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿٢٥﴾ أَذْخُلُوهَا بِسَلَامٍ أَمِينٍ ﴿٢٦﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غَلٍ

چلے گا۔ تیرا زور صرف اُنھی پر چلے گا جو بہکے ہوئے لوگوں میں سے تیری پیروی کریں گے اور ان سب کے لیے جہنم کا وعدہ ہے۔ اُس کے سات دروازے ہیں۔ ہر دروازے کے لیے اُن میں سے ایک حصہ خاص کر دیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف جو خدا سے ڈرنے والے ہیں، وہ باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ اُن سے کہا جائے گا: ان میں سلامتی کے ساتھ بے خوف ہو کر رہو۔ اُن کے سینوں کی کدورتیں جو کچھ رہی ہوں

۶۷۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ شیطان اُنھی کو گم راہ کر سکتا ہے جو خود گم راہ ہونا چاہتے ہوں۔ اللہ کے جو بندے گم راہی سے بچنے کا ارادہ کر لیں اور سیدھی راہ کے سچے طالب بن کر زندگی بسر کریں، اُن پر اُس کی ترغیبات کبھی اس درجے میں اثر انداز نہیں ہوتیں کہ وہ کسی ایسی گم راہی میں پڑ جائیں جو باعث ہلاکت ہو۔

۶۸۔ اصل الفاظ ہیں: إِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ۔ ان میں زور لفظ أَجْمَعِينَ پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ ابلیس کے قول لَأَغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ کے جواب میں استعمال فرمایا ہے۔ اُس نے بڑے طنطنے کے ساتھ دعویٰ کیا کہ میں سب کو گم راہ کر کے چھوڑ دوں گا۔ اُس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اُسی زور کے ساتھ فرمایا کہ پھر میں بھی اُن سب کو جہنم رسید کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔

۶۹۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ایسی جہنم کہاں سے مہیا ہوگی جو اتنے سب لوگوں کو اپنے اندر سمیٹ لے؟ اس طرح کے مجرموں کے لیے جو جہنم تیار کی گئی ہے، وہ ایسی وسیع ہے کہ اُس کے سات دروازے ہوں گے جن سے جہنمیوں کے گروہ اُن کے جرائم کے لحاظ سے الگ







إِخْوَانًا عَلَى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿٢٧﴾ لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ  
مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ ﴿٢٨﴾

نَبِيِّ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿٢٩﴾ وَأَنَّ عَذَابِي  
هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ﴿٣٠﴾ وَنَبِّئُهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ﴿٣١﴾ إِذْ  
دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ ﴿٣٢﴾ قَالُوا

گی، ہم نکال دیں گے۔ وہ آمنے سامنے تختوں پر بھائی بھائی کی طرح بیٹھے ہوں گے۔  
انہیں وہاں نہ کوئی تکان لاحق ہوگی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔ ۲۶-۲۸  
(اے پیغمبر)، میرے بندوں کو بتاؤ کہ یہ میں ہوں کہ بڑا ہی بخشنے والا ہوں، میری  
شفقت ابدی ہے۔ اور یہ بھی کہ میرا عذاب ہی بڑا دردناک عذاب ہے۔ (یہ فرشتوں  
کو دکھانے کا مطالبہ کرتے ہیں)، انہیں (یہ حقیقت سمجھانے کے لیے) ابراہیم کے  
مہمانوں کا قصہ سناؤ۔ جب وہ اُس کے پاس آئے تو انہوں نے کہا: تم پر سلام ہو۔  
ابراہیم نے (اُن کے رویے میں کچھ اجنبیت دیکھی تو) کہا: ہمیں تم لوگوں سے اندیشہ  
الگ داخل کیے جائیں گے۔ قرآن نے جن چیزوں کو اصلی مہلکات قرار دیا ہے، وہ اگر شمار کی  
جائیں تو سات عنوانات کے تحت آ جاتی ہیں\*۔ شیطان اُنھی میں سے کسی ایک یا سب میں مبتلا  
کر کے لوگوں کو جہنم کے راستے پر ڈالتا ہے۔ یہ درجہ بندی غالباً اُنھی مہلکات کے لحاظ سے ہوگی۔  
• یہ کس درجے کی نعمت ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... بہتر سے بہتر عیش و آرام کی زندگی بھی کسی کو حاصل ہو، لیکن اُس میں تجدد و تنوع نہ ہو  
تو آدمی مجھ کے رہ جاتا ہے۔ جنت میں اہل جنت کو اس صورت حال سے سابقہ پیش نہیں آئے  
گا۔ اُس میں ابدی عیش و آرام کی زندگی بھی ہوگی اور ہر لمحہ خدا کی نعمتوں میں ایسی گونا گونی و بوقلمونی

\* بنی اسرائیل ۱۷: ۲۲-۳۹۔



لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ﴿٥٣﴾ قَالَ أَبَشِّرْهُمُونِي عَلَىٰ أَنْ  
مَسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُونِ ﴿٥٤﴾ قَالُوا بِبَشْرِكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ  
مِنَ الْقَانِطِينَ ﴿٥٥﴾ قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ ﴿٥٦﴾  
قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿٥٧﴾ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ

محسوس ہو رہا ہے۔ وہ بولے: اندیشہ نہ کرو، ہم تمہیں ایک ذی علم لڑکے کی بشارت  
دے رہے ہیں۔ ابراہیم نے کہا: کیا تم مجھے بشارت دے رہے ہو، جب کہ مجھ پر بڑھاپا  
آچکا ہے؟ سواب کس چیز کی بشارت دیتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: ہم نے تمہیں  
برحق بشارت دی ہے، اس لیے مایوس نہ ہو۔ ابراہیم نے کہا: اپنے پروردگار کی رحمت  
سے گم راہوں کے سوا کون مایوس ہو سکتا ہے! ۴۹-۵۶

ابراہیم نے پوچھا: اے فرستادو، پھر اب تمہاری مہم کیا ہے؟ انھوں نے جواب

بھی ہوگی کہ اہل جنت کی طبیعت کبھی اُس سے اچاٹ نہیں ہوگی۔“ (تدبر قرآن ۴/۳۶۲)  
۱۔ یعنی یہ حقیقت کہ میں بڑا مہربان ہوں، لیکن اُس کے ساتھ بڑا ہی منتقم اور قہار بھی ہوں۔  
اس لیے یہ مطالبہ کر رہے ہو تو اس بات پر بھی غور کر لو کہ اگر فرشتے آئے تو وہ تمہارے لیے کوئی  
بشارت لے کر آئیں گے یا صاعقہ عذاب بن کر تمہاری بستیوں پر ٹوٹ پڑیں گے؟  
۲۔ ابراہیم علیہ السلام کے اس ارشاد سے واضح ہے کہ وہ یہ بات سمجھ گئے تھے کہ فرشتوں کا  
اس طرح علانیہ آنا خطرے سے خالی نہیں ہے، یہ لازماً کسی مہم کے لیے آئے ہیں۔ سورہ ہود میں  
اس واقعے کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے فرشتہ ہونے کا گمان اُنھیں اُس وقت ہوا،  
جب انھوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

۳۔ یہ اس بات کی طرف لطیف اشارہ تھا کہ وہ لڑکا علم نبوت سے بھی سرفراز ہوگا۔

۴۔ ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہایت خوب صورت پیرائے میں اس بات کی تصدیق چاہی





قَوْمٌ مُّجْرِمِينَ ﴿٥٨﴾ إِلَّا آلَ لُوطٍ إِنَّا لَمُنَجُّوهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٥٩﴾  
إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَرْنَا ۚ إِنَّا لَمِنَ الْغَابِرِينَ ﴿٦٠﴾

دیا: ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ صرف لوط کے لوگ مستثنیٰ ہیں۔ اُن سب کو ہم لازماً بچالیں گے، اُس کی بیوی کے سوا۔ ہم نے ٹھیرا لیا ہے کہ وہ اُنھی میں ہوگی جو پیچھے رہ جائیں گے۔ ۵۷-۶۰

ہے کہ تم جو بشارت مجھے دے رہے ہو، کیا یہ فی الواقع اُسی پروردگار کی طرف سے ہے جو بڑھاپے میں بھی اولاد دے سکتا ہے؟

۵۷ یہ سوال بتا رہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دل کی کھٹک دور نہیں ہوئی اور اپنے لیے بشارت کے باوجود اُنھیں اندیشہ رہا کہ فرشتوں کی یہ پوری جماعت ضرور کسی دوسرے مقصد سے آئی ہے۔ وہ قوم لوط کے حالات سے واقف تھے، اس لیے ممکن ہے کہ اُنھی کے بارے میں خیال کر رہے ہوں کہ یہ بجلی کہیں اسی خرمن فساد پر تو گرنے والی نہیں ہے۔

۶۰ یہ صراحت اس لیے ضروری تھی کہ حضرت ابراہیم کم سے کم لوط اور اُن کے پیروں کے بارے میں مطمئن ہو جائیں کہ وہ اس عذاب کی زد میں نہیں آئیں گے۔ لوط علیہ السلام کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے۔ اُن کی قوم اُس علاقے میں رہتی تھی جو شام کے جنوب میں عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے اور آج کل شرق اردن کہلاتا ہے۔ بائبل میں اُن کے سب سے بڑے شہر کا نام سدوم بتایا گیا ہے۔ لوط علیہ السلام کا تعلق اُس قوم کے ساتھ وہی تھا جو حضرت موسیٰ کا قوم فرعون کے ساتھ تھا۔ اُن کی بیوی کا ذکر یہاں اور بعض دوسرے مقامات پر جس اسلوب میں ہوا ہے، اُس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اُن کی شادی اُسی قوم کے اندر ہوئی تھی اور اس لحاظ سے وہ اُنھی کے ایک فرد بن چکے تھے۔

۶۱ یعنی اگرچہ پیغمبر کی بیوی ہے، لیکن خدا کا قانون بے لاگ ہے، وہ اُسے بھی نہیں



فَلَمَّا جَاءَ آلَ لُوطٍ الْمُرْسَلُونَ ۖ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُونَ ۝۶۲  
 قَالُوا بَلْ جِئْنَاكَ بِمَا كَانُوا فِيهِ يَمْتَرُونَ ۝۶۳ وَآتَيْنَاكَ بِالْحَقِّ  
 وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝۶۴ فَاسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَاتَّبِعْ أَدْبَارَهُمْ  
 وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ وَامْضُوا حَيْثُ تُؤْمَرُونَ ۝۶۵ وَقَضَيْنَا

پھر جب یہ فرستادے لوط کے لوگوں کے پاس پہنچے تو اُس نے کہا: تم کچھ اجنبی سے  
 لوگ معلوم ہوتے ہو؟ اُنھوں نے جواب دیا: نہیں، بلکہ ہم تمھارے پاس وہی چیز  
 لے کر آ گئے ہیں جس میں یہ شک کر رہے تھے۔ ہم تمھارے پاس ایک قطعی حکم لے کر  
 آئے ہیں اور ہم بالکل سچے ہیں۔ لہذا اب تم کچھ رات رہے اپنے گھر والوں کے  
 ساتھ یہاں سے نکل جاؤ اور تم اُن کے پیچھے پیچھے چلنا اور تم میں سے کوئی پلٹ کر نہ

چھوڑے گا۔ آیت میں اس کے لیے لفظ قَدَرْنَا آیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...لفظ قَدَرْنَا کے صحیح مفہوم کو پیش نظر رکھیے تو اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ پیغمبروں اور

نیکوں سے قرابت رکھنے کے باوجود اگر کوئی شخص، خواہ مرد ہو یا عورت، بدی کی راہ اختیار کرے  
 تو وہ خدا کے غضب کا دوسروں کے مقابل میں زیادہ سزاوار ٹھہرتا ہے۔“ (تذبرقرآن ۳۶۸/۴)

۸؎ یہ تنبیہ اور توثیق کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں لڑکوں کی صورت میں دیکھ کر کسی  
 غلط فہمی میں نہ پڑنا۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ شدنی ہے، اس لیے اب بغیر کسی تردد کے اور بلاتا خیر  
 ہماری ہدایات پر عمل کرو۔

۹؎ یہ اس لیے فرمایا کہ اُن کے گھر والوں میں سے کوئی پیچھے نہ رہ جائے۔ استاذ امام کے  
 الفاظ میں، جس طرح راعی اپنے گلے کے پیچھے چلتا ہے کہ کوئی بھیڑیوڑ سے الگ رہ کر بھیڑیے کا  
 شکار نہ ہو جائے۔





إِلَيْهِ ذَلِكَ الْأَمْرَانِ دَابِرَ هَؤُلَاءِ مَقْطُوعٍ مُّصْبِحِينَ ۖ ﴿٦٦﴾  
وَجَاءَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ ۖ ﴿٦٧﴾ قَالَ إِنَّ هَؤُلَاءِ

دیکھے اور وہاں چلے جاؤ، جہاں تم کو جانے کی ہدایت کی جا رہی ہے۔ اور ہم نے اُس کو اپنا یہ فیصلہ پہنچا دیا کہ صبح ہوتے ہی ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔ ۶۶-۶۷  
(اس سے پہلے یہ ہوا کہ لڑکوں کو لوط کے گھر آتے دیکھ کر) شہر کے لوگ خوشیاں

۷۰۔ یہ ہدایت کیوں ہوئی؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے

ہیں:

”... کسی جگہ سے نکلتے ہوئے اُس کی طرف مڑ مڑ کے دیکھنا اس بات کی علامت ہے کہ اُس کے ساتھ انس اور لگاؤ ہے۔ یہ انس اور لگاؤ عام حالات میں تو ایک فطری چیز ہے اور ایک فطری تقاضے کو روکا یا دبایا نہیں جاسکتا، لیکن جس بستی کے لیے اتمام حجت کے بعد عذاب الہی کا فیصلہ ہو چکا ہو، اُس سے نکلتے وقت اہل ایمان کو اس طرح دامن جھاڑ کے اٹھنا چاہیے کہ اُس کے ساتھ دل کے لگاؤ کا کوئی شائبہ بھی باقی نہ رہ جائے۔“ (تدبر قرآن ۳۶۸/۴)

۷۱۔ اصل میں لفظ قُضِينَا آیا ہے اور اُس کے ساتھ اِلٰی کا صلہ ہے۔ یہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ یہاں اُبْلَغْنَا یا اس کے ہم معنی کسی لفظ کا مفہوم مقدر ہے۔

۷۲۔ سورہ ہود میں یہ واقعہ جس ترتیب سے سنایا گیا ہے، اُس سے واضح ہے کہ بدمعاشوں کے حملے سے پہلے حضرت لوط اس بات سے واقف نہ تھے کہ اُن کے مہمان درحقیقت فرشتے ہیں۔ یہی ترتیب واقعات کی فطری ترتیب ہے، اس لیے کہ لوط علیہ السلام اگر اُن کی حقیقت سے واقف ہو چکے ہوتے تو اُس فریاد و فغاں کی ضرورت نہیں تھی جس کا ذکر آگے ہوا ہے۔ لیکن قرآن نے یہاں حملے کی روداد کو موخر کر دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جس پہلو کو نمایاں کرنا مقصود ہے، وہ فرشتوں کا آنا ہے تاکہ مخاطبین یہ جان لیں کہ اُن کے مطالبے پر فرشتے آگئے تو اُن کے لیے کیا



ضَيِّفِي فَلَا تَفْضَحُونِ ۝۶۸ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزَوْنَ ۝۶۹ قَالُوا  
أَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعُلَمِيْنَ ۝۷۰ قَالَ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي إِنْ كُنْتُمْ فَعِلِينَ ۝۷۱  
لَعَنُوكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝۷۲ فَآخَذَتْهُمْ الصَّيْحَةُ

مناتے ہوئے آ پہنچے۔ لوط نے کہا: یہ میرے مہمان ہیں، اس لیے میری فضیحت نہ کرو،  
اللہ سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو۔ وہ بولے: کیا ہم نے تمہیں باہر کے سب لوگوں سے  
روک نہیں دیا تھا (کہ اُن کے اور ہمارے درمیان رکاوٹ نہ بنا کرو)؟ لوط نے (عاجز  
ہو کر) کہا: اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں۔ تیری جان کی قسم،  
لے کر آئیں گے۔ اس طرح کی تقدیم و تاخیر کی مثالیں قرآن کے بعض دوسرے مقامات میں بھی  
ہیں۔

۸۳ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ بد اخلاقی کی کس انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ لوط علیہ السلام  
جیسا مقدس انسان اور معلم اخلاق ہے جس کے گھر پر یہ اس لیے خوشیاں مناتے ہوئے پہنچ گئے  
ہیں کہ انھیں کچھ خوب روٹ کے اُن کے گھر جاتے ہوئے نظر آ گئے ہیں جن سے یہ اپنی ہوس کی  
پیاں بجھا سکتے ہیں۔

۸۴ حضرت لوط نے یہ ان لوگوں کو نہایت موثر انداز میں اپنی عزت و آبرو کا واسطہ اور خوف  
خدا کا حوالہ دے کر بد معاشی سے روکنے کی کوشش کی ہے۔

۸۵ یعنی باہر سے آنے والوں کو ہم ماریں، لوٹیں یا اُن کی آبروریزی کریں، تم اس میں  
رکاوٹ نہ بنا کرو۔ لوط علیہ السلام، ظاہر ہے کہ اس سے پہلے بھی انھیں ان سب باتوں سے  
روکتے رہے ہوں گے اور انھوں نے آپ کو اور آپ کے پیروں کو دھمکیاں دی ہوں گی کہ ہماری  
بد معاشیوں میں اس طرح کی رکاوٹیں پیدا کر کے تم ہماری بستی میں نہیں رہ سکو گے۔ یہ اُن لوگوں  
نے اسی کا حوالہ دیا ہے۔





مُشْرِقِينَ ۙ فَجَعَلْنَا عَلَيْهِمْ حِجَابًا ۖ فَمِنْ سَجِيلٍ ۙ ۙ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ ۙ ۙ وَإِنَّهَا لِبَسِيلٍ ۙ مُّقِيمٍ ۙ ۙ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ۙ ۙ

(اے لوط، اس وقت) یہ اپنی سرمستی میں اندھے ہو رہے ہیں۔ (ہم نے لوط کو تسلی دی)، پھر دن نکلتے ہی اُن کو ہماری ڈانٹ نے آپکڑا اور ہم نے وہ بستی اوپر تلے کر ڈالی اور اُن پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش برسا دی۔ بے شک، اس سرگذشت میں اُن لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو بصیرت حاصل کرنے والے ہوں۔ یہ بستی ایک عام گزرگاہ پر واقع ہے۔ بے شک، اس میں ایمان والوں کے لیے بھی بڑی نشانی ہے۔ ۶۷-۷۷

۷۶ حضرت لوط کی طرف سے یہ اُن اوباشوں کے لیے کیا کوئی پیش کش تھی؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ حضرت لوط کی طرف سے کوئی پیش کش نہیں تھی، بلکہ یہ اپنی قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے اُن کی آخری تدبیر تھی۔ اگر اُن لوگوں کے اندر اخلاقی حس کی کوئی رمت بھی ہوتی تو وہ سوچ سکتے تھے کہ ایک یہ شخص ہے جو اپنے مہمانوں کی عزت بچانے کے لیے اپنی عزت تک خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہے اور ایک ہم ہیں کہ اُس کی اور اُس کے مہمانوں کی عزت کے درپے ہیں۔ یہ بالکل اُسی طرح کی بات ہے، جس طرح ایک اعلیٰ کردار کا آدمی دوسرے کی جان یا آبرو بچانے کے لیے اپنی جان اور اپنے وقار کو خطرے میں ڈال دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۴/۳۷۰)

۷۷ یہ اُس عذاب کی تعبیر ہے جو قوم لوط پر بھیجا گیا۔ باد تند کے ساتھ اُس میں رعد و برق کی کڑک اور چمک بھی تھی، اس وجہ سے یہ لفظ اُس کے لیے نہایت موزوں استعمال ہوا ہے۔

۷۸ پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کی قومیں بالعموم پتھر برسانے والی آندھی



وَإِنْ كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ ظَالِمِينَ ۙ فَانْتَقِمْنَا مِنْهُمْ  
وَانْتَهَى إِلَيْنَا مُمِيزٌ ۙ وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ  
الْمُرْسَلِينَ ۙ وَاتَّبَعَهُمُ ائْتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۙ

اسی طرح بن والے بھی یقیناً ظالم تھے۔ سو ہم نے اُن سے بھی انتقام لیا۔ یہ  
دونوں بستیاں کھلی شاہ راہ پر واقع ہیں۔ اور حجر والے بھی رسولوں کو جھٹلا چکے ہیں۔ ہم

سے تباہ کی گئی ہیں۔ قرآن نے دوسری جگہ اسے 'حاصِب' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اُسی کا بیان ہے۔  
۸۹۔ سدوم اور عمورہ کی بستیاں حجاز اور شام کے تجارتی راستے پر واقع تھیں۔ دونوں ملکوں کے  
تجارتی قافلوں کے لیے یہ راستہ عام گزرگاہ تھا۔ اس سے قافلے گزرتے تو لوگ تباہی کے اُن آثار  
کو دیکھتے تھے جو اس علاقے میں آج بھی نمایاں ہیں۔

۹۰۔ قریش مکہ کے بعد اب یہ اہل ایمان کو بھی متوجہ کیا ہے کہ وہ بھی اگر چاہیں تو ان آثار میں  
اپنے دشمنوں کا مستقبل دیکھ سکتے ہیں۔ لہذا مطمئن رہیں، بالآخر وہی کامیاب ہوں گے اور اُن کے  
دشمن اسی طرح پامال ہو جائیں گے۔

۹۱۔ اس سے قوم شعیب مراد ہے۔ پچھلی سورتوں میں بیان ہو چکا ہے کہ شعیب علیہ السلام  
مدین والوں کی طرف بھیجے گئے تھے۔ اس بستی کے قریب ایک بہت بڑا بن تھا۔ عربی زبان میں  
جھاڑی اور بن کے لیے 'ایکۃ' کا لفظ آتا ہے۔ یہاں چونکہ مخاطبین کو عذاب الہی کے اُن زمینی  
نشانات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جنہیں وہ اپنے تجارتی سفروں میں دیکھتے تھے، اس لیے قوم  
شعیب کا ذکر 'أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ آگے قوم ثمود کو 'أَصْحَابُ الْحِجْرِ' کہا  
گیا ہے۔ اُس کی وجہ بھی یہی ہے۔

۹۲۔ یعنی 'ظالمین أنفسہم' (اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے)۔ یہ کفر و شرک اور صراطِ مستقیم  
سے انحراف کے لیے قرآن کی خاص تعبیر ہے۔





وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ ﴿٨٢﴾ فَآخَذَ تَهُمُ الصَّيْحَةُ  
مُصْبِحِينَ ﴿٨٣﴾ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٨٤﴾  
وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَإِنَّ

نے اُن کو اپنی نشانیاں دیں، مگر وہ اُن سے روگردانی ہی کرتے رہے۔ وہ پہاڑوں کو  
تراش کر گھر بناتے تھے کہ اُن میں چین سے رہیں۔ پھر اُن کو صبح ہوتے ہماری ڈانٹ  
نے آپکڑا تو اُن کے کچھ کام نہ آیا جو کچھ وہ کماتے رہے تھے۔ ۸۲-۷۸

ہم نے، (اے پیغمبر)، زمین اور آسمانوں کو اور اُن کے درمیان سب چیزوں کو  
۹۳ یعنی قوم لوط اور قوم شعیب کی بستیاں۔

۹۴ 'حجر' شمالی عرب اور شام کے درمیانی علاقے کو کہتے ہیں۔ یہ قوم ثمود کا مسکن تھا۔  
صالح علیہ السلام کی بعثت اسی علاقے کے اندر ہوئی۔ اُس وقت جو شہر یہاں آباد تھا، اُس کے  
کھنڈر مدینہ کے شمال مغرب میں موجودہ شہر العلاء سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ اس قوم کی  
طرف ایک ہی رسول کی بعثت ہوئی تھی، مگر کوئی رسول بھی یہ دعوت اُن کے سامنے پیش کرتا، اُس  
کے ساتھ اُن کا معاملہ وہی ہوتا جو صالح علیہ السلام کے ساتھ ہوا۔ قرآن نے اسی بنا پر لفظ 'مُرْسَلِينَ'  
جمع استعمال کیا ہے۔ اس سے جرم کی سنگینی اور شدت ظاہر ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُنھوں نے  
جب ایک رسول کو جھٹلایا تو گویا سب کو جھٹلادیا۔

۹۵ مطلب یہ ہے کہ کمال فن سے بنائے ہوئے نہایت شان دار اور مستحکم مکانات میں اپنی  
جگہ بالکل بے خوف اور مطمئن بیٹھے تھے اور یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اُن کے یہی مستحکم اور  
شان دار مکانات کسی وقت اُن کی قبروں میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔

۹۶ یہ لفظ کیوں استعمال ہوا ہے؟ اس کی وجہ پیچھے قوم لوط کے ذکر میں بیان ہو چکی ہے۔  
۹۷ یہاں سے آگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین و تسلی کے لیے خطاب التفات ہے۔ یہ



السَّاعَةَ لَا تِيَهُ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ۝۸۵ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلْقُ  
الْعَلِيمُ ۝۸۶ وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ۝۸۷  
لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ

مقصد کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے<sup>۹۸</sup> اور اس میں کچھ شک نہیں کہ قیامت آنے والی ہے،  
اس لیے ان کے ساتھ خوبی سے درگزر کرو۔<sup>۹۹</sup> یقیناً تمہارا پروردگار ہی بڑا خلاق اور  
بڑے علم والا ہے۔ ہم نے تم کو سات مثنیٰ، یعنی قرآن عظیم عطا کر دیا ہے۔ تم ان  
چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو جو ہم نے ان کے مختلف گروہوں کو دے رکھی  
خاتمہ سورہ کی آیات ہیں۔ انذار عام اور اتمام حجت کی سورتوں کا خاتمہ بالعموم اسی مضمون پر ہوتا  
ہے۔

۹۸ یہ آگے کی بات کے لیے تمہید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے یہ دنیا غایت و حکمت کے  
ساتھ پیدا کی ہے۔ اس کا لازمی تقاضا ہے کہ یہ اپنے انجام کو پہنچے اور اس میں جو کچھ ہوا ہے، خدا کی  
عدالت انصاف کے ساتھ اس کا فیصلہ سنا دے۔ یہ کوئی بازیچہ اطفال نہیں ہے کہ لوگ اس میں جو  
چاہے، کرتے پھریں اور ان سے کوئی باز پرس نہ ہو۔  
۹۹ اس سے کیا مراد ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... خوبصورتی کے ساتھ درگزر کا مطلب یہ ہے کہ نہ ان کی شرارتوں سے بددل اور مایوس ہو،

نہ ان کی بے ہودہ باتوں کا جواب دو اور نہ اپنے فرض دعوت و تبلیغ سے دست کش ہو، بلکہ اپنے

کام میں لگے رہو اور ان کے معاملے کو اللہ پر چھوڑ دو۔“ (تدبر قرآن ۴/۳۷۶)

۱۰۰ اوپر فرمایا ہے کہ قیامت آنے والی ہے۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ خدا خالق ہے تو پھر کیا

مشکل ہے، وہ جب چاہے، اسی طرح دوبارہ پیدا کر سکتا ہے۔ یہ دوسری پیدائش اگر احتساب کے

لیے ہے تو اس میں بھی کچھ مشکل نہیں، اس لیے کہ وہ علیم بھی ہے۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز اس





عَلَيْهِمْ وَآخِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٨٨﴾ وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ  
الْمُبِينُ ﴿٨٩﴾ كَمَا أَنزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ ﴿٩٠﴾ الَّذِينَ جَعَلُوا  
الْقُرْآنَ عِصْيَانًا ﴿٩١﴾ فَأَوْرَثْنَاكَ لِنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٩٢﴾ عَمَّا

ہیں اور نہ ان کی حالت پر غم کرو۔ اپنے شفقت کے بازو، البتہ اہل ایمان پر جھکائے رکھو اور (نہ ماننے والوں سے) کہہ دو کہ میں تو ایک کھلا ہوا خبردار کرنے والا ہوں۔ ہم نے اسی طرح اُن بانٹ دینے والوں پر بھی اتارا تھا جنہوں نے اپنے قرآن کو بانٹ کر اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اِس لیے تیرے پروردگار کی قسم، ہم اُن سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ وہ جب فیصلہ کر لے گا کہ تمہیں جواب دہی کے لیے بلانا ہے تو تمہارا سب کچا چٹھانکال کر تمہارے سامنے رکھ دے گا۔

۱۰۱۔ یعنی قرآن جیسی دولت گراں مایہ اور نعمت عظمیٰ عطا کر دی ہے جو سات مثانی کا مجموعہ ہے۔ لفظ 'مَثَانِي' 'مثنیٰ' کی جمع ہے اور اِس کے معنی ہیں: وہ چیز جو دو دو کر کے ہو۔ آیت میں حرف 'مِنْ' اضافت کو ظاہر کر رہا ہے اور حرف 'و' تفسیر کے لیے ہے۔ چنانچہ سات مثانی سے ہمارے نزدیک قرآن میں سورتوں کے وہ مجموعے مراد ہیں جن کی ہر سورہ مضمون کے لحاظ سے اپنا ایک جوڑا اور شئی رکھتی ہے اور دونوں میں اُسی طرح کی مناسبت ہے، جس طرح کی مناسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ اِس سے مستثنیٰ چند سورتیں ہیں جن میں سے فاتحہ پورے قرآن کے لیے بمنزلہ دیباچہ اور باقی تہمتہ و تکملہ یا خاتمہ باب کے طور پر آئی ہیں۔ یہ مجموعے تعداد میں سات ہیں۔ انہیں ہم قرآن کے ابواب بھی کہہ سکتے ہیں۔ قرآن کی تمام سورتیں آپس میں توام بنا کر اور انہی ابواب کی صورت میں مرتب کی گئی ہیں\*۔

\* اِس کی تفصیل کے لیے دیکھیے، اسی کتاب کا "مقدمہ"۔



كَأَنَّهُمْ يَعْمَلُونَ ۝ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۝  
 إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ ۝ الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا  
 آخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝ وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ  
 بِمَا يَقُولُونَ ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ۝  
 وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ۝

سب سے ضرور پوچھیں گے جو وہ کرتے رہے ہیں۔ سو، (اے پیغمبر)، تمہیں جو حکم ملا ہے، اُس کو کھول کر سنا دو اور ان مشرکوں سے اعراض کرو۔ تمہاری طرف سے ہم ان مذاق اڑانے والوں (سے نمٹنے) کے لیے کافی ہیں جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو بھی شریک قرار دیتے ہیں، پھر وہ عنقریب جان لیں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں، اُس سے تمہارا دل تنگ ہوتا ہے۔ سو اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو اور سجدہ کرنے والوں میں سے بنو اور اپنے پروردگار کی بندگی میں لگے رہو، یہاں تک کہ تمہارے پاس یقین کی گھڑی آ پہنچے۔ ۸۵-۹۹

قرآن کے بارے میں یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس ارشاد سے بھی واضح ہوتی ہے جس میں آپ نے سورہ فاتحہ کو سبع مثانی اور قرآن عظیم قرار دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...سورہ فاتحہ کی حیثیت پورے قرآن کے دیباچہ کی ہے اور اس میں وہ تمام مطالب بالاجمال سمٹ آئے ہیں جو پورے قرآن میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ گویا اس نگینے کے اندر قرآن عظیم کا پورا شہرستان معانی بند ہے۔ اس پہلو سے یہ سبع مثانی بھی ہے اور قرآن عظیم بھی۔“ (تذبر قرآن ۳/۸۷۸)

۱۰۲ یہ اشارہ یہود کی طرف ہے جنہوں نے اپنے قرآن، یعنی تورات کو حصوں میں بانٹ دیا،



پھر بعض کو چھپایا اور بعض کو ظاہر کیا۔ یہ وہی فعل ہے جسے سورۃ انعام (۶) کی آیت ۹۱ میں  
 'تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ' (جس کو ورق ورق کر کے اُنھیں دکھاتے ہو) سے تعبیر فرمایا ہے۔  
 ۱۰۳۔ یعنی خدا کا فیصلہ صادر ہو جائے اور ہر وہ بات واقعہ بن جائے جس کی تم لوگوں کو خبر دے  
 رہے ہو۔

کوالا لپور

۲۲ اگست ۲۰۱۲ء

